

مکتبہ جامعہ دہلی

معاشیات، سیاسیات، اجتماعیات وغیرہ

ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات	محمد احمد خاں	قیمت
جنگ اور غذا کا مسئلہ	شفیق الرحمٰن	۔
جنگ اور راشن بندی	سعید احمد جیلانی	۔
امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے	عطاء الرحمٰن علوی	۔
کینیڈا " " "	خواجہ شمس الدین	۔
انگلستان " " "	محمد احمد خاں	۔
ہندوستان " " "	سعید احمد جیلانی	۔
محصول زائد نفع اندوزی	" " "	۔
ہندوستان کا قومی قرضہ	محمد احمد خاں	۔
ہندوستان کے لئے ایک معاشی لائحہ عمل	سر پرشوتم داس ٹھاکر داس	۔
معاشیات اور پاکستان	سید عبدالقدوس ہاشمی	۔
ترکستانی خاتون شاہراہ عام پر	قدوس صہبائی بی اے (آنرز)	۔
بخارا کا جمہوری انقلاب	" " "	۔
سیاست جاپان	علی امام بلگرامی ایم اے	۔
مرد انقلاب	شہزادہ کروپاٹکن کے حالات زندگی	۔
جنگ اور مالیہ	امتیاز حسین خاں بی کام (لندن)	۔
جنگ اور اغذیہ	" " "	۔
اشتراکی روس	محمد عبدالقادر لکچرار جامعہ عثمانیہ	۔
تنظیم مابعد جنگ	ڈاکٹر انور اقبال قریشی جامعہ عثمانیہ	۔
پارلیمانی طرز حکومت	منظور الحسن ہاشمی بی اے	۔
مشرق بعید	شاہد حسین رزاقی ایم اے	۔
سوشلزم	عبداللطیف اعظمی بی اے (جامعہ)	۔

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی ۳

جامعہ

زیر ادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۳۴ نمبر ۱ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۴ء | سالانہ چندہ عہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

[illegible]

فنونِ لطیفہ

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنونِ لطیفہ صنعتوں کی اعلیٰ شکلیں ہیں جنہیں انسان کی محنت اور مشق، ذوق اور اولوالعزمی نے صنعتوں سے الگ اور برتر مرتبہ دیدیا۔ صنعتیں اس نے وجود میں لائیں کہ انسان کو بہت سی مادی ضروریات مہیا کرنے اور زندگی کو آسان بنانے کی خواہش تھی۔ اس کی طبیعت میں شروع ہی سے حسن کی طلب اور تخلیق کی امنگ بھی تھی اس نے اپنی ضروریات کے لیے جو کچھ بنایا وہ بھی خوبصورت تھا۔ اس نے ہر کام کی چیز کی ایک موزوں شکل سوچی اور اسے رنگ اور نقش و نگار سے آراستہ بھی کیا۔ ذہنی ارتقا کے ساتھ حسن کا ذوق لطیف ہوتا گیا۔ انسان نے محسوس کیا کہ گانے ناچنے اور خوب صورت چیزیں بنانے میں اس کی شخصیت اور زندگی کی دلچسپی کی تکمیل ہوتی ہے جیسے درخت کی پھول اور پھل آنے سے۔ محض ضرورت پوری کرنا اسے کافی معلوم نہ ہوا، صنعتیں ترقی کرتی رہیں مگر ان کے بنانے والوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہونے لگے جو حسن کے تصور میں ڈوبے رہتے تھے اور اپنے احساسات کو دوسروں تک پہنچانے کی خاص استعداد رکھتے تھے۔ الفاظ اور تصورات کا ذخیرہ بڑھ گیا اور انسان بالکل صحت سے اپنے مطالب ادا کرنے لگا۔ تو زبان تبادلۂ خیال کے علاوہ جذبات اور واردات قلبی کو بیان کرنے کا ذریعہ بن گئی اور فنونِ لطیفہ میں خوش گفتاری اور ادب کا اور اضافہ ہو گیا۔

ہم اس وقت ادبِ لطیف کو آرٹ کے دوسرے شعبوں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں کیونکہ اس کا رواج زیادہ ہے اور اس کا سمجھنا نسبتاً آسان معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے تصورات ایسے ہوتے ہیں جنھیں براہِ راست یعنی استعارہ اور تشبیہ کی مدد کے بغیر ظاہر کرنے کی زبان میں صلاحیت نہیں ہوتی، جیسے کہ جسامت، قوت، حرکت وغیرہ، اور بہت سے آدمی ایسے ہوتے ہیں جو اپنا [illegible]

الفاظ کے پیرائے میں ادا نہیں کر سکتے، البتہ محسوس شکلوں یا رنگوں، سروں یا جسم کی زبان میں بیان کر سکتے ہیں۔ شاعر الفاظ کے ذریعہ اپنی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ مصور رنگ اور شکل کے پیرائے میں، موسیقی کا ماہر دل کی بات ساز یا آواز کی زبانی کہتا ہے سنگ تراش اسے صورت یا مجسمہ کاری میں مجسم کر دیتا ہے۔ مگر شاعر، مصور، سنگ تراش سب ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں سے پیش نہیں کرتے۔ فنون لطیفہ کی ہر صنف کا اپنا الگ منصب اور مقصد ہے مثلاً اشتعال اور حسن کو اس طرح ہم آہنگ کرنا جیسے کہ تاج محل کے معمار نے کیا ہے، شاعری، مصوری یا موسیقی کے بس میں نہیں ہیئت اجتماع کی صورت میں فقط ساکت چیز کو جس طرح دائمی حرکت کا نمونہ بنایا گیا ہے وہ سنگ تراشی کا حصہ ہے اس لئے ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فنون لطیفہ کی کسی ایک صنف کو فضیلت حاصل ہے، اور یہ بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آدمی کو پورا آدمی، زندگی کو پوری زندگی بنانے کے لئے جمالیات کا ایسا ذوق اور ایسا چرچا لازمی ہے کہ ہر فن لطیفہ کا حق ادا کیا جا سکے۔ ہم آرٹ کی کسی صنف کو توجہ کے قابل نہ سمجھیں یا اس سے تعصب برتیں تو ان لوگوں کی تخلیقی قوتیں سلب ہو جائیں گی جو اس فن کو احساسات کا ذریعہ اظہار بنانے کی قدرتی صلاحیت رکھتے ہیں، اسی نسبت سے انسان کی طبیعت اور اس کے فکر کی تشکیل اور تکمیل کے امکانات محدود ہو جائیں گے، اور یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ زندگی جتنی محدود ہو اتنی ہی ناقص اور ناتمام رہتی ہے۔

فنون لطیفہ کا ذوق انسان کی سرشت میں ہے۔ تہذیب کی پیدا کی ہوئی خصوصیت نہیں۔ اس کا ثبوت صرف یہ تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ انسان نے اس وقت سے جب کہ اسے اپنے اعضا پر قابو ہو گیا سنگ اور لکڑی وغیرہ کو اپنا رازداں بنایا ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انسان کو فنون لطیفہ کا اصل سرمایہ قدرت سے ملا ہے، اور یہ شاید کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اس نے حسن کا معیار اپنی طرف سے نہیں بلکہ قدرت کے نمونوں کو دیکھ دیکھ کر قائم کیا ہے۔ اب علم طبیعیات اس کی تصدیق کرتا ہے کہ مصور مختلف رنگوں کی جو تاثیر بتاتے رہے ہیں وہ سائنس کے نقطہ نظر سے صحیح ہے، جن سروں کو فن موسیقی کی بنیاد مانا گیا ہے آہنگ میں سب مطابق ... ہیں۔ مصوری، سنگ تراشی اور فن تعمیر ...

کی انتہا مان لیں اور کہہ دیں کہ اب آگے نقل کرنے کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ جب زندگی کا سلسلہ کسی مقام پر پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا تو جمالیات کا معیار اور اس کی قدریں نئے اور بدلتے ہوئے احساسات اور واردات قلبی کی حامل ہونے سے کس طرح انکار کر سکتی ہیں

یہ قوموں کے زندہ ہونے کی ایک علامت ہے کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جو حسن کو دوسروں کی آنکھوں سے نہ دیکھیں، خود اس کے دیدار کے طالب ہوں، اور اپنے کام کو نئی اخلاقی قدروں اور تازہ قلبی واردات کا حامل بنائیں۔ یورپ میں انیسویں صدی کے نصف آخر سے اس وقت تک آرٹ کی ماہیت پر بحث جاری ہے، اور اس کے جاری رہنے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مصور، سنگ تراش، شاعر، ڈراما نویس، غرض ہر قسم کے آرٹسٹ اپنے فن کے ایسے نمونے پیش کرتے رہے ہیں جن کو جانچنے کے لئے نئے معیاروں کی ضرورت تھی۔ جو آرٹسٹ محض جدت کرنا چاہتے تھے وہ جدت کر کے رہ گئے۔ جو سچے آرٹسٹ تھے وہ اپنے خاص طرز کے امکانات کو آزماتے اور اس میں تنوع پیدا کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کا طرز خود معیار بن گیا۔ انہوں نے تقلید کے مسلک کو اس لئے چھوڑا تھا کہ تقلید کر کے وہ اپنی شخصیت، اپنے مافی الضمیر کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے اور اسی کو ظاہر کرنا وہ آرٹ کا منصب اور اپنا حق سمجھتے تھے۔ آرٹسٹ کے حق کا یہ مطالبہ آزادی کے اس دریا کی لہر نہیں تھی جو اس وقت یورپ میں موجیں مار رہا تھا۔ فنون لطیفہ کی تاریخ سے اگر ایک طرف یہ بات واضح ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ حسن کا ایک خاص معیار تھا تو دوسری طرف یہ بھی ثابت ہے کہ فن کے وہ اصول جو اس معیار کی ترجمانی کرتے تھے، آہستہ آہستہ بدلتے رہے، اور آخر میں ایک زمانہ آیا جب کہ ان اصولوں کو ترک کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، اور آرٹسٹ اس پر مجبور ہوئے کہ ہر پرانے نقش کو مٹا کر حسن کی ایک بالکل نئی تصویر بنائیں

فنون لطیفہ کا ہر طرز جس کی پوری نشو و نما ہوتی ہیں بڑی منزلوں سے گزرتا ہے۔ پہلی منزل وہ ہوتی ہے جبکہ جب آرٹسٹ کا علم اور فنی استعداد اتنی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیال کو پورا پورا ادا کر سکے، لیکن خود خیال میں اتنا زور ہوتا ہے کہ اس کی خوبی فنی خامیوں کے باوجود ظاہر ہو جاتی ہے، جیسے کہ

خوبصورت، تندرست ہو، بے ڈھنگا لباس پہنے ہو تب بھی پیارا لگتا ہو۔ فن کے بچپن کا زمانہ جس کو فنی اصطلاح میں ARCHAIC یعنی قدیمی یا ابتدائی دور کہا گیا ہو اور اس کے کام میں ایسا ابھار ہے۔ بداہت اور سادگی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ارتقا کی دوسری منزل وہ ہے جب کہ آرٹسٹ اپنے فن میں ایسا ماہر ہو جاتا ہے کہ تخیل کی بلند پروازی اسے عاجز نہیں کر دیتی۔ اور اس کا تخیل اپنے فن کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ لازمی پابندیوں کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اس لئے اس دور کی خصوصیت فن اور تخیل کی ہم آہنگی، خیال اور خیال کو پیش کرنے کے طریقے کی ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے۔ یونان اور روما کی تاریخ کے ایک خاص دور کے فنونِ لطیفہ میں سادگی اور نفاست، ضبط اور وجد آہنگی کی ایسی صحیح آمیزش پائی جاتی ہے کہ اسے معیار مان کر فن کے اس دور کو CLASSICAL یا کلاسیکی کہا جاتا ہے۔ یہ عروج کا زمانہ ہوتا ہے اور اس میں عموماً فن کے تمام امکانات آزمائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد انحطاط لازمی ہے، کیونکہ وہ ذہنی قوتیں جن کی بدولت فن کی نشو و نما ہوتی ہے آہستہ آہستہ زائل ہو جاتی ہیں، آرٹسٹ کے سامنے معیاری کام کے نمونے اس افراط سے موجود ہوتے ہیں کہ اس کا تخیل ان میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اس کی طبیعت میں خود بخود یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ دوسروں نے جو کچھ کیا ہے اس سے بڑھ کر کچھ کر دکھائے۔ یہ جذبہ صحیح نہیں، اس لئے کہ آرٹسٹ کی نظر اپنے دل پر ہونا چاہیے، اور دوسروں کے کام کا مطالعہ اسے صرف اس نیت سے کرنا چاہیے کہ فن میں جگہ پیدا کر سکے جب وہ دوسروں کے کام کو سامنے رکھ کر ان سے بازی لے جانے کا حوصلہ کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ نقل کرتا ہے، اور اس سے جو نقصان ہوتا ہے اس کی تلافی کرنے کے لئے یہ کافی نہیں کہ نقل کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انحطاط کے دور کا اصطلاحی نام بروک[1] ہے۔ اس دور میں آرٹسٹ کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ فنی مہارت کے کرشمے دکھائے، کلام کو حد سے زیادہ پیچیدہ کر دیا جاتا ہے، سادہ تخیل کی بے مائگی، خلوص، تربیت کی خامی چھپ جاتی ہے۔ فن کے ماہر اور قدردان دونوں مبالغہ پسند

---

[1] [illegible] BAROQUE کہا گیا تھا۔ [illegible]
[illegible] انحطاط کی [illegible]

ہو جاتے ہیں اور تصنع کی ایک دبیز تہہ جم کے ہلکے اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ زندگی اور فنون لطیفہ کے تصور میں کوئی بڑا انقلاب ہو۔ ایسے انقلاب ساری دنیا میں ہوتے رہے ہیں اور عمل کے لیے نئے میدان، حسن کے لیے نئی جلوہ گاہیں فراہم کرتے رہے ہیں۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی ہمیں فنون لطیفہ کے عروج اور زوال کے کئی دور ملتے ہیں۔ یہ اس کی علامتیں ہیں کہ کئی تہذیبوں نے ترقی کی، عروج پر پہنچیں اور پھر انہیں زوال ہوا ان کے حالات کبھی کبھی کتابوں کے ذریعے معلوم ہوتے ہیں لیکن کتابوں میں وہی درج ہے جو ان کے لکھنے والوں نے دیکھا یا سنا۔ یعنی صرف ظاہری باتیں جن سے تہذیب کے باطن کا پورا بھید نہیں کھلتا ہم صرف کتابوں پر بھروسا کرنے کے بجائے اگر یہ ذہن نشین کر لیں کہ فنون لطیفہ کا مقصد انسان کی انسانیت کو ابھارنا اور شکل دینا ہے اور وہ تہذیبی خصوصیات کے اصل حامل ہوتے ہیں تو ان کا ہر نمونہ معلومات کا ایک خزانہ بن جائے گا۔ ہماری تاریخ جاگ اٹھے گی ہم اپنے پیش رووں کی نظر اور ان کے ذوق کی پوری قدر کر سکیں گے اور ہم پر واضح ہو جائے گا کہ ان کا معجز نگار ہاتھ بے جان چیزوں کو ایسی شکل اور وضع دے سکتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے ان کے تصورات کی یاد تازہ رکھیں۔

ملت اسلامیہ دکن کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل

یہ مقالہ مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد کے سالانہ جلسہ منعقدہ ورنگل میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے تمہیدی حصے کو جس میں صاحب مقالہ نے یہ دکھلایا تھا کہ چونکہ اسلامی معاشی نظام بحیثیت ایک نصب العین ابھی وضاحت کا محتاج ہے اور اس کے حصول کے لئے مملکت اسلامی اور جمعیت اسلامی کا قیام لازمی ہے اس لئے اس نصب العین کو فی الحال عملی سیاست کا جز نہیں بنایا جا سکتا ہم نے گنجائش کی کمی کی وجہ سے حذف کر دیا ہے اور صرف اس حصے کو پیش کر رہے ہیں جس میں موجودہ حالات کے پیش نظر حیدرآباد کے مسلمانوں کے لئے معاشی اصلاح و ترقی کی تجاویز کو پیش کیا گیا ہے۔ منصوبہ بندی نے آج کل ایک اہم بحث اور معرکۃ الآرا مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن یہ ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس پر مختلف مفاد کے نقطہ ہائے نگاہ سے اور مختلف طریقوں کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جا سکتا ہے ہم ملک کے اہل الرائے حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے صفحات کے ذریعے تبادلہ خیال فرمائیں تاکہ اس مسئلے کے مختلف پہلو روشنی میں لائے جاسکیں۔ — مدیر

تمہید | حکومت سرکار عالی یا حکومت ہند کی جانب سے جو معاشی تجاویز اس وقت مرتب ہو رہی ہیں بظاہر ان کی ترتیب پورے ملک کے مفاد کے پیش نظر کی جارہی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ان معاشی منصوبہ بندیوں سے سب سے زیادہ استفادہ وہی طبقہ اور فرقہ کرے گا جس کا موجودہ معاشی موقف مضبوط اور مستحکم ہو۔ ملک میں لاکھ بڑی صنعتیں ہوں لیکن اس سے استفادے میں ان مسلمانوں کا کیا حصہ ہو سکتا ہے۔ جن کی گرہ میں ان صنعتوں میں مشغول کرنے کے لئے ایک ٹکا تک نہ ہو۔ مسلمان معاشی منصوبہ بندیوں کی ان تجاویز کو دیکھتے ہیں اور پھولے نہیں سماتے۔ لیکن افسوس کہ وہ نہیں جانتے کہ یہ معاشی منصوبہ بندیاں ان کے لئے ہیں یا کسی اور کے لئے ہیں۔ جب ان معاشی

تجاویز کو جامہ عمل پہنایا جائے گا تو ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خوش آیند توقعات جو انھوں نے ان معاشی تجاویز سے باندھ رکھی تھیں۔ ایک خواب و خیال سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ بہت جلد یہ تلخ حقیقت بھی ان پر روشن ہو جائے گی کہ عصر حاضر کے اس کلیہ کے مطابق کہ اقوام کی معاشی برتری ہی ان کی سیاسی برتری کا ذریعہ ہے۔ اس ملک میں ان کی سیاسی برتری بھی دوسری ہی ہم سایہ اقوام کی معاشی ترقی کے باعث ایک قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔

اس لئے بحالاتِ موجودہ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسلمان جلد سے جلد اپنی معاشی حالت کی اصلاح کرکے ان معاشی تجاویز سے جو حکومت کی جانب سے نافذ اور روبہ عمل لائی جانے والی ہیں حتی الوسع بیشتر سے بیشتر استفادہ کریں۔ تاکہ اس طرح ان کی معاشی خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی برتری بھی محفوظ رہے۔ اور اپنے معاشی نصب العین کے حصول کے لئے اپنی توانائیوں کو محفوظ اور مجتمع کرسکیں۔

مسلمانان حیدرآباد کی موجودہ معاشی حالت

مسلمانان حیدرآباد کی معاشی ترقی اور اصلاح کی نسبت اصلاحی تجویز کو پیش کرنے سے قبل ان کی موجودہ معاشی حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس ملک میں بجز ان مٹھی بھر گزیٹیڈ عہدہ داروں کے جو رشتہ ملازمت سرکاری میں منسلک ہیں مسلمان عام طور پر ایسے پیشوں میں مصروف ہیں جن کو کسی طرح منفعت بخش نہیں کہا جاسکتا۔ اور جن کے معیارِ آمدنی کو مزدوروں کے معیار آمدنی سے بلند نہیں سمجھا جاسکتا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے دیگر طبقات کے مقابلے میں مسلمانوں کی قومی آمدنی (NATIONAL INCOME) کا معیار بھی بہت پست ہے مسلمانوں کے پاس نہ تجارت ہے نہ زراعت اور نہ صنعت و حرفت۔ یہی نہیں بلکہ حیدرآبادی مسلمان جتنا کماتا ہے۔ اتنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی صرف کردیتا ہے۔ پس اندازی کے ذریعے اپنی آمدنی کو مزید پیدائش دولت کا ذریعہ بنانا وہ نہیں چاہتا۔ اس نے اپنی طرز معاشرت ہی کچھ اس نوعیت کی بنالی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کے کسی جزو کو پس انداز نہیں کرسکتا وہ اپنی سکونت کے لئے وسیع عمارات اور عالی شان قصر تیار کرتا ہے جن کی نگہداشت بھی اس کی اولاد کے لئے تو کیا خود اس کے لئے بھی بسا اوقات دشوار ہو جاتی ہے۔ اور یہ صحت مند زندگی کے لئے آرام دہ اور اچھے مکانات کی درست

ہے لیکن مالی نقصان، ملازمت اور قصور ایک معاشی حیثیت سے پست قوم کے لئے تباہی اور ہلاکت کا موجب ہیں۔ مملکت سلطنت حیدرآباد کا مسلمان اس مرض میں خاص طور پر زیادہ مبتلا ہے۔ اس اسراف دولت کا افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ کروڑہا کی وہ دولت جو پیدائش دولت کے کاروبار میں مشغول کرنے کے لئے بہم دست ہو سکتی تھی رکھ ۔ مٹی اور چونے کے انبار میں ضائع جا رہی ہے

مسلمانوں کے خورد ونوش، لباس اور بود و باش کے طریقے بھی دیگر ہمسایہ اقوام کے مقابلے میں بہت زیادہ چیش خرچ واقع ہوئے ہیں۔ اس قسم کی غیر معاشی طرز بود و باش بھی مسلمانان حیدرآباد کی معاشی پستی میں مزید اضافہ کا موجب ثابت ہوئی ہے۔

سطور آئندہ میں ہم یہ بتلانے کی کوشش کریں گے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی اور خوشحالی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں اور کس طرح حالات موجودہ سے بہترین استفادہ کرکے حیدرآباد کا مسلمان اپنی معاشی خوشحالی کے ساتھ ساتھ ملک میں اپنی سیاسی برتری کو قائم و مستحکم کرکے اپنا معاشی ———— اور اس کے ساتھ سیاسی ———— نصب العین حاصل کر سکتے ہیں۔

<u>مسلمانوں کی معاشی منصوبہ بندی کے مقاصد</u> موجودہ وسائل سے بہترین استفادہ کے حسب ذیل پانچ ذرائع قرار دئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں میں پس اندازی کی ترغیب و تشویق اور پس اندازی کے لئے سہولتیں مہیا کرنا اور مسلمانوں کی جانب سے عظیم سرمایہ کی فراہمی جسے پیدائش دولت کے کاموں میں مشغول کیا جا سکے۔

۲۔ مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے ایسے منفعت بخش پیشوں میں مصروف کرنا جن سے ان کی قومی آمدنی کا معیار بلند ہو۔

۳۔ مسلمانوں میں پیشہ ورانہ تعلیم اور فنی تربیت کا عام کرنا تاکہ مسلمانوں ۔۔ کی چھوٹی اور بڑی صنعتوں کے لئے ماہر دستکار اور اعلیٰ تربیت یافتہ کاریگر فراہم ہو سکیں۔

۴- مسلمانوں میں سائنٹفک تحقیقات کو عام کرنا تاکہ علوم جدید کے انکشافات اور اختراعات سے مسلمانوں کی صنعتی ترقی میں استفادہ کیا جاسکے۔

۵- مسلمانوں میں ایسی تربیت یافتہ جماعت فراہم کرنا جو اعلیٰ انتظامی قابلیت تنظیمی صلاحیت اور عملی تجربات سے وسیع تجارتی اور صنعتی کاروبار کو بہ حیثیت منتظم و مہتمم چلا سکے۔

پس اندازی | پس اندازی ہی وہ چشمہ ہے جہاں سے شغل اصل کے لئے سرمایہ کے دریا پھوٹتے ہیں۔ جب کوئی قوم اپنی قومی آمدنی کو کلیۃً اغراض صرف دولت کے لئے وقف کر دیتی ہے تو اُس سے نہ صرف اس کی پیدائش دولت موقوف ہو جاتی ہے بلکہ اس کی قومی آمدنی کا معیار بھی پست تر ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں ہم بیان کرچکے ہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ معاشی پستی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو پس انداز کرکے اُسے مزید پیدائش دولت کا ذریعہ بنانا نہیں جانتے۔ ان کی اس غیر معاشی توجہات کو دور کرکے انھیں پس اندازی کی ترغیب دینے کا اس وقت نہایت موزوں موقع ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانۂ جنگ میں اختیاری پس اندازی (VOLUNTARY SAVINGS) کا ایسا مناسب موقع حاصل ہے کہ اس کی نوعیت ایک طرح کی جبری پس اندازی (COMPULSORY SAVINGS) کی ہوگئی ہے۔ موجودہ جنگ کے باعث اجناس خوردنی اشیائے مایحتاج اور ضروریاتِ زندگی کی دیگر مختلف اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری نگرانی قائم ہوگئی ہے۔ اور حالات و موانعات جنگ کے باعث سامان تعیش کی درآمد یا تو قطعاً موقوف ہوگئی ہے یا ان میں انتہا درجہ کی کمی آگئی ہے اس صورت حال کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے لئے اپنی آمدنی کو حسب دل خواہ صرف کرنے کے مواقع بہت کم ہوگئے ہیں۔ حکومتیں تو قومی تعمیری اغراض کے لئے جبری پس اندازی کو قانوناً نافذ کیا کرتی ہیں لیکن موجودہ جنگ کے باعث ایسے موانعات معرض وجود میں آگئے ہیں کہ اپنی آمدنی کے ایک معتد بہ حصہ کو بہ آسانی پس انداز کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف سہولتوں کی اور کسی قدر ترغیب کی ہے۔

اور سہولت مسلمانوں کے لئے ملک کے گوشے گوشے میں بنکوں کے قیام کے ذریعے مہیا کی جاسکتی ہے ۔ ہر بڑے قصبے میں یا کم از کم ہر مستقر تعلقہ پر ایک بنک مسلمانوں کی جانب سے قائم کیا جائے ۔ ان بنکوں میں سے ہر بنک کے سرمائے کی اقل ترین مقدار ایک لاکھ روپے ہونی چاہیے ۔ ہر مستقر ضلع پر ایک مرکزی بنک کا قیام عمل میں لایا جائے ۔ ان مرکزی بنکوں کے سرمائے کا تعین مسلم آبادی کے تناسب سے کیا جاسکتا ہے قصبات اور تعلقات کے بنکوں کا ان ضلع واری بنکوں سے الحاق کیا جاسکتا ہے ۔

یہ بنک کسی رقبہ میں تجارتی بنکوں کا کام دیں گے کہیں ان کی انڈسٹریل بنکوں کی حیثیت ہوگی اور کسی جگہ یہ بنک محض قرضہ دہندہ کے فرائض انجام دیں گے ۔

بنکوں کے قیام اور ان کے منفعت بخش اور محفوظ اہتمام کے لئے مسلمان بنک کاروں اور منتظمین کی ضرورت پیش آئے گی ۔ موجودہ صورت حال کے لحاظ سے ایسے مسلمان ماہرین بنک کاری ملک میں مفقود ہیں ۔ لہٰذا ان کی فراہمی کے لئے ایک تربیتی جماعت کے قیام کی ضرورت ہوگی ۔ جہاں ماہرین معاشیات و بنک کاری کے مرتب کردہ مناسب نصاب تعلیم کی سہ ماہی میعاد میں تکمیل کرائی جائے گی ۔ اس تربیتی جماعت میں داخلہ زیادہ تر طیلسان اصحاب کے لئے محفوظ رکھا جائے ۔ کمترین معیار قابلیت میٹرکیولیشن بھی مقرر کیا جاسکتا ہے ۔

اس تربیتی جماعت میں اطراف ملک کے مسلمانوں کو داخلہ اور تربیت کی مناسب سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ چونکہ ان جماعتوں کے نصاب کی تیاری اور مناسب تعداد میں مسلمانوں کی تربیت میں چار ماہ سے زیادہ کی مدت صرف نہ ہوگی اس لئے ملک میں بنکوں کے قیام اور ان کے آغاز کار کے لئے زیادہ عرصہ تک انتظار کی ضرورت داعی نہ ہوگی ۔

مسلمانوں کے ان بنکوں کی رہنمائی اور حل طلب امور میں ان کو مشورہ دینے کے لئے مرکز میں ماہرین معاشیات و بنک کاری پر مشتمل ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو ان بنکوں کو فنی ہدایات اور حسب ضرورت مشورہ دے سکے ۔ یہی مرکزی مشاورتی کمیٹی

اس امر کا بھی تعین کرسکے گی کہ ان بنکوں میں سے کونسے بنک تجارتی (COMMERCIAL BANK) ہوں گے اور کن بنکوں کو انڈسٹریل بنکوں کی حیثیت دی جائے گی اور کن بنکوں سے صرف رقمی داد وستد کا کام لیا جائے گا۔

بنکوں کے اس طرح قیام سے جہاں مسلمانوں کو پس اندازی کی ترغیب اور سہولت حاصل ہوگی وہاں کروڑہا روپے کا سرمایہ پیدائش دولت کے کاروبار میں مشغول کرنے کے لئے مجتمع ہوجائے گا اور اس طرح مسلمانوں کی قومی آمدنی میں اضافہ کے علاوہ معاشیات ملک میں ان کا موقف بلند ہوجائے گا۔

<u>تجارت</u> معاشیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اقوام کی قومی آمدنی میں بیشتر اضافہ کرنے والے پیشوں میں اولیت تجارت کو حاصل ہے۔ یہ تجارت ایک تو اجناس خام کی ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کو یا تو اندرون ملک استعمال کیا جاتا ہے یا بیرون ملک برآمد کی جاتی ہیں۔ جن میں اجناس خوردنی کے علاوہ تیل والے بیج کپاس وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرے ان اشیاء کی تجارت ہے جو اندرون ملک بذریعہ صنعت و حرفت تیار کی جاتی ہیں۔ تیسرے ان اشیاء کی تجارت جو بیرون ملک سے درآمد کی جاتی ہیں۔ تجارت کی کامیابی کے دو لوازم ہیں۔ اول سرمایہ دوم طریقہ ہائے تجارت میں مہارت۔

سرمایہ علاوہ انفرادی ذرائع کے ان بنکوں کی وساطت سے بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔ جن کا بموجب فقرہ بالا ملک میں قیام عمل میں آچکا ہوگا۔

طریق و اصول ہائے تجارت میں مہارت ایک جماعت تعلیمی کے ذریعے مہیا کی جانی چاہیئے جس کی میعاد تربیت ششماہی ہو۔ جہاں عام تجارتی اصول اور طریقوں کی تعلیم کے علاوہ ملک کے اجناس خام کی اقسام۔ مقدار، مراکز، بازار اور اندرون و بیرون ملک ان کی طلب وغیرہ جیسے متعلقہ امور کی معلومات اعداد و شمار کی روشنی میں بہم پہنچائی جائیں۔ نیز ملکی و غیر ملکی مصنوعات کی اقسام مراکز۔ بازار اور ان کی طلب کے متعلق

آخر پیغام

مسائل کے علاوہ ان کی ایجنسیاں حاصل کرنے کے طریقے وغیرہ ان کے نصاب تعلیم کا جزو ہوں اس ترقیتی جماعت میں داخلے کے لئے اقل ترین معیار قابلیت میٹرکیولیشن ہونا چاہیئے۔

تجارتی اغراض کے لئے تربیت یافتہ یہ جماعت جب فارغ التحصیل ہو جائے گی۔ تو مسلمانوں کے تجارتی کاروبار میں ان کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اطراف ملک میں مختلف انواع و اقسام کے تجارتی کاروبار کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ تجارتی کاروبار انفرادی بھی ہو سکتے ہیں یا ان کو امدادِ باہمی کی انجمن ہائے فروخت یا سنڈیکیٹ (SYNDICATES) کے نمونے پر بھی چلایا جا سکتا ہے۔

مسلمانوں نے اب تک جو بے اتفاقی اور بے رغبتی پیشہ تجارت سے برتی ہے اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ عام اور معمولی حالات میں اس پیشہ میں اُن کا داخلہ اور میدان مسابقت میں دیگر ہمسایہ اقوام کا مقابلہ جو صدیوں سے اس پیشے کی اجارہ داربنی ہوئی ہیں مسلمانوں کے لئے نہایت صبر آزما اور ہمت شکن ہوتا لیکن موجودہ جنگ سے پیدا شدہ حالات اس خصوص میں بہت مساعد ہیں۔ کیونکہ اجناس خوردنی کی قیمتوں اور درآمد پر تو کلیتہً سرکاری نگرانی اور تحدید قائم ہے اور دیگر اجناس خام کی قیمتوں اور درآمد و برآمد پر بھی بڑی حد تک سرکاری نگرانی عائد ہے۔ اس سرکاری نگرانی کا ہمارے حق میں ایک نہایت مفید نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس نگرانی نے مسابقت کو ختم کر دیا ہے۔ اس لئے یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ دیگر ہمسایہ اقوام اپنی قدامت اور مسابقتی قوت کے ذریعے نو واردِ مسلمانوں کو میدان تجارت سے خارج کر دینے میں بہت کم کامیاب ہو سکتی ہیں۔ یہی حال ان اشیاءِ صنعتی کی تجارت کا ہے جو یا تو اندرونِ ملک تیار ہوتی ہیں یا سردست قلیل مقدار میں درآمد کی جاتی ہیں۔

میدانِ تجارت میں داخل ہونے اور اس پر قبضہ کرنے کا قدرت نے ایسا زرین موقع ہماری قوم کو عطا کیا ہے کہ بغیر خاص نقصانات برداشت کئے قابل قدر تجربات حاصل کر کے وہ اس شعبۂ زندگی میں اپنے قدم مضبوطی سے جما سکتی ہے۔ اگر اس نادر بیش بہا موقع کو ہم نے

گذر جانے دیا تو اندیشہ ہے کہ آیندہ قرن ہا قرن تک ایسا موقع شاید ہی کبھی حاصل ہو سکے۔ وقت گذر جانے پر اگر ہم جاگے بھی تو ہمارے مد مقابل اقوام ہماری سد راہ ہوں گی اور سوائے کف افسوس ملنے کے کوئی چارہ نہ ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو مناسب اور کافی تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور مسلمان تاجر ذرا سا عقل و فہم سے کام لے اور ان عوامل سے استفادہ کی تمنا پیدا اختیار کرے جو آج کل اس پیشہ میں کارفرما ہیں۔ وہ اس پیشہ پر قبضہ کر کے اپنی ہمسایہ اقوام کے دوش بدوش یقیناً اپنا مقام حاصل کر سکتا ہے۔

مسلمانوں کو معاملات تجارتی میں مشورہ اور حسب ضرورت امداد کے لئے بھی مرکز میں ایک کمیشن کا قیام عمل میں آنا چاہیئے جو مسلمان تاجرین کو وقتاً فوقتاً ضروری مشورہ، ہدایت اور امداد دے سکے۔ اور ان تاجرین کے لئے حکومت سے سہولتیں اور مراعات حاصل کر سکے یہ کمیشن اس امر کا بھی تعین کرے گی کہ ملک میں مسلم چیمبر آف کامرس کی شاخیں کہاں اور کس طرح قائم کی جا سکتی ہیں۔

ملک کے صنعتی و حرفتی ہونے جانے کے باعث اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار بھی وسیع ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ مقولہ مشہور ہے کہ اسٹاک ایکسچینج کسی ملک کے مالیاتی موقف کی نبض ہوتا ہے۔ اسٹاک ایکسچینج نہ صرف ایک منفعت بخش کاروبار کی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے بلکہ بسا اوقات اس کاروبار کا حکومتوں کی معاشی حکمت عملی پر غیر معمولی اثر ہوتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کاروبار میں داخل ہوں تاکہ اس کاروبار سے جو معلومات اور قیمتی تجربات ان کو حاصل ہوں اُن سے کسی ایسی صنعت کے قیام میں استفادہ کیا جا سکے جو مسلم مساعی سے قائم ہو رہی ہو۔

اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں مہارت بہم پہنچانے کے لئے تربیتی جماعتوں کی بجائے ایک سوسائٹی کا قیام مناسب ہوگا جس میں ماہرین معاشیات اور اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار میں تجربہ رکھنے والے حضرات اس سوسائٹی کے اراکین کو معلومات بہم پہنچائیں۔ اس سوسائٹی کا

کے ماہرین اس موضوع پر ہستہ کتب کے مطالعے اور عملی تجربات سے استعداد پیدا کرکے اس کاروبار میں حصہ لینے کی اہلیت پیدا کریں۔

صنعت و حرفت | مسلمانوں کی موجودہ معاشی حالت کے لحاظ سے کسی بڑی صنعت کے قیام کا ان کو نہ مشورہ دیا جا سکتا ہے اور نہ ایسا مشورہ جامۂ عمل ہی پہن سکتا ہے البتہ گھریلو صنعتوں (COTTAGE INDUSTRIES) کا قیام اور ان میں مسلمانوں کا حصہ لینا ممکن اور مفید ہوگا۔ کیونکہ اول تو صنعت و حرفت کا یہی وہ شعبہ ہے جس میں کمتر مقدار سرمایہ کے ساتھ بیشترین تعداد افراد بر سر روزگار ہو سکتی ہے اور دوم بعض گھریلو صنعتیں ملک میں ایسی جاری ہیں جن میں کسی نہ کسی حد تک مسلمان معروف ہیں۔

ان گھریلو صنعتوں کے قیام کی نسبت ہمیشہ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ حتی الامکان ان گھریلو صنعتوں کے قیام سے پرہیز کیا جانا چاہیئے۔ جو ختم جنگ کے بعد ہی حسب سابق مشین ساختہ اشیاء کی زد میں آکر دم توڑنے لگ جائیں۔ بلکہ ایسی ہی گھریلو صنعتوں کے قیام کی سعی کی جانی چاہیئے۔ جن میں ایسی جدت، ندرت اور ہنرمندی کو دخل ہو جو صرف کاریگر اور ہنرمند ہی کر سکتے ہوں اور مشینوں سے یہ کاریگری ممکن نہ ہو۔

گھریلو صنعتوں کے قیام سے قبل ضروری اعداد و شمار کی فراہمی بھی ضروری ہے کہ ملک میں کہاں کہاں کونسی گھریلو صنعتیں رائج ہیں۔ ان کے منجملہ کونسی گھریلو صنعتیں کامیابی سے جاری ہیں اور کون سی جاں بلب۔ اور دم شکستہ ہو گئی ہیں۔ کن میں احیاء و ترقی کے آثار باقی ہیں۔ کہاں کہاں جدید گھریلو صنعتوں کا اجراء عمل میں آنا ممکن ہے۔ اور اشیاء خام طبعی و قدرتی وسائل کے اعتبار سے کون سی گھریلو صنعت کس حصۂ ملک میں قائم کی جا سکتی ہے۔

ان گھریلو مصنوعات کے لئے سرمایہ اس قدر قلیل مقدار میں درکار ہوتا ہے کہ بہ آسانی ان کو انفرادی طور پر یا ان انڈسٹریل بنکوں کی وساطت سے فراہم کیا جا سکتا ہے جو منصوبہ کے باب اول کے تحت ملک میں قائم ہوں گی۔

ان مصنوعات کو امدادِ باہمی کے اصولوں پر چلایا جائے اور امدادِ باہمی کے اصول ہی پر ان کے لئے اشیائے خام کی فراہمی کا انتظام کیا جانا مناسب ہوگا۔

ان مصنوعات کی کامیابی کے لئے سب سے زیادہ اہم سوال ان کی نکاسی کا ہے۔ اس مقصد کے لئے مجالس اتحاد المسلمین اضلاع کے توسط سے ان مصنوعات کی طلب کے اعداد و شمار فراہم کئے جاسکتے ہیں اور ان تجار کی خدمات سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جو باب دوم کے تحت کاروبار تجارتی میں مصروف ہوں گے۔

گھریلو مصنوعات کی امدادِ باہمی کی ان انجمنوں کے کارپردازوں کی تربیت کے لئے ایک تربیتی جماعت قائم کی جائے جہاں سہ ماہی تربیت کا انتظام ہو۔ ان کے نصاب میں امدادِ باہمی کے اصول اشیائے خام کی فراہمی کے طریقے۔ صناعوں سے مصنوعات کی تیاری کے قاعدے عام نظم و نسق اور نگرانی کے اسلوب داخل ہوں گے۔

گھریلو صنعتوں کے قیام اور ان کی ترقی کے لئے عام نگرانی اور رہنمائی کے لئے مرکز میں ایک کمیٹی قائم کی جائے جو ان مصنوعات کو ایک دوسرے سے مربوط اور ان میں تعاون برقرار رکھنے کے علاوہ اس امر کا مشورہ دیا کرے کہ کون سی صنعت کس حصۂ ملک میں قائم کی جاسکتی ہے۔

اس خصوص میں تفصیلی تجاویز کے لئے تنظیم مابعد جنگ کی اس کمیٹی کی تجویز سے اتفاق کی سفارش کی جاتی ہے جو حکومت سرکارِ عالی نے حضرت قائد ملت مدظلہٗ العالی کی ممتاز صدارت میں قائم کی ہے۔

ملک میں گھریلو مصنوعات کے قیام۔ احیاء اور استحکام کے لئے دورانِ جنگ کا یہ زمانہ غیر معمولی طور پر مساعد اور موافق ہے جبکہ غیر ملکی سامان کی درآمد کی تخفیف اور بالخصوص سستے جاپانی مال کی درآمد کی موقوفی کے باعث ہندوستانی بازاروں میں ہماری ان گھریلو مصنوعات کا کوئی مدمقابل باقی نہیں رہا ہے۔ اگر ان موافق حالات سے

استفادہ کرکے مسلمانوں نے گھریلو مصنوعات کے قیام کی کوشش نہیں کی تو زمانہ مابعد جنگ میں ان کے قیام کے امکانات اُمید افزا نظر نہیں آتے۔

عمارتی کاروبار | ملک میں تعمیر شوارع - ذرائع آبپاشی - آب رسانی اور عمارت ہائے سرکاری کی بے شمار اسکیمات روبہ عمل لائی جاتی ہیں اور تنظیم مابعد جنگ کے تحت تو اس نوعیت کی اسکیمات کے علاوہ ہائیڈرو الیکٹرک اور کارخانہ جات کی مزید اسکیمات نافذ ہوں گی اور خود اہل ملک کی غیر سرکاری مساعی سے بھی صنعت و حرفت کی جو توسیع عمل میں آئے گی اور جدید کارخانہ جات تعمیر ہوں گے ان میں عمارتی کاروبار اور انجینیرنگ کے وسیع مواقع فراہم ہوں گے۔

مسلمانوں میں اگرچہ انجینیرنگ کی تعلیم کافی ترقی کرچکی ہے اور انجینیری کے اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بھی خاص تعداد میں موجود ہیں لیکن اس قسم کے کارہائے تعمیر و ترمیم کا سارا کاروبار یا تو ہمسایہ اقوام کے ہاتھوں میں ہے یا بیرون ملک سے لوگ آکر اس منفعت بخش کاروبار سے نفع کما رہے ہیں۔ اگر انجینیری کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بجائے ملازمت سرکاری کی تلاش میں سرگرداں ہونے کے تعمیر و ترمیم کے کاروبار چلانے کی جانب متوجہ ہوجائیں اور ملک کے دیگر کاروباری اشخاص کو بھی اس کاروبار کے چلانے کا تجربہ حاصل کرنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں تو نہایت آسانی کے ساتھ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اس منفعت بخش کاروبار میں مصروف ہوکر قومی آمدنی میں اضافہ کا موجب ہوسکتی ہے۔

یہ کاروبار انفرادی طور پر بھی چلائے جاسکتے ہیں اور محدود کمپنیوں کے قیام کے ذریعے بھی۔ ان انفرادی کاروباری اشخاص اور کمپنیوں کو جو مختلف حصص ملک میں قائم ہوں گی مشورہ دینے اور ان کو اس کاروبار سے متعلق ضروری حالات اور واقعات کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے ایک مرکزی کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے۔

اس کاروبار کی مالی ضروریات کی تکمیل مسلمانوں کے بنکوں (مستذکرہ باب) سے

کی جاسکتی ہے۔

واضح رہے کہ کارہائے تعمیر و ترمیم کے لیے کاروبار سے اب تک مسلمانوں سے غیر معمولی بے اتفاقی برتی ہے۔ اگر مسلمان اس جانب متوجہ ہو جائیں تو بہت آسانی کے ساتھ وہ اس کو مستحکم بنیادوں پر قائم ہو سکتے ہیں اور اس طرح اپنی قومی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکتے ہیں۔

زراعت | زراعت ہمارے موجودہ منصوبہ میں شامل نہیں ہے اور نہ اس پیشے کے تفصیلی تجاویز پیش کرنا ہمارا مقصد ہے۔ لیکن بلحاظ اس کے کہ زراعت ہمارے ملک کا بنیادی اور ابتدائی پیشہ ہے۔ اس سے بھی مسلمانوں کو بمقابلہ موجودہ بہتر استفادہ کرنا اور سرکار عالی کے محکمہ زراعت کی ترقیات اور خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

غرضکہ مسلمان بنک کاری کے ذریعے اپنی آمدنیوں کو پس انداز کر کے اس کو تجارت اور صنعت و حرفت جیسے منفعت بخش کاروبار میں استعمال کر کے مزید پیدا کش دولت کے لائق اور اس طرح قومی آمدنی میں بے انتہا اضافہ کے موجب ہوں گے۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ دنیا میں سیاسیات کی بنیاد معاشیات پر ہو مسلمانان حیدرآباد کو اپنے موقف کے استحکام میں امداد کے علاوہ اس طرح جو مزید دولت وہ پیدا کریں گے مابعد جنگ کی تعمیر میں دفاعی (DEFENCE HEAVY INDUSTRIES) صنعتوں (BASIC INDUSTRIES) میں مشغولہ اصل کے ذریعے معاشیات اور سیاسیات ملک میں بہتر مقام حاصل کر سکیں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ اگر وہ یہ ترقی حاصل کر لیں تو ملک کی آیندہ سیاسی اور معاشی تنظیم میں انہی کی آواز کو بڑا دخل ہو۔

ماہر کاری گر | مصنوعات خواہ بڑے پیمانہ پر ہوں خواہ گھریلو ان کے قیام و ترقی کے لیے کاری گر اور ہنرمند (TECHNICIANS) کا وجود لازمی اور لابدی ہے۔

دار و مدار تھا۔ ٹکنیکل تعلیم مفقود تھی اور باوجود سعی بسیار کے اس کا حصول دشوار تھا۔ لیکن اب
جنگ کے باعث نہ صرف اس نوع کی تعلیم و تربیت کی سہولتیں حاصل ہو گئی ہیں بلکہ مناسب
سرکار ترغیبی وظائف بھی دئے جا رہے ہیں۔ ایسے زریں موقعے سے استفادہ نہ کرنا بڑی
بدنصیبی کی بات ہے۔

مسلمانوں میں ٹکنیکل تعلیم کے عام کرنے اور مسلمان ماہر کاریگروں کی فراہمی کی خاطر ایک
کمیٹی قائم کی جانی چاہیے جو ذیلی مجالس اتحاد المسلمین کے توسط سے ٹکنیکل تعلیم کے لئے امیدواروں
کی فراہمی کے علاوہ اس امر کی [illegible] کرے گی کہ طلباء کی کس قدر تعداد گھریلو صنعتوں کی تربیت
حاصل کرے اور کتنے طلباء ایسی [illegible]بیت کے لئے منتخب کئے جائیں جو فارغ التحصیل ہو کر
بھاری اور دفاعی صنعتوں میں [illegible] ہو سکیں۔ یہ کمیٹی اس امر کی بھی نگرانی کرتی رہے گی
کہ طلباء مناسب تعداد میں حسب ضرورت فنی تعلیم کے مختلف شعبہ جات میں داخل ہوں
تاکہ آئندہ ان کو برسر روزگار ہونے میں دقتیں نہ اٹھانی پڑیں اور ان صنعتوں میں مسلمانوں
کو زیادہ سے زیادہ تناسب بھی حاصل رہے۔

<u>سائنٹفک تحقیقات</u> | ایسے مسلمان جو جامعات سے سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نکلتے ہیں
اور پھر مختلف غیر سائنٹفک ملازمتیں اختیار کر کے اپنی قابلیتوں کا خون کرتے ہیں۔ قوم کو
فائدہ کی بجائے مضرت پہنچانے کے باعث ہوتے ہیں۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے
کہ ایسے صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کے سائنٹفک رجحانات کو ضائع جانے سے بچایا
جائے۔ مرکز میں اس غرض کے لئے ایک کمیٹی کا قیام عمل میں لایا جائے جو سائنس کے اعلیٰ
تعلیم یافتہ مسلمانوں کو حکومت کے مختلف محکمہ جات کے تحت قائم کردہ تجربہ خانوں اور ریسرچ
گاہوں میں داخلہ کی سہولتیں بہم پہنچائے۔ جہاں یہ نوجوان اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور ایجاد
و اختراع و انکشافات سے ملک کو فائدہ پہنچائیں۔ کمیٹی نہ صرف حکومت سرکار عالی سے
وظائف حاصل کرنے میں ان کی امداد کرے گی بلکہ خانگی عطایا حاصل کر کے وظائف کے

ضیعہ ان کی مالی مشکلات رفع کرکے ان کی ہمت افزائی کرے گی۔

صنعتی اور تجارتی کاروبار کے تعمیر و تنظیم | صنعت و حرفت اور تجارت کو کامیابی سے چلانے کے لئے صرف سرمایہ کی فراہمی۔ سائنٹفک ایجادات و اختراعات اور ماہرین فن کاری گروں کا وجود ہی کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ اُن کے اہتمام کے لئے بھی ایک طبقہ ایسا موجود نہ ہو جو اپنی گوناگوں صلاحیتوں۔ وسیع تجربہ، اعلیٰ مہارت اور ذاتی قابلیت سے ان صنعتوں کو اپنی نگرانی اور انتظام کے ذریعے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچا دے۔ اس قسم کے تشکیل و تعمیر کے لئے ہمہ جہتی علمی، معاشی، مالیاتی اور سائنٹفک صلاحیتوں کے علاوہ اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایسے افراد صنعتی و حرفتی اہتمام کے عملی تجربہ کے بھی حامل ہوں۔

بحالت موجودہ بہترین صورت یہ ہے کہ جتنی صنعتی کمپنیاں اور کارخانہ جات کا ملک میں قیام عمل میں آتا جا رہا ہے۔ مسلمان تعلیم یافتہ مسلمان مالکان اصل مسلمان تاجر اور مسلم مالکان کارخانہ جات اُن کے منیجنگ ڈائرکٹر یا کم از کم رکن بورڈ آف ڈائرکٹرس مقرر ہونے کی سعی کریں اور ان کمپنیوں کے نظم و نسق سے متعلق معلومات حاصل کریں۔ جتنی زیادہ مستعدی کے ساتھ وہ ان کارخانہ جات کے نظم و نسق کی نگرانی کی کوشش کریں گے اتنا ہی ان کا تجربہ وسیع ہوگا۔

اس طرح وہ آئندہ دیگر صنعتوں کے قیام اور اُن کو کامیابی سے چلانے کے زیادہ سے زیادہ اہل قرار پائیں گے اور آئندہ قائم ہونے والی صنعتی کمپنیوں میں بہ حیثیت مینجنگ ڈائرکٹر ان کی زیادہ قدر اور طلب ہوگی۔

نشر و اشاعت | ہماری ایسی منصوبہ بندی کی کامیابی کا انحصار پروپیگنڈے کے ذریعے عوام کی غیر معاشی ذہنیت کو معاشی بنانے پر ہے۔ معاشی جدوجہد کی اہمیت اور عظمت کو ان کے قلوب میں جاگزیں کرنے کے لئے دو امور کی ضرورت ہوگی۔

۱۔ ہفتہ وار معاشی اخبارات اور ماہوار معاشی رسائل کا اجرا جو معاشیات

کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے معاشی مباحث اور تنقید و نظر کے کام آئیں اور مختلف معاملات اور پیشوں میں معروف لوگوں کو وقت کے اہم معاشی مسائل سے روشناس کرنے ان کا مستقل کے حل دریافت کرنے اور دیگر ممالک کی معاشی ترقی سے بھی آگاہ کرنے کا ذریعہ ہوں۔

۔ مرکز میں ایک معقول معاشی کتب خانہ کا قیام اور ملک کے اہم مراکز میں معاشیات کا ضروری لٹریچر فراہم کیا جائے اور اہم موقتی مسائل کی نسبت چھوٹے چھوٹے عام فہم کتابچے شائع کئے جائیں۔ جن سے لوگوں کی معاشی معلومات تازہ اور ان میں اضافہ ہو۔ معاشی کانفرنسوں اور اہلیانِ صنعت کے اجتماعات کے انعقاد سے بھی نشر و اشاعت کے مقاصد کی بہ احسن الوجوہ تکمیل ہونے کے علاوہ ملک کی معاشی ترقی کے امکانات آئندہ کے لئے تجاویز پر غور کیا جا سکتا ہے۔

منصوبہ ہذا کے نفاذ کا طریقہ | سطور بالا میں ہم نے منصوبہ کے اہم خط و خال کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ضروری اعداد و شمار اور واقعات کی عدم دستیابی کے باعث تفصیلی منصوبہ بندی کرنے سے مجبوری رہی۔ اس لئے منصوبہ ہذا کے نفاذ سے قبل اعداد و شمار اور حالات اور واقعات کی فراہمی نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے منصوبہ ہذا کی اساس پر ایک بند سوالات مرتب کر کے جوابات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور حسب ضرورت اس مقصد کے لئے معاشیات کے طلبسان نوجوانوں کی خدمات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے جن کی بفضلہ تعالیٰ ملک میں اب کوئی کمی نہیں ہے۔

تفصیلی منصوبہ بندی کے لئے ایک سنٹرل پلاننگ کمیشن کا انعقاد ضروری ہے۔ مندرجہ بالا ہر شعبہ کی کمیٹی اس کی رہنمائی اور زیر ہدایت کام کرے گی اور اپنی رپورٹیں اس مرکزی منصوبہ بندی کمیٹی کے پاس روانہ کرے گی۔ جب تفصیلی منصوبہ مدون اور مرتب ہو جائے گا تو اس کے نفاذ کی ذمہ دار ہر ضلع کی مجلس اتحاد المسلمین ہوگی۔

چونکہ اس وقت ہمارے پیش نظر مطلوبہ اعداد و شمار نہیں ہیں۔ اور ہم تفصیلی منصوبہ

کی ترتیب سے اس سبب قاصر ہیں اس لئے اس نوبت پر اس امر کا تعین ہمارے لئے دشوار ہے کہ اس منصوبے کے روبہ عمل آنے کے بعد مسلمانان حیدرآباد کی قومی آمدنی میں کتنا اضافہ ہوگا۔ لیکن ہم اتنا ضرور وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کل بے روزگاری کی جو شکایت تعلیم یافتہ نوجوانوں میں عام ہے ہمارے منصوبے کے جامہ عمل پہن لینے کے بعد نہ صرف یہ کہ رفع ہو جائے گی بلکہ مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے کاروبار کی اتنی گوناگوں راہیں پیدا ہو جائیں گی کہ ملک میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کمی نظر آنے لگے گی۔

منصوبہ ہٰذا کے نفاذ کی میعاد

منصوبہ ہٰذا پر ملکی مجلس عاملہ ماہرین معاشیات کی آراء میں غور فرمائے گی اور اس کے بعد منصوبہ ہٰذا کو مناسب ترمیمات کے ساتھ نافذ کرے گی۔ غور و فکر کی اس منزل کے لئے ہماری رائے میں تین ماہ کی مدت کافی ہے۔ اس کے بعد بنک کاری کی تربیت کے لئے نصاب کی ترتیب کے لئے ایک ماہ کی مدت درکار ہوگی اور بنک کاری کی تربیتی جماعت کے نصاب تعلیم کی میعاد تین ماہ کافی ہوگی۔ اس نوبت پر ملک میں بنک کاری کا آغاز ہو جائے گا۔ چار ماہ کی اس مدت کے دوران میں تجارت و صنعت و حرفت کے اعداد و شمار کی فراہمی اور تجارت کے لئے تربیتی جماعت کے نصاب کی ترتیب مکمل کر لی جائے گی اور تجارت و صنعت و حرفت کے لئے تربیتی جماعتوں کا افتتاح عمل میں آ جائے گا۔ جن کے نصاب تعلیم کی میعاد شش ماہی ہوگی نصاب تعلیم کی اس مدت کے اختتام پر ملک میں تجارت و صنعت و حرفت کے مختلف کاروبار کے اجرا کا امکان پیدا ہو جائے گا گویا منصوبہ ہٰذا کے اہل ملک کے آگے پیش ہونے کی تاریخ سے ۱۳ ماہ کے اندر میں مختلف تجارتی کاروبار اور گھریلو مصنوعات کی تیاری کا آغاز ہو جائے گا نفاذ منصوبہ ہٰذا کے سال دوم میں معمولی کام کا آغاز ہوگا لیکن سال سوم میں اس کی تکمیل ہو جائے گی۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل واضح کر آئے ہیں ہمارا یہ منصوبہ زمانہ مابعد جنگ کے لئے نہیں ہے بلکہ بحالات موجودہ اس کا نفاذ مقصود ہے۔ تاکہ جنگ کے بعد آنے والی [illegible] سے بہتر سے بہتر استفادہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔

تعلیم میں ہاتھ کا کام

تاریخی نشوونما

(۱)

تعلیم میں ہاتھ کا کام کب سے اور کس شکل میں شروع ہوا، اس کا تعین بہت مشکل ہے، پھر بھی سب سے پہلے یونانیوں کے ہاں اس کا پتہ چلتا ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاست" میں لکھا ہے کہ یونان میں بڑھئی، نانبائی، لوہار، موچی اور معمار ان میں سے ہر ایک پیشہ ور کی تعلیم کا ان کے اپنے اپنے فن میں نہایت معقول انتظام تھا۔

لیکن تعلیم کے ساتھ ہاتھ کا کام اس سے زیادہ مرتب اور منظم شکل میں یورپ کی خانقاہوں کے اندر پایا جاتا تھا جو قرون وسطیٰ میں قائم ہوئیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں عیسائیوں کے ایک عالم باسل نے جب خانقاہوں کی تعلیم کی تنظیم کی تو اس میں صرف و نحو، حساب اور انجیل وغیرہ کی تعلیم کے ساتھ ایک نہ ایک ہاتھ کے کام کا بھی انتظام کیا، مثلاً لکڑی کا کام، دھات کا کام، کپڑا بنائی، خیاطی، معماری اور زراعت وغیرہ۔ یہ خانقاہیں اس زمانہ میں ان فنون کی تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ قلمی کتابوں میں طلائی یا نقرئی کام کی وجہ سے جلدوں کے کام میں بھی ترقی ہوئی۔ بعض بعض مشہور پادری اور عیسائی علماء لکڑی، دھات اور ہاتھی دانت کے کاموں میں بڑے ماہر اور صناع ہوتے تھے۔ بعض پادریوں نے اپنے ماتحت پادریوں پر یہ لازم کر دیا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام ضرور سیکھیں تاکہ وہ اپنے اپنے حلقوں میں جا کر اپنے پیرووں کو کوئی ہاتھ کا کام بھی سکھا سکیں۔

ساتویں صدی عیسوی میں سینٹ بینیڈکٹ نے خانقاہوں کی از سر نو تنظیم کی اور اس میں انھوں نے ہر راہب کے لیے اوقات کے ضمن میں روزانہ ہاتھ کے کام کا اصول رکھا۔ اس اصول کی وجہ سے خانقاہوں کے اندر بیکاری کی برائیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کا خیال تھا کہ تنہائی کی زندگی میں ذہن بیمار اکثر آزمائشوں کا شکار ہوتا ہے اس لیے انھیں زیادہ سے زیادہ وقت ایسے کاموں میں مصروف رہنا چاہیے جن میں محنت و مشقت کی ضرورت ہو۔ راہبوں کے مختلف ہاتھوں کے کام اختیار کرنے کی وجہ سے ایک تو وہ پیشے کے قریب آ گئے

اور دوسرے ان پیشہ وروں کے سامنے زندگی کا ایک بہتر نمونہ آگیا اور تیسرے یہ کہ بعض بعض ہاتھ کے کاموں مثلاً زراعت، لکڑی، چمڑے اور دھات کے کام، [illegible] کے کام، آرائش اور معماری کے کاموں میں بڑی ترقی ہوئی۔

لیکن تعلیم میں ہاتھ کے کام کا شمول سب سے زیادہ باقاعدہ شکل میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی تین شکلیں تھیں:-

(۱) ایک خیالی مثالی زندگی میں زراعت، نجاری، اور دوسرے ہاتھ کے کاموں کا ذکر جو دوسروں کے لئے بطور نمونہ پیش کی گئی ہو۔

(۲) ایسے مصلحانِ تعلیم کے افکار و خیالات میں جنھوں نے عام تعلیم کے ساتھ ہاتھ کے کام کی تلقین کی ہو اور

(۳) ان مصلحینِ تعلیم کے اثر سے مختلف اداروں اور مدرسوں میں ہاتھ کے کام کا شمول۔

نشاۃ ثانیہ کے دور میں بعض ایسی مثالی زندگی کے نقشے پیش کئے گئے جن میں ہاتھ کا کام ایک اصلاح یافتہ زندگی کا جزو قرار دیا گیا۔ زندگی کے ان مثالی نقشوں میں بعض میں یہ معاشی وجوہ کی بنا پر شامل کیا گیا تھا، بعض میں اس لئے کہ یہ ایک حقیقی زندگی کا جزو سمجھا گیا اور بعض میں اس وجہ سے کہ اس وقت کے تنگ اور محدود نصاب کے خلاف یہ ایک احتجاج تھا۔

اس قسم کی مثالی تصویروں میں سر ٹامس مور کی کتاب "مثالی دنیا" (یوٹوپیا) سب سے زیادہ مشہور ہے جو ۱۵۱۶ء میں شائع ہوئی۔ اس مثالی زندگی میں انھوں نے سب سے پہلی بار مدرسے کی عام تعلیم کے ساتھ ہاتھ کے کام کو بھی شامل کیا ہے۔ ان کے اس مجوزہ نظام زندگی میں ہر شہری کو ایک نہ ایک ہاتھ کا کام اور زراعت جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ تمام شہریوں کو اس کی بچپن سے تعلیم دی جاتی ہے جس کا کچھ حصہ تو وہ مدرسے میں سیکھتے ہیں اور کچھ عملی طور پر حاصل کرتے ہیں۔ انھیں اکثر شہر سے باہر کھیتوں میں لے جایا جاتا ہے جہاں وہ نہ صرف دوسروں کو کام کرتے دیکھتے ہیں بلکہ وہ خود بھی انھی کی طرح کام کرتے ہیں۔

اس کے بعد نشاۃ ثانیہ کے معلمین میں رابیلے کا درجہ آتا ہے جس نے تعلیم میں ہاتھ کے کام کرانے کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ رابیلے نے اپنی تعلیمی اسکیم میں یہ ذکر کیا ہے کہ بچوں کو اپنے گرد و پیش کے ماحول سے آشنا کرنے کی غرض سے انھیں یہ چیزیں دکھلانے کے لئے لے جایا جاتا ہے کہ

"کس طرح دھات کا کام کرنے والے، لکڑی کا کام کرنے والے، اپنا کام کرتے ہیں اور سونے اور ہیرے جواہرات کاٹنے والے اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کو کیمیا گروں، سکہ بنانے والوں، کپڑا بننے والوں، مخمل کا کام کرنے والوں، گھڑی سازوں، آئینہ سازوں، چھاپہ گروں اور اسی قسم کے دوسرے کاریگروں کے کام دیکھنے کے لئے لے جایا جاتا ہے۔"

رابیلے کا بچوں کو ان ہاتھ کے کاموں سے آشنا کرنے کا ایک اور مقصد بھی تھا اور وہ یہ کہ بچے سماجی زندگی کے ان پہلوؤں کا کچھ تجربہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ ان کی جسمانی ورزشوں کے سلسلے میں بھی بعض قسم کے محنت طلب کاموں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً بارش کے زمانے میں وہ سوکھی گھاس کا ذخیرہ جمع کرتے، لکڑیاں چیر پھاڑ کر اکٹھا کرتے اور بالوں سے مکئے کے دانے نکال کر کھتوں میں جمع کرتے ہیں۔

اس زمانے میں حقیقت پسندی کی تحریک زوروں پر تھی اور اس کا سب سے بڑا علمبردار انگلستان کا فلسفی بیکن تھا۔ بیکن چونکہ ایک فلسفی تھا، اس لئے اس نے سب سے زیادہ اس تحریک کا ذکر علم کیا ہے؛ اور اس کی بنیاد اس نے محسوسات و مشاہدے پر رکھی ہے۔ تعلیمی اصلاح کے سلسلے میں اس نے پرانے طرز کی لسانی تعلیم کو چھوڑ کر ایک ایسی تعلیم کا تصور پیش کیا ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہو اور اس کے نزدیک یہی تعلیم ہو سکتی تھی جو ہاتھ کے کام سے متعلق ہو۔ چنانچہ اس نے اپنے مثالی مدرسے "بیت سلیمان" میں جس طرز کی تعلیم کا ذکر کیا ہے وہ یہی حرفہ یا دستکاری کی تعلیم ہے۔ اس مدرسے کے علاوہ اس نے تین "استادان فن" رکھے ہیں جو تمام میکانیکی فنون، سائنس کے تجربوں اور ایسے کاموں کے نمونے جمع کرتے ہیں جن کا آرٹ میں شمار نہیں ہے۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی کیمپانیلا ہے جس کی ایک مشہور کتاب "بلدۃ الشمس" کتاب میکانیکی کے نام سے ۱۶۲۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اس نے ایک ایسے شہر کا نقشہ کھینچا ہے جس میں سات ہم مرکز

قائم ہیں اور ہر دائرے کی دیوار پر عام تعلیم کی غرض سے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس تعلیم کا تمام نصاب حقیقت پسندی پر مبنی ہے اور بچوں کو تعلیم الفاظ کے ذریعے نہیں بلکہ اشیاء کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ہر دیوار پر تصویریں، نقشے اور نمونے کے بت بنے ہیں جو کسی نہ کسی فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ چھٹے دائرے کی دیوار خاص طور سے دستکاریوں اور صنعتوں سے متعلق ہے۔ اس دیوار پر ہر قسم کے میکانیکی فنون کو جگہ دی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام ضروری آلات و اوزار بنے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ یدوی تعلیم کی اہمیت سب سے زیادہ اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے سکھانے کے لئے سب سے بہتر ذہن کو مقرر کیا جاتا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ کارخانوں میں جاکر کام کا دیکھنا بھی ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ ریاست میں ہاتھ کے تمام کاموں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اور جو شخص ہاتھ کا کام بہت اچھا کرنا جانتا ہے اس کی انتہائی عزت و تکریم ہوتی ہے۔

اس سلسلے کی سب سے آخری کڑی آندریے کی کتاب "بلدۃ المسیح" ہے جس میں اس نے نظری اور عملی دونوں قسم کی تعلیم کا خاکہ کھینچا ہے۔ تعلیم کی نوعیت کے ضمن میں وہ لکھتا ہے کہ "اس میں لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔ لڑکوں کے مطالعہ کا وقت صبح کو ہے اور لڑکیوں کا سہ پہر میں۔ ان کی تعلیم کے لئے استاد اور استانیاں مقرر ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا بقیہ وقت ہاتھ کے مشاغل اور امور خانہ داری کے کاموں میں صرف ہوتا ہے تاکہ ہر شخص اپنے طبعی میلان کے مطابق آئندہ اپنا پیشہ اختیار کر سکے۔" عورتوں کی تعلیم سے بحث کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ "شادی شدہ عورتیں اپنے اس علم کا استعمال جو انھوں نے کالج کی تعلیم کے زمانے میں حاصل کیا تھا صنعت میں کریں۔ انسان نے ریشم، اون اور سن کی صنعت کے سلسلے میں جو کمال حاصل کیا ہے، وہ کام حقیقت میں عورتوں کا ہے اور ان سے متعلق تمام کام حقیقت میں ان کے لئے ہونا چاہیے۔"

اسی طرح [illegible] اپنی [illegible] کی کتاب میں جو ۲۰ سال بعد شائع ہوئی، یہ تجویز کرتا ہے کہ ہر مدرسہ کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ہاتھ کے کاموں کے ذریعے بچوں میں میکانیکی مہارت پیدا کرے۔

دوسرا دور تعلیم میں ہاتھ کے کام کا خیالی اور نظری نہیں بلکہ اس میں ہاتھ کے کام کی عملی حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ یہاں ہاتھ کے کام کو ایک مثالی دنیا کے نظری مسئلہ کی حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ نفسیاتی اور معاشی بنیاد پر اسے مدرسوں اور تعلیم گاہوں میں داخل کئے جانے پر زور دیا گیا ہے۔

اس ضمن میں جان آموس کومینیس کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو سترھویں صدی عیسوی میں ایک بہت بڑا مصلح تعلیم گزرا ہے۔ اس کے تعلیمی خیالات اور نظریے اپنے زمانے سے اس قدر آگے تھے کہ تقریباً دو صدی تک بیشتر انھیں پیشکل ہی جامہ پہنایا جا سکا۔ اس نے اپنی مشہور کتاب "معلم کبریٰ" میں تعلیم میں ہاتھ کے کام سے بہت مفصل بحث کی ہے۔ اس نے تعلیم کی کئی منزلیں قرار دی ہیں۔ اور ان میں سب سے پہلی منزل کو وہ "آغوشِ مادر" کہتا ہے جو آج کل کے کنڈرگارٹن یا ایک گھر سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ

"اس عمر کے بچوں کو جہاں تک ہو سکے میکانیکی تعلیم دی جائے اور انھیں اپنے ہاتھ کے استعمال کا برابر موقع ملتا رہے۔ مثلاً چیزوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھا کر رکھنا، انھیں ترتیب دینا، بنانا، بگاڑنا، گرہیں لگانا اور کھولنا وغیرہ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنھیں بچے اس عمر میں شوق سے کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کام چونکہ حقیقت میں ذہن اور دماغ کی قوتوں کے اظہار کا ذریعہ ہیں اس لئے ان سے انھیں روکنا نہیں چاہیئے بلکہ ان کے کرنے کے اور زیادہ مواقع بہم پہنچانے چاہئیں اور ان کاموں میں ان کی صحیح رہبری کرنی چاہیئے۔"

اسی طرح وہ بچوں کے لئے کھیل کود کی سفارش کرنے میں بھی یہ بات پیش نظر رکھتا ہے کہ اس میں انھیں ہاتھ کے کام کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیش آئیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ

بچوں کو کھیل کود کے لئے ایسے کھلونے دئے جائیں۔ اور انھیں موقع دیا جائے کہ وہ ان کو ایسے کاموں کی نقل اتاریں جو مختلف ہاتھ کے کاموں اور پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً ہل چلائیں اور کھیتی باڑی سے متعلق دوسرے کاموں کی نقلیں اتاریں۔ راج اور معماری کے کاموں کے چربے کھینچیں، سپاہی بنیں وغیرہ وغیرہ۔"

اس سے آگے کی منزل یعنی ابتدائی تعلیم کے لئے وہ تجویز کرتا ہے کہ

"اس عمر کے بچوں کو چاہیئے کہ وہ میکانیکی حرفوں کے تمام ضروری اصول اور قواعد سیکھیں تاکہ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا سے بےخبر نہ رہیں اور اگر ان میں اس قسم کے کاموں کا کوئی میلان طبع ہو تو اس کے اظہار کا انھیں آسانی کے ساتھ موقع مل سکے۔"

"اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر انھیں اپنی آئندہ زندگی میں اس قسم کے کاموں کے کرنے کا موقع ملے تو وہ کام انھیں نئے یا دشوار نہ معلوم ہوں بلکہ انھی جیسے نظر آئیں جو وہ پہلے کر چکے ہوں۔"

کومی نیس ایک اور مدرسہ کا خاکہ کھینچتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ

"اشیاء کے علم کا ہاتھ کے کام سے برابر تعلق اور ربط رہنا چاہیے بغیر اس کے جس شخص کو علم صحیح حاصل بھی ہو وہ عملی حیثیت سے بے کار ہے۔ اس مدرسے سے کوئی لڑکا اس وقت تک فارغ التحصیل نہیں ہو سکتا ہے جو ان ہاتھ کے کاموں میں اچھی طرح ماہر نہ ہو جنھیں بڑی احتیاط اور ہنرمندی سے کرنے کی ضرورت ہے۔"

کومی نیس کے تعلیم میں ہاتھ کے کام پر اس قدر زور دینے کے مختلف وجوہ تھے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کومی نیس اس گروہ میں داخل تھا جو حقیقت پسند کہلاتا ہے اور اسی بنا پر تعلیم میں ہاتھ کے کام پر زور دینے کی وجہ کومی نیس کے نزدیک یہ تھی کہ بچے اپنے گرد و پیش کی دنیا سے بے خبر نہ رہیں۔

دوسری وجہ نفسیاتی تھی۔ اگرچہ اس وقت تک تعلیم میں نفسیات کا کچھ بہت عمل دخل نہ تھا، پھر بھی کومی نیس نے حقیقت پسندی کی بنا پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ بچے اس عمر میں کچھ نہ کچھ ہاتھ سے کرنا چاہتے ہیں اور ان کا ذہن یا دماغ محسوس اشیاء کا طالب ہوتا ہے اس لئے ہاتھ کا کام ان کی ان نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

ان فلسفیانہ اور نفسیاتی وجوہ کے علاوہ بعض معاشی اور سیاسی اسباب بھی تھے جو تعلیم میں دستکاری یا حرفہ کے شامل کئے جانے کا موجب سمجھے جا سکتے ہیں۔ اس زمانے میں تیس سالہ جنگ کی وجہ سے وسطی یورپ میں ایک عام افلاس اور بے روزگاری کی لہر دوڑ گئی تھی، اس بنا پر بعض مفکرین اور مصلحین تعلیم اس خرابی کا علاج اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ جن بچوں میں کسی دستکاری یا حرفہ کے کام کے میلانات ہوں، انھیں تعلیم میں اس کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان میلانات کو بروئے کار لا سکیں اور آئندہ ان کو کسب معاش کا ذریعہ بنائیں۔

پھر ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی تھے، مثلاً ہاتھ کے کام سے صحت اور تندرستی پر اچھا اثر

جائے اسے عام تعلیم کا ایک جزو بنایا جائے۔ نیز اس زمانے کے لفظی اور مذہبی مباحثوں سے لوگ تھک گئے تھے۔ اس لئے تعلیم میں ہاتھ کا کام ایک عام پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

تعلیم میں ہاتھ کے کام کی یہ اہمیت نہ صرف مصلحین تعلیم ہی نے تسلیم کی بلکہ اس زمانے کے بعض فلاسفر و عقلیین نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ ڈیکارٹ سترھویں صدی عیسوی میں فرانس کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے۔ اس کے متعلق اس کے ایک سوانح نگار نے لکھا ہے:

"وہ پہلا شخص تھا جس نے دستکاروں کے لئے دستکاری کی عام تعلیم دیئے جانے کا خیال پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ مختلف حرفوں اور دستکاریوں کے لئے بڑے بڑے ہال بنائے جائیں۔ ان میں سے ہر ایک ہال میں ایک چھوٹا سا عجائب خانہ اور ایک مشورہ کا کمرہ ہو۔ عجائب خانے میں اس حرفے سے متعلق ضروری اوزار اور سامان رکھے جائیں۔ اس قسم کے تمام مدرسوں کیلئے ہر حرفے کا ایک نہایت لائق ماہر فن رکھا جائے جو کاریگروں کے تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دے سکے اور انہیں تمام باتوں کی وجہ بتلاسکے جو روزمرہ کے تمام کاموں میں پیش آتی ہیں۔"

لیکن تعلیم میں ہاتھ کے کام کو اہمیت اس سے زیادہ اس کے ایک جرمن شاگرد وائیگل نے دی، اور اس نے کم و بیش انہی خیالات کا اظہار کیا ہے جو بعد میں فروبل اور فنڈلی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بچوں سے ہاتھ کا کام لینا چاہیئے تاکہ وہ خود کام سے عقل و حکمت کی تمام باتیں سیکھیں اس کام کی نوعیت اور اس سے زیادہ خدائے تعالیٰ کی کارسازی سے واقف ہو جائیں اور اس طرح وہ دوسروں کو محض سن کر علم نہ سیکھیں بلکہ ہاتھ کے کام کے ذریعے حاصل کریں۔

اس سے بھی زیادہ اہمیت ہاتھ کے کام کی اس کے شاگرد اور مشہور فلسفی لائبنتز نے دی ہے۔ اور جو کچھ ڈیکارٹ نے کاریگروں اور صناعوں کے بچوں کے لئے کیا تھا وہ یہ سب بچوں کے لئے چاہتا ہے وہ اپنی مشہور کتاب "ایک شہزادے کی تعلیم" میں ایسے بچوں کے لئے جو ذہنی اعتبار سے کسی قدر سست ہیں ہاتھ کے کام کی تعلیم کا مشورہ دیتا ہے تاکہ وہ استاد کی مار پیٹ سے اپنی زندگی کے عزیز

سال ضائع نہ کریں اور اس طرح ریاست کا بھی نقصان ہو جو ان کی عدم افادیت سے اتنا ہی گھاٹا اٹھائے جتنا وہ خود اپنی عمر کا ایک حصہ کھو کر اپنا کریں گے۔ اس لئے کہ ان لڑکوں کی قوتِ عمل کو اور طرح سود مند لایا جاسکتا ہے جن کا ان سالوں میں ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔"

واشبرن نے اپنی ایک کتاب میں اس امر کی نہایت پُرزور سفارش کی ہے کہ عام تعلیم کے سلسلے میں ۱۲ سے ۱۵ سال کے لڑکوں کو کسی ہاتھ کے کام کی تعلیم دینی چاہئے۔

ہاتھ کے کام کی تعلیم کے جہاں اور بہت سے مقاصد تھے وہاں ایک اور خاص غرض بھی تھی۔ سترھویں صدی میں بعض لوگوں نے امراء کے طبقے سے ہر قسم کی اصلاح اور ترقی کی امید قائم کی۔ چنانچہ ان کے لئے حرفہ اور دستکاری کی تعلیم بھی ضروری سمجھی گئی اور اس غرض کے لئے بہت سی تعلیمی اسکیمیں اور مدارس تجویز کئے گئے۔ ان کے لئے ہاتھ کے کام کی تعلیم علاوہ ہاتھ کے کام والوں کی حالت کی واقفیت کے ان کی عام صحت و تندرستی اور تفریح کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی سمجھا جاتا تھا۔

جان لاک نے جو انگلستان کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے اسی بنیاد پر اپنی کتاب "تعلیم سے متعلق خیالات" میں شرفاء کے لڑکوں کی تعلیم کی ایک اسکیم پیش کی ہے اور اس سلسلے میں باغبانی، لکڑی کا کام اور دوسرے صنعتی مشاغل تجویز کئے ہیں۔ جن کے فوائد وہ ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

"اس سے دو قسم کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایک خود اس کام کی مہارت جو بذاتہ نفع بخش ہے اور دوسرے ورزش جو بغیر کسی اور فائدے کے پیش نظر عام صحت کے لئے مفید اور ضروری ہے۔ یہاں سے شرفاء کے لئے میں ان دو چیزوں میں سے ایک یا دونوں تجویز کروں گا۔

(۱) باغبانی یا زراعت کا کام۔ (۲) نجاری یا لکڑی کا کام۔ ان میں سے ایک میں مہارت حاصل کرنے سے وہ خود اپنے مالی کو قابو میں رکھ سکے گا اور اس کے کام کو بہتر بنا سکے گا۔ دوسرے کام کو سیکھ کر وہ بہت سی استعمال کی چیزیں اور ان کے نمونے بنا سکے گا۔ اگرچہ یہ باتیں میں اس خیال سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ یہی اس کام کی اصل غرض و غایت ہیں، بلکہ اس سے محض ان میں ایک میلان پیدا کرنا مقصود ہے۔ میرا اصل منشا تو یہ ہے کہ ایسے کار آمد اور صحت بخش

ہاتھ کے کاموں سے دماغ اور ذہن سنجیدہ باتوں کے سوچنے اور کرنے میں دے سکے ۔"

اب تک تو صرف امرا ہی کے طبقے میں ہاتھ کے کام کی تحریک جاری تھی، سترھویں صدی کے بعد سے متوسط اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے لئے بھی اس خیال کا اظہار ہونے لگا۔ اٹھارھویں صدی کے شروع میں بلرنے "ہاتھ کے کام کے لئے ریاضی کے ایک مدرسے کا خاکہ" پیش کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے:-

"جس طرح اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کے لئے امرا کے مدارس قائم ہیں تاکہ ان کے بچے ان میں تعلیم پاکر مذہبی، سول اور فوجی خدمات انجام دیں، اسی طرح مناسب ہے کہ وہ لوگ جو آگے چل کر کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں اور جنھوں نے اب تک صرف لکھنے پڑھنے کی تعلیم حاصل کی ہے، کسی ایسے میکانکی کام کے مدرسوں میں اس قسم کی تعلیم حاصل کریں جو ان کے مقصد اور ان کی آئندہ زندگی کے مطابق ہو تاکہ انھیں مختلف چیزوں اور آلات و اوزار سے واقفیت حاصل ہو اور وہ اس علم اور واقفیت کو اپنے آئندہ کے کام کو بہتر طریقہ پر اور سوچ سمجھ کر کرنے میں صرف کریں ۔"

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جہاں آزادی، جمہوریت اور مساوات کی بنیاد پر نظم زندگی کی ایک نئی داغ بیل ڈالی گئی تھی، عوام کے لئے ہاتھ کے کام کی تحریک اور زور روں پر بڑھی۔ ۱۹۳۵ء میں طامس جفرسن نامی ایک شخص نے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کا ایک خاکہ تیار کیا، جس میں اس نے لڑکوں کی تعلیم کے لئے یہ شرط رکھی کہ وہ عام تعلیم کے ساتھ کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام بھی سیکھیں، مثلاً ریاضی کے اوزار بنانا، گھڑی سازی، بننے کا کام، جوتے بنانا، اور ایسے کام جن کا مدرسہ انتظام کر سکے" اور لڑکیاں "سن اور اون کی کتائی کا کام، موزے اور دستانے بنانا، سینا پرونا، گھاس پھوس کی ٹوپیاں اور ٹوکریاں بنانا اور ایسے کام جن کا مدرسے میں انتظام ہو سکے ۔"

طامس جفرسن نے اسی پر ختم نہیں کیا بلکہ روزانہ کے پروگرام میں اس نے ہاتھ کے کام کی جگہ بھی معین کی۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ

"بچے صبح کے دو گھنٹے پڑھنے لکھنے اور حسابات وغیرہ میں صرف کریں۔ اس کے بعد

دو گھنٹے ہاتھ کے ایسے کام میں جو وہ سب سے زیادہ خوشی کے ساتھ کرنے کو تیار ہوں اس کے بعد دو گھنٹے کھانے پینے اور تفریح میں گزاریں پھر دو گھنٹے سہ پہر کے وقت اپنے مختلف کاموں میں صرف کریں:

اس کے علاوہ فرینکلن نامی ایک شخص نے ایک انگریزی مدرسے کا خاکہ تیار کیا تھا جس میں اس نے ایک نئی چیز پیش کی اور وہ یہ کہ اس نے ہاتھ کے کام کو مدرسے کے کسی نہ کسی مضمون سے مربوط کر کے سکھانے کا مشورہ دیا تھا۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ

جس وقت بچے مطالعہ فطرت کا مضمون پڑھ رہے ہوں اس وقت کیا تھوڑا سا باغبانی کا کام مثلاً تخم لگانا، پودا لگانا، چشمے باندھنا وغیرہ سکھایا اور کرایا نہیں جا سکتا ہے؟ اور کبھی کبھار انہیں آس پاس کے اچھے اچھے کاشتکاروں کے کھیتوں پر لے جا کر انہیں اچھے طریقۂ کاشت کا مطالعہ نہیں کرایا جا سکتا ہے، اور انہیں یہ ذہن نشین نہیں کرایا جا سکتا ہے کہ زراعت کی ترقی میں سب کا فائدہ ہے اور اس کا سیکھنا کسی کے لئے نقصان کا باعث نہیں: اسی طرح تاریخ تعلیم کے سلسلے میں بہت سے میکانیکی کام کرائے جا سکتے ہیں، مثلاً تجارت کی ابتدا، فنون کی ایجاد، صنعتوں کی ترقی، کاروبار کا پھیلنا مع تمام وجوہ اور اسباب کے لڑکوں کے لئے دلچسپی اور فائدہ کا باعث ہو سکتا ہے اسی کے ساتھ انجن اور مشین کی قوت اور ان کا استعمال قدرتاً بچوں میں یہ خواہش پیدا کرے گا کہ وہ میکانیکی کام کریں، مشین اور اس کے اصولوں سے واقفیت حاصل کریں جن کی مدد سے کمزور انسان نے بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دئے ہیں اور اس سے ان کی اتنی ساری محنت بچی ہے اور صنعت و حرفت میں اس قدر ترقی ہوئی ہے:

جان کومی نیس کے ہم مذہب جو عیسائیوں کے موراوی فرقے سے تعلق رکھتے تھے، امریکہ کی ایک ریاست پنسلوینیا میں آکر آباد ہو گئے تھے اور انہوں نے یہاں آکر تعلیم میں ہاتھ کے کام کے مسئلہ کو اپنے مدرسوں میں اس آسانی سے حل کر لیا تھا جو بہت عرصے تک بعد کے ماہرین تعلیم کے لئے ایک عقدۂ لاینحل بنا رہا۔ انہوں نے اپنے مدرسے میں بچوں کے کھیل کود اور تفریحات کو ایسے کاموں کے تحت رکھا تھا جو وہ آئندہ زندگی میں کرنے والے ہوں، مثلاً زراعت میکانیکی کام وغیرہ۔ انہوں نے اپنے مدرسوں میں انہی عملی کاموں کے ذریعے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ خیال محض کھیل نہیں بلکہ اپنے اندر بڑی حقیقت بھی رکھتا ہے۔

حالاتِ حاضرہ

(الف) ممالکِ غیر

یورپ اور ایشیا کی جنگ اب اس دور سے گزر چکی ہے جب اس کے انجام کے بارے میں شبہ ہو سکتا تھا، اور اب اتحادیوں کی طاقت اتنی ہو گئی ہے کہ وہ اپنا ہر منصوبہ پورا کر سکتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جرمن اور جاپانی اپنی شکست تسلیم کرنے پر تیار ہیں۔ جرمنی کی فوجیں پسپا ہوتے ہوتے ملک کی سرحد تک پہنچ گئی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مغرب میں انگریز اور امریکی اور مشرق میں روسی جتنے شدید اور مسلسل حملے کرتے رہے اتنی ہی جلدی جرمن فوجوں کا آخری محاذ ٹوٹ جائے گا۔ ۲۰ جولائی میں ہٹلر کو قتل کرنے کی سازش کامیاب ہوئی ہوتی تو جرمنی کب کا ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ مگر ہٹلر سلامت ہے اور نازی پارٹی نے پورا تسلط حاصل کر لیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جرمن فوجیں قدم جما کر لڑ رہی ہیں اور ڈاکٹر گوبلز نے اعلان کر دیا ہے کہ اگر اتحادی اور روسی جرمنی میں گھس آئے تو جرمن قزاقانہ طریقہ پر لڑیں گے۔ یہ محض دھوکہ نہیں ہے۔ مسٹر چرچل نے اپنی ۲۹ ستمبر کی تقریر میں اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جرمن باقاعدہ طور پر کبھی جنگ بند ہی نہ کریں، اور اتحادی لڑائی کو اس وقت ختم سمجھیں جب انھیں یقین ہو جائے کہ جرمن بڑے پیمانے پر جنگ کرنے کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مسٹر چرچل کے نزدیک ایسی صورت سال کے آخر تک پیدا ہو سکتی، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اگلے سال کے چند مہینے اور جرمنی سے لڑنے میں صرف ہوں۔ مشرقی محاذ پر بھی سب کچھ ہو سکتا ہے جو کہ مغرب میں، لیکن یا تو روسی اس بارے میں قیاس آرائی نہیں کرتے کہ جنگ کا فیصلہ کب تک ہو جائے گا، یا ان کے خیال کی اتنی اشاعت نہیں کی جاتی کہ ہمیں بھی کچھ معلوم ہو سکے۔ بہر حال لڑنے میں وہ اتحادیوں سے کچھ کم مستعد نہیں ہیں، اور جرمنی کا مغربی محاذ ٹوٹا تو مشرقی محاذ بھی قائم نہ رہ سکیگا۔

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ جرمن صرف اس وقت تک لڑتے ہیں جب تک کامیابی کی کوئی امید ہو اور جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے تو لڑائی بند کر دیتے ہیں مگر اس جنگ میں یہ دیکھا

گیا ہے کہ انھیں خواہ مخواہ قربانیاں کرنے میں مزا آتا ہے، سٹالن گراڈ اور تونس میں انھوں نے اپنے سپاہیوں کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور فرانس میں بھی جب بظاہر انھیں آدمیوں کی بہت ضرورت تھی انھوں نے بندرگاہوں میں آخر وقت تک مقابلہ کرنے کے لئے سپاہی چھوڑ دیے۔ انھیں قربان کرنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا سوا اس کے کہ اتحادی ان بندرگاہوں کو تھوڑے دن اور استعمال نہ کرسکیں گے۔ مسٹر چرچل کے خیال میں یہ محض حماقت کی بات تھی اور وہ بیچارے ہٹلر کو ایسی تمام حماقتوں کا ذمہ دار مانتے ہیں۔ لیکن اب جرمنی کے جنرل سٹاف اور سیاسی لیڈروں کو فوج کی پسپائی اور شکست کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، اور غالباً ان کا منشا یہ ہے کہ ایسی مہموں میں جن کا انجام معلوم ہے کہ کیا ہوگا آدمی ضائع کرکے قوم میں سرفروشی کا ایسا جذبہ پیدا کریں کہ اسے فتح اور شکست سے مطلب ہی نہ رہے۔ اور وہ پنے نقصان کو بھی روحانی تکمیل کا ذریعہ سمجھے۔ اتحادی فوجیں جرمنی میں داخل ہوجائیں گی تو معلوم ہوجائے اکہ نازی پارٹی ایثار اور قربانی کا کیا جذبہ پیدا کرسکی۔ فی الحال جرمن سپاہیوں اور سپہ سالاروں کے طرز ل میں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی کہ وہ ہمت ہار گئے۔ لیکن انھیں یہ امید نہ ہوگی کہ اتحادی ان ے خلوص اور ایثار سے متاثر ہوکر اپنی پیش قدمی بند کردیں گے دراصل نازی لیڈر اور فوج کے سپہ سالار انتے ہیں کہ بیس پچیس ہزار ہوائی جہازوں کے بیڑے کا صحیح جواب تیس پینتیس ہزار ہوائی جہاز بھی نہیں ہیں بلکہ لمے ایسے آلات جو ابھی تک اتحادیوں کے پاس نہیں ہیں اور جن کا رد عمل سوچنے میں اتحادیوں کو چار ر مہینے لگ جائیں گے۔ اڑن بم ان آلات میں سے پہلا تھا اس کی نئی شکل یہ ہے کہ یہ ہوائی جہاز کے نیچے لگا جاتا ہے اور ہوائی جہاز مناسب فاصلے سے اس کو گولے کی طرح داغ دیتا ہے۔ حال ہی میں خبر آئی ہے کہ ایک چودہ ٹن کا گولہ تیار کیا گیا ہے جس کے پھٹنے کا اثر دو میل تک ہوتا ہے۔ اسی طرح کی دوچار ر ایجادیں ہوں گی۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ جرمن نئے آلات کافی مقدار میں تیار کرکے محاذ تک پہنچا بھی یں گے یا نہیں۔ اگر اتحادیوں نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر محاذ کو توڑ دیا تو نئے آلات جرمنوں کے ر کام نہ آئیں گے، اتحادیوں کو بہت زیادہ دیر لگی تو ممکن ہے یورپی جنگ کا خاتمہ سال چھ مہینے کے وری ہوجائے۔ لیکن جنگ کا محاذ جرمنی کی سرحد پر ہی یا ملک کے اندر ہوگا۔

جنگ کے میدانوں میں جرمنی کی پسپائی کا نتیجہ اس کی سیاست پر بھی پڑا ہے اب ہنگری کے سوا جرمنی کے تمام ساتھی اس سے الگ ہو گئے ہیں، اٹلی بالکل اتحادیوں کے ساتھ ہو گیا ہے اور رومانیہ اور بلغاریہ روس کی طرف سے جرمنی کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ سیاسی انقلابوں سے سب سے زیادہ فائدہ روس نے اٹھایا ہے۔ فرانس اور اٹلی بے شک اتحادیوں کے ساتھ ہیں۔ مگر ان کے اپنے الگ مقاصد بھی ہیں اور جنگ کے بعد ان کی توجہ اپنے مقاصد پر ہوگی۔ روس جنگ کے بعد فن لینڈ، پولینڈ، چیکوسلوواکیہ، رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی سیاست پر بالکل حاوی رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نظر آ رہے ہیں۔ روس چیکوسلوواکیہ سے بیس سال کا معاہدہ کر چکا ہے جس کے مطابق چیکوسلوواکیہ کی خارجی سیاست روسی سیاست سے ہم آہنگ ہوگی۔ پولینڈ کی جلاوطن حکومت ایسا معاہدہ کرنے پر تیار نہ تھی اس لئے روس نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے اور غالباً جنگ کے بعد پولینڈ کی حکومت ایسی پارٹی کے ہاتھ میں ہوگی جو کمیونسٹ نہ ہوئی تب بھی خارجی ہر مسئلہ میں روس کے مشورے پر عمل کرے گی۔ رومانیہ اور بلغاریہ میں روسی اس کا اہتمام کر رہے ہیں کہ ان کے مخالف ایک مدت تک حکومت پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ انھیں یہ بھی گوارہ نہیں ہے کہ انگریز اور امریکی بلغاریہ کے داخلی معاملات میں کوئی حصہ لیں۔ ۲۰ ستمبر کو انھوں نے قریب بیس انگریز اور امریکی فوجی افسروں کو جو بلغاریہ کی دارالسلطنت میں تھے ۲۴ گھنٹے میں ملک کو چھوڑ دینے کا حکم دیا، اور جب وہ موٹروں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو ان کے پیچھے روسی افسر سرحد تک گئے، تاکہ شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ اب اتحادی فوجیں البانیہ میں اتاری گئی ہیں ان کا مقصد یوگوسلاویہ کی مدد کرنا ہے اور ان جرمنوں کا راستہ بند کرنا جو اب تک کریٹ اور یونان میں ہیں۔ اس چال کا سیاسی نتیجہ یہ ہوگا کہ یونان پر روس کا سیاسی تسلط نہ ہوگا۔ یوگوسلاویہ میں روسیوں نے پہلے ہی سے اپنے قدم جما لئے ہیں، اور بلغاریہ کو بھی وہ اس طرح اپنے قابو میں رکھیں گے کہ کوئی کارروائی عمل میں نہ آنے پائے جو ان کی مصلحت یا مفاد کے خلاف ہو۔

جب تک یورپ میں جنگ ہو رہی ہے انگریز اور امریکی روس کے رویے پر اعتراض نہ کریں گے۔ انھوں نے اصولاً نہیں تو عملاً تسلیم کر لیا ہے کہ استھونیا، لیٹویا اور لیتھونیا روسی وفاق کے ارکین یعنی روس میں شامل ہیں۔ پولینڈ کے معاملات میں مسٹر چرچل نے ہمیشہ روس کا ساتھ دیا ہے، اور پولینڈ کی نئی حدبندی کی تجویز منظور

کرلی ہے۔ اگرچہ مسٹر چیمبرلین نے سنہ ۱۹۳۹ء میں پولینڈ کو جو گارنٹی دی تھی اس میں پولینڈ کی اس وقت کی حدود کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا گیا تھا چیکوسلواکیہ سے روس کا جو معاہدہ ہو چکا ہے وہ اس [illegible] اقتصادی نظام سے الگ ہوگا جو اتحادی جنگ کے بعد قائم کریں گے جس کا مطلب یہ ہے کہ چیکوسلواکیہ اور اس کی بدولت وسطی یورپ کے مسائل میں روسیوں کا اختیار اتحادیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگا۔ فی الحال مسٹر چرچل کو یہ بھی منظور ہے پارلیمنٹ میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جرمنی سے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈالنے کو کہا جائے گا۔ چاہے اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جرمنی میں انقلاب ہو جائے اور کمیونسٹ حکومت پر قبضہ کر لیں۔ گویا مسٹر چرچل نے یہ خیال چھوڑ دیا ہے کہ یورپ میں آزاد اور خودمختار ریاستوں کے درمیان قوت کا ایسا توازن قائم کیا جائے کہ جنگ کی نوبت نہ آنے پائے۔ اور اس کی جگہ انھوں نے ایسی کوئی تجویز سوچی ہے کہ برطانیہ، روس اور امریکہ مشترکہ طور پر سیاسی اور معاشی نگرانی کے فرائض انجام دیں۔ اور یورپ کی تمام قومیں [illegible] رہیں۔ اس تجویز کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ متحدہ ریاستیں یورپ کی سیاسی رہنمائی کی [illegible] اور دوسرے اخراجات برداشت کریں جو یورپ جیسے براعظم کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ پریذیڈنٹ روزویلٹ اور ان کے وزرا تو اس کے لئے تیار ہیں لیکن غالباً جنگ ختم ہونے کے بعد کانگریس اور امریکہ کے سرمایہ دار متحدہ ریاستوں کی سیاست کو حکومت کے اختیار میں نہ رہنے دیں گے اور پریذیڈنٹ روزویلٹ منتخب ہو گئے تب بھی جنگ کے بعد متحدہ ریاستوں کا رویہ ضرور بدلے گا۔ ایک فرقہ جو اصولی بحث کرتا ہے یہ کہے گا کہ جب روس کو ایسی ریاستوں پر قبضہ رکھنے کا حق دیا گیا ہے جو جنگ سے پہلے آزاد تھیں اور اس کے باقی پڑوسی بھی اس کے ماتحت کر دیے گئے ہیں تو متحدہ ریاستیں کس اصول پر یورپ کے معاملات میں دخل دے سکتی ہیں اور ان سے کس مقصد کی خاطر سیاسی نگرانی کی زحمت اٹھانے کو کہا جا سکتا ہے۔ متحدہ ریاستیں قوموں کی آزادی کی حفاظت اور ان اصولوں کی حمایت کر سکتی ہیں جن سے قوم کو عقیدت ہے، دوسروں کی اغراض پوری کرنا ان کا کام نہیں۔ دوسرا فرقہ جس میں سرمایہ دار ہیں جنگ کی کامیابیوں سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا، [illegible] غیر سیاسی مگر بہت طاقتور فرقے کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ متحدہ ریاستوں کو بحرالکاہل کے ان جزیروں پر قبضہ رکھنا چاہیے جو انھوں نے فتح کئے ہیں اور ظاہر ہے جنوب مشرقی ایشیا میں امریکی فوجوں کو [illegible]

نسبت سے ایسے لوگوں کے مطالبے بڑھتے جائیں گے۔ اور تجارتی فائدے کے مقابلے میں اپنے اتحادیوں کے سیاسی احساسات کا ذرا بھی خیال نہ کریں گے۔ ایسی حالت میں متحدہ ریاستوں کا کسی واضح اور مستقبل پالیسی پر عمل کرنا بہت دشوار ہوگا۔ اور برطانیہ اور روس ہی یورپ میں امن قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوں گے روس اپنے اقتدار کو مستحکم کر رہا ہے۔ اور وسطی، مشرقی یورپ پر وہ حاوی رہے گا۔ برطانیہ کا اثر جتنا بھی ہوگا ناروے، سویڈن، فرانس، ہسپانیہ، اٹلی اور یونان میں ہوگا۔ قوت کے اس توازن میں فیصلہ کن بات ہوگی کہ جرمنی کی صنعت پر کس کا قبضہ ہوتا ہے۔

(۲۴ اکتوبر ۱۹۴۴ء) (م۔م)

(ب) ہندوستان

گاندھی جناح کی گفتگوئے مصالحت

مہاتما گاندھی اور قائد اعظم جناح کی گفتگو افسوس ہے کہ بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے ہوئے فی الحال منقطع ہو گئی ہے۔ ترقی پسند حلقوں میں اس کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں اور رجعت پسند حلقوں میں اس کی وجہ سے بڑی پریشانی اور سراسیمگی تھی۔ ترقی پسند حلقے عام طور پر مسلمانوں کے حق خود ارادیت کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ چونکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی اس بات کو ایک حد تک تسلیم کر چکی ہے[۱] اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس کی جانب ایک بڑا قدم اٹھا چکی ہے[۲]۔ اور گاندھی جی نے راجہ جی کے فارمولے[۳] کو قبول کر کے مسلمانوں کے پاکستان کے حق کو مان لیا ہے اس لیے اب مسلم لیگ کی لاہور کی

---

[۱] کرپس سے جب ہندوستان کے دستور کا معاملہ طے ہو رہا تھا تو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کہا تھا کہ "وہ ملک کے کسی علاقہ کے لوگوں کو ان کی اعلان کردہ اور مستقر مرضی کے خلاف، سلطنت مشترکہ ہند میں شریک رکھنے کے لیے مجبور کرنے کا خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتی" جس کا مفہوم گویا یہ تھا کہ گو کانگریس مشترکہ ہندوستان کی حامی ہے لیکن اگر

قرارداد کے تسلیم کرنے میں بہت کم رکاوٹ رہ گئی ہے اور اس کو باہمی گفتگو سے دور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن گفتگو کی جو روداد باہمی مراسلت کی صورت میں شائع ہوئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خوش اعتقاد لوگ غلط فہمی میں مبتلا تھے دراصل دونوں رہنماؤں کے خیالات میں بنیادی فرق پایا جاتا تھا جس کا مصالحت کی گفتگو سے دور کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاندھی جی ہندو مسلم مشترکہ قومیت کے عقیدہ پر قائم تھے۔ جناح صاحب ہندوؤں اور مسلمانوں کو بنیادی طور پر دو جداگانہ قومیں تسلیم کرتے تھے گاندھی جی ہندوستان کی ایسی تقسیم چاہتے تھے جیسی دو بھائیوں کے درمیان ہوتی ہے کہ اندرون خانہ تو وہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن باہر والوں کے مقابلہ میں وہ پھر بھی متحد ہی رہتے ہیں جناح صاحب پاکستان کو بالکل مختار مطلق ریاست بنانا چاہتے تھے جو اپنی مدافعت۔ خارجی پالیسی، تجارت ذرائع آمد و رفت وغیرہ کا انتظام بذات خود جداگانہ اور آزادانہ طریقہ پر کرے اور اس سلسلہ میں صرف ان ضروری پابندیوں کو قبول کرے جو آزاد اور خود مختار پاکستان اور ہندوؤں کے درمیان باہمی معاہدے سے طے پائیں۔ جناح صاحب مسلم قوم کے لئے خود ارادیت کے حق کے طلبگار تھے۔ گاندھی جی مسلم علاقوں کے لئے اس حق کو ماننے کے لئے تیار تھے۔ جناح صاحب صرف مسلم قوم کی رائے کو فیصلہ کن قرار دیتے تھے گاندھی جی مسلم اکثریت کے علاقوں کی پوری بالغ آبادی کی جس میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہوں۔ عام رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ جناح صاحب تقسیم کو مقدم اور آزادی کو موخر رکھتے تھے

(بقیہ نوٹ صفحہ) مسلمان چاہیں گے تو وہ علیحدہ بھی رہ سکیں گے

[1] بمبئی کے ۸ اگست کے تاریخی اجلاس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے وفاق میں شامل ہونے والے واحدوں کے لئے جس زیادہ سے زیادہ خود مختاری کو جائز رکھا تھا اور باقی اختیارات انہیں واحدوں کے حوالے کئے تھے اور اس سلسلہ میں گاندھی جی مسٹر جناح سے ملاقات بھی کرنے والے تھے لیکن ان کی گرفتاری کی وجہ سے یہ ملاقات نہیں ہو سکی تھی

[2] راجہ جی کا فارمولا چھ نکتوں پر مشتمل تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کو ہندوستان کی کامل آزادی کے مطالبہ کی تائید کرنا ہوگی اور درمیانی زمانہ کے لئے ایک قومی حکومت کے بنانے میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔ جنگ کے ختم

گاندھی جی آزادی کو مقدم اور تقسیم کو مؤخر رکھتے تھے۔ جناح صاحب مسلم لیگ کے با اختیار نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے گاندھی جی صرف ذاتی حیثیت سے گفتگو کر رہے تھے۔ جناح صاحب ہندو قوم سے سمجھوتہ چاہتے تھے اور مسٹر گاندھی کو مسلم لیگ کی قرارداد دکھانا اور ان کو مسلم لیگ کا ہم خیال بنانا چاہتے تھے گاندھی جی جناح صاحب سے سمجھوتہ چاہتے تھے تاکہ بعد میں دونوں مل کر ساری قوم کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں اور آزادی کے حصول کی مشترکہ سعی کر سکیں۔ مسٹر جناح کے اندر قطعیت تھی اور منطقی تھی مسٹر گاندھی میں ابہام۔ لچک اور نرمی تھی لیکن نہ اتنی کہ مسٹر جناح کی مسلسل کاری ضربوں کی غیر محدود مدت تک متحمل ہو سکتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تین ہفتے تک طول کھینچنے کے بعد آخر کار یہ گفتگو ناکامی کے ساتھ ختم کرنا پڑی۔

لیکن اس گفتگو کو بے کار اور مضرت رساں سمجھنا صحیح نہیں ہے اس کے ذریعہ ترقی کی طرف جانب ایک نہایت اہم قدم اٹھایا گیا ہے اس کے ذریعہ عوام کی نہایت اچھی سیاسی تعلیم ہوئی ہے۔ مورد نزاع جس طرح واضح صورت میں سب کے سامنے آ گئے ہیں ایسے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ گاندھی جی نے اس گفتگو کی

(بقیہ نوٹ صفحہ) پر ایک کمیشن ان علاقوں کی حد بندی کرے گا جن میں عام بالغ شہری کے فیصلہ کے ذریعہ ہندوستان کو علیحدہ کیا جانے کا آبادی کی جو قطعی اختیاری ہو گی اور ان تمام شرطوں پر اس وقت عملدرآمد ہو گا جب برطانیہ مکمل طور پر حکومت ہند کو خود مختار بنا دے گا۔

؎ قرار پایا کہ مسلم لیگ کے اس جلسہ کا غور و خوض کے بعد خیال ہے کہ کوئی دستوری تجویز اس وقت تک اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہو گی جب تک کہ حسب ذیل بنیاد پر نہیں سوچا جائے گا یعنی یہ کہ جغرافیائی لحاظ سے جو وحدے ایک دوسرے سے ملحق ہیں ان کی علاقوں کی صورت میں حد بندی کر دی جائے اور ان کو ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ اس طرح تشکیل دے دی جائے کہ وہ علاقے جہاں مسلمان تعداد کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے انہیں متحد کر کے ایسی آزاد ریاستوں کی صورت دے دی جائے جن میں شامل ہونے والے وحدے خود مختار اور مقتدر اعلیٰ ہوں گے۔ نیز یہ کہ ان وحدوں اور ان علاقوں کی اقلیتوں کے لئے موثر اور دستوری ضمانتوں کا خصوصی طور پر بندوبست

آخری منزل میں اپنی طرف سے مصالحت کی جو تجویز پیش کی وہ بہت واضح اور غیر مبہم تھی اور جناح صاحب نے اسے تجویز کردہ عہد کی قرارداد کے منافی قرار دے کر جس طرح مسترد کیا اس میں بھی بہت صراحت و صفائی پائی جاتی ہے۔

بہرحال اس تمام گفتگو کا اہم ترین سوال یہ تھا کہ آیا مسلمانوں کا ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے حق خود ارادیت تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ جناح صاحب یہ کہتے تھے کہ یہ حق جداگانہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہئے اور گاندھی جی جداگانہ قوم کی حیثیت سے اس حق کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ جناح صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ برطانوی ہند میں ہندوستانی قوم کا کہیں کوئی وجود نہیں ہے۔ اس سلطنت میں مسلم قوم آباد ہے اور ہندو قوم بھی آباد ہے لیکن ہندوستانی قوم جسے کہتے ہیں وہ ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمان نو سو سال سے ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے ہندوستان میں ہیں۔ آٹھ سو سال تک وہ یہاں حکمراں کی حیثیت سے رہے پھر وہ محکوم ہو گئے لیکن قومیت کے ہر لحاظ سے انھیں ایک جداگانہ قوم کہا جا سکتا ہے۔ ان کی آبادی دس کروڑ ہے ان کا ایک جداگانہ تمدن اور تہذیب ہے، جداگانہ زبان اور ادب ہے، جداگانہ فن لطیف اور طرز

(بقیہ نوٹ صفحہ) کیا جائے تاکہ ان کے مذہبی، تمدنی، معاشی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق اور مفاد کا تحفظ ان کے مشورے سے کیا جا سکے اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے لئے اور دوسری اقلیتوں کے لئے کافی موثر اور دستوری ضمانتوں کا مخصوص طور پر بندوبست کیا جائے تاکہ ان کے مذہبی تمدنی، معاشی سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق اور مفاد کا تحفظ ان کے مشورہ سے کیا جا سکے۔

[1] آپ کی مدد سے جو مجھے آپ سے ملاقات کے دوران ملتی رہی ہے میں انتہائی کوشش کر رہا ہوں تاکہ ۱۹۲۹ء کی مسلم لیگ کی قرارداد میں جو مطالبہ پیش کیا گیا ہے اس کو معقولیت کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔ میرے آپ کو یہ اندیشہ نہ کرنا چاہئے کہ اگست کی قرارداد ہمارے سمجھوتہ کی راہ میں حائل ہوگی۔ اس قرارداد میں ہندوستان اور برطانیہ کے اختلاف کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور یہ ہمارے سمجھوتے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔

میں اس مفروضہ سے ابتدا کرتا ہوں کہ ہندوستان کو دو یا زائد قوموں قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ایک خاندان کو جس کا جا سکتا ہے جس میں بہت سے رکن شامل ہیں اور ان میں مسلمان جو شمال مغرب کے علاقے یعنی بلوچستان، سندھ، شمال مغربی 1

عبارت ہے، جداگانہ نام اور اصطلاحیں ہیں، جداگانہ احساس قدر شناسی ہے، جداگانہ رواج اور جنتری ہے، جداگانہ تاریخ اور روایات، جداگانہ رجحانات اور عزائم ہیں۔ غرض ان کا زندگی کے بارے میں اور زندگی سے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نگاہ ہے اور بین الاقوامی قانون کے ہر اصول کے لحاظ سے انھیں ایک جداگانہ قوم کہا جا سکتا ہے اس قدر کثیر التعداد قوم کو یہ جمہوری حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مکمل آزادی کو عمل میں لانے کے لئے ایک سرزمین وطن کا مطالبہ کرے۔ چونکہ اس کی تعداد کل سلطنت ہند کی آبادی کی ایک چوتھائی ہے اس نے برطانوی حکومت سے آزاد ہونے کے وقت اس سلطنت کے ایک چوتھائی رقبہ پر مطالبہ کرنے کا اس کو جائز حق حاصل ہے اپنے اس حق کی بنا پر مسلم قوم اپنے لئے حیدرآباد، بمبئی اور مدراس کی طرف بھی ایک چوتھائی رقبہ کا مطالبہ کر سکتی تھی۔ اور اس مطالبہ کے جواز میں بہت سی باتیں پیش کی جا سکتی تھیں۔ لیکن ایسا کرنے میں ملک کی زندگی میں نسبتاً زیادہ ابتری پیدا ہوتی۔ حسن اتفاق سے مسلم قوم کی بیشتر آبادی ملک کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں میں مجتمع ہے اس نے مسلم لیگ کا مطالبہ ہے کہ ان دونوں جانب کے علاقوں کو مسلمانوں کی سرزمین وطن تسلیم کر لیا جائے۔ اس وقت سلطنت برطانیہ کے موجودہ صوبوں میں سے

(بقیہ نوٹ صفحہ　　) سرحدی صوبہ اور پنجاب کے ایک حصہ میں رہتے ہیں اور جہاں وہ دوسرے عام عناصر کے مقابلے میں قطعی اکثریت میں ہیں اور بنگال اور آسام کے ان حصوں میں جہاں وہ قطعی اکثریت میں ہیں، بقیہ ہندوستان سے علیحدہ رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

عام بنیاد کے بارے میں آپ سے اختلاف رکھنے کے باوجود میں بحیثیت کانگریسی اور رکن سے اس بات کی سفارش کر سکتا ہوں کہ مسلم لیگ کے علیحدگی کے مطالبہ کو جو لاہور کے ۱۹۴۰ء کی لیگ کی قرارداد میں موجود ہے میری بنیاد پر اور مندرجہ ذیل شرائط کے ماتحت قبول کیا جائے۔

علاقوں کی حد بندی ایک ایسا کمیشن کرے جس کو کانگریس اور مسلم لیگ پسند کریں۔ حد بندی کئے جانے والے علاقوں کے باشندوں کی خواہشات کا پتہ ان کی بالغ آبادی کی رائے شماری کے ذریعہ یا اسی کے مساوی کسی اور ذریعہ سے کیا جائے۔

شمال مغرب میں سندھ بلوچستان. سرحدی صوبہ اور پنجاب کو شامل کرتا ہوگا اور شمال مشرق میں صوبہ بنگال کو اور صوبہ آسام کے ایک حصہ کو۔ لاہور کی قرارداد میں حد بندی کرتے وقت تھوڑی سی علاقہ وار ترمیم وتنسیخ کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ لیکن وسیع نقطہ نگاہ سے یہ تقسیم ہے جس کا مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ ہے اور یہ علاقے ہیں جن پر شمال مغربی اور شمال مشرقی پاکستان مشتمل ہوگا۔

جناح صاحب نے گاندھی جی کی آخری تجویز پر جو اعتراض کئے ان میں نہایت پرمعنی اعتراض یہ تھا کہ گاندھی جی پاکستان کو صرف ان مسلم اضلاع تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی قطعی اکثریت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناح صاحب کو یہ بات منظور نہیں ہے بلکہ وہ پاکستان میں بعض ان اضلاع کو بھی شامل کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جہاں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت نہیں ہے لیکن جو اس وقت پنجاب اور بنگال کے موجودہ برطانوی صوبوں میں شامل ہیں کیونکہ ان کا شمول وہ پاکستان کی زندگی کو مکمل کرنے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی حد بندی کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "اگر آپ کی تجویز کو منظور کر لیا جائے اور اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ان صوبوں کی موجودہ حدود ناقابل علاج حد تک مجروح

(بقیہ نوٹ صفحہ) "اگر رائے علیحدگی کی موافقت میں ہو تو اس بات پر اتفاق کیا جائے کہ یہ علاقے ہندوستان کے غیر ملکی تسلط سے آزاد ہونے کے بعد جس قدر جلد سے جلد ممکن ہو سکے گا ایک علیحدہ ریاست بن جائیں گے اور وہ مختار مطلق آزاد ریاستوں کی صورت اختیار کرلیں گے

"علیحدگی کے وقت ایک معاہدہ کیا جائے گا جس میں معاملات خارجہ، مدافعت، داخلی نقل وحمل اور خبر رسانی، کروڑگیری، تجارت اور اس قسم کے دوسری چیزوں کے معقول اور اطمینان بخش انتظام کو ملحوظ رکھا جائے گا کیونکہ یہ ایسے معاملات ہیں جن میں لازمی طور پر شریک معاہدہ فریقوں کے مشترکہ مفاد علیحدگی کے بعد بھی جاری رہیں گے

"اس معاہدہ میں ایسی شرائط بھی ہوں گی جن کے ذریعہ دونوں ریاستوں کی اقلیتوں کے تحفظ کو بھی ملحوظ رکھا جائے گا۔

جب کانگریس اور لیگ اس سمجھوتہ کو قبول کرلیں گی تو اس کے فوراً بعد یہ دونوں ہندوستان کی آزادی کے

اور مسخ ہو جائیں گی اور پاکستان کے پاس دانہ کی جگہ بھوسہ رہ جائے گا۔ یہ چیز لاہور کی قرارداد کے خلاف ہے۔ نیز آپ کی تجویز کی رو سے ان مسخ شدہ علاقوں میں بھی خود ارادیت کا حق صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہوگا بلکہ ان نئے حد بندہ علاقوں کے سارے باشندے اس میں شریک ہو سکیں گے۔ یہ چیز بھی لاہور کی قرارداد کے منافی ہے۔

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب پاکستان میں پنجاب اور بنگال کے موجودہ صوبوں کے بعض ان اضلاع کو بھی شامل رکھنا کیوں ضروری سمجھتے ہیں جن میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت نہیں، جبکہ جن میں قطعی اکثریت غیر مسلموں کی ہے۔ اس سوال کا جواب جناح صاحب کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ان صوبوں کی موجودہ حدود ناقابل علاج حد تک مجروح اور مسخ ہو جائیں گی اور پاکستان میں دانے کی جگہ بھوسہ رہ جائے گا۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ اضلاع معاشی حیثیت سے اہم ہیں اور ان کا پاکستان میں شامل رکھنا پاکستان کی مالی اور معاشی تکمیل اور استحکام کے لئے ضروری ہے۔

اس دلیل سے بحث کے اندر ایک نئے اور نہایت اہم عنصر کا اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ عنصر ایسا ہے جس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کی معلومات اور واقفیت بہت کم ہے۔ یہ عنصر ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرا کر پاکستان کا جہاز ریزہ ریزہ اور غرق ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ پاکستان کے مالی اور معاشی پہلو کے بارے میں نہایت مکمل اور مفصل تحقیق کرائی جائے۔ ورنہ اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر کوئی سمجھوتہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے پاکستان کا قبول کرنا "دانہ کی جگہ بھوسہ" کے قبول کرنے کے مرادف ثابت ہوگا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مسلم لیگ نے اس قسم کی کوئی باقاعدہ اور اطمینان بخش تحقیقات کرائی ہے یا نہیں اور مسلم لیگ کی طرف سے جو منصوبہ ساز کمیٹی بنائی گئی ہے اس کے حدود مطالعہ میں یہ چیز بھی شامل ہے یا نہیں۔ اخبارات میں اس کی حالیہ تحقیقات کے بارے میں جو اطلاعات شائع ہوئی ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منصوبہ ساز کمیٹی موجودہ غیر

(بقیہ نوٹ صفحہ   ) نئے مشترکہ طریق عمل کے بارے میں فیصلہ کریں گی۔
لیکن لیگ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو اس براہ راست اقدام سے علیحدہ رکھے جس کو کانگریس تو شروع کرے لیکن جس میں لیگ شریک نہ ہونا چاہے۔"

متحدہ ہندوستان کے لئے عام طور پر اور ان صوبوں کے لئے جو آئندہ پاکستان میں شامل ہونے والے ہیں خاص طور پر ایک معاشی منصوبہ تیار کرے گی لیکن یہ بات کہ پاکستان کو آزاد اور خود مختار رکھ کر اس کی کوئی ایسی حد بندی بھی تجویز کرے گی جو اس کی مالی اور معاشی آزادی اور استحکام کے لئے ضروری ہے کسی اطلاع سے ثابت نہیں ہوتی۔ بہرحال اگر مسلم لیگ کی طرف سے اس قسم کی تحقیقات کرائی جا چکی ہے اور وہ اطمینان بخش ثابت ہو چکی ہے تو اس کے نتائج کو پبلک کے سامنے بہت جلد اور بہت وسیع پیمانے پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ لیگ کے مطالبہ کا قابلِ عمل ہونا بھی لوگوں پر اچھی طرح واضح ہو سکے۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

(م۔ ع)

جامعہ

زیرادارت: پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴ نمبر ۳ | بابتہ ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۷ء | سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

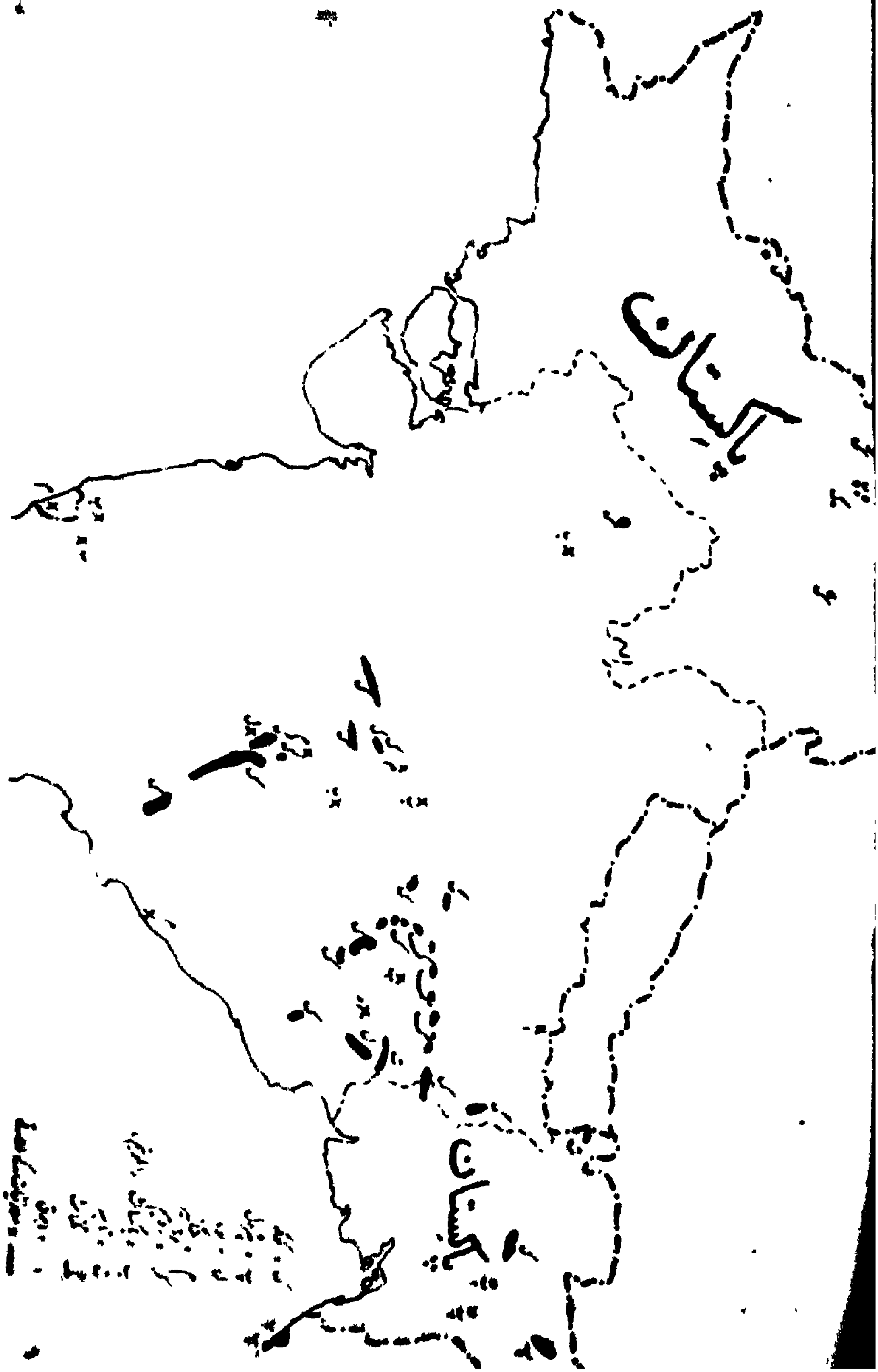
فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن، محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پاکستان اور ہندوستان کے معدنی وسائل و دولت

ذیل میں ہم کولمبیا یونیورسٹی کے ماہر ارضیات، پروفیسر چارلس ایچ بہرے کی ایک رپورٹ کے اقتباسات کو ترجمہ کرکے پیش کر رہے ہیں۔ یہ رپورٹ امریکہ کے مشہور سہ ماہی رسالہ "فارین افیرس" کے اکتوبر ۱۹۴۷ء کے پرچے میں شائع ہوئی تھی اس میں جو واقعات اور خیالات ہیں وہ نہایت عالمانہ، منصفانہ اور ہمدردانہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ بظاہر پروفیسر بہرے کو ہندوؤں کی طرف داری کرنے کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ مشورہ دیا ہے وہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور اس بنا پر ہمارے انتہائی غور اور توجہ کا مستحق ہے۔ پاکستان کا معاملہ ہندوؤں سے طے کرتے وقت ہمیں اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو جذبات سے خالی ہوکر سوچ سمجھ لینا چاہئے اور ضروری ماہرانہ مشوروں کو بھی حاصل کرلینا چاہئے۔ تاکہ بعد میں ہمیں پچھتانا اور تکلیف نہ اٹھانا پڑے ہم ملک کے صاحب فکر و بصیرت اصحاب کو عام دعوت دیتے ہیں کہ وہ جامعہ کے صفحات کے ذریعے اس مسئلے پر اپنے گراں بہا خیالات پیش فرمائیں۔ (مدیر)

برمائے سلطنت ہند سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود بھی اس ملک کا درجہ، دنیا کی تجارت میں مندرجہ ذیل معدنی اشیاء کے فراہم کرنے والے ملک کی حیثیت سے یا تو فی الحال اہم ہے یا اس کے اہم ہو جانے کی امید ہے: کوئلہ اور پیٹرول، لوہا، مینگنیز، اور کرومیم کی کچ دھاتیں، سونا، باکسائیٹ، میگنیسائیٹ، ابرک، جپسم، مختلف بیش قیمت پتھر، مونازائیٹ اور بعض دیر میں پگھلنے والی چیزیں۔ ان کے خاص ذخیرے یا کانیں سلطنت ہند میں کس کس جگہ ہیں ان کو ساتھ کے نقشے میں مناسب


پاکستان
پاکستان

نشانوں کے ذریعے سے دکھلایا گیا ہے۔

موجودہ زمانے میں صنعتی طاقت کا دارومدار، کوئلے، لوہے اور معدنی تیل کی تثلیث پر ہے۔ ہمارے موجودہ فولادی دور میں۔ کوئلہ اور لوہا مل کر صنعتی نظام کی بنیاد کا کام انجام دیتے ہیں مشین کی ترقی کے لئے ان کی اہمیت ویسی ہی ہے جیسی کہ انسانی جسم کی نشو و نما کے لئے ہائیڈروجن اور آکسیجن کی ہوتی ہے۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ پایا جانا ضروری ہے۔ معدنی تیل بھی اگرچہ بہت بیش قیمت چیز ہے لیکن یہ اتنا لازمی اور ناگزیر نہیں ہے اس زمانے میں اگر کسی ملک کے پاس کوئلے کے ذخیرے بافراط موجود ہوں اور معدنی اشیاء کا مبادلہ آزادانہ طریقے پر ہو سکتا ہو تو وہ معدنی تیل کے ذخیروں کے بغیر بھی اپنا کام چلا سکتی ہے۔ جب اس کے پاس معدنی تیل نہیں ہوگا تو وہ اپنے کوئلے کو مایع ایندھن کی شکل میں تبدیل کرے گی جیسا کہ جرمنی آج کر رہا ہے۔ فولاد کے تیار کرنے میں معدنی تیل کی براہ راست کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ فولاد کی صنعت میں اسے کوئلے کی جگہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا کوئلے کا موجود ہونا لازمی ہے۔

مجموعی قدر و قیمت اور تقسیم دونوں اعتبار سے سلطنت ہند کی معدنی صنعتی پیداوار میں انفرادی طور پر کوئلہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی قسموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق پایا جاتا ہے اور گلنائیٹ سے کر مقامی انتھراسائیٹ تک ہر قسم کا کوئلہ ملتا ہے اور یہ ہر حالت میں دستیاب ہوتا ہے لیکن بہترین اور مقدار کے لحاظ سے کثیر ترین یعنی ۹۸ فی صدی سے زیادہ وہ کوئلہ ہے جو متوسط درجے کی قدیم (یعنی پرمین عہد کی) چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور اس طرح کی چٹانیں خاص طور پر صوبہ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں ملتی ہیں۔

عام طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ بہتر قسم کے کوئلے کے یہ علاقے ایک کمان کی صورت میں منحنی ہیں اس جگہ سے شروع ہوتے ہیں جہاں دریائے گنگا صوبہ بہار کی حدود کو پار کر کے صوبہ بنگال میں داخل ہوتا ہے اور جہاں اس دریا کے اندر ایک بڑا سا خم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ علاقے کسی قدر جنوب میں جھکتے ہوئے صوبہ جات متوسط کے مغرب تک چلے گئے ہیں اور پھر یکبارگی

جنوب مشرق کی طرف سے گھوم کر احاطہ مدراس میں دریائے گوداوری کے دہانے کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ ناظرین کو چاہیے کہ اس موقع پر ساتھ کے نقشے کو دیکھیں اور بہار اور اڑیسہ کے مشرقی صوبوں کی طرف خاص طور پر توجہ کریں۔ یہ وہ صوبے ہیں جن میں ہندوؤں کی بہت غالب اکثریت ہے یعنی ۱۹۴۱ء میں تین کروڑ دس لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں اس علاقے میں صرف ۴۴ لاکھ مسلمان بسے چلتے تھے۔ مذہبی بنیاد پر سلطنت ہند کی جو بھی تقسیم ہوگی اس میں یہ دونوں صوبے ضرور ہندوستان میں شامل کیے جائیں گے۔ لیکن چونکہ سلطنت ہند کی بیش ترین معدنی دولت کا خزانہ یہاں جمع ہے اور اس میں ملک کے اعلیٰ ترین کوئلے کے ذخیرے بھی شامل ہیں۔ اس لیے صنعتی ترقی کے نقطۂ نگاہ سے انھیں اس ملک کے اہم ترین حصے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بات لائق توجہ ہے کہ یہ دونوں بنگال کی پاکستانی مملکت کے قریب واقع ہیں اور بہار کا صوبہ بنگال اور شمال مغرب کی پانچ مسلمان پاکستانی مملکتوں کے درمیان براہ راست حائل ہے۔ ایک ماہر ارضیات اس بات کو بھی لائق توجہ سمجھے گا کہ بنگال اور بہار کی ارضیاتی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں جس قسم کی چٹانیں ایک صوبے میں ملتی ہیں زیادہ تر ویسی ہی دوسرے صوبے میں بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ بنگال کے کوئلے کے علاقے دراصل بہار اور اڑیسہ کے سلسلے ہی کی ایک کڑی ہیں۔

وسط ہند میں کئی کوئلے کے علاقے پائے جاتے ہیں جن میں جھریا کا کوئلہ کا علاقہ، وسعت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے۔ اس علاقے کے محفوظ ذخیروں کے تخمینوں میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک طرف اگر ان کا اندازہ تین کروڑ ٹن کیا گیا ہے تو دوسری طرف دس کروڑ ٹن کیا گیا ہے۔ بہر حال انھیں مستقبل میں وسط ہند کے اندر غالباً سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہے گی۔ صوبہ جات متوسط میں وردھا کی وادی کا کوئلہ کا علاقہ سب سے زیادہ وسیع ہے اس میں ڈیڑھ ارب ٹن کوئلہ موجود ہے۔ بلوچستان میں بھی کوئلے کے ایسے علاقوں کو جو دوسرے علاقوں سے الگ تھلگ ہیں ترقی دی گئی ہے۔

لیکن کوئلے کے سب سے زیادہ بڑے علاقے جن میں عام کاموں اور مختلف استعمالوں کے

لئے خصوصاً کوک بنانے کے لئے موزوں ترین کوئلہ دستیاب ہوتا ہے اور جو ساتھ ہی ساتھ ریل اور سمندر سے بھی بہت قریب ہیں۔ بہار اور اڑیسہ اور اسی سلسلے کی شمال مشرقی کڑی یعنی بنگال کے کوئلے کے علاقے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۲ء کے درمیان جو تجربے کئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں مجموعی طور پر دس ارب پندرہ کروڑ ٹن اچھے قسم کا کوئلہ موجود ہے۔ یہ ذخیرے زیادہ تر حسب ذیل مقامات پر مجتمع ہیں۔ کرن پورہ کے کوئلے کے علاقے (بہار) اور بکارو کا علاقہ۔[1] (بہار)۔ اس سے اور زیادہ جنوب مغرب میں دریائے گوداوری کی وادی کے علاقے ہیں۔ ان کا سلسلہ حیدرآباد اور مدراس بلکہ تقریباً سمندر کے قریب کوکاناڈا تک چلا جاتا ہے۔ ان میں تقریباً چھ ارب چالیس کروڑ[2] اعلیٰ قسم کا کوئلہ موجود ہے۔ صرف ان دونوں خطوں کے محفوظ ذخیرے آسانی کے ساتھ چار سو سال تک چل سکتے ہیں

غرض سلطنت ہند کے اعلیٰ کوئلے کے ذخیروں کا نمبر صرف مندرجہ ذیل ملکوں کے بعد آتا ہے:
چین۔ سوویٹ روس، پولینڈ، جرمنی، انگلستان، کناڈا، ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ لیکن پھر بھی یہ صورت مجموعی یہ تھوڑے سے رقبے کے اندر محدود ہیں اور یہ محدود تقسیم سلطنت ہند کی ایسی صنعتی ترقی کی راہ میں جو ملک کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہو ایک زبردست رکاوٹ ہے ان واقعات کی روشنی میں سلطنت ہند کے مستقبل کے بارے میں معقول حد تک پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ اس کے صنعتی مرکز کس جگہ واقع ہوں گے۔

معاشیات کا ماہر یہ کہے گا کہ سلطنت ہند بہت خوش قسمت ہے کہ اس کے کوئلے کے ذخیرے اس کے لوہے کے بڑے ذخیروں کے بالکل قریب واقع ہیں۔ کیونکہ اس ملک کے لوہے کی پیداوار

---

[1] سی۔ ایس۔ فاکس "دی لوور گونڈوانہ کول فیلڈز آف انڈیا" جیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ میمائرس جلد ۵۹ ۱۹۳۲ء

[2] ڈی۔ بال او۔ کر۔ آر۔ سمپس۔ دی کول فیلڈز آف انڈیا: جیالوجیکل سروے آف انڈیا میمائرس جلد ۷۱ ۱۹۴۱ء

بھی یہاں کے کوئلے کی طرح زیادہ تر بہار اور اڑیسہ ہی کے ذخیروں سے حاصل کی جاتی ہے جن کا سلسلہ شمال میں پہنچ کر بنگال میں داخل ہوجاتا ہے۔ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۳۴ء تک بہار میں لوہے کی مجموعی پیداوار تقریباً دو کروڑ بیس لاکھ ٹن کچ دھات کے برابر ہوتی تھی جس کی قیمت موٹے طور پر ۲۴ لاکھ ۱۵ ہزار پونڈ ہوتی تھی[۵۱]۔ موجودہ جنگ کے شروع ہونے تک کے تازہ ترین اعداد کے دیکھنے سے اس کے بعد بھی مسلسل ترقی کا پتہ چلتا ہے[۵۲]۔ لوہے کی ایسی کچ دھاتیں جن میں لوہا ابتی پیداوار کی صورت میں دستیاب ہوتا ہے۔ جزیرہ نمائے ہند میں زیادہ وسیع طریقہ پر بکھری ہوئی ملتی ہیں اور یہ ایسی شکلوں میں ملتی ہیں جو مقدار میں ہر چند مختصر ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی قسم عموماً اوسط درجے سے بہتر درجے تک کی ہوتی ہے۔ اس نوع کے ذخیرے وسط ہند میں خصوصیت کے ساتھ دستیاب ہوتے ہیں مگر کچ دھاتوں میں سب سے اہم ایک حد تک اس لحاظ سے کہ یہ مسلسل ملتی ہے اور اس کا حاصل کرنا ممکن ہے وہ ہے جو کناڈا اور ریاستہائے متحدہ کی جھیل سپیریر کی لوہے کی کچ دھات سے مشابہ ہے اور جو سلطنت ہند میں مشرقی صوبوں خاص طور پر بہار اور اڑیسہ میں ملتی ہے۔ اور نسبتاً زیادہ مختصر مقدار میں لیکن پھر بھی اہم شکل میں بنگال میں اور مقامی طور پر سلطنت ہند کے دوسرے علاقوں میں بھی ملتی ہے۔

ان مختلف قسم کے لوہے کے محفوظ ذخیروں کا تخمینہ لگانا مشکل ہے۔ سب سے زیادہ توجہ بہار اور اڑیسہ کی کچ دھاتوں کی طرف کی گئی ہے اور ان تخمینوں کے ذریعے ایسی کانوں کی میزان جن سے کچ دھات کو نفع بخش طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں[۵۳]:—

---

۵۱ جے، سی براؤن "انڈیاز منرل ویلتھ" لندن آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۳۶ء ص ۱۰۶

۵۲ ایس جی، کون "آئرن اینڈ اسٹیل" منرل انڈسٹری ڈیورنگ ۱۹۳۹ء میں مرتبہ جی اے روش نیویارک: میک گرا ۱۹۴۰ء ص ۳۵۲

۵۳ ایچ، سی، جونس "دی آئرن اور ڈیپازٹس آف بہار اینڈ اڑیسہ" جیالوجیکل سروے آف انڈیا، میمائرز جلد ۶۳ حصہ دوم ۱۹۳۴ء ص ۲۲۹ تا ص ۲۵۵

ضلع سنگ بھوم (اڑیسہ) .... ایک ارب چار کروڑ ستر لاکھ ٹن

ریاست کیونجھار .... نو کروڑ ۰۰ لاکھ ٹن

ریاست بونائی .... چھ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن

ریاست مایربھنج .... ۱۰ لاکھ ٹن

میزان = دو ارب ۰۰ کروڑ دس لاکھ ٹن

زیادہ حال میں جو تخمینے کئے گئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعداد ایک حد تک بہت کم ہیں۔[1]

جو کچ دھاتیں اب کانوں سے نکالی جارہی ہیں ان کے اندر چونکہ پچاس فی صد لوہا نکلتا ہے اس لئے اس حساب سے دھات کی شکل میں لوہے کے محفوظ ذخیروں کا تخمینہ ایک ارب چالیس کروڑ ٹن کیا جاسکتا ہے یعنی یہ مقدار اتنی ہے کہ موجودہ شرح استعمال سے پانچ سو سال کے لئے کافی ہو۔ یہ درست ہے کہ اس موافق تخمینے میں لوہے کے استعمال میں جو نمایاں اضافہ ہو رہا ہے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس میں یہ کسر بھی ہے کہ آئندہ جو لوہے کی نئی کانوں کے دریافت ہونے کا امکان ہے اس کو بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آخر میں اس قدر اور کہہ دینا ضروری ہے کہ دنیا میں جس قدر لوہے کی کچ دھاتیں پائی جاتی ہیں ان میں سلطنت ہند کی کچ دھاتوں کا شمار نسبتاً اعلیٰ درجے میں کیا جاسکتا ہے۔

باوجود اس کے کہ سلطنت ہند نے لوہے اور فولاد کو ابھی حال ہی میں قابل لحاظ مقدار میں پیدا کرنا شروع کیا ہے لیکن پھر بھی اس نے موجودہ جنگ سے قبل انھیں برآمد کرنا شروع کردیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں نیم مصنوعہ لوہے (پگ آئرن) کا ۵۵ فی صد حصہ (۲۲ لاکھ ۱۰ ہزار ۱۰۰ ٹن) جاپان کو برآمد کیا جاتا تھا اور بقیہ دو لاکھ ۱۵ ہزار ۰۰ ٹن سلطنت متحدہ برطانیہ کو اور

---

[1] ایم۔ ایس کرشنان جن کا حوالہ ایچ۔ سی جونس نے مندرجہ بالا تصنیف میں دیا ہے۔

۰۰ ہزار ۳۰ ٹن ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو[1] ٹاٹا فولاد کا بیشتر حصہ بھی جاپان ہی کو برآمد کیا جاتا تھا سلطنت ہند باہر سے صرف خاص قسم کے نیم مصنوعہ لوہوں کو درآمد کرتی تھی اور بقیہ نیم مصنوعہ لوہے کے لئے وہ کسی غیر ملک کی محتاج نہیں رہی تھی۔ لیکن فولاد کے بعض مرکبات کو جن میں فیرو ایلائیز Ferro Alloys اور بہت سی قسموں کے خاص خاص شکلوں کے بنے ہوئے فولاد شامل ہیں اس کو باہر سے منگانا پڑتا تھا۔ واقعہ یہ ہے۔ فولاد کی سلاخیں اور فولاد کی چادریں اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے سامان جن کی فولاد کے بنانے میں ضرورت ہوتی ہے ابھی تک یہاں بہت محدود مقدار ہی میں تیار کئے جاتے ہیں۔

۱۹۴۳ء میں سلطنت ہند میں اس صنعت کے چار بڑے کارخانے تھے:

(۱) برن پور میں انڈین آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی جس میں دو پوری بھٹیاں ہیں جن میں سے ہر ایک کی سالانہ صلاحیت پیداوار ڈیڑھ لاکھ ٹن ہے۔

(۲) شموگا میں، میسور آئرن ورکس جس میں چند لکڑی کے کوئلے کی بھٹیاں ہیں۔

(۳) کلٹی میں بنگال آئرن کمپنی جس میں پانچ پوری بھٹیاں ہیں جن کی مجموعی سالانہ صلاحیت پیداوار ڈھائی لاکھ ٹن نیم مصنوعہ لوہا ہے۔

(۴) ٹاٹا آئرن کمپنی جس کے جمشید پور کے بڑے کارخانے میں نیم مصنوعہ لوہا تیار کرنے کی صلاحیت پانچ لاکھ دس ہزار ٹن سالانہ ہے اور جس کے اندر کہا جاتا ہے کہ ترقی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ جنگ نے اس صنعت کی ترقی کو تیز کر دیا ہے اور اگر اسے معقول سرپرستی ملتی رہی تو اُمید ہے کہ ہندوستان کی لوہے اور فولاد کی پیداوار اس کے زمانے کی ضرورتوں کے لئے بھی بڑھتی رہے گی یہاں تک کہ ملکی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے کافی ہو جائے گی۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ سلطنت ہند کے تمام ممتاز لوہے کے علاقے ہندوستان میں

---

[1] اے. ایم. ہیون: دی منرل پروڈکشن آف انڈیا اینڈ برما ڈیورنگ ۱۹۴۰ء " جیالوجیکل سروے آف انڈیا میموائرز جلد ۷۵ ۱۹۳۹ء حصہ سوم صفحہ ۴۷

واقع ہیں۔ پاکستان کے مغربی حصے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لوہے کے ذخیرے ہیں لیکن کوئی ایسا نہیں ہے جو ایک بڑے فولاد کے کارخانے کی ضرورت کے لئے کافی ہو۔ اس عام بیان سے اڑیسہ کی ان کچ دھاتوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے جو شمال اور مشرق کی طرف پھیلنے کے بعد بنگال کے اندر داخل ہو جاتی ہیں اور جن کی بنیاد پر بنگال آئرن کمپنی کو قائم کیا گیا ہے۔ اس کمپنی نے اپنا کام [illegible]ء میں شروع کیا ہے۔ لیکن بنگال کے یہ ذخیرے بھی اڑیسہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ نہیں ہیں۔

صنعتی طاقت کے تیسرے اہم جزو یعنی پٹرولیم کی رسد سلطنت ہند میں اتنی اچھی نہیں ہے گو یہ صحیح ہے کہ حال کے سالوں میں اس ملک کی پیداوار میں بہت ترقی ہوئی ہے اور اب پیداوار کی سالانہ مقدار ۲۰ کروڑ ۰۰ لاکھ گیلن غیر صاف شدہ پٹرول ہو گئی ہے۔ یہ اضافہ بہت معلوم ہوتا ہے لیکن مقامی ضروریات کے لئے ناکافی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنے گیلن اینڈھن کا تیل اور مٹی کا تیل ہندوستان کے چشموں سے نکالا جاتا ہے اتنے ہی گیلن باہر سے بھی منگایا جاتا ہے۔ اگر بڑے پیمانے کی صنعت کو ترقی دی گئی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے فاسد طریقوں کو مسلسل طور پر شدت کے ساتھ یہاں بھی اختیار کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ کم سے کم عارضی مدت کے لئے سلطنت ہند کی ضروریات کے لئے اس ملک کے پٹرولیم کی رسد کافی ہو جائے لیکن اس لحاظ سے سلطنت ہند کے مستقبل کو روشن نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی پٹرولیم کی مجموعی رسد کے مقابلے میں سلطنت ہند کی سالانہ پیداوار ایک فی صد حصے سے بھی کم ہے اور اس مختصر مقدار کا بھی بڑا حصہ برما سے حاصل کیا جاتا ہے۔

خاص سلطنت ہند کے تیل کے چشمے دو علاقوں میں واقع ہیں۔ اوّل آسام میں کچھ تیل کے علاقے ملے ہیں جو ایک چوڑی کمان کی صورت میں مشرقی بنگال تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہ برما کے نیانگ یت اور دوسرے تیل کے چشموں کے بالکل متوازی واقع ہیں۔ لیکن ابھی تک یہاں صرف تیل کے دو اہم علاقوں کا پتہ لگایا جا سکا ہے۔ ایک ڈگ بوئی میں ہے اور دوسرا بدر پور میں۔

ایک زمانے میں بدرپور کے علاقے میں تیل کی پیداوار بہت زیادہ تھی لیکن یہ برابر گھٹتی گئی [illegible]ء میں اس سے صرف ۰ لاکھ ۰۴ ہزار گیلن حاصل ہوا تھا اور [illegible]ء میں بظاہر کچھ بھی پیدا نہیں ہوا۔ ڈگ بوئی کے علاقے کی پیداوار [illegible]ء میں ۶ کروڑ ۷۰ لاکھ ۱۸ ہزار ۳۰۴ گیلن تھی اور آئندہ اس سے بھی زیادہ حاصل ہونے کی امید ہے۔ دوسرا اہم خطہ پنجاب کا ہے جہاں تین امید افزا تیل کے علاقے پائے جاتے ہیں یعنی کھور، ڈھولیاں اور جھرت۔ کھور کی پیداوار حال میں کم ہوگئی ہے۔ لیکن یہاں بہت سی جگہوں میں تیل والی ریت اور موافق ساخت دریافت کی گئی ہے اور نئے چشموں کے ملنے کی امید ہے۔ [illegible]ء کی رپورٹ میں جھرت کی پیداوار درج نہیں کی گئی تھی۔ [illegible]ء میں کھور اور ڈھولیاں کے علاقوں کی مجموعی پیداوار ۹۹ لاکھ ۳۶ ہزار ۲۲۰ گیلن بتلائی گئی تھی۔

یہ بات خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ اب تک جس قدر پٹرولیم کی موجودگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ سلطنت ہند کے مسلم حصے میں ہیں۔ ہندوستان کے اہم مرکزی حصے یعنی جزیرہ نما میں ارضیاتی ساخت اس نوعیت کی ہے جس میں پٹرولیم کے دریافت ہونے کا امکان نہیں پایا جاتا۔ دوسری اہم اور لائق توجہ بات یہ ہے کہ سلطنت ہند کے مشرقی ہمسایہ یعنی برما کے پاس پٹرولیم بافراط موجود ہے۔

صنعتی طاقت کے اہم عناصر ترکیبی میں مینگنیز اور کرومیم کا درجہ بھی بہت بلند ہے کیونکہ ان کی آمیزش ہی سے اعلیٰ معیار کا فولاد تیار کیا جا سکتا ہے۔ سلطنت ہند میں ایسے تہ نشین بکثرت موجود ہیں جن سے مینگنیز یعنی اس لائق آمیزش دھات کو جو فولاد کو سخت اور مضبوط بناتی ہے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حال کے سالوں میں سلطنت ہند کی پیداوار کا درجہ دنیا کے مینگنیز کے مرکزوں میں اول یا دوم رہا ہے۔ مثال کے طور پر [illegible]ء میں سلطنت ہند کی پیداوار کا نمبر سوویٹ روس کے بعد آتا تھا لیکن اپنے دوسرے حریف جنوبی افریقہ کے مقابلے میں اس کی پیداوار دگنی تھی۔ [illegible]ء میں جن ممتاز صوبوں سے اس حاصل کیا جاتا تھا وہ حسب

ذیل ہے:

صوبہ جات متوسط جہاں کل کچی دھات کا ۸ر۴۲ فی صد حاصل کیا جاتا تھا بمبئی ۹ر۵ فی صد، بہار اور اڑیسہ ۱ر۱۱ فی صد اور میسور ۵ر فی صد۔ لیکن یہ سب صوبے ہندوستان کا جز ہوں گے، پاکستان کا نہیں ہوں گے۔ مینگنیز کو جہازوں کے ذریعے برآمد کرنے کا کام بھی کلکتہ کے علاوہ سلطنت ہند کے ہندو علاقے کے ساحلی شہر انجام دیتے رہتے ہیں اور احاطہ مدراس میں وزاگاپٹم کی نئی بندرگاہ کی ترقی نے اس اہم کچے مال پر ہندوؤں کے قبضے کو اور زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔

مینگنیز کے بعد دوسرا آمیزہ جسے فولاد کے بنانے میں بہت اہمیت حاصل ہے کرومیم ہے۔ اس کا فائدہ زیادہ تر یہ ہے کہ یہ فولاد کی سختی اور مضبوطی میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن اگر اسے خاص تناسب کے ساتھ ملایا جائے تو یہ فولاد کے اندر زنگ کے مقابلہ کرنے کی بھی زیادہ اہمیت پیدا کر دیتا ہے۔ سلطنت ہند میں کروم کے علاقے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر بلوچستان، میسور، بہار اڑیسہ میں واقع ہیں۔ اس کے محفوظ ذخیروں کے بارے میں تخمینے موجود نہیں ہیں۔ لیکن تہ نشینوں کی نوعیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صوبوں میں جس نسبت سے اسے فی الحال حاصل کیا جا رہا ہے اسی نسبت سے اس کے محفوظ ذخیرے بھی منقسم ہیں۔ اس بنیاد پر انہیں پاکستان اور ہندوستان میں تقریباً برابر قرار دیا جا سکتا ہے[1]۔

قیمتی دھاتوں کا جہاں تک تعلق ہے ان میں سونے کی رسد سلطنتِ ہند میں اچھی خاصی ہے میسور میں کولار کا ضلع ہندو علاقہ میں واقع ہے اور اس کی کانوں میں ۲۲ ہزار مزدور

---

[1] مالیبڈینم جس کی اہمیت فولاد کے آمیزہ کی حیثیت سے روز بروز بڑھتی جا رہی ہے وسط ہند کے ہندو علاقوں میں کئی مقامات پر پایا جاتا ہے اور یہی بات فولاد کے دوسرے عام آمیزوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے

کام کرتے ہیں اور ۱۹۴۳ء میں ان کانوں کی پیداوار ۳ لاکھ ۳ ہزار ۱۰۰ ٹرائے اونس تھی حقیقت یہ ہے کہ اس ضلع کا شمار دنیا کے ممتاز ترین سونے کے علاقوں میں کیا جا سکتا ہے۔ احاطۂ مدراس کے ضلع اننت پور میں بھی سونے کے نسبتاً کم ذخیرے ملتے ہیں لیکن ان سے کام نہیں لیا جاتا ہے۔ برما کے ضلع باڈون میں چاندی کو دوسری بہت سی دھاتوں کے ساتھ کھودا جاتا ہے لیکن حال کے سالوں میں اصل سلطنت ہند سے چاندی کی قابلِ لحاظ پیداوار حاصل نہیں کی گئی ہے۔

غیر آہنی اولیٰ تر دھاتوں میں باکسائیٹ جس سے المونیم نکالا جاتا ہے سلطنت ہند میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے کچھ تو کشمیر کے پاکستانی علاقے میں ہے لیکن زیادہ تر ہندو علاقہ میں ہے یعنی صوبہ جات متوسط، بمبئی اور بہار میں[5] لیکن سلطنت ہند کی اس کچ دھات کی قسم کچھ زیادہ نفع بخش نہیں ہے اور دوسرے عوامل بھی اس صنعت کے موافق نہیں ہیں اس لئے باوجود اس کی وسیع تقسیم کے باکسائیٹ کی کان کنی اور المونیم کی صنعت کو سلطنت ہند کی صنعتی زندگی میں بصورت مجموعی زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ آئندہ کے بارے میں توقع یہ ہے کہ جس قدر ایلومنیم ہلکی دھات کی منڈی پر اپنا قبضہ قائم رکھ سکے گا۔ اسی قدر اس صنعت کی ترقی بھی آہستہ آہستہ ہوتی رہے گی۔ آج کل جو المونیم بنایا جاتا ہے وہ صرف مقامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے المونیم کے برتن بنانے کا کام مختلف کارخانوں میں متوسط پیمانہ پر ترقی کر رہا ہے۔ لیکن یہ کارخانے زیادہ تر ہندو علاقے میں ہیں پائے جاتے ہیں۔

تانبا سات ہزار ٹن سالانہ کی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔ قابل لحاظ کانیں صرف دو ہیں اور دونوں صوبے بہار کے ضلع سنگ بھوم میں موسابونی اور دھوبنی میں واقع ہیں

---

[5] سی، ایس، فاکس "دی باکسائیٹ اینڈ ایلومنیس لیٹرائٹ آکرنسز آف انڈیا" جیالوجیکل سروے آف انڈیا میموائرز جلد ۴۹ نمبر ۱۹۳۲ء حصہ اول صفحہ ۹۲ تا صفحہ ۱۸۴

سیسہ اور جست برما میں بافراط موجود ہیں لیکن اس سے ہندوستان اور پاکستان کے باہمی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی طرح سلطنت ہند کے دھات کے کارخانوں کے لئے ٹین اور نکل کا ماخذ بھی برما ہی ہے۔

ہر اس مملکت میں جہاں بڑے پیمانے کی صنعت کو فروغ دیا جانے والا ہو بعض ادھاتی معدنیات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے مشین کے استعمال اور تجدد پسندی کی ابتدائی منزلوں میں تو اُن کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی لیکن جوں جوں مصنوعات کا کام ترقی پاتا جاتا ہے اور خصوصاً ان کیمیاوی صنعتوں کو نشو و نما ملتی ہے جو گنجان آبادی اور متنوع پیشے رکھنے والے اکثر بڑے ملکوں میں پائی جاتی ہیں تو ان کی اہمیت تیزی کے ساتھ بڑھنے لگتی ہے۔ ان ادھاتی معدنیات میں خاص طور پر حسب ذیل چیزیں نمایاں نظر آتی ہیں:

نمک، چونا، گندھک، جپسم، چکنی مٹی اور میگنیسائیٹ، نیز فاسفیٹ اور پوٹیسیم حاصل کرنے کے ذرائع۔

گندھک کے علاوہ باقی ان سب چیزوں کے تہ نشیں سلطنت ہند میں دریافت کئے جا چکے ہیں اور انھیں کام میں بھی لایا جا رہا ہے۔ چونا دور دور تک پھیلا ہوا ہے اور پلاسٹر اور سمنٹ کے بنانے اور وزنی کیمیاوی صنعتوں میں اس سے اس حد تک کام لیا جا رہا ہے جس حد تک کہ نقل و حمل کی سہولتیں اور مقامی ضرورت اس کی اجازت دیتی ہے۔ ہمارا یہ مفروضہ بے جا نہ ہوگا کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کو معمولی کاموں کے لئے اپنے حدود کے اندر کافی چونا دستیاب ہو سکے گا۔ یہی بات جپسم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ نمک پنجاب اور شمالی مغربی سرحدی صوبے میں جو دونوں پاکستان میں ہیں، پتھریلی چٹانوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن سلطنت ہند کا ۵۰ فی صد نمک سمندر کے پانی کو خصوصاً بمبئی اور مدراس میں اور جھیل کے پانی کو زیادہ تر راجپوتانے میں سکھا کر حاصل کیا جاتا ہے اور یہ سب کام ہندوستان میں ہوتا ہے۔ بہرحال اس اہم کیمیاوی مادے کے محفوظ ذخیرے باوجود اس زائد طلب کے

جو بڑی کیمیادی صنعتوں کی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوگی پاکستان میں بھی بہت کافی سمجھے جا سکتے ہیں۔ برتن بنانے کی چکنی مٹی، چینی مٹی اور آگ میں نہ پگھلنے والی مٹی بھی سلطنت ہند میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اگرچہ ان کے محفوظ ذخیروں کے تخمینے موجود نہیں ہیں لیکن یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں اس لحاظ سے خود مختار حیثیت کے مالک ہیں۔ آگ میں نہ پگھلنے والی مٹی کے بہترین ذخیرے مشرق کے کوئلے کے علاقوں میں ہیں جو مجوزہ مشرقی پاکستان اور ہندوستان کی حدود سے باہر پھیلے ہوئے ہیں۔ جپسم جس کو بعض سمنٹ کی قسموں میں ریگسل (یعنی دیر میں پگھلنے والے) جز کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے اور جس سے گندھک کے تیزاب بنانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے مدراس میں بڑی مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ میسور میں اس کے ذخیرے نسبتاً کم ہیں لیکن ان کی پیداوار اچھی ہے۔ سلطنت ہند کا ابرک اور کالی نائٹ بھی وسیع پیمانے پر زیادہ تر ہندوستان ہی سے برآمد کیا جاتا ہے۔

فاسفیٹ بلاشبہ نہ صرف صنعت کے لئے مفید ہیں بلکہ زراعت کے لئے بھی ناگزیر ہیں۔ یہ بات سلطنت ہند جیسے پرانے ملکوں پر خاص طور پر منطبق ہوتی ہے جہاں بہت بہت صدیوں سے کاشت کا کام نہایت غیر سائنٹفک طریقے پر کیا جا رہا ہے اور جہاں اس بنا پر زمین کی زرخیزی یا تو ختم ہو گئی ہے یا ختم ہونے کے قریب ہے۔ تمام سلطنت ہند کی زمینوں میں (جس میں ہندوستان اور پاکستان یکساں طور پر شامل ہیں) فاسفیٹ کے ذرائع کی افسوس ناک حد تک کمی پائی جاتی ہے۔ کھادوں کی ایک بڑی مقدار کو ہر سال باہر کے ملکوں سے درآمد کیا جاتا ہے اور ان میں ایک تہائی کھاد ایسے ہوتے ہیں جن کا مقصد مسلسل محروم شدہ زمین کو فاسفیٹ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ فاسفیٹ کے حاصل کرنے کا ایک ادنیٰ تر ذریعہ بہار اور اڑیسہ کے دور وسیع طور پر منتشر علاقوں میں دستیاب ہوتا ہے جہاں اس سے فائدہ اٹھانے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک دوسرا ذریعہ

جن سے ابھی تک کام نہیں لیا گیا ہے۔ پنجاب کے کوئلہ رکھنے والے سلیٹی پتھر اور جنوبی سندھ کی مختلف چٹانیں ہیں۔ لیکن اس معدنی پیداوار کے خاص ذرائع بھی چاہے اُسے طبعی حالت میں حاصل کیا جائے چاہے مصنوعی طریقے پر زیادہ تر ہندوستان ہی میں ملتے ہیں۔ پوٹیشیم کے ذرائع جو ایسی زمین کے لئے جس پر کاشت کا سلسلہ ایک عرصے سے اور عمیق طریقے پر جاری رہا ہو پاکستان اور ہندوستان دونوں جگہ یکساں طور پر دستیاب ہوتے ہیں۔

(۲)

سلطنت ہند کے معدنی وسائل کے مندرجہ بالا جائزہ سے باوجودیکہ یہ مختصر ہے پہلا ظاہری نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ سلطنتِ ہند میں معدنی تیل کی رسد کافی مقدار میں موجود نہیں ہے لیکن اہم ترین صنعتی معدنیات مثلاً کوئلہ، لوہا کئی ایک ایسے آہنی آمیزے جو اچھے فولاد کے بنانے میں کام آتے ہیں اور ضمنی معدنیات کے بڑے ذخیرے موجود ہیں اور یہ اتنی کافی مقدار میں ہیں کہ وہ اس ملک کو ایک طاقت ور اور کافی بالذات صنعتی قوم بنا سکتے ہیں۔ اکثر دوسری بڑی صنعتی اقوام کے مقابلے میں ان کی رسد فی کس کم ہے۔ لیکن لازمی معدنیات کے محفوظ ذخیروں کو خطرے میں ڈالے بغیر ان کے استعمال فی کس کو مستقبل قریب میں خاصی معقول حد تک ترقی دی جا سکتی ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنتِ ہند کے یہ معدنیات اس ملک کے اُن مختلف علاقوں میں جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے کچھ اس طریقے پر منقسم ہیں کہ اگر سلطنت ہند کو مذہبی آبادی کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تو ہندو مملکت دولت مند اور مسلم مملکت نمایاں طور پر مفلس ہو جائے گی۔ یہ عدم توازن اتنا زیادہ ہے کہ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے دونوں علاقوں کی آبادی کی گنجائی میں جو اختلاف ہے وہ بھی بصورت مجموعی کچھ زیادہ کارگر ثابت نہ ہو سکے گا۔ پھر اس پہلو طر

کا لحاظ کرتے ہوئے جو اس وقت حاصل کی جارہی ہے ہندو علاقے کی نسبتاً زاید معدنی دولت صرف موجودہ زمانے ہی کے لئے زیادہ نہیں ہے بلکہ جیسے جیسے سلطنتِ ہند میں صنعتی ترقی زیادہ ہو گی یہ فرق بلا شبہ اور بھی زیادہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ سلطنتِ ہند کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اس سوال کا جواب در اصل ان ہی بنیادی واقعات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

سلطنتِ ہند میں کوئلہ اور لوہے کے بڑے محفوظ ذخیرے موجود ہیں۔ اس کے پاس آہن آمیز دھاتوں کے اچھے ذخیرے ہیں (اگرچہ ایک حد تک یہ نامکمل ہیں اور کچھ دوسرے آمیزوں کو کو باہر سے درآمد کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے) اسی طرح ادھاتی معدنیات اور سونے کے بھی اچھے ذخیرے ہیں۔ سوائے میگنیسیٹ کے اور باقی تمام دوسری ضمنی معدنیات کے بھی اس کے پاس کافی ذخیرے ہیں اور معدنی تیل بھی ہے یہ سب باتیں سلطنتِ ہند کی صنعتی ترقی کے لئے سازگار ہیں۔ لیکن ایک عام بیان کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلطنتِ ہند کے تقسیم ہو جانے کے بعد کوئلے کا ۹۰ فی صد اور لوہے کا ۹۲ فی صد حصہ ہندوستان میں پہنچ جائے گا اور بقیہ پاکستان میں رہے گا اور پاکستان کا یہ بقیہ لوہا اور کوئلہ بھی گھٹیا قسم کا ہوگا ان تمام آہنی آمیزوں اور ضمنی معدنیات کی جو ایک کافی بالذات صنعتی علاقہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے درکار ہیں۔ ہندوستان میں بیشتر تعداد موجود رہے گی اور پاکستان میں بھی ان میں سے کچھ موجود ملیں گے۔ متوسط درجے کی صنعتی ترقی اور ایک خاصے بلند معیارِ زندگی کے حاصل کرنے کے لئے جس قدر معدنی تیل کی ضرورت، داخلی احتراق کے انجنوں کو چلانے کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سلطنتِ ہند کے پاس تیل کے ذخیرے کم ہوں گے اور جتنے ہوں گے ان کا بیشتر حصہ پاکستان میں مل سکے گا۔

ان واقعات کی بنیاد پر ہمارا دوسرا نتیجہ مختصراً یہ ہے کہ سلطنتِ ہند کے ہندو اور مسلم علاقے ایک دوسرے کے محتاج اور پابند ہیں نہ صرف ہندوستان کو تقسیم کے بعد پاکستان کی

بعض چیزوں کی ضرورت باقی رہے گی بلکہ پاکستان کو بھی اپنی صنعتی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستان کے وسائل کی نہایت بُری طرح ضرورت لاحق رہے گی۔

اگر تقسیم کے بعد ان دونوں تقسیم شدہ علاقوں نے آزاد تجارت کو بند کر دیا تو بنگال کی پاکستانی مملکت صنعتی حیثیت سے بالکل فنا ہو جائے گی اور یہ صورت حال ایسی ہو گی جو لوگوں کو زور اور زبردستی سے کام لینے کی طرف مائل کرے گی۔ مسلم مملکت جب اپنی ترقی کا راستہ مسدود پائے گی تو اس کے باشندے جو اپنے مالدار پڑوسیوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ جنگجو ہیں حملہ اور پیش دستی کریں گے۔ بنگال سے ملی ہوئی آسام کی مسلم مملکت کی معاشی حالت بھی ناموافق ہو گی اس کے پاس کوئی اہم معدنی وسائل نہیں ہیں اس لئے تقسیم شدہ سلطنت ہند میں اس کی حالت بنگال سے بھی زیادہ ناگفتہ بہ ہو جائے گی۔ چاہے تقسیم ہو یا نہ ہو، پنجاب کشمیر اور مغرب کی دوسری مسلم مملکتوں کی معیشت میں کسی طرح کی تبدیلی نہ ہو سکے گی۔ یہ جیسی آج گلہ بانی اور زراعت کا کام کر رہی ہیں ایسی ہی آئندہ بھی کرتی رہیں گی اور ہندوستان کے باجگذار علاقے کی حیثیت سے زندگی گذارتی رہیں گی۔ اگر ہندوستان کو خالص مذہبی بنیاد پر تقسیم کیا گیا تو نام پاکستان اسی باجگذارانہ حیثیت پر قناعت کرنے کے لئے مجبور ہو گا۔

اس سوال کا —————— کہ آیا مسٹر جناح ان حقائق کو تسلیم کریں گے یا ان پر غور و خوض کرنا ملتوی کئے رہیں گے کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جو بیان حال میں، ہربرٹ ایل میتھیو کو انھوں نے دیا ہے اور جو نیویارک ٹائمس میں ۱۲ ستمبر ۱۹۴۶ء میں چھپا ہے اس میں انھوں نے اشارۃً کہا تھا کہ افغانستان ایک غریب ملک ہے لیکن وہ اپنا کام چلا رہا ہے۔ اسی طرح عراق بھی اپنا کام چلا لیتا ہے جس کی آبادی ہماری سات کروڑ آبادی کے مقابلے میں نہایت ہی مختصر ہے اگر ہم آزادی کی خاطر کفایت شعاری اور غریبی کی زندگی گذارنے کے لئے تیار ہیں تو ہندوؤں کو اس پر کیوں اعتراض ہے؟ ہماری معاشی حالت وقت گزرنے پر خود ہی سنبھل جائے

گی ....

دوسرے مقامات کی طرح، بڑے پیمانے کی صنعتی ترقی کا دباؤ سلطنت ہند میں بھی اتحاد کا طلبگار رہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا سلطنت ہند بڑے پیمانے کی صنعتی ترقی پا سکتی ہے!

سلطنتِ ہند کے صنعتی مستقبل سے دلچسپی مسٹر گاندھی کو مسٹر جناح سے بھی کم ہے۔ ہماری اس رپورٹ میں مسٹر گاندھی کے نقطۂ نگاہ کے تجزیے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن ہم ابھی تک یہ یقین نہیں کر سکے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے اپنے دستی کتائی کے پروگرام کو ایک مبنی بر واقعیت معاشی پالیسی کے طور پر پیش کیا ہے یا اُسے اُنھوں نے ایک علامت کے طور پر پیش کیا ہے جس سے سلطنت ہند کی موجودہ بنیادی ضرورتوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے یعنی اس کی اس ضرورت کا کہ اس کی معیشت کو کافی بالذات ہونا چاہیے اس کی اس ضرورت کا کہ اُسے دیہات کی مختصر جماعت کی ترقی اور بہبود کی طرف سے غفلت نہیں کرنا چاہیے۔

سلطنت ہند کے دیہات کی ان چیزوں میں جنھیں ایک شخص چاہے اس کا نقطۂ نگاہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مشکل سے نظر انداز کر سکتا ہے وہاں کا افلاس ہے۔ اس بات پر بڑی حد تک ایک عام اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسئلے کا کوئی ایسا حل کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو اس مایوس کن افلاس کو کم کرنے کی اُمید نہ دلا سکے جس میں ہندوستان کے کروڑوں آدمی مبتلا ہیں۔ اس افلاس کو کم کرنے کی ایک امکانی صورت یقیناً یہ ہے کہ استعمال کی چیزوں کو بڑے پیمانے پر تیار کیا جائے تاکہ ان کی قیمت کم ہو اور لوگوں کی قوت خرید میں اضافہ ہو۔ بڑے پیمانے کی صنعت کو اگر افلاس کا تیر بہدف علاج نہ بھی سمجھا جائے تو بھی کم سے کم اُسے اس کے علاج کا ایک ایسا ذریعہ تو سمجھا ہی جا سکتا ہے جس سے اگر اس کی پسندیدگی کو تسلیم کر لیا جائے کام لینا ممکن ہے۔

جنگ نے سلطنتِ ہند میں بڑے پیمانے کی صنعتوں کی ترقی کا بہت موقع فراہم کر دیا ہے صنعتی ترقی دنیا میں ابھی تک اپنی ابتدائی منزل میں ہے لیکن اس سرکش جن کا جتنا تجربہ آدمی کو ہوا ہے جس میں سے کچھ فیض بخش ہے اور کچھ ظالمانہ اس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ جن ایک

دفعہ قید سے رہا ہو جاتا ہے تو پھر اُسے دوبارہ بوتل میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ سلطنتِ ہند میں مشین کی ترقی کے لئے نہ صرف کوئلہ اور لوہا موجود ہے بلکہ اس کے پاس اس آخری وسیلۂ دولت کی بھی فراوانی ہے جس پر تمام مشینوں کا دارومدار ہے یعنی انسانی طاقت۔ پھر ہندوستان کی اس بے شمار انسانی طاقت کی ممتاز ترین خصوصیت مغرب کے لوگوں کی نگاہ میں یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کا خرچ فی کس (معیارِ زندگی) بہت کم ہے یا مختصراً یوں کہئے کہ اس ملک میں افلاس و محرومی بہت زیادہ ہے۔ جتنے قدرتی وسائل یہاں موجود ہیں، جتنی انسانی طاقت یہاں پائی جاتی ہے اور سلطنتِ ہند کے لوگوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی جتنی ضرورت ہے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں یہاں بڑے پیمانے کی صنعت کی ترقی ناگزیر سی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن اس بات کا تعین کہ سلطنتِ ہند میں بڑی صنعت کی ترقی نسبتاً آسانی کے ساتھ ہوگی یا مشکل کے ساتھ۔ اس کے اس فیصلے کے ذریعے ہوگا کہ اس کا سیاسی مستقبل کن شرائط کے ماتحت طے کیا جائے۔ جنوبی امریکہ کی "نئی" لیکن مالی حیثیت سے کمزور ریاستوں کے تجربے سے سلطنتِ ہند کے لوگوں کو سبق لینا چاہئے۔ ایسی "نئی" قوموں کو جب ان کے یہاں صنعتی ترقی کا عمل جاری ہوتا ہے اور انھیں سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اُسے نجی سرمایہ داروں سے حاصل کرنے کے لئے مجبور ہوتی ہیں، اس کی بہت گراں قیمت مراعات اور حقوق کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے۔ ایک متحدہ مملکتِ ہند کے لئے دوسری حکومتوں کی ہمدردی حاصل کرنے میں اور بین الاقوامی نظام کے ماتحت ان شرائط پر قرض لینے میں جن پر چین قرض مانگے گا، سہولت رہے گی لیکن ایک ایسی مملکتِ ہند اور اس سے بھی زیادہ ایسی ہندوستانی مملکتیں جو اپنی نئی حاصل کی ہوئی خود مختاری اور اقتدارِ شاہی سے یہ کام لیں گی کہ اپنے قومی حدود کے گرد محاصل درآمد کی ایک چہار دیواری کھڑی کریں گی۔ ان کو روپیہ قرض دینے میں سرمایہ دار زیادہ خطرہ محسوس کریں گے، اور اس پر ایک سٹہ باز کے برابر شرح منافع کے طلب گار ہوں گے۔

پھر اس مسئلے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جب ایک دفعہ بڑے پیمانے کی صنعت کو ترقی دینے کا کام، مملکت ہند بہ طور فیصلہ شدہ پالیسی کے اختیار کرے گی تو اس کے سامنے یہ مسئلہ ہوگا کہ اس پروگرام کو وہ کس طرح اپنے قابو میں رکھے کہ اس سے محض چند آدمیوں کو فائدہ پہنچنے کی جگہ کل قوم فائدہ اٹھا سکے۔ یہی وہ جانا پہچانا مسئلہ ہے جس نے مغربی قوموں کو ایک صدی سے پریشان کر رکھا ہے اور جو بلاشبہ ہندوستان کی موجودہ سیاست کا بھی ایک لازمی جزو بن چکا ہے۔ اگر مملکت ہند ٹکڑوں میں بٹ گئی تو اس ناگزیر مسئلے کا حل دگنا تکلیف دہ ہو جائے گا۔ متحدہ ہندوستان میں یہ مسئلہ ایک مہمیز کا کام دے گا اور ملک کو اس بات کے لئے اکسائے گا کہ وہ ایک بلند تر جماعتی نقطۂ نگاہ سے چیزوں کو دیکھے۔ اور یہی بات اس کے ملکی اور غیر ملکی بہی خواہ چاہتے ہیں۔

پھر اپنے کوئلہ، لوہے اور انسانی طاقت کے بل پر مملکت ہند کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ وہ چین کے ساتھ ایشیا کی رہنمائی کے کام میں شریک ہو سکے بلکہ ہو سکتا ہے کہ ایشیا کی صنعتی ترقی میں اس کا مرتبہ سب سے زیادہ نمایاں اور بلند ہو۔ خارجی تمام عامل اس کو متحد رہنے کے لئے اتنا ہی مجبور کر رہے ہیں جتنا کہ اس کے معاشی وسائل کی منطق اسے مجبور کر رہی ہے۔ ہند کی مشرقی سرحد پر بدھ مذہب کا ماننے والا برما کا ملک ہے جو ایک قوم بننے کا حوصلہ کر رہا ہے۔ برما سے مملکت ہند کو نکل، ٹین، ٹنگسٹن، سیسہ، جست اور غالباً پٹرولیم کے حاصل کرنے کی ضرورت رہے گی اور برما سے تعلقات قائم کرنے میں متحدہ مملکت ہند منقسم شدہ مملکت ہند کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوگی۔ جب چین وزنی دھات کی صنعتوں کو شمال مشرق کے کوئلے کے اشتراک سے ترقی دینا چاہے گا تو اپنے ساحلی علاقوں میں اس کے لئے ہندوستان کے لوہے کی کچی دھات جہازرانی کی راہ سے چین بھیجی جا سکے گی جو نقل و حمل کے لحاظ سے سب سے آسان اور لاگت کے لحاظ سے سب سے کم خرچ ثابت ہوگی۔ لیکن چین اور ہندوستان کے ان باہمی انحصار رکھنے والے وسائل کو ترقی دینے سے پہلے ان پابندیوں کو ختم کرنا ہوگا جنہیں برطانیہ

کی موجودہ شہنشاہیت پسند پالیسی نے عاید کر رکھا ہے۔

اس رپورٹ کا یہ کام نہیں ہے کہ سلطنت ہند اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان باہمی سمجھوتے میں جو تاخیر ہو رہی ہے اس کی ذمے داری کو متعین کرے نہ اس کا یہ منشا رہے کہ ہندوستان کی قوموں کے نزدیک مذہبی قدروں کی جو اہمیت ہے اس کو کم کر کے دکھلائے اس میں تو صرف اس بات پر غور و توجہ کی گئی ہے کہ معدنی وسائل کے نقطۂ نگاہ سے سلطنت ہند کے ہندو اور مسلم علاقے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت قریبی طور پر گتھے ہوئے ہیں۔ اور معاشی لحاظ سے ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ اس رپورٹ کا یہ پرزور دعویٰ ہے کہ جہاں معاشی باہمی انحصار اس قدر قریبی اور ناگزیر طور پر موجود ہو وہاں سیاسی باہمی انحصار ہی مسئلے کا عقلمندانہ حل ہو سکتا ہے۔ اس میں یہ بات بھی دکھلائی گئی ہے کہ اگر مذہبی بنیاد پر سلطنت ہند کی تقسیم کی گئی تو اس میں ہندو علاقوں کے مقابلے میں مسلمان علاقے زیادہ نقصان میں رہیں گے اور آخر میں اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ سلطنت ہند کی معیشت بصورت مجموعی ایشیا کے دوسرے حصوں کے ساتھ بھی باہمی انحصار کے رشتے میں منسلک ہے

چین کے رہنماؤں نے اس بات کو تسلیم کر کے تدبر اور سیاست دانی کا ثبوت دیا ہے کہ ان کے جنوب کے پڑوسی کا مضبوط و متحد رہنا ان کے فائدے کا موجب ہے۔ اسی بات کو سلطنت ہند کے اندر، ہندوؤں اور مسلمان دونوں کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ اسی میں دراصل دونوں کا فائدہ ہے۔

امام عبید اللہ ابن الاسلام سندھی

ذیل کا مقالہ علامہ موسیٰ جار اللہ صاحب نے شیخ الجامعہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمت میں اشاعت کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہم اس کے ساتھ علامہ موصوف کا وہ خط بھی شائع کر رہے ہیں جو صاحب موصوف نے عربی زبان میں ڈاکٹر صاحب کو لکھا تھا۔

(مدیر)

بسم اللہ

شیخ الجامعۃ الملیۃ الاسلامیۃ الاستاذ الکریم الدکتور الحکیم مولانا ذاکر حسین صاحب، السلام علیکم وعلی السادۃ الکرام اساتذۃ الجامعۃ وعلی کل التلامذۃ سلام دعاء وتحیۃ واحترام

متع اللہ بحیاتکم وبرکاتکم وبکل مساعیکم الاسلام واہلہ۔

أرسل الیکم ہذہ الاوراق الستۃ التی کتبتہا بالعربیۃ فی شأن الامام عبید اللہ بن الاسلام السندی وترجمتہا الی اللغۃ الہندیۃ مدرس یتقن اللغۃ العربیۃ ۔ واظن ان الترجمۃ جاءت موافقۃ مطابقۃ للاصل وصحیحۃ فی الادب الہندی

فان رأیتم فی نشرہا فائدۃ ومصلحۃ فلکم ان تنشروہا فی مجلتکم، وفی غیرہا من المجلات الہندیۃ۔

لکم الخیار فی النشر وعدمہ وعلی الثانی ان تردوہا الیّ۔ والعنوان

Bhopal Shish Mahal

Musa Bey

بالشکر والاحترام

۱۹۴۴/۹/۲۷

موسیٰ جار اللہ

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيَاةً طَيِّبَةً

انشاء اللہ

امام مجاہد و مجتہد مولانا عبید اللہ سندھی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے پروردگار کی طرف ہنسی خوشی نفس مطمئنہ کے ساتھ واپس ہوئے۔ اللہ تعالےٰ مرحوم کو اپنے عباد میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے۔

مولانا سندھی کے اعتقاد کے بموجب، سورۃ البلد کی آیات کریمہ میں "عبادی" سے مراد "ملاء اعلیٰ" ہے "مَاكَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلٰى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ" سورہ صاد (۶۹) اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "ملاء اعلیٰ" کو "حظیرۃ القدس" کے نام سے موسوم فرماتے ہیں، اور فلسفہ ولی اللہی میں "حظیرۃ القدس" کا اعتقاد ایک بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتا ہے۔
حضرت الامام شاہ ولی اللہ کے فلسفہ میں "حظیرۃ القدس" کا کام وہی ہے جو حکمائے یونان کے فلسفہ میں "عقل عاشر" کا کام ہے۔ فیوضِ الٰہی میں سے ہر فیض جو عالم انسانیت پر نازل ہوتا ہے وہ "حظیرۃ القدس" کے واسطے سے نازل ہوتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی (خدا ان کو اپنے عباد میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے) اکثر و بیشتر "حظیرۃ القدس" کا ذکر فرمایا کرتے تھے، اور جب کبھی "حظیرۃ القدس" کا ذکر فرماتے تو اس وقت ان کی تمنا دلی، خوشی بن کر ان کے چہرے سے نمودار ہوتی۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ یقین کر رہے ہیں کہ جب کبھی خدائے تعالےٰ اُن کو اپنی طرف ہنسی خوشی لوٹنے کا حکم دے گا تو ضرور ان کو اپنے بندوں میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمائے گا اور اُن کی جائے قرار، "ملاء اعلیٰ" یعنی "حظیرۃ القدس" میں ہوگی۔

پس خدائے کریم نے نہ اپنے سچے وعدے کے خلاف فرمایا اور نہ ذرہ برابر اپنی مقررہ میعاد کے خلاف کیا۔ کیونکہ خدائے بزرگ نہ کسی عامل کے عمل کو ضائع کرتا ہے اور نہ کسی امیدوار کی امید کو۔ وہ اپنی کتاب کریم میں فرماتا ہے: "یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي"۔

ہمیں قرآن کریم کے ارشاد کے بموجب خدا کے فضل سے امید ہے کہ اس نے مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دی اور اپنے عباد میں شامل اور اپنی جنت میں داخل فرمایا۔ اور ملاء اعلیٰ یا خطیرۃ القدس کو مرحوم کی جائے قرار بنایا۔

ہمیں امید ہے کہ امام عبید اللہ سندھی نے اپنی حیات ابدی میں اپنے خدائے کریم سے اس انعام کو پا لیا جس کے وہ آرزومند تھے۔ "وَذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ"

میں مولانا سندھی سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ مرحوم کو اس وقت دیکھا تھا جبکہ وہ لینن کی زندگی میں، روس کے دارالسلطنت ماسکو میں تشریف لائے تھے اور اعیان حکومت نے ان کا استقبال کیا تھا۔

حکومت بالشویک، مولانا کا بہت زیادہ احترام کرتی تھی، اور ان کے افکار و خیالات سنتی کرتی تھی۔ چنانچہ حکومت نے مولانا کے بعض ارشادات انگریزی زبان میں طبع کرائے۔ میرے پاس اس کا ایک نسخہ باقی رہ گیا ہے۔

میں بھی ماسکو پہنچا تاکہ مولانا کا استقبال کروں اور آپ کی زیارت سے استفادہ کروں۔ میں مولانا کی صحبت میں، بہت روز تک رہا۔ اور خود مولانا بھی اکثر دبیشتر، صبح و شام میرے گھر تشریف لایا کرتے تھے۔

پھر مولانا کو میں نے روس کے دوسرے بڑے شہر لینن گراڈ میں مدعو کیا۔ مرحوم نے حکومت سے اجازت طلب کی اور پھر آپ اپنے نوجوان ہندوستانی دوستوں کی ہمراہی میں، جو روس کے کالجوں کے طالب علم

تھے لینن گراڈ تشریف لائے میں نے ان کا استقبال کیا اور حکومت روس کی طرف سے بھی استقبال کیا گیا۔ مولانا مرحوم نے میرے مکان پر ٹھہرنا پسند فرمایا۔ اور میرے گھر کو ماہِ رمضان میں دو ہفتے تک اپنے قیام سے مشرف فرمایا۔

مولانا سندھی، یا آپ کے ساتھیوں میں سے کسی شخص نے بعد از سفر روزے قضا نہیں کئے میری رفیقۂ حیات، معزز مہمانوں کے واسطے چائے، دوپہر اور رات کا کھانا، افطاری اور سحری تیار رکھتی تھیں۔ مگر میں نے اُن میں سے کسی کو روزہ قضا کرتے نہیں دیکھا۔ دسترخوان بچھے رہتے تھے اور اُن پر ہر قسم کے لذیذ اور پاک و صاف ماکولات و مشروبات چنے رہتے تھے۔

افطار کے وقت مولانا سندھی کھانے کی میز پر تشریف لائے اور اُن کے ساتھ ان کے دوست ہوتے اور بعض اوقات روس کے بڑے بڑے علماء بھی ہوتے تھے جو آپ سے ملنے اور تبادلہ خیال کے لئے آیا کرتے تھے۔

مولانا سندھی اور آپ کے ساتھیوں نے لینن گراڈ کی خوب سیر کی اور ہر وہ چیز دیکھی جو شوقین سیاحوں کا مطمع نظر ہو سکتی تھی۔ علاوہ ازیں آپ نے بہت سی ایسی چیزیں بھی دیکھیں جن کو کم ہی لوگ دیکھتے ہیں۔

مولانا کا جتنے روز تک میرے مکان پر قیام رہا میں ہر وقت اُن کے ساتھ رہتا تھا، ورسوائے آپ کے آرام کے اوقات کے یا اس وقت جبکہ وہ اپنے دوستوں سے ملتے تھے، میں کبھی مرحوم سے جدا نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ میں مولانا کو خوب جانتا ہوں۔ مولانا ایک سچے اور مخلص حنفی المذہب تھے۔ آپ کے کیرکٹر اور گفتگو میں کسی قسم کی بناوٹ۔ تصنع یا تکلف دیکھا۔

اپنے علم میں وہ بہت بڑے مجتہد اور اپنی تحریکات و اعمال میں، ایک عظیم الشان مجاہد تھے مولانا کی بہت سی آرزوئیں اور اُمیدیں تھیں جن کے پورے ہونے کی ان کو کامل توقع تھی۔

مولانا مرحوم، سنہ [illegible]ء میں روس سے واپس ہوئے، پھر سنہ [illegible]ء میں میری اور ان کی ملاقات استانبول میں ہوئی۔ نیز حرمین میں مجھ کو اُن سے بارہا شرف ملاقات حاصل ہوا۔ مرحوم کی

میں کئی ماہ تک میں اُن کے ساتھ رہا اور اس اثنا میں مولانا سندھیؒ نے قرآن کریم کی تفسیر، شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے کے مطابق مجھ کو املا کرائی۔ اور میں نے نہایت اہتمام سے اس کو مدوّن کیا۔ اسی زمانے میں، مجھ کو مولانا کے اجتماعی اور سوشل خیالات و افکار، نیز قرآنِ کریم کے متعلق اُن کے حکیمانہ عزائم و مقاصد پر واقف ہونے کا کافی موقع ملا۔

بعض اوقات، حضرت، قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کو پڑھتے "قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (۷ : ۱۵۸) فرماتے کہ اگر ہم قرآن کریم کی تفسیر، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے فلسفے کے مطابق کریں تو خدا کے اس فرمان کو، ہم موتمر ادیان و مذاہب میں ہر دین کی کتاب سے ثابت کر سکتے ہیں۔

حضرت مولانا سندھیؒ کے نزدیک اُن کی مہتم بالشان آرزوؤں کی تکمیل کا واحد ذریعہ اور ابتدائی تدبیر یہ تھی کہ اُمتِ اسلامیہ کے بچوں اور بچیوں کی کامل تربیت، اسلامی اور عصری اصولوں کے مطابق مسلمانوں کی بہترین اسلامی درسگاہوں اور عالم تمدن کی اعلیٰ جامعات میں کرائی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مولانا نے جو سب سے پہلا اقدام کیا وہ یہ تھا کہ دہلی اور لاہور میں آپ نے "دار الحکمہ" کی ایک چھوٹے نمونے پر (Miniature Model) تاسیس کی اور ان کی آرزو تھی کہ اس کو اپنی زندگی میں، تمام کرۂ ارض کی بہترین یونیورسٹی دیکھیں جو اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ، عہدِ حاضر کے انسانی اور اجتماعی علوم کی تعلیم کا واحد مرکز ہو۔

حضرت مولانا سندھی کی وفات، نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے ایک عظیم الشان خسارہ ہے۔

لہٰذا اُمتِ اسلامیہ کے علماء، امراء اور دولت مندوں کا فرض ہے کہ مولانا سندھی کی آرزوؤں کو اُن کی یادگار قائم کرکے زندہ کریں اور قرآن کریم کے اس ارشاد کو نہ بھولیں مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً (سورہ نحل ۹۷)

اس سلسلے میں میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کے چندوں اور عطیوں سے مولانا سندھی کی یادگار کے واسطے

Imam Sindi Memorial Fund

کے نام سے ایک فنڈ کھولا جائے اور جب کافی رقم جمع ہو جائے تو اس کو امت اسلامیہ کے بچوں اور بچیوں کی اعلیٰ اسلامی اور عصری تربیت کے انتظام میں صرف کیا جائے۔

اگر وہ مر چکے تو اب ہم کو ان کے جانشین پیدا کرنا چاہئیں۔ جن سے اسلام اور ملت اسلام کی زندگی وابستہ ہے

مسلمانو۔ قرآن کریم کو اپنے ملک میں مہجور و متروک مت ہونے دو۔

موسیٰ بک

انوکھا سبق

چیخوف مشہور روسی افسانہ نویس نے اپنے بچپن کی اس کہانی میں مروجہ طریق تعلیم اور اس کے عاملین پر دلچسپ انداز میں طنز پیش کیا ہے کہ ایک بچہ خونخوار درندوں کی ناپید نسل کا ایک سہ دوست رو جس کی فطرت میں چوہے کا شکار کرنا ودیعت کیا گیا ہے غلط تعلیم کا شکار ہو کر ایک ننھی سی چوہیا سے ڈرنے لگتا ہے۔ بلی کی روح کے چھچھوندر کی سرسراہٹ سے خوف زدہ ہونے لگتی ہے۔

خدا جانے ہمارے درسگاہوں کے کتنے بچے مدرسے کی غلط تعلیم سے ہی نہیں بلکہ گھر کی تادیب اور سماج کی تربیت سے اور نہ جانے کتنی اپنی شخصیت کا توازن کھو چکے ہیں کہ ان کی روح اک چھچھوندر کی سرسراہٹ کو نہیں جھیل پاتی، بھوتوں اور سایوں کی جھلک سے لرز اٹھتی ہے اور نتیجہ وہ ذات تو ہوتی ہے لیکن شخصیت نہیں رہتی جسے زمانے کا اندیشہ ہو۔

ہم نے مثل کو ڈر کی نہیں بلکہ تعلیمی کوڈلی اور ڈرے استاد کا ہاتھ روک لیا ہے لیکن دنیا کا کوئی قانون بچپن کی کونپلوں پر سنگدل تنقید کے گہرے رنگ کو چڑھنے سے نہیں روک سکتا۔ کوئی پابندی اس کے کانوں کو سماج کے بدشگونوں کی جھنکار سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ نئے تعلیمی انقلاب کے لئے استاد نہیں بلکہ پورے سماج کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بچہ مدرسے میں آ کر اک وقت طلب مسئلہ ہو کے رہ گیا ہے تو یقیناً اس بھیانک تصویر کے پس منظر میں ان کے گھر، خاندان میں اس سے بھی زیادہ وحشت طلب مصیبت بن کر صرف رہ ہی نہیں چکے بلکہ اب تک ہیں۔

بلی کا بچہ بے زبان تھا مگر خوف نے اس کی بےکسی اور مظلومیت کے اظہار کو زبان عطا کردی مگر ان بازبان حیوان ناطق کے بچوں کے لئے جن کا المیہ روزانہ مدرسے ہی میں نہیں خاندان اور سماج، بازار اور تفریح گاہوں میں کھیلا جاتا ہے ابھی ایک موئے کی ضرورت پر

میرے چچا مدرسہ جانے کو تیار ہو رہے تھے لاطینی گرامر کی کتاب جو اٹھائی تو کیا دیکھتے ہیں جلد کا ایک کونا چوہوں نے کتر ڈالا! غصہ میں بھنا کر سیدھے باورچی خانے میں گھس گئے اور اماں سے بولے یہ ہمارے یہاں اتنے چوہے کہاں سے آگئے۔ غضب خدا کا! کل میری ٹوپی کتر گئے آج لاطینی گرامر کا ستیاناس کر ڈالا اس حساب سے تو چند دن میں کپڑوں تک چٹ کر جائیں گے۔

"تو بھلا میرا کیا قصور ہے۔ میں تو انہیں کہیں سے نہیں لائی۔"

"تم نہیں لائیں تو تمہاری روٹیوں کے ٹکڑے لائے ہوں گے۔ بھابی ان کا کچھ انتظام تو ہونا چاہیے کہیں سے کوئی بلی تلاش کرو کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"میاں بلی تو میرے پاس بھی موجود ہے پر اس کا ہوگا کیا؟" ساتھ ہی اس نے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ چچا نے جو گھوم کر دیکھا تو وہاں ایک سینے کا سا ننھا دبلا بلی کا بچہ جھاڑو کے پاس گٹھری بنا اونگھ رہا تھا۔

"کیوں؟ یہ کام نہ دے گا؟"

"یہ تو ابھی بچہ ہے۔ دو مہینے کا بھی نہ ہوگا۔"

"ہوا کرے۔ ہم خود سکھا لیں گے۔ یہاں کونے میں پڑے رہنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ کوئی کام کی بات سیکھے۔" یہ کہہ کر چچا نے پریشانی کے عالم میں ایک آہ بھری گویا دنیا بھر کو کام کی باتیں سکھانے کی ذمہ داری اللہ میاں نے انہی کے شانوں پر ڈال دی تھی اور حیوانوں کی انہوں نے خود اپنے سر لے لی تھی۔

بلی کے بچے نے سر اٹھایا کچھ دیر اونگھتے ہوئے ان کے پیچھے دیکھتا رہا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ اسکول سے واپسی پر چچا بازار سے ایک چوہے دان خرید لائے ایک بغل میں کتابوں کا پلندہ اور دوسری میں چوہے دان۔ بدن قدرے آگے کو جھکا ہوا۔ دور سے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی پرندہ اک عقابی اڑان لینے کو زمین سے اٹھا چاہتا ہے اور دونوں پر ایک انداز سے کھولے ہے۔

شام کے کھانے کے بعد چوہے دان کے فکس رہا۔ روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹکا دیا اور تیار کر کے اسے چچا جان کے سرہانے رکھ دیا گیا۔ وہیں جہاں طبابت کی پرانی کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا جنھیں وہ کبھی کبھار ضرورت کے وقت گھر کے کام میں لے آتی تھی۔

چھوٹے شام جب چچا جان بیٹھے ہوئے پوری کی اچھی کی کاپیاں درست کر رہے تھے تو دفعتاً کھٹاک سے ایک آواز آئی۔ اتنے زور سے کہ چچا جان چونک گئے اور قلم ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ فوراً پلنگ کے پاس پہنچے اور چوہے دان باہر نکال لیا کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ننھی سی انگوٹھے کے برابر چوہیا بار بار چوہے دان کے تاروں کو سونگھتی ہے اور ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہی ہے۔

"خوب آپ ہیں!" چچا جان نے عجب طنز ہی کینہ توزی کا بدلہ ... معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے آج سے کسی زبانی امتحان میں پاس کرنے کا عہد کر لیا ہے آہستہ آہستہ ... تو میری کتابیں کیوں کتریں؟ ذرا شرم تو نہیں آتی۔ ابھی تو نامعلوم میری کس کی کتاب کیسے کترتی ہیں!

اس اظہار طمانیت کے بعد چچا نے چوہے دان کو فرش پر رکھ دیا اور ماما کو بلایا۔ "دیکھو تو آج کون پھنسا ہے! فی الفور بلی کے بچے کو لاؤ!"

"ابھی لائی سرکار"

ایک منٹ کے اندر اندر ماما اپنے ہاتھوں میں خونخوار بلی کے ایک بچے کو لیے ہوئے پہنچ گئی۔ چچا مارے خوشی کے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولے "شاباش! آج ہم اس بچے کو پہلا سبق دیں گے۔ اسے چوہے دان کے ادھر رکھو۔ دیکھنا ادھر نہیں ذرا سی تھوڑا سا ہٹ کر بس بس یہیں ٹھیک ہے۔ اچھا اب پہلے یہ چوہے دان کو سونگھ تو لے اور چوہیا کو دیکھ تو لے"

بلی کے بچے نے پہلے تو کچھ تعجب سے میرے چچا کو دیکھا پھر آرام کرسی پر نگاہیں جما دیں اس کے بعد کچھ دیر گھبراہٹ میں چوہے دان کو سونگھتا رہا اور دفعتاً! یا تو بلب کی چندھیا دینے والی روشنی سے ڈر گیا یا شاید اس توجہ کی تاب نہ لا سکا جو برابر ہر جانب سے اس پر دی جا رہی تھی ایک بارگی لپکا اور بے حد خوف زدہ انداز میں دروازے کی طرف بھاگا۔

"چچا جان نے حیرت انگیز پھرتی سے اس کی دم تھام لی اور چلائے "روکو! اس بدمعاش کو روکو" گویا اب بھی روکنے کی ضرورت تھی "نالائق! ایک چوہے سے ڈرتا ہے! ارے گدھے دیکھتا نہیں یہ تو محض ایک چوہا ہے! آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟ (داہنے ہاتھ کی انگشت شہادت کو غصہ کے انداز میں ہلا کر) میں تم سے دوبارہ کہتا ہوں ذرا آنکھیں تو کھول کر دیکھو"

یہ کہہ کر چچا جان نے بچے کو گود میں پکڑا اور اس کی ناک چوہے دان کی تاروں سے بھڑا دی۔ "دیکھ دیکھ ابے تھرڈ ویژن ذرا دیدے کھول کر دیکھ۔ بالا (ملازم) سے تھام لو، اور چوہے دان کی کھڑکی کو مقابل لئے رہو اور دیکھنا جونہی میں کھڑکی کھولوں تم فوراً اسے چھوڑ دینا سستی ہوئی، فی الفور، بغیر ایک لمحہ توقف کے! اچھا خبردار!"

اس وقت چچا جان کے چہرے پر ایک پُراسرار حجت دکھائی دے رہی تھی گویا وہ کسی المیہ سٹیج کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انھوں نے چوہے دان کی کھڑکی کھول دی!

چوہیا پہلے تو ڈری ڈری ہی نکلی، نتھی سی ناک کو ہوا میں سونگھا، اور پھر نا معلوم کیوں، تیر کی طرح الماری کے نیچے گھس گئی۔ ادھر بلی کا بچہ چھٹتے ہی میز کے نیچے تھا اور اس کی دہشت خوف کے ہوا میں کھلی رہی تھی۔

چچا غصے میں سرخ ہو کر بولے "ادھو ... ! کمبخت صاف بچ نکلا! کہاں ہے، وہ بدمعاش ہے کہاں۔ کیا بکس کے پیچھے ہے۔ (دایاں ہاتھ غصے میں جھٹکے سے ہلاتے ہوئے گویا کسی خیالی دشمن کے ٹھونگا لگا رہے ہیں) ذرا ٹھہر تو سہی ...

چچا نے بچے کو میز کے نیچے سے گھسیٹ کر باہر نکالا اور گردن سے پکڑ کر اونچا اٹھایا کان پر زور سے تھپڑ لگاتے ہوئے "ملعون اور دے گا! پھر دوبارہ ایسا کرے گا زندہ نہیں چھوڑوں گا بدمعاش کہیں کا!"

دوسرے دن چچا جان نے بار بار کر پھر بلایا اور بولے "دیکھو آج ایک اور چوہا پھنس گیا ہے بلی کے بچے کو ادھر لاؤ"

کل کے حادثے کے بعد بچہ کارنس کے پیچھے آتش دان میں گھس گیا تھا اور مارے خوف کے ساری رات باہر نہ نکلا جب ماما نے اسے کھینچ کر باہر نکالا اور گردن سے پکڑ کر چوہے دان کے سامنے کھڑا کیا ہے تو وہ کار

ڈر کے تھر تھر کانپ رہا تھا اور مترنم انگیز انداز میں میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔ چچا جان اس کی یہ حالت دیکھ کر کچھ نرم ہو گئے۔ بولے اسے دم بھر کے لئے سستا لینے دو یہی ہو کہ یہ پہلے چوہا کو دیکھے اور سونگھے اور ہیچے کی طرف دیکھ کر، شیر کے خالو ادھر دیکھو اور اپنا کام سیکھو۔ دیکھتے ہو نہ کہ یہ چوہے دان سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہے، خدا انہیں غارت کرے۔ غصے میں نہ آ کر، میں نہیں تو مار مار دوں گا کہ عمر بھر یاد رکھو گے۔ اسے کان سے پکڑے رہو۔ ٹھیک ٹھیک۔ ایسے ہی۔ اچھا اب اسے چوہے دان کے سامنے کھڑا کر دو۔

اس کے بعد چچا نے آہستہ سے چوہے دان کی کھڑکی کھولی چوہا بلی کے بچے کی ناک کے نیچے سے صاف نکل گیا اور تیزی میں خادم کے ہاتھ سے جا کر اور وہاں سے الماری کے نیچے غائب! ادھر بلی کے بچے نے اپنے آپ کو آزاد پا کر جو ایک جان توڑ جست لی ہے تو سوفا کے نیچے

ہائے غضب دوسرا چوہا بھی گیا۔ تم نے بلی کے بچے ہر دوات میں کر، اس کا علاج تو محض ڈنڈا ہی ڈنڈا اور جوتے لے تو اس چوہے دان کو پٹنا چاہیے۔

جب تیسرا چوہا پکڑا گیا اور بچہ چوہے دان کے سامنے لایا گیا تو مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہا تھا اور ماما کے ہاتھ کو آہستہ آہستہ سہلاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چوتھے چوہے پر تو چچا جان غصہ کے مارے آپے میں نہ رہے۔ بلی کے بچے کو زور سے ایک ٹھوکر جمائی اور کہنے لگے اس نامعقول کو میری نگاہوں سے دور لے جاؤ۔ کہیں چھوڑ آؤ دفع بھی کرو کمبخت کو یہ کسی مرض کی دوا نہیں :

اس پر ایک سال گزر گیا اور کمزور مریل بلی کا بچہ ایک موٹا تازہ گچھوں والا سمجھدار بلا بن گیا ایک دن یہ حضرت مکان کے پچھواڑے سے ہوتے ہوئے اپنی کسی محبوبہ سے ملنے جا رہے تھے۔ ابھی منزل مقصود تک پہنچنے نہ پائے تھے کہ راستے میں ایک آہٹ سی پائی نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک چوہا نالی میں سے لت پت ہوتا ہوا بیل خانے کی طرف کو جا رہا ہے۔ بس وہیں کے وہیں ٹھٹک کر رہ گئے اور بدن کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ میرے شیر کی کمر کمان کی طرح اوپر کو اٹھ گئی اور اس کے گل پھوں میں سے ایک عجیب و غریب قسم کی آواز نکلی اور اس کے ساتھ ہی سارے جسم پر کپکپی چھوٹ گئی۔ اس کے بعد دو تین قدم تو انھوں نے

اس احتیاط سے لئے گویا ساری زندگی کا دارو مدار انہی پر ہے اور اس کے بعد جو بھاگے ہیں تو ان کی دُم پشت سے جا لگی تھی۔

میں بھی کبھی کبھی اپنے آپ کو کچھ ایسی ہی مضحکہ خیز حالت میں پاتا ہوں۔ بلی کے بچے کی طرح مجھے بھی ایک زمانہ میں ایسا ہی افتخار بخشا گیا تھا۔ چچا جان نے مجھے اپنے دست مبارک سے (دماغ مبارک سے نہیں) لاطینی زبان پڑھائی تھی اب بھی جب کبھی اتفاقاً کرئی علی کو سیکی کتاب پر نگاہ پڑ جاتی ہے تو بجائے کسی علمی تڑپ اور شوق کے مجھے لاطینی کی پنج حرفی اور شش حرفی گردانیں یاد آنے لگتی ہیں اور اس کے ساتھ چچا جان کا زرد اور ترش چہرہ..........

میں دفعتاً پیلا پڑ جاتا ہوں۔ میرے سر کے بال خوف کے مارے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں بھی پلے کی طرح سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلتا ہوں!

مالابار میں

مالابار کے قحط کی خبریں سن کر کملا دیوی نے وہاں کا دورہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ میں ان کی روانگی کے وقت مدراس میں تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ مالابار کے لاوارث بچوں کے لئے یتیم خانے کھلے ہیں اور میں دیکھنا چاہتی تھی کہ ان یتیم خانوں میں تعلیم دینے کے کچھ موقع ہیں یا نہیں۔ کملا دیوی نے مجھے اپنے سنگ لے لیا۔ سب سے پہلے ہم کالی کٹ گئے۔ کملا دیوی کے آنے کی خبر مشہور ہو چکی تھی اور اسٹیشن پر ہمارا خیر مقدم کرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ تمام لوگ ایسے صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا ابھی گھاٹ پر سے دھلوا کر آئے ہیں۔ یہ سب طالب علم تھے اور ہماری جے پکارتے ہوئے ہماری قیام گاہ تک آئے۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پہلا دن ملتے ملاتے گذر گیا۔ مجھے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کا کام سال ڈیڑھ سال سے جاری ہے۔ مالابار میں قحط پڑا، پھر ہیضے کی وبا پھیلی اور دونوں نے مل کر وہاں کے معاشی نظام میں بڑی ابتری پیدا کر دی۔ لیکن غریبوں کی سیوا میں خاصی سرگرمی دکھائی گئی۔ کام کرنے والے اداروں میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی، ویمنس مہاسنگھ، اور ہوم سوسائٹی سب سے ممتاز ہیں۔ انھوں نے لوگوں میں دوائیں تقسیم کیں، یتیم بچوں کے لئے یتیم خانے کھولے۔ مسلمانوں کے لئے الگ یتیم خانے ہیں۔ ان میں سے بھی میں نے دو تین دیکھے۔

ہمارا پروگرام اس ارادے سے بنایا گیا تھا کہ جن علاقوں میں قحط اور وبا کا زیادہ اثر پڑا تھا ان کا دورہ کریں، مگر مالابار میں نظر جہاں تک جاتی تھی قحط کے آثار کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ چاروں طرف ہرے بھرے اور پھلوں سے لدے ہوئے ناریل کے درخت، جہاں بھی زمین ذرا ہموار تھی، دھان لہلہا رہے تھے۔ بازاروں میں کیلے اور ترکاریوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں کا قحط کیسا ہے۔ لوگوں کو دیکھتی تھی تو وہ بھی سب صاف ستھرے تھے۔ ان کے چہرے ہرگز فاقہ زدہ لوگوں کے سے نہ تھے۔ جب مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے حالات دریافت کئے تو مجھے بتایا گیا کہ مالابار کی آبادی بہت بڑھ گئی ہے کیونکہ بہت

سے لوگ جو ملایا میں رہتے تھے بھاگ کر وطن واپس آگئے ہیں۔ اس کے علاوہ جنوبی ہند میں جو فوجیں ہیں ان کی ضروریات بھی پوری کی جاتی ہیں۔ مالابار کی پیداوار کا بیشتر حصہ پہلے ہی بھیج دیا جاتا تھا، جنگ نے ہر چیز اتنی گراں کر دی کہ مزدور، کسان اور ماہی گیر پیٹ بھر کھانے کو کچھ خرید نہ سکتے تھے۔ مالابار کا غریب طبقہ کساوے کی سوجی اور چاولوں پر گزر کرتا ہے۔ کساوے کا بھاؤ ایک پیسہ سیر تھا اب اس کی پیداوار بند ہوگئی ہے اور وہ مشکل سے دو روپے سیر ملتا ہے۔ چاول کی پیداوار پہلے بھی آبادی کے صرف ایک تہائی حصے کے لئے کافی ہوتی تھی باقی کے لئے باہر سے آتا تھا۔ یہ بند ہوگیا تو غریبوں کے لئے کھانے کو بہت کم رہ گیا۔ غذا کی کمی سے وہ کمزور ہوگئے اور مختلف بیماریاں پھیلنے لگیں۔ جون اور جولائی ۱۹۴۳ء میں ہیضہ کی سخت وبا پھیلی اس میں کوئی ۳۰ ہزار آدمی ضائع ہوئے غذا کی کمی اور بیماریوں کی شدت کسی حادثے کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ جن حالات کا یہ نتیجہ تھیں وہ اب بھی موجود ہیں۔ مالابار والوں کو جو مدد پہنچائی جاری ہے وہ وقتی ہے مستقل نہیں۔ معاشی اصلاح میں دیر بہرحال لگتی ہی ہے اور اصلاح کی جو تدبیریں ہو سکتی ہیں ان پر عمل کرنا آج کل اور بھی مشکل ہے۔ مالابار کے دیہات میں کتائی کا کام شروع کیا گیا ہے اور اسے زیادہ تر لڑکیاں اور بوڑھی عورتیں کرتی ہیں۔ ان کے لئے الگ الگ مرکز بنے ہیں جن میں ۲۰۰ سے ۵۰۰ تک عورتیں کتائی کرتی ہیں ان میں ہندو مسلمان دونوں ہیں۔ بڑا سوال یہ ہے کہ جو سوت تیار ہو رہا ہے اس سے کپڑا کہاں اور کیسے بنا جائے گا جب تک اس کا مستقل انتظام نہ ہو جائے غریبوں کی آمدنی بڑھانے کی یہ تدبیر کامیاب نہیں کہی جا سکتی۔

ہم ۱۸ اکتوبر کو کالی کٹ پہنچے تھے۔ ۱۹ کو کتائی کا ایک مرکز دیکھنے گئے۔ راستہ بہت خوبصورت تھا۔ ایک طرف پہاڑ تھے دوسری طرف ایک گہری وادی۔ زمین کا قدرتی سرخ رنگ درختوں کی سبزی سے خوب میل کھاتا ہے۔ راستے میں بہت سے لوگ آتے جاتے تھے۔ بعض مالابار کی مخصوص ٹوپی پہنے تھے یہ کلاہ اور چھتری کی ایک بہت کارآمد آمیزش ہے۔ اور ناریل کی پتیوں سے بنائی جاتی ہے۔ اس قسم کی چھتریاں بھی جیسی کہ لوگ برسات میں لگاتے ہیں ناریل کی پتیوں سے بنتی ہیں اور بہت خوبصورت رنگی ہوتی ہوتی ہیں انہیں نمبودری برہمنوں کی عورتیں لگاتی ہیں یہ ان کا پردہ ہے۔ اس لئے وہ رات کو بھی ایسی چھتریاں لگا کر نکلتی ہیں مسلمان عورتیں پردے کے لئے معمولی قسم کی کپڑے کی چھتریاں لگاتی ہیں۔ ان سے چہرہ چھپایا نہیں جاتا۔

صرف ایک رسم کا لحاظ ظاہر کیا جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے ہندو اور مسلمان عورتوں کے لباس میں فرق صرف یہ تھا کہ مسلمان عورتیں بہت رنگین کپڑے پہنتی تھیں ان کی کرتیوں کی آستینیں کلائی تک ہوتی ہیں۔ یہ ایک اور فرق ہے۔ بعض ذاتوں کی عورتیں کمر کے اوپر کچھ نہیں پہنتی ہیں۔ شمالی ہند کے مقابلے میں یہاں عورتوں کا مرتبہ اور ان کا اختیار بہت زیادہ ہے وہ گھر اور خاندانی ملکیت کی قانوناً مالک ہوتی ہیں۔ اور خاندان پر پوری حکومت کرتی ہیں۔ مردوں کے لیے یہ تعریف کی بات ہے کہ انہوں نے قدیم زمانے کی حکومت مادری کی یہ نشانی قائم رکھی اور عورتوں کی ماتحتی کو گوارا کرتے ہیں۔

مالابار میں مسجدیں اور مندر بالکل گھروں کی طرح بنتے ہیں اور باہر سے دیکھ کر انھیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ عمارت بیشتر لکڑی کی ہوتی ہے۔ مالابار میں ساگون کی لکڑی افراط سے ہوتی ہے اور عمارتوں میں یہی لگائی جاتی ہے۔ کالی کٹ سے دس میل دور دیہات میں میں نے ایک دو سو برس کا پرانا مکان دیکھا۔ یہ سارا لکڑی کا تھا اور لکڑی پر اس طرح جلا کی گئی تھی کہ پتھر کا دھوکا ہوتا تھا۔ مکان میں کھڑکیاں بہت تھیں اور اتنی لمبی کہ ہر کمرہ برآمدہ معلوم ہوتا تھا۔ انھیں کے ساتھ نشست کا بھی انتظام تھا۔ کھڑکیوں میں بہت ہی خوبصورت جالیاں لگی تھیں۔ چھت کا بوجھ سنبھالنے کے لئے لکڑی کے سڈول گاؤدم ستون تھے۔ مکان کا فرش مٹی کا تھا جس میں کاجل کا تیل ایک خاص مقدار میں ملایا گیا تھا۔ اس آمیزش سے فرش بہت چکنا ہو جاتا ہے اور اتنا سخت کہ اس پر پانی بالکل اثر نہیں کرتا۔

کالی کٹ سے ہم لوگ کئی کل گئے۔ یہاں ایک مشہور مدرسہ ہے جہاں کتھ کلی ناچ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم لوگ مدرسے میں گئے تو دیکھا کہ ایک استاد چھ سات برس کے لڑکوں کو ناچ سکھا رہا ہے۔ ایک آدمی ڈھول بجا رہا تھا، ایک طبلہ۔ ایک کتھا پڑھ رہا تھا اور ایک قصہ کو بیان کرنے کے بھاؤ بتا رہا تھا۔ کئی کل میں ہم نے ایک اور قسم کا ناچ بھی دیکھا جسے اوٹن دوٹی کہتے ہیں۔ اس میں ناچنے والا اپنے چہرے کو رنگتا ہے۔ اس کے پیچھے دو سازندے ہوتے ہیں جو قصہ بھی سناتے رہتے ہیں۔ ناچنے والا اسے ادا کرتا ہے مگر اس ناچ میں کوئی حسن اور نفاست نہیں ہوتی۔

کئی کل میں زمورن کا محل بھی ہے۔ پہلے زمورن کالی کٹ کے راجہ ہوتے تھے، اب ان کی کوئی سیا

حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ زیمورن کے خاندان کے کچھ مردوں نے کملا دیوی کو محل میں آنے کی دعوت دی اور ان کے ساتھ میں بھی چلی گئی۔ ہم کو پہلے ایک اونچی اور بہت لمبی فصیل نظر آئی جس کے سامنے خندق تھی، جیسے کہ پرانے زمانے کے قلعوں میں۔ زیمورن کا کنبہ اب کوئی ۲۰۰ خاندانوں پر مشتمل ہے اور ان کی بستی میں کوئی ۲۰۰۰ مرد عورتیں اور بچے ہوں گے۔ ہم پھاٹک سے فصیل کے اندر آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک لمبے چوڑے احاطے کے اندر بستی سی بسی ہے۔ محل کی طرح کی کوئی عمارت نہیں۔ دروازے کے ایک طرف مندر تھا، اور اس کے آگے عمارتوں کے بیچ میں دو ہال، ہم پہلے ایک ہال میں داخل ہوئے جو کسی زمانے میں زیمورن کا دیوان عام ہوگا۔ پھر دوسرے ہال میں گئے جہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور بیشتر اپنے قومی لباس میں تھیں۔ یعنی صرف ایک تہمد باندھے تھیں۔ خاندان کی سردار ایک بہت بوڑھی عورت ہے یہ ایک لکڑی کے تخت پر بیٹھی تھی لیکن آن بان اور لب ولہجہ شاہانہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم لوگ کون ہیں اور کیسے آئے ہیں، لیکن جب کملا دیوی کا باقاعدہ تعارف کرایا گیا تو اس نے پوچھا "کملا دیوی کون ہے؟" جب اس کا جواب دیا گیا تو پھر پوچھا "یہ یہاں کیوں آئی ہے؟" دربار کی یہ رسم ادا کر دی گئی تو دوسری عورتوں نے ہمیں گھیر لیا اور باتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے ہندی کتابوں سے پڑھی تھی، کسی کو ہندی بولتے سنا نہیں تھا۔ انھوں نے ہم سے فرمائش کی کہ ہم ہندی بولیں مگر ہم نے جو کچھ کہا اس کا ایک لفظ وہ نہیں سمجھیں۔ معلوم نہیں وہ ہندی کے نام سے کیا پڑھتی ہیں لیکن وہ پڑھتی بہر حال ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ ہندی، ہندوستانی اور اردو تینوں زبانیں بول سکیں گی۔ مجھے ڈر ہے ان کی زبان محل کی چار دیواری کے باہر کہیں نہ سمجھی جائے گی۔

مالا بار میں کمیونزم کا بہت پرچار کیا جا رہا ہے اور وہاں کے کمیونسٹ قومی خدمت کے کام بڑے خلوص سے انجام دیتے ہیں۔ وہاں ہندو اور مسلمان کا کوئی اختلاف نہیں، جو اختلاف ہے وہ کمیونسٹ اور کانگریسی کا ہے۔ کمیونزم کی تحریک نوجوانوں اور خاص طور سے طالب علموں میں پھیلی ہے، اور انھوں نے کملا دیوی کا استقبال بہت جوش کے ساتھ اس وجہ سے کیا کہ وہ کملا دیوی کو کمیونسٹ سمجھتے تھے۔ انھیں بڑی مایوسی ہوئی جب کملا دیوی نے یہ صاف صاف کہہ دیا کہ اب ان کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ مالا بار میں کمیونسٹوں نے جگہ جگہ اپنے مرکز بنائے ہیں، مردوں کے الگ عورتوں کے الگ۔ ان میں شوق، حوصلہ اور صلاحیت کی کوئی کمی نظر نہیں آتی اور خدمت کے جو موقعے قحط اور وباؤں نے پیدا کئے ہیں ان سے وہ پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

کتب موصولہ پر ایک نظر

ہمارے ہندوستانی مسلمان | تالیف ڈبلیو ۔ ڈبلیو ہنٹر۔ مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین صاحب ۔ ناشر اقبال اکیڈمی، ظفر منزل تاج پورہ لاہور۔

یہ ولیم ہنٹر کی وہ کتاب ہے جس نے انیسویں صدی کے آخری ربع میں ہمارے انگریز حکمرانوں کے خیالات کے تعمیر کرنے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ اس میں حضرت سید احمد بریلوی رحؒ کی تحریک مجاہدین پر جو ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرنے کی ایک زبردست کوشش تھی مفصل تبصرہ ہے، اس تحریک کی حیرت انگیز تنظیم اور ان کی ایمان افروز قربانیوں کی داستان، دار الاسلام اور دار الحرب کی بحث اور جہاد کی حقیقت اور انگریزی حکومت کے ہاتھوں مسلمانوں سے جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کا درد انگیز بیان ہے۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ انگریزوں کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ ایسا تھا کہ جس سے بجا طور پر مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے تھا اور انگریزوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم اور اصلاح و ترقی کے لئے خاص طور پر کوشش کریں۔ اس کتاب کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ دکھلایا گیا تھا کہ مسلمان کس طرح حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور علمی پیشوں سے ارادتاً بتدریج خارج کئے گئے اور ۔ ۔ ۔ کس طرح وہ گمنامی اور محرومی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مسلمانوں کی معاشی حالت پر تبصرہ کرتے وقت اکثر اس کتاب کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صادق حسین صاحب کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو اردو کا جامہ پہنایا۔ ترجمہ کی زبان شستہ صاف اور با محاورہ ہے۔ کتابت، طباعت، جلد، گرد پوش سب اعلیٰ معیار کے ہیں۔ ۳۰۲ صفحات کی کتاب ہے اور اس کی قیمت دو روپے بارہ آنہ (مجلد) رکھی گئی ہے۔

سوویٹ روس | از محمد کلیم اللہ صاحب، ناشر ماڈرن بک ڈپو، سلطان بازار ۔ حیدرآباد دکن۔ کتابت

طباعت، جلد، گردپوش اعلیٰ معیار کے ۳۲۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔

مولف نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ معاشی زندگی سے متعلق ہے دوسرا سیاسی زندگی سے اور تیسرا معاشری زندگی سے۔ پہلے حصے میں صنعتی نظام، زرعی نظام، طبعی سائنس اور تقسیم پیداوار کے نظام کا حال، انقلاب سے قبل، انقلاب کے بعد، نئی معاشی پالیسی، پہلے دوسرے اور تیسرے پنج سالہ منصوبوں اور جنگ کے زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بیان کیا گیا ہے اور آخر میں روس کے معاشی تحفظ کے انتظامات سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں سویٹ حکومت کے نظام، اس کے اجزا اور سویٹ دستور کی خصوصیات خارجی حکمت عملی قومیت کا مسئلہ اور سرخ فوج سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

تیسرے حصے میں تعلیم و تربیت، فنون لطیفہ، صحت جسمانی اور کھیل، عورتوں کی حیثیت اور مذہب و اخلاق سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

اردو میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے جس میں سویٹ روس کے بارے میں اس قدر شرح و بسط کے ساتھ معلومات فراہم کی گئی ہیں اور چھوٹے پیمانے پر اسے سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب "سوویٹ روس: ایک نئی تہذیب" کا بدل سمجھا جا سکتا ہے۔ مصنف کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کتاب کی تیاری میں ایسے مصنفوں کی تحریروں سے مدد لی گئی ہے جن کی غیر جانبداری اور ایمانداری پر کسی کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

کتاب کی زبان سلیس اور آسان ہے۔ محمد کلیم اللہ صاحب اس عمدہ تالیف کے لئے مستحق مبارکباد ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی از پروفیسر محمد سرور صاحب۔ ناشر سندھ ساگر اکادمی لاہور۔ کتابت طباعت، جلد، گردپوش کا معیار اعلیٰ ۴۰۲ صفحات۔ قیمت عـــہ

اس مشہور شخصیت کے نام سے سب واقف تھے لیکن اس کے خیالات کو مرتب اور منظم صورت میں وہ لوگ بھی نہیں سمجھ سکے جنھیں مولانا سے خاصا قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ یہ مولانا کے عزیز شاگرد

ہونہار شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب کا بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مولانائے مرحوم کے حالاتِ زندگی تعلیمات اور سیاسی افکار کو عام فہم سلیس اور دلچسپ انداز میں مرتب کردیا وہ اس کام کے لئے ہر طرح اہل اور مجاز تھے اور انھوں نے اپنے فرض کو نہایت حسن اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔ یہ کتاب مولانائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کی مخالفت میں ان کے کسی بیان کے شائع ہونے کا ہمیں ابھی تک علم نہیں ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس کے تمام بیانات سے متفق رہے تھے

مولانا کی شخصیت بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے اور آیندہ شاید اور زیادہ بن جائیں ہمیں امید ہے کہ سرور صاحب کی یہ کتاب مولانا کے معتقدوں اور مخالفوں دونوں کے لئے ایک مستند ذریعہ کا کام دے گی۔ کتاب کی ترتیب اور طرز بیان دونوں نہایت خوب ہیں۔ شاگرد نے استاد کے افکار و خیالات کو اس قدر اپنا کر پیش کیا ہے کہ بعض وقت شبہہ ہونے لگتا ہے کہ یہ خیالات در حقیقت مولانائے مرحوم کے ہیں یا ان کے ہونہار شاگرد کے اپنے ذاتی خیالات ہیں جو انھوں نے مولانا سے منسوب کردیئے ہیں۔ اسے مرتب کی بڑی خوبی سمجھنا چاہیے۔

مشرق بعید از شاہد حسین صاحب رزاقی۔ ناشر دار الاشاعت سیاسیہ حیدر آباد دکن صفحات ۱۴۲ قیمت [illegible]۔ غیر مجلد کتابت طباعت اچھی۔

اس کتاب کے حصہ اول میں مشرق بعید کے جملہ علاقوں مثلاً سائبریا، منگولستان، مانچوکو، کوریا، جاپان، چین، ہندی چین، تھائی لستان، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ کے بارے میں مستند معلومات فراہم کی گئی ہیں جن کی وضاحت اس علاقے کا ایک نقشہ دے کر کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں سامراجی دول کی سیاسی بساط یعنی چین کے جو مختلف دول سے تعلقات رہے ہیں ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ ابتدائیہ میں ایک عام تبصرہ موجودہ بین الاقوامی سیاست پر ہے۔ کتاب نہایت قابلیت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے اور اس کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔

پارلیمانی طرزِ حکومت از منظور الحسن صاحب ہاشمی۔ ناشر دار الاشاعت سیاسیہ، حیدر آباد دکن صفحات ۹۶۔ قیمت ۱۲ غیر مجلد۔ کتابت، طباعت اچھی۔

یہ کتاب انگلستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا کی پارلیمنٹ کے حالات پر مشتمل ہے شروع میں ایک نقشہ جدید ملکوں کی تقسیم اور دوسرا پارلیمانی حکومتوں کے اجمالی خاکہ کا دیا گیا ہے۔ انگریزی نظامِ حکومت کے لئے کتاب کے کل نو ابواب میں سے چھ ابواب وقف کئے گئے ہیں اور ضمیمہ میں سیاسی اصطلاحات کی تشریح اور اہم آئین آزادی کو درج کیا گیا ہے۔ کتاب طلبہ اور عام واقفیت حاصل کرنے والے افراد کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

۱۔ اقبال کا تصور زمان و مکان
۲۔ موت و حیات اقبال کے کلام میں

مرتبہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب
ناشر اقبال اکیڈمی [illegible] لاہور۔

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدر شعبہ ریاضی حیدرآباد دکن صاحب ریاضی ہی نہیں بلکہ ایک اسلامی فلسفی اور ادیب بھی ہیں۔ آپ نے اقبال ڈے کے موقع پر یہ دو مضمون پڑھے تھے جنھیں ناشرین نے مختصر چھوٹے رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ پہلے مقالے کے موضوع پر ڈاکٹر رضی الدین صاحب ہی کو قلم اٹھانے کا حق تھا اور انھوں نے قابلیت کے ساتھ اس فرض کو پورا کیا ہے۔ دوسرا مقالہ بھی اپنی جگہ پر خوب ہے۔

اقبال کے چند جواہر ریزے

مرتبہ خواجہ عبدالحمید صاحب ایم اے
ناشر اقبال اکیڈمی، لاہور

یہ مقالہ رسالہ معارف میں شائع کیا جا چکا تھا، اسے اب رسالے کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان قیمتی اقوال کو جمع کر دیا گیا ہے جو مختلف صحبتوں میں مرتب نے ان کی زبان سے خود سنے تھے۔ ان کا حسن اور ان کی دلچسپی کسی تعارف و تعریف کی محتاج نہیں ہے۔

علمائے کرام کا مستقبل

مرتبہ نظام الدین صاحب صدیقی
ناشر اقبال اکیڈمی، لاہور

اس رسالے میں علماء کی موجودہ سیاست اور منہاج سے اختلاف کرتے ہوئے ان کو تنبیہ کی گئی ہے [illegible] اس پر تعجب ہے کہ ہندوستان میں بھی ترکی اور ایران کی تاریخ دہرائی

کی کتاب سطحی ہے اور تشنہ دلبندی پر مبنی معلوم ہوتی ہے موضوع کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ زیادہ تفکر و تدبر سے کام لیا جاتا۔

ذہنی زلزلے

از مقیم صاحب صدیقی، ناشر دار الاشاعت نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن کتابت طباعت، جلد، گرد پوش اچھی۔ ۱۹۲ صفحات قیمت عہ

یہ چند تفریحی تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں نہایت کامیاب طریقے پر تہذیب و پسندیدگی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اچھوتے موضوع، نئے طرز ادا، مشاہدہ اور تصویر کشی کی صحت اور ٹیکنیک کی قدرت کے لحاظ سے اس کتاب کی تحریروں کا شمار ادب لطیف کے معیاری نمونوں میں کیا جانا چاہئے مصنف جدید ادب اردو کے داخلی پہلو سے مطمئن نہیں ہے۔ سارے انداز محض نسوانی جذباتیت کو ادب قرار دینا برا سمجھتا ہے اور اس کی جگہ خلاقیات کو ادب میں دیا وہ جگہ نہیں دی جاتی۔ مصنف کا قیام دار السلام پٹھان کوٹ میں ہے اور وہ کوثر (سابق مسلمان) کے مدیر معاون ہیں

بیل بوٹے

از مظفر حسین صاحب شمیم ناشر مکتبہ [illegible] کتابت طباعت جلد، گرد پوش اچھا، صفحات ۸۰ قیمت عہ

یہ مصنف کے ان مضامین اور افسانوں کا مجموعہ ہے جو ادبی حیثیت سے مختلف رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں اور حاصل قابل تعریف ہے

گاؤں سدھار گیت

از مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر ناشر آزاد بک ڈپو کوچہ چیلان دہلی، غیر مجلد، صفحات ۴۰ قیمت ۸/

یہ گیت دیہات کے بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے لئے لکھے گئے ہیں اور ان کی اہمیت جاننے کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ یہ "بچوں کے تحفہ" کے مصنف کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کا تعارف بھی موجود ہے۔

سرخ سویرا

از مخدوم محی الدین صاحب ناشر اشاعت گھر حیدرآباد دکن صفحات ۱۰۴ - قیمت عہ۔ کتابت، طباعت، جلد، گرد پوش اعلیٰ

یہ مخدوم محی الدین صاحب کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ صاحب موصوف ایک سرگرم عمل کمیونسٹ ہیں۔ ان کی نظموں میں اُن کے عقیدوں اور زندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔

اُردو کا سب سے بڑا شاعر مصحفیؔ | از قاضی عبد الصمد صاحب صارم۔ ناشر مصنف خود غیر مجلد صفحات ۱۴۴۔ کتابت، طباعت اچھی۔ قیمت عمر

اس میں مصحفی کے حالاتِ زندگی اور اس کے کلام پر عالمانہ تبصرہ ہے

راحت کدہ | از خواجہ عبد السمیع پال اثرؔ صہبائی۔ ناشر تاج کمپنی لاہور۔ کتابت، طباعت جلد نہایت دیدہ زیب۔

یہ جناب اثرؔ صہبائی کے کلام کا مجموعہ ہے اور اس پر خان بہادر مرزا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی نے مقدمہ لکھا ہے۔

دیہات میں تعلیم | از عبد الشکور صاحب ناشر نظامی پریس، بدایوں۔ غیر مجلد قیمت عمر

اس میں گاؤں کی تعلیم کیا ہونا چاہیے اس سے بحث کی گئی ہے۔

مشاہیر کی بیویاں | از طاہرؔ رفعت ناشر دار الاشاعت سیاسیہ حیدرآباد غیر مجلد قیمت ۱۲ر

یہ کتاب اس عنوان کا حصہ اول ہے اور اس میں مغرب کے مشاہیر کی بیویوں کے حالات لکھے ہیں جس میں میڈم اسٹالن، سنیورا مسولینی، مسز چرچل، مسز روزولٹ، پولو فرانکو اور مسز ڈی ویلرا کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب دلچسپ ہے۔

تذکرہ دار العلوم | از نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ غیر مجلد عمر ملنے کا پتہ حبیب کمپنی، حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں دار العلوم، حیدرآباد دکن کی تاریخ درج کی گئی ہے۔

افسانے اور ڈرامے

قیدخانہ | از احمد علی صاحب۔ ناشر انشاء پریس۔ دہلی۔

یہ احمد علی صاحب کے چار نئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ موصوف انھیں اپنے سب افسانوں میں زیادہ اہم سمجھتے ہیں نہ صرف افسانوی پہلو سے بلکہ فلسفی نقطۂ نظر سے بھی" احمد علی صاحب نہ صرف سخن گو ہیں بلکہ سخن شناس بھی ہیں۔ اس لئے اگر وہ یہ کہتے ہیں تو دوسروں کو بھی ان کی اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے اگرچہ ان افسانوں کا موضوع فہم عام سے کچھ بالا معلوم ہوتا ہے۔ طباعت کتابت گردپوش عمدہ۔

کارخانہ | از محمد فضل الرحمٰن صاحب۔ ناشر عبد الحق اکیڈمی حیدرآباد دکن

یہ ایک مختصر مزاحیہ ڈراما ہے۔ غیر مجلد۔ قیمت ۱۲؍

نراس | از نور الحسن صاحب۔ ناشر دی حیدرآباد بک ڈپو

یہ چھ افسانوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے، طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے۔ ۱۲؍

کنول | از اعظم کریوی صاحب، ناشر عبد الحق اکیڈمی حیدرآباد دکن

نو افسانوں کا مجموعہ ہے طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے۔ قیمت ۱۲؍

خانقاہ | از ایم اسلم صاحب۔ ناشر عبد الحق اکیڈمی، حیدرآباد دکن

نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت ۔ ۱۲؍

سادہ و رنگین افسانے | از ظفر قریشی۔ ناشر عبد الحق اکیڈمی حیدرآباد دکن۔

بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے ۔ ۱۲؍

دل کے آنسو | از رئیس احمد صاحب جعفری۔ ناشر مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی۔

چھ اچھے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ طباعت، کتابت، جلد، گردپوش اعلیٰ قسم کے ۔ ۱۲؍

حالاتِ حاضرہ

(الف) ہندوستان

مابعد جنگ کے لئے حکومت کے تعمیری منصوبے

حکومتِ ہند چاہتی ہے کہ لوگ ماضی کو بھول جائیں، حال سے غافل رہیں اور اپنی نظریں مستقبل کی طرف جمائے رکھیں۔ اس کا جو محکمہ اس وقت پروپیگنڈے کے ذریعے سب سے زیادہ عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے وہ تعمیرِ نو کا محکمہ ہے۔ منصوبہ بندی کے نئے وزیر سارے ملک کا دورہ کرتے پھر رہے ہیں اور اپنی تقریروں میں مابعد جنگ کی معاشی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں اور متعلقہ افراد اور اداروں سے مشاورت کرتے رہے ہیں۔ وائسرائے کی کلکتہ کی تقریر میں بھی جس کا نہایت بے چینی سے لوگوں کو انتظار رہتا ہے۔ موجودہ سیاسی جمود کو دور کرنے کا کوئی اشارہ نہیں تھا۔ نہ ہندوستان کو جنگ کی موجودہ مشکلوں سے بعد نجات دلانے کی کوئی امید دلائی گئی تھی بلکہ اس کی جگہ انہیں اس بات کا یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی قربانیاں دوسرے ملکوں کے مقابلے میں جو جنگ کا واقعی محاذ بنے ہوئے ہیں، بہت کم رہی ہیں اور اس بنا پر انہیں دعوت دی گئی تھی کہ وہ مستقبل میں اور زیادہ قربانیوں کے لئے تیار رہیں۔ ان کی تقریر میں اگر کوئی امید افزا حصہ تھا تو وہ مابعد جنگ کی تعمیرِ نو سے متعلق تھا۔ صنعتی کانفرنس کا جو اجلاس دسمبر کی آخری تاریخوں میں دلی میں منعقد ہوا اس کا افتتاح منصوبہ بندی کے وزیر سر اردشیر دلال نے کیا اور قدرتی طور پر ان کی تقریر کا موضوع مابعد جنگ کے تعمیری منصوبے ہی تھے۔ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر [illegible] کے خطبہ کا بھی زیادہ تر یہی موضوع تھا۔ کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں جو مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں وہ بھی زیادہ تر اسی موضوع کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق تھیں۔ غرض آج کل ہندوستان کے

پڑھے لکھے طبقہ کا موضوع بحث و گفتگو تنظیم مابعد جنگ ہے۔

اس وقت تک بہت سے منصوبے تیار ہو چکے ہیں اور بہت سے تیار ہو رہے ہیں لیکن یہ سب ایسے لوگوں کی طرف سے تیار کئے گئے ہیں جو سیاسی اقتدار کے مالک نہیں ہیں اس لئے ان کے نفاذ کی کوئی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی اور ان منصوبوں کی حیثیت موجودہ حالات میں مشوروں یا سیاسی پروپیگنڈے سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ لیکن نومبر ۱۹۴۴ء میں وائسرائے کی عاملہ کی تعمیری کمیٹی نے ترقیات مابعد جنگ کے بارے میں اپنی جو رپورٹ شائع کی ہے وہ ایک برسر اقتدار اور ذمہ دار حکومت کا منصوبہ ہے اس لئے ہماری توجہ کا سب سے زیادہ مستحق ہے حکومت ہند کے مختلف محکموں نے جو مختلف منصوبہ بندی کی ہے یہ رپورٹ اسی کا ایک خلاصہ ہے۔ یہ اس سلسلے کی دوسری رپورٹ ہے۔ پہلی رپورٹ جو فروری ۱۹۴۴ء کو شائع ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی حیثیت بھی سیاسی پروپیگنڈے سے زیادہ نہ ہو لیکن یہ ایک صاحب اقتدار حکومت کی طرف سے ہے جس کو بات کو پکڑا جا سکتا ہے اس لئے اس رپورٹ کو ایک مستند اور اہم دستاویز سمجھنا چاہیے۔ اس سے حکومت ہند کی ذہنی پرواز اور اس کے آئندہ کے منصوبوں اور پالیسیوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حکومت ہند مابعد جنگ کی تعمیری کوششوں کو کس حد تک قابل عمل سمجھتی ہے۔

اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے:۔

تنظیم مابعد جنگ کے بڑے مقاصد کو دو عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔ (الف) وہ جن کو چھوٹی مدت میں حاصل کیا جائے گا اور (ب) وہ جن کو لمبی مدت میں حاصل کیا جائے گا۔ اول کو صحیح معنی میں اصلاح و مرمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے اس کام کو بھی طویل مدت کی ترقی کی اسکیموں کے ساتھ ساتھ چلانے کی ضرورت ہوگی۔ ان میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں:۔

(۱) فوجی کام یا جنگی صنعت وغیرہ میں لگے ہوئے لوگوں کو دوبارہ اس کے کام میں لگانا

بسانا۔

(۲) زائد فوجی ذخیروں، سامانوں، زمین اور عمارتوں کو دوسرے لوگوں کو فروخت یا حوالے کرنا۔

(۳) صنعت کو جنگ کے کام سے امن کے کام میں منتقل کرنا۔

(۴) نگرانیوں کا امن کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ختم کرنا یا ان کے اندر ضروری ترمیم کرنا

(ب) لمبی مدت کی تجاویز کو زیادہ مناسب طریقے پر ترقی و توسیع کے عنوان کے ماتحت رکھا جا سکتا ہے اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں لیکن کچھ مدیں ایسی ہیں جن پر بہت سا سرمایہ لگانا ہوگا اور یہ ترقی کے لیے بصورت مجموعی بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

(۱) بجلی کی قوت کی ترقی جس پر صنعتی ترقی اور اس سے کم درجے پر زراعتی ترقی، پمپ کے ذریعے آبپاشی اور دیہاتی صنعت کا دار و مدار ہوگا

(۲) صنعت کی ترقی جس میں دولت آفریں اشیاء اور ایسی صرف کی اشیاء کی پیدائش جو عام استعمال میں آتی ہیں خاص طور پر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں چھوٹی اور خانگی صنعتوں کا تحفظ اور ان کی ترقی بھی شامل ہے۔

(۳) سڑکوں کی آمد و رفت اور نقل و حمل کی خدمات کی ہمہ گیر طریقہ پر ترقی خصوصاً دیہی علاقوں میں۔

(۴) زراعت کی ترقی اور اس کے ساتھ آبپاشی، زمین کے کٹاؤ کی انسدادی تدبیروں اور نئی زمینوں کی کاشت وغیرہ کی ترقی۔ ان کاموں میں حکومت اور نجی کمپنیوں کو بہت روپیہ خرچ کرنا ہوگا اور اس سے بہت زیادہ آمدنی حاصل ہوگی جس سے بعد میں اجتماعی خدمات کو بہ درجۂ بہتر تعمیر دیا جا سکے گی

تب اس سے بہتر صنعتی اہمیت سے تعلیم، تندرستی اور مکانات کی ترقی کی کوشش کی

اُن کے ساتھ ساتھ شروع نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسا کرنا نہ صرف جماعتی بہبود کے لئے بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تعلیم خصوصاً فنی تعلیم کو قابل لحاظ ترقی زراعت، صنعت وغیرہ کی ترقی کا ایک لازمی پیش خیمہ ہے۔ غرض اس قسم کے کاموں کو حکومت ہند نے اپنے منصوبے کے مقاصد میں داخل کیا ہے اور ان کے بارے میں تفصیلات مہیا کی ہیں۔

ابتدائی پانچ سال کے منصوبوں کو چلانے کے لئے جس قدر روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت ہوگی مالیاتی منصوبہ بنانے والوں کا خیال ہے وہ کافی مقدار میں فراہم ہو سکے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ ترقی کے کاموں کے لئے ابتدائی پانچ سالوں کے واسطے یعنی ۱۹۵۰-۵۱ء سے ۱۹۵۵-۵۶ء تک دس ارب روپے کی رقم فراہم ہو سکے گی۔ اس میں سے پانچ ارب تو میزانیہ کی توفیروں پر مشتمل ہوگی اور اس سے باقی ترقی کی ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا کام لیا جائے گا جن کا خرچ قرض لے کر پورا نہیں کیا جائے گا یا اس کے ذریعے مسلسل یا غیر مسلسل امدادیں عطا کی جائیں گی۔ بقیہ پانچ ارب کی رقم ان مرکزی اور صوبجاتی قرضوں پر مشتمل ہوگی جنہیں مرکزی حکومت لے گی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ دس ارب کی اس رقم میں قرض کی وہ رقم شامل نہیں ہے جو نجی شغل اصل کے لئے بازار میں موجود ہوگی اور جس کی مقدار کو تقریباً پانچ ارب کے برابر سمجھنا چاہئے اس طرح کل سرکاری اور غیر سرکاری رقم کی میزان جو ترقی کے کاموں میں لگائی جا سکے گی پندرہ ارب کے قریب ہوگی۔ تقریباً اتنی ہی رقم کے خرچ کا اندازہ ٹاٹا برلا کے منصوبہ بنانے والوں نے بھی اپنے منصوبے کے ابتدائی پانچ سالوں کے لئے کیا تھا۔ اس لئے جہاں تک ابتدائی پانچ سالوں میں روپئے کی مجموعی رقم کے خرچ کرنے کا تعلق ہے ٹاٹا برلا کے منصوبے اور اس سرکاری منصوبے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس منصوبے کے ایک اور پہلو پر بھی اجمالی نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔ اس منصوبے میں کس صنعت کی ترقی کو ترجیحی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اس کا صحیح تعین تو بعد میں کیا جائے گا لیکن عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ قوت محرکہ کی صنعت کی ترقی کو جو تمام صنعتی ترقی کی بنیاد ہے اور دوسری صنعتوں پر مقدم رکھا جائے گا۔ اسی طرح شروع میں ایسی دولت آفریں شغلوں کو

صنعتوں کی ترقی کو جنہیں قومی مقاصد کے لئے لازمی سمجھا جائے گا۔ اشیاء صرف کی صنعتوں کے مقابلے میں مقدم رکھا جائے گا۔ ان میں لائق ذکر حسب ذیل ہیں۔ لوہے اور فولاد کی صنعت، مشین سازی کی صنعت، مشین کے اوزاروں کی صنعت، وزنی کیمیاوی صنعتیں اور کھاد کی صنعتیں۔ لیکن توجہ اگر صرف دولت آفریں اشیاء تک محدود رکھی گئی تو اس کی وجہ سے جو زائد قوت خرید پیدا ہوگی اس کو چیزوں کے استعمال کرنے پر صرف نہیں کیا جاسکے گا۔ اس کی وجہ سے افراطِ زر پیدا ہوگا اور خریداروں کو دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس لئے ساتھ ہی ساتھ فوری طور پر استعمال میں آنے والی چیزوں کی صنعت کو بھی ترقی دینا ضروری ہوگا۔ اس قسم کی بہت سی صنعتیں ہیں جن کو جنگ کے زمانے میں نشوونما ملی ہے اور یہ امن کے زمانے کی ضرورتوں کو بھی پورا کرسکتی ہیں۔ ان کی خبرگیری کرنا ہوگی۔ اسی زمرے میں چھوٹی اور خانگی صنعتوں کو بھی رکھا جاسکتا ہے اور ان کی بھی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ انہیں چلانے کے لئے نسبتاً کم سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن ان کے ذریعے زیادہ کام کرنے والوں کو روزگار سے لگایا جاسکتا ہے۔ غرض جب منصوبہ ترقی پائے گا تو ترجیح کے مسئلے کو ان اصولوں کی روشنی میں اور ملک کے مختلف حصوں کی ضرورتوں کو ساتھ رکھ کر طے کرنا ہوگا

حکومت کی نگرانی اور ملکیت کے سوال کا رپورٹ میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ جدید خیالات کا رجحان یہ ہے کہ صنعتوں پر مملکت کی نگرانی بڑھائی جائے تاکہ نفع طلبی کی ذہنیت کو معاشرتی ضرورتوں کا پابند بنایا جاسکے۔ مملکت کا تعلق صنعت سے تین طرح کا ہوسکتا ہے (۱) مالک شریک کار کا (۲) نگرانی کرنے والے کا (۳) انتظام کرنے والے کا۔ بعض صنعتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا قومی مفاد کے پیش نظر مملکت کو مالک اور منتظم دونوں بننا پڑتا ہے۔ دوسری ایسی صنعتیں ہوتی ہیں جن کا قومی مفاد کے لئے قائم کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن جن کے لئے نجی افراد سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی صرف ملکیت، حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے اور انتظام نجی کمپنی کو سپرد کردیتی ہے۔ لیکن صنعت کے ساتھ حکومت کا تعلق عام طور پر صرف نگرانی کرنے والے

کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس نگرانی کی قسمیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ حکومت اپنی طرف سے ڈائرکٹر نامزد کر سکتی ہے، لائسنس لینا ضروری قرار دے سکتی ہے، منافع کو محدود کر سکتی ہے اور یہ نگرانی بڑھ کر پیداوار کی یا تقسیم دولت یا دونوں کی مکمل نگرانی تک پہنچ سکتی ہے۔ جن صنعتوں کے لئے حکومت کی کچھ نگرانی ضروری ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

عام فائدے کی صنعتیں، بنیادی صنعتیں اور ایسی صنعتیں جو ان کچے مالوں کو استعمال کرتی ہیں جن کی رسد قلیل ہے کیونکہ یہ صنعتیں ایسی ہیں کہ اگر ان پر نگرانی قائم نہ کی جائے تو یہ اجاروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس منزل پر اس بات کا تعین کرنا ضروری ہے کہ حکومت کن صنعتوں پر نگرانی قائم رکھے گی۔ عام طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سوائے ان صورتوں کے جہاں قومی مفاد میں نگرانی قائم کرنا ضروری ہوگا باقی تمام صورتوں میں صنعت کو مقابلہ کرنے والے نجی سرمایہ داروں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے گا۔ لیکن ان کی اتنی نگرانی ہمیشہ کی جائے گی جس سے مزدوروں کے استحصال ناجائز کا تدارک کیا جا سکے اور ان کے لئے معقول اجرت اور مہذب حالات زندگی کو یقینی بنایا جا سکے۔

دولت کی زیادہ بہتر تقسیم کے سوال کا رپورٹ میں یہ جواب دیا گیا ہے کہ ایک طرف تو غریبوں کے طبقے کو مختلف سہولتیں مفت یا کم قیمت پر فراہم کی جائیں گی مثلاً چودہ سال کی عمر تک تعلیم، طبی امداد، پانی کی فراہمی اور دوسری افادہ کی چیزیں جن میں بجلی کی طاقت بھی شامل ہے مفت یا کم قیمت پر فراہم کی جائیں گی۔ ان کے علاوہ اور کارکردگی میں جو عام بہتری پیدا ہوگی اس کا بھی اثر ان کی معاشی بہتری پر پڑے گا۔ دوسری طرف ان کے لئے منصفانہ شرائط حاصل کرنے (یعنی معقول اجرت، زچگی اور بیماری کے زمانے میں امداد، رخصت با تنخواہ وغیرہ) کے لئے خاص قوانین بنائے جائیں گے۔ صنعتوں کو جس طریقے پر توسیع دی جائے گی اس کا بھی یہ اثر ہوگا کہ پیدائش دولت کے ذرائع کی ملکیت لوگوں کی زیادہ کثیر تعداد کے ہاتھ میں پہنچ جائے گی۔ بڑی صنعتوں کے معاملے میں بھی، چونکہ ان کے منافع کے بڑے حصے کو کاروبار کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے دوبارہ صنعت میں لگانا ہوگا، اور اس کام کے لئے ان کی نگرانی کرنا اور ایک حد تک ان پر محاصل لگانا ضروری ہوں گے۔ اس لئے اس کا بھی یہ اثر ہوگا کہ دولت چند ہاتھوں کے اندر مجتمع نہ ہو سکے گی۔ چنانچہ موجودہ

زمانے میں جو بدترین افلاس اور زبردست دولت مندی کا نہایت نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ باقی نہیں رہے گا۔

اس کے علاوہ حکومت پس ماندہ طبقوں اور فہرست میں درج کی ہوئی ذاتوں کی حالت کو بہتر کرنے کی بھی خاص طور پر کوشش کرے گی۔ عام اجتماعی سہولتوں سے انھیں خاص طور پر مستفید ہونے کا موقع دیا جائے گا اور جہالت اور غربت کی وجہ سے انھیں جن ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے انہیں تعلیمی سہولتیں، زمین کے عطیات، وظیفے، دارالاقامے، بہتر پانی کا انتظام وغیرہ فراہم کرکے دور کیا جائے گا۔

آخر میں منصوبے کی مدت اور اس کی ترقی کی رفتار کے بارے میں رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ منصوبہ بندی کی موجودہ ابتدائی منزل میں اگرچہ عمل کو زیادہ ٹھوس اور معین شکل میں پیش کرنا تو ممکن نہیں ہے لیکن ارادہ یہ ہے کہ ایک کل ہند منصوبہ مجمل طور پر زیادہ طویل مدت کے لئے پیش کیا جائے اور دوسرا زیادہ مفصل منصوبہ پانچ سال کے لئے تیار کیا جائے۔ طویل مدت کے منصوبے عام طور پر پندرہ سال کے لئے ہوں لیکن بعض کاموں کی مخصوص ضرورتوں کا خیال کرتے ہوئے یہ زیادہ طویل مدت کے لئے بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر تعلیم کے لئے مرکزی مشاورتی بورڈ کا منصوبہ چالیس سال کے لئے بنایا گیا ہے۔ سڑکوں اور سڑکوں کی نقل و حمل کی ترقی کا منصوبہ دس سال کے لئے ہے۔ زراعت کے لئے جو منصوبہ فی الحال بنایا گیا ہے وہ پندرہ سال کی مدت میں دس عرب روپیہ خرچ کرکے زراعت کی آمدنی کو دوگنا کرنا چاہتا ہے۔ صنعتوں کے لئے ابھی تک کوئی ابتدائی منصوبہ بھی نہیں بنایا جا سکا ہے۔ کیونکہ صنعتی رہنماؤں سے جو معلومات طلب کی گئی تھیں وہ ابھی تک موصول نہیں ہوئی ہیں۔ لیکن صنعتوں کی زیادہ سے زیادہ ترقی کا جو امکان نظر آتا ہے اس کے تحت ابتدائی پانچ سالوں میں جس قدر روپیہ صرف کرنے کی ضرورت ہوگی، امید ہے کہ اس کا انتظام کیا جا سکے گا۔ صنعتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں یہ ہیں کہ ماہر اشخاص اور ضروری سامان و سامان فراہم نہ ہو سکیں گے اس کے علاوہ لوگ فردی نگرانی اور محاصل کو برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔

لیکن اگر سب حالات موافق ہوئے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ صنعتی ترقی کی رفتار گیہوں زراعتی ترقی سے بہت زیادہ تیز نہ ہوگی۔

غرض حکومت ہند کا منصوبہ فی الحال اسی منزل تک پہنچا ہے۔ ابھی اُسے اور بہت سی منزلوں سے گزرنا باقی ہے۔ لیکن منصوبہ بندی کے بہت سے کام ایسے ہیں جن کا موجودہ جنگ کے زمانے میں آغاز ہو چکا ہے اور ان کا جنگ کے بعد صرف جاری رکھنا ضروری ہوگا۔ اب اگر فوجی تیاری اور لڑائی جیتنے کے مقصد کو سامنے رکھ کر معاشی تنظیم کی جا رہی ہے تو آئندہ ہندوستان کے لوگوں کا معیارِ زندگی بصورتِ مجموعی بلند کرنے اور ہر شخص کے لئے روزگار مہیا کرنے کے لئے اسی تنظیم کو جاری رکھنا ہوگا اور صنعت و تجارت، زر اور ساہوکارے، مبادلہ اور خارجی تجارت پر جو بہت سی نگرانیاں اس وقت قائم ہیں، انھیں برقرار رکھنا ہوگا۔

حکومت ہند کی یہ تجاویز کسی انقلابی پروگرام کو پیش نہیں کرتیں بلکہ اصلاحی اور تدریجی ترقی کی حامل ہیں۔ لیکن انھیں بھی کس حد تک عملی جامہ پہنایا جاسکے گا اور اس کو نافذ کرنے کا کام کون اپنے ذمے لے گا۔ موجودہ حکومت ہند جو کسی سیاسی جماعت کی نمائندہ نہیں ہے یا کوئی اور ــــ یہ مسئلہ ابھی تک مشتبہ ہے اور جب تک یہ بات مشتبہ رہے گی اس وقت تک ان منصوبوں پر زیادہ اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ (۲۶ جنوری ۱۹۴۵ء)

ممالک غیر

۱۹۴۴ء اتحادیوں کے لئے کامیابی کا سال تھا، مگر وسط دسمبر میں جرمنوں کے حملے نے بہت سی تدبیریں الٹ دیں اور اُمیدوں کا خون کر دیا۔ حملہ اچانک ہوا بہت سخت تھا، اور ایسے موقع پر کیا گیا جب اتحادی اور خاص طور پر برطانوی سیاست کے لئے جنگ کا کامیابی کے ساتھ جاری رہنا بہت ضروری تھا۔ مسٹر چرچل چاہتے تھے کہ اٹلی میں مارشل بدولیو کی حکومت رہے، وہ نہیں رہ سکی، برطانیہ کے اصرار پر صرف اتنا ہوا کہ کاؤنٹ سفورزا ئی وزارت میں شامل نہیں کئے گئے۔ پھر بلجیم میں فساد ہوا بعض لوگ کہتے ہیں کہ بلجیم کی ترقی پسند پارٹیوں نے خود ہی اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کر دیئے۔ بعض کا خیال ہے کہ بلجیم کے وزیر اعظم موسیو پیرلو کے کچھ بنائے نہ بنتی اگر جنرل ارسکن بلجیم کی محافظ اتحادی فوج کے سپہ سالار اور برطانوی سیاست کے مقامی نمائندے اپنی قوت کا مظاہرہ اور ارادوں کا اعلان کرتے۔ سب سے نازک مسئلہ یونان کا تھا۔ غالباً مسٹر چرچل یونان کے بادشاہ سے وعدہ کر چکے ہیں کہ یونان میں کوئی سیاسی انقلاب نہ ہونے دیں گے۔ لیکن ایسے وعدے نہ کئے گئے ہوتے تب بھی برطانیہ یونان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے پر مجبور ہوتا۔ ترکی نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنی سیاست میں اپنے ہی مفاد کا ہی خیال رکھے گا، کسی کے اثر میں نہ رہے گا، روس نے رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ بالکل اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ اگر یونان اور اُس کے ساتھ کریٹ کا جزیرہ بھی برطانیہ کے اثر سے نکل جاتا تو مشرقی بحیرۂ روم میں برطانیہ بہت کمزور پڑ جاتا اور مصر، فلسطین اور شام کی سیاست اور سویز کی حفاظت برطانیہ کے قدرتی یا خداداد حقوق میں شامل نہ رہ سکتی۔ یونان میں دخل دینا اس سے بھی لازمی ہو گیا کہ وہاں کی ترقی پسند ایلوس پارٹی کمیونسٹ ہے اور غالباً اس کے روس سے تعلقات بھی ہیں۔ ایلوس پارٹی اور برطانوی فوج کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تھی اور شدت پکڑتی جاتی تھی جب [illegible] نے مغربی محاذ پر حملہ کر کے اس اعتبار کو بہت کمزور کر دیا جو اتحادیوں کو اپنی فوجی [illegible] تھا۔

جرمن حملے کی نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہت پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔ جرمن درحقیقت اپنی سرحد کے قریب پہنچ کر ہی لڑنا چاہتے تھے۔ نورمنڈی میں جو جنگ ہوئی اس کا ایک مقصد یہ ضرور ہوگا کہ اتحادیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا جائے، لیکن جرمن ہائی کمانڈ کو معلوم ہوگا کہ یہ مقصد پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ ضمنی قرار دیا گیا ہوگا، اور اتحادیوں کو صرف اتنے عرصے تک روکنے کی کوشش کی گئی ہوگی کہ جرمن فوجیں فرانس سے ہٹائی جائیں۔ اتحادیوں کی قوت اور جنگ کے اتفاقات کو دیکھتے ہوئے یہ کارروائی بغیر کسی بڑے نقصان کے عمل میں آئی، مگر یہ تھی بہرحال پس پائی، اور اس نے یہ خیال پیدا کیا۔ مسلسل محاذ قائم ہونے کے بعد کی اتحادی کامیابیاں تقویت پہنچاتی رہیں کہ جرمنی میں پیش قدمی کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ اتحادی ایسا محاذ بنا سکتے تھے کہ جو حملہ اور مدافعت دونوں کے لئے مناسب ہوتا۔ لیکن اس سے اُن کی پیش قدمی کی رفتار بہت سست ہو جاتی۔ انھوں نے جنگ کی تنظیم میں پیش قدمی کی ضروریات کا زیادہ لحاظ رکھا اور شاید اس خطرے کو نظر انداز کیا کہ جرمن اُن کے محاذ کو توڑ بھی سکتے ہیں۔ جرمن ہائی کمانڈ اس حقیقت سے واقف تھا اور اس نے ان تمام موقعوں سے فائدہ اٹھانے کی تدبیریں کیں جو اچانک اور کامیاب حملہ پیدا کر سکتا ہے۔ طاقتور ہوائی بیڑے، نئی توپوں اور ٹینکوں کے علاوہ پیرا ٹروپوں سے بھی کام لیا گیا، اتحادی محاذ کے پیچھے جرمن جاسوس پہنچائے گئے، امریکی فوجوں کی جو لاریاں، موٹر، توپیں اور دوسرا سامان قبضہ میں آیا وہ فوراً اُن کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اور بعض موقعوں پر امریکی سپاہیوں اور فوجی سرداروں کو یہ طے کرنا بہت مشکل ہوا ہوگا کہ وہ اپنے آدمیوں پر گولی چلا رہے ہیں یا دشمنوں پر۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جرمنوں نے لکسمبرگ اور جنوبی بلجیم میں اتحادی محاذ کو توڑ دیا اور پچیس تیس ڈویژن اس کے پیچھے پہنچ دیئے۔ اتحادی انھیں روک نہ پاتے تو یہ شمال کی طرف مڑ کر جنرل منٹگمری اور ہاجز کی فوجوں کی پشت مار سکتے تھے، یا جنوب کی طرف گھوم کر جنرل پیچ اور جنرل پیٹن کی فوجوں کو گھیر لیتے تھے۔ جنوبی بلجیم میں جرمن دریائے میوز کے کنارے پر پہنچ گئے، لیکن انھیں روکنے کے لئے شمال و جنوب کی اتحادی فوجوں کے حصے

بڑے حصے کو ادھر بھیجنا پڑا اور اس کی وجہ سے یہ دونوں محاذ بھی کمزور پڑ گئے۔ جنوری کے پہلے ہفتے میں جرمنوں نے دریائے زار کی طرف پیش قدمی شروع کی اور جنرل پٹن کی نوجوں کو گھیرے میں پکڑ لیا۔ اسی کے ساتھ بالکل جنوب میں فرانسیسی کچھ اور پس پا کر دئے گئے۔ آردن کی پہاڑیوں، یعنی بلجیم میں جرمنوں پر دو طرف کی مار پڑ رہی ہے۔ لیکن انھوں نے اس علاقے پر قبضہ کرتے ہی ایسی مورچہ بندی کر لی کہ اتحادی نوجوں کو قدم قدم پر لڑنا پڑا اور ان کی رفتار اتنی سست ہو گئی کہ محصور جرمنوں کا صفایا کر دینے کا کوئی سوال نہیں رہا۔ اتحادی فوج اپنے ہوائی بیڑے پر بہت بھروسا کرتی ہے اور یہ بیڑا موسم کی ناموافقت کی وجہ سے کوئی خاص مدد نہیں پہنچا سکا۔ چونکہ مختلف اتحادی فوجوں کے درمیان ایسا یقینی تعلق نہیں رہا تھا کہ ایک مرکز سے احکامات جاری کئے جا سکیں اس لئے وہ تین حصوں میں تقسیم کر دی گئی ہے جو بڑی حد تک اپنے اپنے طور پر لڑیں گے۔ برطانیہ کے اخبار اتحادی سرسپہ سالار جنرل آئزن ہاور پر ایسے اعتراضات کر رہے ہیں کہ ممکن ہے خطرہ دور ہونے کے بعد۔ یا اس کے بڑھ جانے پر۔ ان کی جگہ کوئی اور مقرر کیا جائے۔

اتحادیوں کے لئے یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ یورپ کی سیاست میں پیچ پڑنے اور جنگ میں ناکامی کے ساتھ ہی برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گئے یا اگر وہ پہلے سے موجود تھے تو ان کی شدت بڑھ گئی۔ انگریزوں کو اندیشہ ہے کہ امریکہ دنیا میں اپنا معاشی تسلط قائم کر رہا ہے؛ امریکن اس کی شکایت کر رہے ہیں کہ برطانیہ، روس اور فرانس بھی یورپ کو سیاسی حلقوں میں تقسیم کر کے بین اقوامی نظام کی تجویزوں کی پہلے ہی سے جڑ کاٹ رہے ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ لڑائی ختم ہوتے ہی وہ متحدہ ریاستوں کو یورپ کی سیاست سے الگ کر دیں گے۔ متحدہ ریاستوں کے وزیر خارجہ سٹے ٹی نیس کئی مرتبہ اپنی حکومت کی طرف سے ایسے موقعوں پر متحدہ ریاستوں کی غیر جانب داری کا اعلان کر چکے ہیں جب برطانیہ کسی ملک کی اندرونی سیاست میں مداخلت کر رہا تھا، اور امریکہ کے ایک ممتاز نامہ نگار ڈریو پیرسن کا بیان ہے کہ یونان کے بارے میں پریزیڈنٹ روزولٹ اور مسٹر چرچل کے درمیان خاصے سخت الفاظ میں بذریعہ تار گفتگو ہوئی۔ غالباً ڈریو پیرسن

کے ہاتھ میں ایسی تحریریں پہنچ گئیں جو صیغۂ راز میں تھیں اور جن کے اقتباس شائع کرکے اس نے انھیں اور بھی سنسنی خیز بنا دیا۔ اختلافات سے بہرحال کوئی انکار نہیں کرتا۔

ادھر پولینڈ میں لبلن کی قومی کمیٹی نے اعلان کیا ہے کہ پولینڈ کی وقتی مگر باضابطہ حکومت وہی ہے اور روس نے اس کی اس حیثیت کو تسلیم کرلیا ہے برطانیہ اور متحدہ ریاستیں پولینڈ کی جلاوطن حکومت سے، جس کا مرکز لندن میں ہے، کئی مسائل میں اتفاق نہیں کرتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جلاوطن حکومت سے قطع تعلق کرلیں گی، صرف اس لیے کہ لبلن کمیٹی کی خواہش ہے کہ وہ ایسا کریں اور روس نے اس خواہش کو برحق مان لیا ہے۔ اتحادی پولینڈ کی جلاوطن حکومت کا ساتھ اس وجہ سے بھی نہیں چھوڑ سکتے کہ متحدہ ریاستوں میں پولستانی امریکن بڑا اثر رکھتے ہیں اور وہ جلاوطن حکومت کے حامی ہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جلاوطن حکومت کی حمایت کیسے کی جائے گی کیا مسٹر چرچل اس کی خاطر پولینڈ میں ایک برطانوی فوج اتاریں گے۔

اتحادیوں کے مقابلے میں روسی سیاست زیادہ یکسوئی اور کامیابی کے ساتھ اپنے منصوبوں پر عمل کرتی رہی ہے لیتھویہ اور ستھونیا کے ایک چھوٹے سے حصے کے سوا روسیوں نے ان تمام علاقوں کو فتح کرلیا ہے جن پر وہ براہ راست حکومت کرنا چاہتے ہیں اور رومانیہ، بلغاریہ اور یوگوسلاویہ آزاد ہوکر روس کے حلقۂ اثر میں شامل ہوگئے ہیں۔ لیکن جرمنوں کے خلاف جنگ کرنے میں روسیوں کو ویسی مسلسل کامیابی نہیں ہوئی ہے جیسی کہ خبروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ روسیوں نے مشرقی پرشیا، وسطی پولینڈ، لیتھویہ اور معلوم ہوتا ہے اب بوداپسٹ کے شمال مغرب میں بھاری شکستیں کھائی ہیں اس وقت تک جرمن میدان کی وسعت کے سبب سے پسپائی پر مجبور تھے اور وہ اس وجہ سے بھی پورا مقابلہ نہ کرسکے ہوں گے کہ جنگ کی نوعیت بدل رہی تھی اور اس کی مناسبت سے تنظیم کرنے کی ضرورت پیدا ہوگئی تھی۔ اب نئی تنظیم مکمل ہوگئی ہے، شاید جنگ کے لیے نیا سامان بھی تیار ہوگیا ہے اور اب دیکھنا ہے کہ روسی کس محاذ پر اور کس طریقے سے اپنا زور دکھاتے ہیں۔

کوہیما کی داستان



ٹوجو کے فوجی چندوِن کو پار کر آئے اور آہستہ آہستہ چھپتے چھپاتے کوہیما اور ناگا کی پہاڑیوں تک پہنچ گئے۔ انہوں نے کوہیما کے ارد گرد چند چوٹیوں پر قبضہ کر لیا۔ ناگا لوگ اپنے گاؤں سے باہر نکال دیئے گئے۔ ان کے گھر جلا دیئے گئے۔ جھونپڑیاں مسمار کر دی گئیں۔ ان کے جانور، مرغی، غلے اور فصلیں لوٹ لی گئیں۔ یہ جاپانیوں کے بقول "ہندوستان پر چڑھائی" تھی۔

حالات تیزی سے بدلتے گئے۔ آپ کو یہ نام یاد ہوں گے۔ جیل کی پہاڑیاں، جی پی ٹی چوٹی، نیب ہیں، ذری جونی پہاڑ اور سب سے آخر ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ۔ یہ بڑی سخت لڑائی تھی۔

مگر ہمارے آدمیوں نے، دشمن کی کہیں بھاری تعداد کے مقابلے میں، نہ صرف حملے کو روک دیا بلکہ آخر کار عظیم جوابی کارروائی کر کے شاندار فتح حاصل کر دکھائی۔



قومی جنگی محاذ نے شائع کیا

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

| جلد ۴ نمبر ۱ | بابت ماہ جنوری ۵۱ سنہ ء | سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر |

فہرست مضامین

مطالعۂ اسلامیات کا مستقبل

(یہ آنریبل سر محمد عزیز الحق صاحب کامرس ممبر حکومت ہند کے اس مقالہ کا ترجمہ ہے جو مرحوم نے "انڈیا سوسائٹی" لندن کے ایک اجلاس منعقدہ ۱۹۶۶ء کے لئے لکھا تھا)

(ایڈیٹر)

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے عرب میں ایک شخص پیدا ہوا۔ عرب ـــــ وہ ملک ہے جو ابتدائے آفرینش سے، اپنے وسیع، بے آب وگیاہ ریگستانوں، اور جلی بھنی، خشک پہاڑیوں کے لئے مشہور رہا ہے۔ اس کے دشوار گذار صحراؤں میں البتہ کہیں کہیں خیابانوں کے قطعے خال خال دیکھنے میں آجاتے ہیں جن سے، انسانی نظر تھوڑی بہت آسودگی حاصل کرسکتی ہے ـــــ پیغمبر اسلام کی بعثت سے پہلے یہ خطۂ زمین۔ قبائلی عصبیت اور مسلسل خانہ جنگی کی ایک خونی آماجگاہ بنا ہوا تھا باشندے جہالت کی تہہ در تہہ تاریکیوں میں گھرے ہوئے۔ نہایت ہی مضحکہ انگیز توہمات کا شکار تھے، اس کیفیت میں مکہ کا وہ بے یارومددگار انسان ـــــ جس کے سر سے باپ کا سایہ پیدائش کے وقت ہی اٹھ چکا تھا، جو صرف چھ برس کی عمر میں آغوشِ مادری سے محروم ہوگیا۔ جس کی ایذا رسانی کے لئے اپنے اور بیگانے مستعد تھے۔ یہاں تک کہ جسے اپنے وطن اپنی ولادت گاہ تک کو خیرباد کہنا پڑا ـــــ کوہ حرا کے مقدس غار سے نکلا اور دنیا کو ـــــ انسانیت کو اُمید و یقین کا ایک آسمانی پیغام دیا۔ اس واقعے کو تقریباً چودہ سو سال گذر چکے ہیں۔ انسانی تاریخ کے اس طویل عرصۂ وقت میں، افراد اور ان کی ذہنیتیں، اقوام و ممالک ـــــ ملتیں اور ان کے تمدن، کئی انقلابات سے دوچار ہوئے، کئی صورتوں میں سے ہوکر گذرے لیکن عمل و یقین کا وہ بنیادی سانچہ ابھی تک وہی ہے جو پیغمبر اسلام نے تجویز فرمایا تھا، اور زندگی اخلاق کا وہ ضابطہ ـــــ وہ دستور العمل جو بانئ اسلام نے پیش فرمایا تھا۔ اب تک ایک زندہ

اور کارفرما قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ایک ایسے دور میں جبکہ دنیا کی ہر قوم اپنی ہمعصر ہر دوسری قوم کو وحشی محض سمجھتی تھی، اس نے عالمگیر انسانی اخوت، اور بین الاقوامی برادری کی آواز اٹھائی اس نے سود خواری کی چاہے وہ کسی شکل میں ہو پرزور مذمت کی اور اُسے سوسائٹی کے حق میں ایک مہلک ترین لعنت قرار دیا، شادی اور ازدواجی زندگی کے قواعد و ضوابط مرتب کئے، اس صورت میں کہ شرعی تقاضوں کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک مرد ——— ایک وقت میں صرف ایک ہی بیوی رکھ سکے۔ لیکن اختلافِ واقعات، نیز فطرت کے گوناگوں تقاضوں کے پیشِ نظر، جہاں ممکن یا ضروری ہو، وہاں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت بھی دیدی گئی۔ تاکہ یہ قوانین سوسائٹی کی ہر سطح، ہر معیار، ہر ضرورت، ہر تقاضے کا ساتھ دے سکیں ——— ازدواجی کشیدگیوں، پیچیدگیوں، اور الجھنوں کو حل کرنے کے لئے طلاق کو روا رکھا گیا

بین الاقوامی اجتماعیات کے فوائد و اہمیت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے ہر صاحبِ توفیق مسلمان پر یہ فرض کر دیا گیا کہ کم از کم ایک بار "حج" کی تقریب پر وہ اپنے دوسرے بھائیوں سے ملاقات کرے ——— ان احکام کی پوری پوری تعمیل ہوئی، در لطف یہ کہ اُن کی پشت پر نہ تو کسی سلطنت کی طاقت تھی اور نہ کسی حکومت کا کوئی قانون۔

ایک مختصر سی مدت میں، انسانی ذہن و خیال کی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب رونما ہو گیا اور ایک بالکل جدید نظام کی طرح پڑ گئی ——— ایک دوسرے سے الگ مختلف ملکوں، متحارب فرقوں، متضاد سیرت، اور متصادم مفاد رکھنے والی قوموں ——— اور ایسے لوگوں کو جو روایات و تاریخ، زبان و ادب، عادات، اطوار، رنگ و نسل غرض ہر چیز میں اختلاف رکھتے تھے، نہ صرف یہ کہ انھیں ایک مشترکہ نصب العین پر لاکر مجتمع کر دیا، بلکہ ان میں بین الملی محبت کا وہ غیر فانی احساس بیدار کر دیا جس نے ان متضاد عناصر کو ——— طرزِ فکر و خیال، اصولِ معاشرت و معیشت، تصوراتِ اخلاق و سیاست حتیٰ کہ عقلی و ذہنی رجحانات کی، ایک عالمگیر مشترکہ

لڑی میں پرو دیا۔ زمانۂ قدیم کی ہر مستحسن خصوصیت کو محفوظ کیا گیا۔ افراد و اقوام میں زندگی و حرارت کی ایک برقی رو جاری و ساری ہو گئی۔ مشرق اور مغرب ہم آغوش ہو گئے۔ یونانی اور رومی، ترک اور تاتاری چینی اور ایرانی، ہندوستانی اور مصری، ہسپانوی اور بربری۔ گویا ہر شخص کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ارسطو، افلاطون، سقراط کے علاوہ کئی جلیل القدر حکماء جنہیں دنیا قطعاً فراموش کر چکی تھی ——— اُن کے علم و حکمت کا دوبارہ احیاء کیا گیا اور اُنھیں حیاتِ جاوید بخشی گئی۔ فکری مسائل پر ایک بالکل اچھوتے انداز میں غور کیا گیا جس سے موجودہ علوم فلسفہ و منطق، ریاضی و مساحت، رمل و نجوم، طب و حکمت اور ادب اور آرٹ کے جدید ترین نظریات کی بہت کچھ نشو نما ہوئی۔ یقین و ایمان کی وہ برق جہندہ بار جس نے تاریخ انسانی کے اس تاریک ترین دور میں دریائے "گنگس" کے کنارے سے لے کر سواحل بحر اٹلانٹک تک نور ہی نور کر دیا تھا، اس کی تیز رو کرنیں، نیل، دجلہ، اور فرات پر سے گزرتی ہوئیں، گنگا کی زرخیز وادیوں، اور ہوانگ ہو کے زرد ہی میدانوں تک پھیل گئیں۔ یہ روشنی اسلام کی روشنی تھی۔ جو اب بھی کرۂ ارضی کے ہزار ہا کروڑوں مرد۔ عورتوں کے سینوں میں ایک روشن قندیل کی طرح لرز رہی ہے ——— زندگی کو دیکھنے کا مخصوص زاویۂ نگاہ، اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی اسلامی بصیرت ——— مسلمانوں کے اخلاقی، اور ذہنی رجحانات ——— انسانی تمدن اور زندگی کے ہر شعبہ مثلاً اصول سیاست و حکومت، ضوابط معیشت و اقتصادیات، قواعد اخلاق و معاشرت کو ایک خالص اسلامی کلچر میں ڈھالتے چلے گئے۔

قریباً چودہ سو برس سے مسلمانوں کا یہ مخصوص کلچر علی حالہٖ قائم ہے۔ یہ درست ہے کہ اس اثنا میں بعض نئی تہذیبوں نے آنکھیں کھولیں، کئی جدید تمدنوں کا اجرا ہوا، لیکن نہ تو اسلامی کلچر کی صورت مسخ ہو سکی نہ یہ کسی دوسرے تمدن میں مدغم ہو سکا۔ موجودہ تہذیب ——— انسانیت کی نسبت کوئی ایسا تمدنی نظریہ دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی جو بنیادی طور پر اسلامی تصورات تمدن میں شامل نہ ہو۔ درحقیقت یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ موجودہ تہذیب و تمدن کی ترقی و

تکمیل ان اسلامی نظریات کا بہت کچھ عمل دخل ہے۔ روح کی داخلی خلش اور بیرونی زندگی کی ناگزیر ضرورتوں کے درمیان اسلام نے ایک ایسا تطابق دریافت کیا جو انسانی فراست و صلاحیت کے اعتبار سے بالکل ممکن العمل ہے۔ اسلام کی عالمگیر تعلیم مساوات و اخوت نے مشرق و مغرب کو محبت اور بھائی چارے کے ایک اچھوتے تجربے سے آشنا کیا۔ صدیاں بیت گئیں، مگر اسلامی فلسفہ و عقائد کی حیثیت و حقیقت اب تک وہی ہے اور اب بھی کروڑوں قلوب اس کی گرمی سے حرارت اندوز ہو رہے ہیں۔

۱ میرے لئے قطعی طور پر ناممکن ہے۔ اس تھوڑی سی فرصت میں اسلام کے ان عظیم اثرات اور وسیع کلچرل تسخیرات کا کوئی سرسری سا تذکرہ بھی کرسکوں جو اس نے ساری دنیا پر چھوڑے۔ البتہ میں آپ کی توجہ کو تھوڑی دیر کے لئے ان نقوش کی طرف منعطف کرنا چاہتا ہوں جو ہندوستان کی کلچرل تاریخ میں اسلامی یادگار کے طور پر محفوظ ہیں۔ ان آثار کا تذکرہ میں نہایت مختصر طور پر کروں گا۔

آئیے سب سے پہلے ہم مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت پر ذرا غور کرتے ہیں۔ انسانی حقوق کی تقسیم —— ذات پات اور پیدائش کی تفوق و فضیلت پر موقوف تھی۔ مذہبی کتب کے مطالعے کی صرف خاص خاص گروہوں کو اجازت تھی۔ عوام الناس کو ان سے دور رکھنے کے لئے وضع دار کڑے قوانین موجود تھے۔ کچھ عرصے پہلے سے بدھ مت نے ہندو ازم کی ترقی کو روک دیا تھا۔ دونوں مذہبوں میں ایک نہایت تلخ اور زبردست مسابقانہ کشمکش شروع ہو گئی۔ دن بدن ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہندو ازم ایک تنکے کی طرح اس نئے طوفان میں بہہ جانے کا ہی ہوا۔ تھوڑے عرصے میں ہی ہندو ازم صرف گنگا کے ساحل کی ترائی میں سمٹ کر رہ گیا۔ چنانچہ کچھ مدت کے بعد جب بنگال کے ایک راجہ نے بنگال میں ہندو ازم کو دوبارہ رائج کرنا چاہا تو اسے اس کام کے لئے اپنے ملک میں ایک برہمن بھی نہ مل سکا۔ اور اسے قنوج سے پانچ برہمن خاص طور پر منگوانا پڑے —— لیکن یہ کیفیت بہت دیر تک قائم نہ رہ سکی اور آخرکار ہندو ازم نے بدھ مت کو ہندوستان کی سرحد سے باہر دھکیل دیا۔ مذاہب کی اس آویزش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ذات پات کی پابندیاں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئیں۔

مسلمانوں کے ورود کے وقت ہندوستان بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا؛

یہ ریاستیں آپس میں ہمیشہ لڑتی بھڑتی، اور ایک دوسرے کے خلاف خوفناک سازشوں میں شریک ہوتی رہتی تھیں۔ ملک میں ہر طرف بے امنی، بد نظمی، افراتفری اور بے ترتیبی کا دور دورا تھا، یہ محسوس ہوتا تھا، گویا ہندوستان ایک ملک ہی نہیں۔ قنوج اور راشٹر کوٹ، جے چند اور پرتھوی راج ایک دوسرے سے گتھ رہے تھے۔ ایک طرف شمالی ہندوستان کی راجپوت ریاستیں مسلمان حملہ آوروں کو روکنے کے لیے جمع ہو رہی تھیں، دوسری طرف مسابقت کی خاطر راٹھوروں اور چوہانوں میں خونریز جنگیں ہو رہی تھیں۔ غرضیکہ انتشار اور بدنظمی کی ایک کیفیت تھی جو ملک میں ہر طرف طاری تھی۔

یہ ریاستیں تو ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں ہی، لیکن ان کے باشندے اور بھی زیادہ متفرق و پریشان تھے، ایک دوسرے کے دشمن، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اسی حالت میں مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے، اور اپنے ساتھ باہمی محبت، اخوت، اور بھائی چارے کی تعلیم لائے اور اسے تاریخ کا عجیب سمانی اتفاق سمجھئے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی اسلامی حکومت غلاموں کے خاندان نے ہی قائم کی۔ جس کا سب سے پہلا تاجدار ایک غلام ہی تھا اس کا یہ مطلب ہوا کہ اسلام کے تمدنی دائرے میں ایک معمولی غلام کے لئے بھی یہ گنجائش ہے کہ وہ بلند تک بن سکے۔ یہ پہلا سبق تھا جو اسلام نے ہندوستان کو دیا۔

مسلمان کچھ مستحکم ہوئے تو انھوں نے ہندوستان کی "وحدت ملکی" کی تشکیل کی، اور اس کا نام ہندوستان رکھا —— یہ امر بجائے خود کچھ کم قابلِ ذکر نہیں کہ ایک مشہور نسل کی ایک قوم جس کی غارتگری نے ایشیا اور یورپ کے اکثر حصوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اسلام قبول کرتے ہی اس میں ایسا انقلاب ہو گیا کہ جب وہ ہندوستان کے فاتح کی حیثیت سے ہندوستان میں نمودار ہوئی، تو وہی "اُجڈ، خانہ بدوش، اور بے رحم قوم —— علم و ادب، فن اور آرٹ کی سرگرم سرپرست نظر آتی ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ حکومت کا دور اس حقیقت کی ایک زریں یادگار ہے —— ہندوستان میں مسلمانوں کی قیادت و حکومت کے مراکز، دہلی، آگرہ، الہ آباد، لکھنؤ، حیدرآباد اور گولکنڈہ وغیرہ میں قائم ہوئے لیکن وہ ہمیشہ قلت میں ہی رہے۔ شاہانِ اسلام کی سرپرستی میں ہندوستان کی سوشل اور علمی زندگی

کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ علم و ادب کو فروغ ہوا۔ ریاضی، طب، فن تعمیرات وغیرہ میں نئے نئے تجربات کامیابی کے ساتھ کئے گئے۔ سڑکیں، پل اور آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر ہوئیں۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کو بے حد ترقی دی گئی۔ صوبوں کی نئی تشکیل کی گئی۔ سلطنت کا سارا نظم و نسق دیوانی اور فوجداری ——— ایک طے شدہ ضابطے کے ماتحت ترتیب دیا گیا۔ جگہ جگہ مکاتیب و مدارس جاری کئے گئے جن میں ہر مذہب و ملت کا طالب علم داخل ہو سکتا تھا۔ ہندوؤں کا مقدس مذہبی لٹریچر ——— ہندوستان کا بہترین ادبی خزانہ ——— متداول زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ حکومت کے کارکنان انتظام کے انتخاب میں قوم یا ذات کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ فوج کے اکثر اعلیٰ عہدے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے۔ محکمۂ مال کے کلکٹر اکثر ہندو ہوتے رہتے تھے۔ مسجدوں اور مندروں کے نام یکساں فراخدلی کے ساتھ جاگیریں لگائی جاتی تھیں۔ مشاہیر ادب و فن کو ایک جیسے احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ موجودہ ہندوستان ——— جو ہندوستان آج ہم دیکھ رہے ہیں ——— یہ بہت کچھ مسلمانوں کی مسلسل کاوشوں اور مخلصانہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

یہاں فقط ہندوستان پر اسلام کے گوناگوں احسانات کا ایک ہلکا سا عکس پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ عالم پر بھی مسلمانوں کے اثرات کچھ کم نہیں ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کے عقائد و مسلمات میں مساوات کو جو بنیادی حیثیت حاصل ہے یہ اسلام ہی کا بخشا ہوا تصور ہے۔ یہ ایک مانی ہوئی تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام نے ابتدا ہی سے جمہوریت و مساوات کو وسیع انسانی تعلقات کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اس چیز کے تحفظ و استحکام کے لئے دنیا کو کئی خونیں انقلابات اور ہولناک جنگوں میں سے گذرنا پڑا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس اصول کو پورے طور پر منوانے کے لئے ابھی اور کوئی جنگ نہیں ہوگی؟ ——— لیکن کئی صدیاں پیشتر جب اس وقت کی سوجھ بوجھ والی دنیا کے خیال میں اس تصور کا گذر تک ناممکن تھا، اسلام نے دنیا پر اصولِ مساوات کی تقدیس و اہمیت کو پورے طور پر ظاہر کر دیا تھا، اسلام نے غیر مبہم الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان نہ صرف آپس میں ایک ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں بھی ایک ہیں۔ گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں،

کالے کو پیلے پر کوئی فضیلت نہیں ــــــ تمام انسان بلا امتیاز رنگ و نسل اپنے خالق حقیقی کے سامنے مساوی ہیں۔ یہ ہے وہ پیغام جو پیغمبر اسلام نے دنیا کو سنایا۔ اور اس حکم کی تعمیل میں بڑے بڑے شہنشاہوں کو جھکنا پڑا، تاکہ مساوات کے اصول کو عملی حیثیت دی جاسکے۔ خدا کے نزدیک اور قانون کی نگاہوں میں بالکل مساوی ہونے کے یہ معنی ہوئے کہ ساری دنیا کے مسلمان ــــــ امیر و غریب، شاہ و گدا، گورے کالے ــــــ افراد کی ایک بین الاقوامی ملت کے رکن ہیں، جو براہ راست حکومتِ الٰہیہ کے تابع فرمان ہیں۔

اسلام کا شمار تاریخ عالم کی اہم ترین تحریکات میں ہوتا ہے۔ سیاسیات، اقتصادیات اور اقوام کی سماجی زندگی پر اس تحریک کا اثر بہت وسیع اور گہرا ہوا۔ اسلام کا آغاز، اس کا ارتقا، باقاعدہ نشوو اشاعت، اس کا پھلنا پھولنا ــــــ یوروپی، ایشیائی اور افریقی ممالک میں اس کے ہمہ گیر اثرات ــــــ اور جدید اسلامی ریاستوں کا حب وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو انسانیت کے ایک طالب علم کے لئے گہری دلچسپی کا موضوع ہوسکتی ہیں۔ اور بلاشبہ تاریخ عالم کے رجحانات کو سمجھنے میں ان کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے۔ اسلام کے اثرات کی ایک بنیادی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ ان تمام ممالک کو جہاں جہاں سے اس کا گذر ہوا، "زرخیز" بناتا چلا گیا۔ اسلام کی عالمگیر رو بہت جلد جغرافیائی حد بندیوں کو توڑتی، پھیلاتی ہوئی اکثر قطاع عالم میں پھیل گئی۔ اور جہاں کہیں زندگی و حرارت کا یہ سیلاب پہنچا، وہاں کے گھر میں ایک نئی زندگی بیدار ہوتی گئی۔ اسلام نے اپنے زیر اثر ممالک میں غلامی اور غلامانہ رسم و رواج کا خاتمہ کردیا۔ افراد کے حقوق کو تسلیم کیا گیا۔ اور سوسائٹی میں عورت کو وہ جگہ پیش کی گئی جہاں وہ اب نظر آتی ہے۔ یورپ میں بھی کئی بڑے شہر اسلامی تعلیم و تمدن کے اہم مراکز بن گئے۔ جہاں براعظم یورپ کے ہر حصے سے طالب علم آکر آرٹ و سائنس کے مختلف شعبوں میں تعلیم پاتے تھے اور اس طرح یورپ میں ہسپانیہ کی سرزمین فلسفہ و سائنس کی ایک بڑی درسگاہ بن گئی۔ یورپ، افریقہ اور ایشیا کے براعظموں میں مسلمانوں کے مسلسل اور طویل قیام کی کئی یادگاریں ابھی تک باقی ہیں۔

مسلمانوں کی موجودہ تاریخ ـــــــ تاریخ عالم کا ایک اہم جزو ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ "مسلمانوں کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کئے بغیر ہم یورپ کے تمدنی اور سیاسی مسائل کی تاریخ کو اچھی طرح سے نہیں سمجھ سکتے" ـــــــ ایشیا اور افریقہ میں تو آج بھی اسلام ایک فیصلہ کن طاقت ہے۔ اسلامی تحریکات و اثرات کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے موجودہ صورت کے طویل عرصے کو نگاہ میں رکھنا نہایت ضروری ہے اور اس وسیع حلقۂ اثر و کار کو بھی جس کی وسعت کو آج تک کوئی بڑی سے بڑی سلطنت نہیں پہنچ سکی۔

"اسلامی مطالعہ" کو ہم کئی شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً زبان و ادب، اور تاریخ و سیاسیات وغیرہ۔ کسی فرد واحد یا کام کرنے والوں کے کسی ایک گروہ کے لئے یہ امر بے حد مشکل ہے کہ وہ اس عظیم الشان کام کا اندازہ کر سکے جو اسلام نے ان شعبوں میں سر انجام دیا ہے۔ اس کے لئے ماہرین علوم کی ایک پوری جماعت کی ضرورت ہے جو ایک مخصوص پروگرام کے ماتحت کام کرتی ہے۔ سلطنت برطانیہ میں ان لوگوں کے لئے جو ایک "جدید دولت مشترکہ برطانیہ" کی تشکیل و تعمیر کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسلامی تاریخ و تمدن کا مطالعہ از بس ضروری ہے کہ سلطنت برطانیہ میں بسنے والی اکثر آبادی اسی مذہب پر ایمان رکھتی ہے۔ افغانستان، ایران، عراق، عرب، مصر، ترکی، مشرقی ترکستان۔ یہ سب اسلامی ممالک ہیں۔ ہندوستان میں ایک سو ملین مسلمان آباد ہیں۔ چین کے وسیع ملک میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور چینی مسلمان انسانیت کے ایک بہت بڑے دشمن سے برسر پیکار ہیں۔ افریقہ میں بھی مسلمان غالب اکثریت میں آباد ہیں۔ چنانچہ چند ہی مہینے قبل جب مجھے "لاگوز" میں چند روز قیام کرنے کا اتفاق ہوا تو میں نے ایک برطانوی افسر کی قیادت میں مقامی فوج کے ایک حصے کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ سب بآواز بلند "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ" پکار رہے تھے۔ اُن کے علاوہ ملایا، سنگاپور، جزائر شرق الہند اور انڈو چائنا وغیرہ مسلمان آبادیوں سے پٹے پڑے ہیں۔ پس اس صورت میں کہ خود دولت برطانیہ کے اندر مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت موجود ہے، اور سلطنت برطانیہ کی حدود سے ملی ہوئی ایسی

ایسی ریاستوں میں بھی مسلمان اکثریت میں آباد ہیں، جن کے ساتھ مستقبل میں برطانیہ کے دوستانہ مراسم ضروری ہیں، یہ بے حد لازمی ہے کہ ہم اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن کا بنظر غائر مطالعہ کریں۔

اسلامی فلسفہ و مطالعہ کے مستقبل کا زیادہ تر انحصار بے شک مسلمانانِ عالم کی دلچسپیوں پر ہے۔ لیکن یہ تنہا مسلمانوں کی ذمہ داری نہیں۔ اسلام ساری دنیا کے لئے ایک مخصوص تہذیب لایا ہے لہذا جو لوگ اسلام میں ایمان نہیں رکھتے اگر وہ اس کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے تو یہ چیز مختلف اقوام کے درمیان باہمی اعتماد پر مبنی ایک مخلصانہ اور صحت مندانہ نظام کی تشکیل کو بروئے کار لانے میں بہت حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہے، تمدن کے فروغ و اشاعت میں مذہب کو ہمیشہ نمایاں پوزیشن حاصل رہی ہے۔ پھر مذہب کے اثرات کبھی فقط اسی ملک میں محدود نہیں رہتے جہاں کہ یہ پیدا ہوا ہو۔ بلکہ یہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک پر بھی اثر انداز ہو کر رہتا ہے۔ بدقسمتی سے ماضی میں مذاہب بہت کچھ غلط فہمی کا شکار رہے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے کم و بیش ہر مذہب کی غلط نمائندگی یا غلط ترجمانی سے کام لیا گیا۔ مذہب اسلام شاید اس بدقسمتی کا سب سے زیادہ نشانہ رہا ہے بالخصوص یورپ میں۔ قرونِ وسطیٰ کا تو ذکر کیا ذکر، ابھی گذشتہ چند سالوں تک اسلامی عقائد اور اس کے تمدنی اصولوں سے عام بے خبری پائی جاتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ہزار سال میں اسلام اور یورپ کے "مسیحائی کلچر" میں زبردست تصادم رونما ہوا تھا۔ لیکن ان باتوں کو ہوئے ایک زمانہ گذر چکا ہے۔ اب زمانہ اور اس کے تقاضے بالکل بدل چکے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ امن و سلامتی کی اس کشادہ تر فضا میں، جو مستقبل میں پیدا ہونے والی ہے، اسلامی عقائد اور تمدن کا مطالعہ زیادہ دلچسپی اور غور کے ساتھ کیا جائے گا۔ ضرورت ہے کہ بے خبری اور لاعلمی کی حدود کو توڑتے ہوئے "اسلامی مطالعہ" کو دنیا کے ہر حصے میں پھیلا دیا جائے اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں اُن کا ازالہ کر کے اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ جب یہ ہو جائے گا تو دنیا خود بخود محسوس کرے گی کہ تہذیب و تمدن کے فروغ میں اسلام کا کتنا حصہ ہے؟ اور اسلام نے کس طرح دنیا کی ہر اس تہذیب کو جس کے ساتھ اس کا سابقہ پڑا

یک سر تبدیل کرکے رکھ دیا؟

ماضی میں ہوتا یہ غلط طور پر قیاس کرلیا گیا تھا۔ کہ کسی ملک کی روایات، زبان و تمدن اور معتقدات مذہبی کو جانے بغیر بھی اس ملک پر حکومت کی جاسکتی ہے۔ لیکن اب زمانے کا مزاج اور اشیاء کی ماہیت بالکل بدل چکی ہے۔ اب اقوام کے مستقبل کا انحصار زیادہ تر باہمی اعتماد و خلوص پر موقوف ہوگا جس کے لئے ایک دوسرے کی کلچرل مفاہمت" نہایت ضروری ہے۔ اس کلچرل مفاہمت" اور باہمی اعتماد" پر بین الاقوامی امن و سلامتی کی بنیاد رکھی جاسکتی۔ دورِ عصرِ حاضر کی بہت سی سیاسی و معاشی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔ وہ وقت گذر چکا، کہ ایک قوم یا ایک ملک دنیا میں کسی خاص قسم کی تہذیب کے نشر و فروغ کا دعویٰ کرسکے۔ نئے نظام میں یہ کام صرف اقوام کی مشترکہ کوشش و مساعی سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ آئیے اس عظیم الشان مقصد کے پیش نظر ہم اسلام کے کلچر اور اس کی روایات کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ کہ تمام خطۂ ارضی کو خصوصی فائدہ پہنچے گا۔ وقت ہے کہ ہم ۔ نسی کی غلطیوں کو ازالہ کریں۔ ضرورت ہے کہ ہم سب مل کر ساری انسانیت کو بہتر اور عظیم تر بنانے کی سعی کریں۔ ہمیں اتنا خود غرض و خود میں نہیں ہونا چاہیے کہ ہم اپنے سوا دوسروں کو جاننے کی کوشش ہی نہ کریں، یا بیرونی دنیا کی حقیقتوں سے جان بوجھ کر آنکھیں بند کرلیں۔

مترجمہ

سید ضمیر جعفری بی۔ اے

پرانے اور نئے ادب کی آویزش

جارج سینڈ کے قول کے مطابق محبت عورت کے لئے زندگی کا سب سے اہم بالشان واقعہ ہے مگر مرد کے لئے ایک اتفاقیہ سانحہ! ایک ادیب کے لئے نئے ادب اور پرانے ادب کی کشمکش زندگی اور موت کی کشمکش ہے مگر ہم راہ چلتے تماشائیوں کے لئے اور تماشائیوں سے میری مراد ان پڑھنے والوں سے ہے جو اکثر پرانے اور نئے چھوٹے اور بڑے ہر قسم کے ادیبوں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں ایک وقتی تفریح کی چیز ہے اس میں شک نہیں کہ اس ادبی جنگ کے میدان میں ان کی دلچسپیاں اور اخلاقی قدریں یوں روندی جارہی ہیں جیسے جرمن ٹینکوں کے نیچے یوکرائن کے شاداب اور لہلہاتے ہوئے باغ۔ یہ جنگ بغیر اُن کی اجازت اور رضامندی کے اُن کے گھروں میں نہیں بلکہ ان کے سروں پر لڑی جارہی ہے۔ ادیبوں کے لئے تو یقیناً یہ جنگ ایک رزمیہ ہے۔ ان کی نوک میں جان اٹکی ہے لیکن ادبی راہگیروں کے لئے تو یہ محض برسرِراہ اور وہ بھی گاہے قسم کی چیز ہے۔

راستہ چلتے چلتے دو شخص جھگڑتے نظر آئے۔ اسی انداز میں دست وگریباں ہوتے نظر آئے جس میں سرسید نے ایسے لوگوں کی تصویر کھینچی ہے۔ ادبی راہ گیر کا تصور صرف اتنا ہے کہ وہ چلتے چلتے ذری کی ذری ٹھٹھک گیا ہے اور ایک مربیانہ انداز میں دونوں کو بچوں کی طرح نہیں بلکہ عورتوں کی طرح جھگڑتا دیکھ رہا ہے۔ ان عورتوں کی طرح جو ایک بچے کی ملکیت کے بارے میں جھگڑ رہی تھیں اور آپس میں کوئی فیصلہ نہ کرسکیں۔ میرا یہ مقصد نہیں کہ خدانخواستہ ہر پڑھنے والا ادبی سلیمان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بچارے میں یہ سکت کہاں جو حضرت سلیمان کی طرح اس کا دوٹوک فیصلہ کردے ہر ایک کے حوالے ادھر دوسرے کے۔ ہاں ڈر یہی ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اس کھینچا تانی میں بچے کے چیتھڑے اُڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ لیکن اس راہ گیر کو ایک اور خطرہ بھی تو ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ دونوں سب جگہ

چھوڑ چھاڑ اس فریب پر پل پڑیں ہندوستانی رستوں پر چلنے لگے، اگر یہ بچے کچھ بڑے ہیں تو ان کی مت ماری جاتی ہے جیسے ان کی فانی عادتوں سے نہیں بچ سکتے تو ادبی صداقتوں کا یا خدا حسن اس لیے تماشائی کا بھلا اسی میں ہے کہ اس کا فیصلہ جلد ہو جائے۔

ان الفاظ سے ہمیں اس دخل در معقولات کی صفائی پیش کرنا مقصود نہیں نہ ہمیں اس دنگل میں اترنے کا شوق ہے جس میں بڑے بڑے نامی بزرگ ادبی ٹکریں لڑ رہے ہیں۔ خدا ان کے سر سلامت رکھے۔ اور انھیں ملک اور قوم کے لئے ہمیشہ ہمیشہ محفوظ و مصئون رکھے۔ یہ ٹکریں تو انھی کے بس کی ہیں۔ ہماری حیثیت تو ان شریر بچوں کی سی ہے جو بغیر ٹکٹ لئے تماشاگاہ میں گھس جاتے ہیں۔ اور چوری چھپے تاک جھانک کرتے رہتے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ بڑی بھاری لڑائی پڑھنے والوں کی زمین پر لڑی جا رہی ہے۔ ایسے حالات میں انھیں اتنی اجازت تو ہونی چاہیے کہ شردھا اور بھگتی کے چند پھول اپنے ادبی دیوتاؤں کے چرنوں پر چڑھا سکیں۔ یہ مانا کہ دوئی اور چوتھی کے درجے والے کسی شمار قطار میں نہیں لیکن ہندوستان کے سنیما گھروں کی رونق در اصل ہیں جیسے ٹرام کی ریل پیل تو انھیں تیسرے درجے کے مسافروں کے دم قدم سے ہے۔

انگریزی میں ایک کہاوت ہے کہ جو نقد دے وہی راگ گنوائے۔ ہندوستانی ادیبوں کا کیسں پرستار یہ جسارت تو نہیں کر سکتا کہ اپنے ادبی آقاؤں کی توجہ اس طرف مبذول کرے کہ وہ جس کا کھائیں اس کا گن گائیں اور لکھتے وقت اتنی تمیز کر لیں کہ کون سا گن لایا جائے۔ یہ بچارے اپنے سیاسی آقاؤں سے بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے جو سودا تم نے اسی کا کھاتے اور سات رنگ اور چھتیس راگنیاں سب کی سب دوسروں کی ہی الاپتے ہیں۔

ہاں ایک بات ضرور ہے وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اس مسئلے پر سچا اور متوازن حکم شاید ایسا شخص لگا سکتا ہے جو اس کشمکش کے باہر اس مسئلے کو صحیح پس منظر میں دیکھ رہا ہو۔ اس کی نگاہ میں وہ تیزی اس کی نظر میں ابھی جذبے کی وہ رنگینی پیدا نہیں ہوئی جس سے ایک کی جگہ دو دو اور ساون کے مہینے میں نہیں بلکہ ہر موسم میں ہریالی ہی ہریالی نظر آنے لگتی ہے۔

پچھلے دنوں انڈیا گیٹ بمبئی کی پرسکون اور بھیگی ہوئی رات میں ایک آواز اٹھی تھی۔ جو

آواز اٹھانے والوں کے کہنے کے مطابق پورے ہندوستان پر چھاگئی۔ اس کی جوابی صدا لکھنؤ سے بھی اٹھی ہلکا سا تلاطم کئی ایک جگہ اور بھی ہوا۔ کہیں کہیں پرانے چراغ ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھے اور کہیں نئے چراغوں میں نیا سوز وگداز پیدا ہوا کہیں نوجوانوں کی جبیں پر بل پڑگئے اور کہیں جھریوں دار چہروں پر مارے غصے کے بل کھلنے لگے عشق کی دنیا میں نہیں بلکہ ادبی دنیا میں "لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں" کی بہ گبر تفسیر شاید بھی ہوگی۔ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے ہاں بڑے بوڑھوں کے چہرے پر یہ عنوان کسی طور بھلے نہیں معلوم ہوتے ایک بوڑھے بزرگ کا عتاب یقیناً انسانی اسٹیج کا بہت بڑا المیہ ہے مگر ہر المیہ کا نبھانا معمولی اداکار کا کام نہیں۔ ایک خام کار کے ہاتھوں اونچے سے اونچا المیہ بھی مزاحیہ نہیں بلکہ مضحکات کا آئینہ بن سکتا ہے۔ دور پھر یوں گو زندگی کی طوفان خیز گھاٹیوں سے گزر رہی کی پرسکون وادیوں کی خاموش مرغزاروں میں پہنچ چکے ہیں نوجوانوں کی تند بینی کے سامنے ان کے لبوں پر تو ایک نور پاش تبسم ہونا چاہئے۔ یہ تبسم زندگی کا مسرت خیز ہو نہیں بلکہ خود اعتمادی و رجحان و تفکر کا آئینہ دار ہوگا یہ تبسم ہیں حقیقت میں روشنی CREST WAVE ہے روشنی کا وہ سیلاب جو زندگی کی آخری منزل میں چہار طرف سے امنڈ آتا ہے۔ جس میں ہماری رنجشیں اور کدورتیں تفرقے اور اختلافات خس وخاشاک کی طرح بہ نکلتے ہیں۔

نئے اور پرانے ادب کی جنگ آج سے نہیں برسوں سے جاری ہے۔ اس جنگ نے دونوں ادبوں میں تلاطم برپا کیا ہمیں امید رکھنا چاہیے کہ ہمارے جنگ جو ایک فدائی فوج دار کی طرح پون چکی کے بازوؤں پر اندھا دھند نہیں پڑ رہے ہیں انھیں اس میدان کے نشیب و فراز اس کے داؤ اور گھات اس کے تاریخی پس منظر کا پورا پورا شعور ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ان سے پہلے اس میدان کے مرد کیا حربے استعمال کرتے تھے۔ ان کے وار اور بچاؤ کے طریق کیا تھے۔ یہ جنگ آج سے برسوں پہلے ایک شاندار رزمیہ کے انداز میں لڑی جا چکی ہے۔ البتہ محاذ جنگ کچھ بدل گیا ہے۔ اس میں ادبی دیوتاؤں کی سی شان رکھنے والے مفکروں اور مصنفوں نے حصہ لیا ہے اس میں ٹالسٹائی بھی شریک تھا اور اس کے ہم عصر بھی ایک دلچسپ اور سچے جذبات سے لرزتے ہوئے انداز میں گورکی نے ٹالسٹائی کے اس موضوع پر تاثرات اس کے اپنے الفاظ میں یوں بیان کئے ہیں:۔

"خزاں کی ایک صبح تھی۔ میں ماسکو کی ایک گلی میں سے گزر رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شراب کی مدہوش بدمست عورت نالی میں پڑی ہے۔ ایک گھر کی بدرو میں سے گندا پانی اس کی گردن اور پشت کے نیچے سے بہا چلا جا رہا ہے۔ اس کا جسم غلاظت سے لتھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس میں کلبلاتی کبھی کانپتی کپکپاتی کبھی اپنے جسم کو کسمساتی پڑی ہے۔ مگر اٹھ نہیں سکتی۔ یہ کہہ کر ٹالسٹائی نے اپنی آنکھیں بند سی کر لیں۔ اور اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑنے لگی اس اخلاقی صدمے نے اس ذکی الحس شخصیت کی عظیم الشان عمارت کو ایک بھونچال کی طرح ہلا دیا تھا۔ شدت احساس سے وہ اپنا سر آہستہ آہستہ ہلانے لگا اور کہنے لگا۔ بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! کیا بھیانک اور نفرت انگیز واقعہ ہے۔ ایک شرابی عورت۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی امداد کروں۔ مگر نہ کر سکتا تھا۔ الٰہی توبہ مجھے اس سے کیسی گھن آرہی تھی۔ اس کا جسم سارے کا سارا لتھڑا ہوا اور چپچپا رہا تھا۔ اس پر اسے دوبارہ دیکھنا زہر ہوگیا۔ اور ایک دفعہ پھر اس کے جسم میں رعشہ کی ہلکی سی لہر دوڑنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر میں نے اسے اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھو بھی لیا تو میں مہینوں تک دھونے سے بھی اپنے ہاتھ پاک نہیں کر سکوں گا۔ اور دوسری طرف ایک ننھا سا ذہین بچہ بیٹھا تھا۔ اس کے رخساروں سے ٹپ ٹپ آنسو جاری تھے۔

وہ بار بار ہچکیاں لے رہا تھا اس کے چہرے پر عجیب کش مکش اور بے چارگی کا سایہ پڑا ہوا تھا۔

"امی۔ ممم امی۔ اٹھو! اٹھو! وہ کبھی کبھی اپنے بازوؤں کو ہلاتی جاتی۔ کبھی کچھ بڑبڑاتے ہوئے انداز میں کہتی۔ ایک مرتبہ کوشش کرکے اپنا سر اٹھا لیتی اور پھر دھڑام سے اسی گندے پانی میں گر جاتی تھی۔"

ٹالسٹائی خاموش تھا۔ پھر ادھر ادھر دیکھ کر دبی سی آواز میں کہنے لگا " ہاں ہاں کس قدر خوفناک۔ کتنا المناک واقعہ ہے۔ تم نے بھی بہت سی شرابی عورتیں دیکھی ہوں گی۔ کیا بہت سی؛ میرے اللہ۔ دیکھنا اس کے متعلق کچھ لکھنا نہیں۔" میں نے پوچھا کیوں؟" اس نے نگاہ بھر کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ اور مسکرا کر بولا "کیوں؟ کیوں؟" پھر گہری سوچ میں چلا گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا" مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے تمھیں کیوں منع کر دیا۔ مگر مجھے ایسی چیزوں سے کتنی گھن آتی ہے۔ لیکن

اور ان کی نئی اور دھندلی سی تصویر معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں اکثر انھیں اپنے نقوش بھی ملتے ہیں۔ ان کتابوں میں انھیں زندگی کے مسائل جیتے جاگتے کبھی ان کے پیچھے بھاگتے اور کبھی نگاہوں میں نگاہیں ڈالتے اور مسکراتے ہوئے ملتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کتابوں کو اپنے جنسی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں پڑھتا اس کے لئے اس کے پاس زیادہ مادی اور دلچسپ ذرائع موجود ہیں اور ہمارے ان ناکام ذہنی لحاظ سے ناکام مصنفین کی کوششوں پر بجز کار راہ عملی لحاظ سے فنکار پڑھنے والے کے دل میں کچھ ایسا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے جو اندھیرے میں راہ گم کردہ بچے کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ جب ایک کہنہ مشق پڑھنے والا ان نوسکھوں کے ادھ کچرے تاثرات کا ملاحظہ کرتا ہے تو اس کا دل احساس برتری سے لبریز ہو جاتا ہے ان کی تصنیفات کس قدر بے رنگ جنسی حقیقت سے دور اور بے کیف معلوم ہوتی ہیں ان میں نہ تو جنسی تنوع ہے اور نہ اس کی گہرائی اور نہ اس کا تحقیقاتی پہلو ہے۔ اور نہ ہمہ گیریت۔

اس کا جی چاہتا ہے کہ انھیں بر سر بازار کہے کہ چور گلی کے پھرنے والو! اس آتش فردہ میں کیا جنسی زندگی کے طوفان رنگ و بو میں ہمارے ساتھ مردانہ وار بے باکانہ کود پڑو۔ یہ لب بام کا تماشہ کیا معنی۔ اس کے بعد تم اپنے افسوں اور افسانوں۔ نئے ادب اور پرانے ادب سبھی کو نہ بھول جاؤ تو ہمارا ذمہ۔ یہ جو ایسی پھیکی سیٹھی چیزیں لکھتے ہو تو اسی لئے کہ تمہارے منہ کا ذائقہ نہیں بدلا۔ لہٰذا اس جرعۂ آتشیں کو دو دو ہتہ جام تک الٹ جاؤ تو پھر کبھی لکھنے کا نام نہ لو۔

ایک طرف تو یہ نوجوان ادیب ہیں جو غلاظت سے سنی ہوئی مدہوش عورت کے رسیلے ہونٹوں کو دیکھ کر لب چاٹ رہے ہیں اور دوسری طرف پرانی نسل کے لوگ روحانی قسم کے چشمے آنکھوں پر چڑھا کر یہ چاہتے ہیں۔ کہ نہ تو کیچڑ میں سنی ہوئی مدہوش عورت کو دیکھیں اور نہ اس کے بچے کو۔ بچارے ادبی راہ گیر کی بساط سے یہ باہر ہے کہ جنگ کی وجہ سے آج کل عینکوں کا رنگین چشمے بھی بہت مہنگے بلکہ نایاب ہو گئے ہیں!

سچ تو یہ ہے کہ نیا ادب اس ملک میں اس بھٹکتی ہوئی روح کی طرح ہے جسے جسد خاکی نصیب نہ ہو سکا۔ پرانی نسل تو اسے ایک بھوت سمجھ کر گریزاں ہے۔ اور اکثر انسان ضمیر کی آواز سے بھی تو ایسا…

بھاگتا ہے جیسے کسی بھوت سے۔ اور نئی نسل سمجھتی ہے کہ اس نے اس روح کو سینے میں جگہ دے رکھی ہے۔ بس کیا پتہ کہ یہ نئے ادب کی روح نہیں اس کا آسیب ہے۔

یہ ادبی تماشا اب کافی وقت لے چکا ہے۔ تماشائی کی طبیعت اس سے بھر چکی وہ سمجھتا ہے کہ اب بحث کا حق ادا ہو چکا۔ مگر تماشا دکھانے والے ابھی تک نہیں اکتائے۔ تماشائی کا جی چاہتا ہے کہ اب آخری جوڑ اکھاڑے میں آ جائے جو آپس میں پنجہ ملانے کو جھکے تو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک
1 دم کے لئے رک جائے اور کہے کہ ارے بھئی غلط فہمی ہو گئی ہم تو ہاتھ ملانے آئے تھے یہ تماشائی خواہ مخواہ تماشہ دیکھنے کے لئے اکٹھے ہو گئے!

اگر ایسا نہ ہوا تو تماشائی ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے اور میدان تماشا دکھانے والوں کے ہاتھ میں رہ جائے گا۔

بچوں کا ادب

"بچوں کا ادب" ! یہ ترکیب بہت سے لوگوں کو غیر مانوس اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ بچوں کو ادب سے کیا واسطہ ؟۔ ان کے لئے ابجد کی تحصیل۔ سیدھی سادھی عبارت کی نوشت و خواند یعنی خود ایک بڑا مرحلہ ہے چہ جائیکہ ادب سے استفادہ کرنا۔ ادب جس کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہمارے بلند ترین خیالات اور انتہائی نازک و لطیف جذبات احساسات کی عکاسی کرتا ہے۔ ان نوخیز، سادہ لوح، معصوم روحوں کے لئے سرمایہ مسرت کیونکر بن سکتا ہے ؟

اس سوال کا شافی جواب وہی لوگ دے سکتے ہیں جو بچوں کے ذہنی ارتقا اور ان کی ادبی دلچسپیوں کا بغور مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ باخبر والدین اور معلّمین کا مشاہدہ ہی اس بارے میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے ۔ ماہرین تعلیم اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ بچوں کی پسندیدہ کتابوں میں ایسی کتابوں کا تناسب بہت کم ہے جو صرف بچوں کے لئے تیار کی گئی ہیں۔ زیادہ تعداد ان تصانیف کی ہے جو بالغوں کے لئے لکھی گئی ہیں اور جن کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ انگریزی کی مقبول و معروف تصنیف "روبنسن کروسو" میں ڈیفو نے اپنے عہد کے عمرانی اور مذہبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے لیکن بچوں نے ان مسائل سے قطع نظر کر کے اس کو دلچسپ کہانی کو اپنا لیا ہے۔ اسی طرح بنین (BUNYAN) نے "ترقی زائر" میں اپنے دلکش تمثیلی انداز میں ایک سچے عیسائی کے دستور حیات کو پیش کیا ہے۔ لیکن بقول ایک عیسائی نقاد "یہ کتاب سن رسیدہ رشیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ یہ ننھے گنہگاروں کے ہاتھ لگی" سفرنامہ گلیور (GALLIVERS TRAVELS) جس کا شمار سیاسی طنزیات میں ہوتا ہے۔ حکایات لقمان (AESOP'S FABLES) جن کا مقصد بالغوں کے لئے اخلاقی لائحہ عمل پیش کرنا ہے (UNCLE.TOMES.CABIN) جس میں صرف بالغوں سے خطاب کیا گیا ہے۔ بچوں کی لائبریری میں داخل کر لی گئی ہیں۔ اردو زبان میں بھی "باغ و بہار" "آرائش محفل"

"فسانۂ آزاد" اور "الف لیلیٰ کے قصے" اپنے دلکش طرزِ تحریر، جیتی جاگتی تصویروں، اپنے خیالی و کہانی عنصر کی بنا پر بچوں میں بہت مقبول ہیں گو یہ وہ تصانیف ہیں جو ادب میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں اور جن میں روئے سخن بالغوں کی طرف ہے۔ ان کتابوں کے بعض حصوں پر اخلاقی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا جا سکتا لیکن ایسے حصوں کو حذف کر دینے کے بعد بھی ان قصوں کی دلکشی باقی رہتی ہے۔

اوپر کی چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچوں میں بھی معیاری ادب سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ بالغوں کی بہت سی کتابیں صرف بڑوں کی دلچسپی کی موجب ہی نہیں ہوتیں بلکہ اکثر بچوں کے مطالعے میں رہتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بچوں کے لئے کتابیں انتخاب کرنے کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ انھیں بڑے آدمی شوق سے پڑھیں۔ اس بارے میں ایک انگریز خاتون لیڈی ایسٹ لیک کی رائے نہایت صحیح ہے۔ "بچوں کی کتاب کی دلکشی کا اصل راز عبارت کے آسان اور طرزِ تحریر کے رنگین ہونے میں نہیں بلکہ اس کے زیادہ دلچسپ اور فطرت سے قریب تر ہونے، اس کے پلاٹ کے مکمل تر ہونے اور پھر اس خوبی کے حامل ہونے میں ہے جو بچوں کے گہرے اور تر و تازہ مشاہدات اور محسوسات سے متعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے پڑھنے کی کتابیں اُن کے بزرگوں کے کتب خانوں میں ملتی ہیں۔ اور بچوں کے لئے اچھی لکھی ہوئی کتابیں بڑوں کی دلچسپی کی موجب بھی ہوتی ہیں۔" واقعات، خیالات کو صرف آسان زبان میں پیش کر دینے سے بچوں کا ادب نہیں بنتا۔ اس کو بچوں کے اپنے مشاہدات اور محسوسات سے گہرا تعلق ہونا چاہئے۔ چونکہ بچے اور بڑے سب اپنے گرد و پیش کی زندگی انسان کے دکھ سکھ کی کہانی اور روزمرہ کے واقعات و حادثات میں یکساں دلچسپی لیتے ہیں اس لئے وہ تصنیف جس میں زندگی کی سچی تصویر، فطری جذبات کی صحیح ترجمانی، انسانی ہمدردی اور خلوص ملتا ہے۔ بچوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اگر ادب کا مقصد ہماری زندگی کی تصویر اور اس ماحول کی سچی تصویریں پیش کرنا ہے جس میں بچہ پرورش پاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بچے بھی اعلیٰ ادب سے حظ نہ اٹھا سکیں۔ ایک نو دس برس کا بچہ جو آسان عبارت کو روانی سے پڑھ سکتا ہو ہر اس تحریر سے بہرہ مند ہو سکتا ہے جو ادبی شان رکھنے کے ساتھ ساتھ سلیس زبان، سادہ اور دلکش اندازِ بیان رکھتی ہے۔ البتہ موضوعات کے اعتبار سے اس تحریر کو بچوں کی فطرت سے

مناسبت ہونی چاہئے اس سوال کے جواب میں کہ سلیس زبان کا کیا معیار ہونا چاہیے، ہم میرامن کی "باغ و بہار" اور حالی کی "مناجاتِ بیوہ" پیش کر سکتے ہیں۔

سن و شعور بڑھنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی ادبی دلچسپیوں میں بھی تغیر ہوتا رہتا ہے۔ اگر آٹھ، نو برس کا بچہ جانوروں کی کہانیوں، جن پری کے قصوں اور روزمرہ کی زندگی کے مختلف واقعات میں دلچسپی لیتا ہے تو بارہ تیرہ سال کے بچوں کو جانبازی کے قصے، گھر اور مدرسے کی زندگی سے متعلق کہانیاں، سیاحوں اور بوائے اسکاؤٹوں کے کارنامے اور میکانک کی کتابیں بہت دلکش معلوم ہوتی ہیں اور چودہ سے سولہ برس کی عمر تک بہادری اور جانفشانی کی داستانوں کے علاوہ جاسوسی اور رومانی ناول، تاریخ کی بڑی ہستیوں کے سوانح حیات، سائنس کی ایجادات اور موجدوں کی زندگی کے واقعات بہت شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ غرض کہ بچوں کے فطری رجحانات ان کی ادبی سرگرمیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اگر استاد بچوں کے ان طبعی میلانات کو ملحوظ رکھ کر ان کے مطالعے کے لئے مناسب کتابیں مہیا کر دے تو سولہ سال کی عمر تک جسے ماہرینِ نفسیات نے عام ذہانت کی نشو و نما کی آخری حد قرار دیا ہے۔ بچہ ادب کے ایک معتدبہ حصے سے آشنا ہو سکتا ہے۔ البتہ ادب کے بعض پہلو جن کا تعلق نہایت لطیف جذبات، بلند ترین خیالات اور تخیل آفرینی سے ہے بچوں کی صلاحیتوں سے بالاتر ہیں بچوں کی دنیا میں سٹیونسن کی TREASURE ISLAND اور اس کی دوسری تصنیفات کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ دیگر مصنفین کی تصنیفات کے مقابلے میں اوّل الذکر کے زیادہ عام فہم ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ ان میں زیادہ خلوص، زیادہ گرمی اور زیادہ حرکت پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی سے قریب تر ہیں اور اس کی رقصاں تصویریں پیش کرتی ہیں۔ ڈراما کے کرداروں کی جانبازی، ڈکنس اور پریم چند کی انسان دوستی نے ان کی کتابوں کو بچوں میں بے حد مقبول بنا دیا ہے۔

اوپر کی بحث اور مثالوں سے اتنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ اگر بچوں کی ادبی سرگرمیوں کی صحیح رہنمائی کی جائے تو ان میں بہت جلد اعلیٰ ادبی تصانیف سے مستفید ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے مگر آپ کہیں گے کہ یہ کچھ دل لگتی بات معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارے مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبا عموماً

پست درجے کا ادبی مذاق رکھتے ہیں۔ وہ اردو زبان کے قلیل سرمائے کے جواہر پاروں سے بھی کما حقہٗ واقف نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کہ مغربی ملکوں کے بچے اپنے ادب کا وسیع مطالعہ کرتے ہوں اور اُن میں اپنے ادبی کارناموں سے مستفید ہونے کی استعداد بھی موجود ہو لیکن ہمارے یہاں کے اکثر طلبار تو پھر قصبات تیسرے درجے کے سنسنی خیز ناولوں، مشغلہ افسانوں، داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا کے طلسم ہی میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ ادبی ذوق کی اس پستی کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟ کیا یہ نقص طلبا کے ابتدائی مطالعہ کی نگرانی نہ ہونے کے باعث ہے یا والدین اور اساتذہ کی بد ذوقی کا نتیجہ ہے؟ اس میں شک نہیں کہ بچے والدین اور معلم کی پسند ہی کی تقلید کرتے ہیں۔ اور عام بگڑے ہوئے مذاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن طلبار کی اس تہی دامنی کا اصل سبب مطالعہ کے لئے مناسب اور مفید کتابوں کا مہیا نہ ہونا ہے۔ اچھی اور دلچسپ کتابیں نہ ملیں تو بچے مجبوراً ان سستی اور گھٹیا کتابوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کا عموماً کوئی اخلاقی، اصلاحی یا تعلیمی مقصد نہیں ہوتا بلکہ ان میں یا تو محض تفریح طبع مقصود ہوتی ہے یا قارئین کے جذبات میں ہیجان پیدا کرکے لطف داستان کو دوبالا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مطالعہ کا شوق بارہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے نصف النہار پر ہوتا ہے۔ اس عمر میں بچہ ہر قسم کی بُری بھلی کتابیں پڑھتا ہے۔ بچوں کے ادبی ذوق کی تشکیل اور نشوونما کا بہترین زمانہ یہی ہے۔ لیکن عموماً یہ وقت درسی کتابوں کی ورق گردانی میں صرف ہوتا ہے۔ بچوں کے ذاتی مطالعہ کی اہمیت سے اکثر والدین اور استاد بے خبر ہیں۔ وہ طلبار کے لئے مناسب اور عمدہ ادبی تصانیف کو مہیا نہیں کرتے اور اُن کو اُن کے حال ہی پر چھوڑ دیتے ہیں کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ اس بے توجہی اور غفلت شعاری کے باوجود بھی ان طلبار میں سے کچھ کو بلند پایہ ادیب یا شاعر بننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

بچوں کے مطالعے کے لئے کس قسم کی کتابیں منتخب کرنی چاہئیں؟ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں بچوں کے طبعی میلانات اور نفسی کیفیات کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اُن کے فطری رجحانات ہی ان کی ادبی سرگرمیوں کو متعین کرتے ہیں۔ کیا کیا موضوع مختلف سن و سال کے بچوں کو عموماً دلچسپ معلوم ہوتے ہیں اس کا تذکرہ مجملاً پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس کی تفصیل ایک علیحدہ اور مستقل مضمون کی محتاج ہے۔

یہاں صرف یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ بچے کو دلچسپ موضوع کے علاوہ ادب میں کیا چیزیں دلفریب معلوم ہوتی ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ بچہ ادب میں کم از کم چار چیزوں کو ضرور تلاش کرتا ہے:۔

۱۔ ادب کی وہ خوبی جو بچے کو سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے "حرکت و عمل" ہے۔ یعنی اس میں جو کردار اور تصویریں پیش کی جائیں وہ اصل زندگی کی طرح جاندار، چلتی پھرتی اور بولتی چالتی ہوں۔ بچے کو بے جان چیزوں میں بھی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ وہ گھنٹوں تنہا اپنے کھلونوں سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ گرد و پیش کی متحرک چیزیں اس کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ اپنے ان محسوسات ہی کی جھلک وہ ادب میں بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

۲۔ ادب کی دوسری خوبی جو بچوں کے لئے جاذب توجہ ہوتی ہے وہ انسانی زندگی کے دلچسپ پہلوؤں کی رونمائی ہے۔ بچے ان تصانیف کو بہت پسند کرتے ہیں جن میں انسانی دوستی کا جذبہ اس قدر نمایاں ہو کہ اُن کے دل و دماغ پر فوری اثر کرے۔ بچوں کا اپنی برادری کے واقعات اور دوسرے بچوں کی سرگرمیوں سے خاص دلچسپی لینا ایک بالکل فطری امر ہے۔ اس لئے وہ قصے خصوصاً بہت ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں جن میں بچوں اور اُن کے کارناموں کو مرکزی حیثیت حاصل ہو۔

۳۔ تحریر کی وہ خصوصیت جو بچوں کے تخیل کو اکساتی ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مصنف اپنے مشاہدے اور تخیل سے کام لے کر ایسی تفصیلات اور جزئی نقش و نگار کو نمایاں کرے جن کی مدد سے بچے کا ذہن سچی تصویریں بنا سکے۔

بچوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے والی کچھ اور چیزیں بھی ہیں مثلاً:

۱۔ بات چیت کا انداز بیانیہ نہ ہو بلکہ اُسے ہمیشہ مکالمے کی صورت میں پیش کیا جائے۔

۲۔ زبان سادہ ہو مگر تصویریں رنگین پیش کی جائیں۔ اس کے لئے گہرے مشاہدے اور غیر معمولی قدرت بیان کی ضرورت ہے۔

۳۔ کسی کہانی یا واقعے کے موضوع و محل کو صاف صاف بتا دیا گیا ہو تاکہ تخیل کو پوری مدد ملے۔

۴۔ مضحکہ خیز واقعات ہوں یا ظرافت کی چاشنی ہو لیکن وہ بالغوں کے ... [illegible]

سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ یہ لطف عموماً اُن بے جوڑ چیزوں اور روزمرہ کی زندگی کے مضحک پہلوؤں کو پیش کر کے پیدا کیا جاتا ہے۔

۵. اخلاقی باتوں کو واعظانہ یا ناصحانہ انداز میں بیان نہ کیا جائے بلکہ واقعات کے پردے میں اس طرح پوشیدہ کر کے پیش کیا جائے کہ بچے کو اس کوشش کا احساس آسانی سے نہ ہو سکے۔ "حکایت لقمان" مولوی نذیر احمد کی "منتخب الحکایات" "کلیلہ دمنہ" کی کہانیاں اس کی کامیاب مثالیں ہیں۔

۶. انداز بیان سے خلوص ٹپکتا ہو۔

۷. لب ولہجہ بلند آہنگ اور مرعوب کن نہ ہو۔ اس میں بڑے پن کی بو نہ ہو۔ اپنے تخیل کی قوت اور حافظہ کی مدد سے مصنف کو بچوں کے محسوسات اور میلانات کا صحیح اندازہ لگا کر انہی کی زبان میں ان سے گفتگو کرنی چاہیے۔

قیصر حسین زیدی

جدید ترکی پر ایک نظر

براعظم ایشیا کے نقشے پر اگر ہم نظر ڈالیں تو انتہائی مغرب میں ہمیں ایک ملک نظر آتا ہے جسے ایشیائے کوچک یا ترکی کہتے ہیں۔ یہی ملک آج سے چالیس سال قبل "یورپ کا مرد بیمار" کی حیثیت سے آتش و خون کے بستر پر دم توڑ چکا تھا۔ دنیا کی یہ شاندار اسلامی سلطنت "تاریخ کے لئے عبرت انگیز مواد مہیا کر کے اپنے لئے کسی تاریک گوشے میں جائے پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ یہ وہی ترکی تھا جس کے ڈر سے سولھویں صدی عیسوی میں سارا یورپ لرزتا تھا۔ لیکن سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم نے اس کے سارے انجر پنجر ڈھیلے کر دئے اور سامراجی گرگے اس بات میں ہمہ تن مصروف ہو گئے تھے کہ کسی طرح سے بھی اس اسلامی حکومت کو تباہ و تاراج کر کے اس کے حصے بخرے کر دئے جائیں۔ اس یورپ کے مرد بیمار کو دم توڑتے دیکھ کر اتحادیوں کی حرص اور بھی بڑھ گئی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر ہم اس وقت کے ترکی کی اندرونی سیاست کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مغرب کی سامراجی طاقتیں ان ملکوں کے اندرونی نظام پر بھی حاوی تھیں ہر سامراجی قوم کو آزاد اسلامی ممالک میں خصوصی اختیارات اور مراعات حاصل تھے۔ ان لوگوں کے لئے مدرسے، عدالتیں، حتیٰ کہ چنگی اور سڑکیں بھی علیحدہ تھیں۔ مغربی تاجر اور پادری ان ملکوں میں حکمراں طبقہ کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ غرض یہ کہ مسلمان تاجروں سے بالاتر ان لوگوں کی حکومت اسلامی ملکوں پر حاوی تھی۔ اسلامی ممالک کے باشندے اس وقت سے ہوش میں آنے لگے اور ان کو اپنی اہمیت کا اس وقت اندازہ ہوا جبکہ عہد نامہ [illegible] کی رو سے ترکی حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے جو لوگ ترکوں کے خلاف عربی اتحاد کے پردے میں انگریزی سامراج سے ساز باز یا فرانس سے سازشیں کر رہے تھے انھیں اب پتہ چلا اور وہ اپنی اس غفلت پر پچھتانے لگے کہ سامراج در اصل عربی اتحاد کے خواہاں نہیں تھے بلکہ وہ ہر اسلامی ملک میں زیادہ سے زیادہ بہبودیوں کو برباد کرنے کی فکر میں مصروف تھے۔ انگریزی سامراج کا جب

سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انھیں عراق کے تیل کے چشمے اور نہر سوئز کی حفاظت کی غرض سے کچھ مالغرض مل جائے۔ اتحادیوں کی یہ مراد عہد نامہ وارسائی کی رو سے بر آئی اور انھیں وہ سب کچھ مل گیا۔

اگر جنگ عظیم کے بعد حالات اور واقعات کروٹ نہ بدلتے اور اسلامی حکومت کے باشندے اپنی صحیح اہمیت کا اندازہ نہ لگاتے تو یہ یقین تھا کہ بہت سی پرانی تہذیبوں کی طرح ترکی قوم کی کہانیاں بھی صرف تاریخ کے صفحوں پر ملتیں۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد ایک طرف انقلاب اور آزادی کے رجحانات بڑھنے لگے تو دوسری طرف یورپ میں فاشزم کا دور دورہ شروع ہوا فاشزم کی تاریخی تشریح کا اس وقت کوئی موقع نہیں ہے۔ البتہ اس جنگ کے خاتمے سے عالمگیر سرمایہ داری کی پیچیدگیاں اور مصیبتیں بڑھتی ہی گئیں۔ اور انھی پیچیدگیوں کی وجہ سے عوام کی آزادی خطرہ میں پڑ گئی۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے آپسی تضادات شدت کے ساتھ واضح ہونے لگے۔ سرمایہ داری اپنی فنا کا سامان خود مہیا کر لیتی ہے۔ اور اسی سے جہاں ایک طرف سرمایہ دارانہ معاشرت آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے تو دوسری طرف ایک نیا ترقی پسند طبقہ نئی معاشرت کا پیام لے کر اپنی آزادی کے لئے جد و جہد کرتا ہے۔ اور یہی جد و جہد آخر میں زور پکڑ کر پرانی معاشرت کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ ترکوں کو متحد کرنے کے لئے ایک ایسی عظیم شخصیت نے اُن کی رہبری کی جن کا نام کمال اتا ترک تھا۔ اس جلیل القدر آزادی کے علمبردار نے عام فتنہ انگیزوں کو للکار کر کہا کہ "ترک بہ حیثیت غلام زندہ نہیں رہ سکتے وہ اپنی کھوئی ہوئی سطوت و عظمت حاصل کریں گے یا موت کے بھیانک منہ میں اپنے لئے جائے پناہ ڈھونڈ لیں گے" اتا ترک کے اس عزم اور استقلال نے ترک عوام کے حوصلے بڑھا دیے اور وہ اپنی کھوئی ہوئی آزادی کے حاصل کرنے میں جس عزم اور استقلال کے ساتھ اُٹھے تھے اسی طرح کامیاب ہوئے۔ زمانے کی فرعونی قوتوں نے ترک قوم کے اس عزم اور ارادے کا مضحکہ اڑایا مغرب کی فضا میں اس کے خلاف طنز آمیز قہقہوں کا ہجوم ہوا لیکن ترکی عوام نے جب یونانیوں کو بے عزتی کے ساتھ اناطولیہ سے نکال باہر کیا اور چناق سے آگے بڑھ کر قسطنطنیہ پر اپنی آزادی

کا پرچم لہرا دیا تو اس وقت ہر سامراجی طاقت نے اپنی غلطی کو محسوس کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوزان کانفرنس میں ترکی کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں موجودہ جمہوریہ ترکی کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے پہلے صدر ترک قوم کے محبوب رہنما کمال اتاترک بنائے گئے۔ اب کیا تھا۔ ترکی قوم ایک نئی زندگی کے سانچوں میں ڈھلنے لگی۔ اور اس میں قومیت کا ایک ایسا جذبہ صادق پیدا ہو گیا جس میں کسی قوم کے مذہبی تعصبات کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ یہیں سے ترکی حکومت کی تعمیر نو کا آغاز ہوتا ہے جس نے مذہبی امتیازات کو نظر انداز کر کے اپنی کمزوریوں پر غالب آ کر ایک منظم قوم کی شکل میں اپنے آپ کو ڈھالا ہے جس کا نقطۂ نظر انسانیت ہو ترک قوم کی زندگی میں یہ دور ایسا دور تھا جبکہ اس کو رجعت پسندی کے مرکز سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا جہاں سے اس میں زندگی کی نئی قدریں پیدا ہو گئیں۔ شخصی حکومت کے خاتمے نے ترکوں کے لئے ترقی کی وہ تمام شاہراہیں کھول دیں جو قیام جمہوریت سے قبل مسدود تھیں۔ ترکی کی اس ترقی کا اندازہ ہم سر جارج کلارک کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ جنھوں نے ترکی سیاحت سے واپس آنے کے بعد ان خیالات کو قلم بند کیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے اور کسے معلوم تھا کہ یورپ کا مرد بیمار اس قدر تیزی سے اپنی اس ترقی پسند زندگی کا ثبوت دے گا۔ میں نے ترکی کی سیاحت کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ترک قوم کی ترقی کی راہ میں دو طاقتیں سنگ گراں بنی ہوئی تھیں۔ پہلی چیز شخصی حکومت اور دوسرا ملاؤں کا اقتدار۔ لیکن کمال اتاترک کے ہتھوڑے کی ضربات اور عصمت انونو کی سیاسی تدابیر نے ان پتھروں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ اور قوم و ملک کے لئے ترقی کی تمام راہیں کھول دیں۔ ذیل میں ہم ان چند ترقیوں کا ذکر کرتے ہیں جن سے ترکوں کی مادی خوش حالی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ کسی بھی ملک کی معاشی و تجارتی ترقی کا انحصار وہاں کے رسل و رسائل، حمل و نقل پر منحصر ہے۔ جمہوریہ ترکی نے مناسب حکومت سنبھالتے

ہی سب سے پہلے ریلوے لائنوں کی تعمیر کی طرف اپنی توجہ مبذول کی اور اپنے ملک میں ریلوں کا ایک جال بچھا دیا۔ اور ان ریلوے لائنوں کی تعمیر و ترمیم کی گئی جو جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ترکی حکومت نے ۳۰۰۰ کلومیٹر جدید ریلوے لائن تعمیر کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سڑکوں وغیرہ کی تعمیر پر بھی لاکھوں پونڈ صرف کئے گئے۔ یہی حال صنعت و حرفت کا ہے۔ تجارتی اداروں کو سفارت خانوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہر شخص اپنے کاروبار میں آزاد ہے۔ قسطنطنیہ میں "ایوانِ تجارت" کے نام سے ایک محکمہ قائم ہے جس نے فرانس، جرمنی، ہنگری، فن لینڈ، روس، ایران، عراق، یونان، رومانیہ، امریکہ، برطانیہ، اور اٹلی سے تجارتی معاہدات کر رکھے ہیں۔ درآمد و برآمد کے لئے مساوی سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ موجودہ ترکی میں کارخانوں کی تعداد ۱۰۵۰ ہے۔ آج کا ترک کسی بھی ملک کے کپڑے کا محتاج نہیں ہے بلکہ اپنی ضرورت سے زیادہ کپڑا تیار کرتا ہے۔ معدنیات کی کانوں کی دریافت کی وجہ سے ترکی کا ہر کار طبقہ آج برسرکار نظر آتا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ترکی معدنیات کی آمدنی صرف ایک لاکھ پونڈ تھی لیکن ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ معدنیات کی آمدنی پچیس کروڑ چھتر لاکھ ترکی پونڈ ہے۔ جمہوریہ ترکی کے ظہور پذیر ہونے سے قبل ترکی میں صحت عامہ کا فقدان تھا۔ لیکن "کبیر ملی" (ترکی پارلیمان) نے ۱۹۲۳ء میں باضابطہ طور پر محکمہ صحت عامہ کی بنیاد رکھی جو اپنے ملک والوں کی فلاح و بہبود اور اُن کی جسمانی ترقی کے لئے نمایاں طور پر کام انجام دے رہا ہے۔ آج ترکی میں بڑے بڑے ہسپتال اور زچگی خانے اور مرکز بہبودی اطفال نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں سند یافتہ ڈاکٹروں کی تعداد صرف دس ہزار تھی لیکن ۱۹۳۶ء کی طبی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ رجسٹر شدہ ڈاکٹروں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہے تعلیمی ترقی کا بھی یہی حال ہے۔ وزیر تعلیم ترکی نے ۱۹۳۳ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جمہوریہ ترکی کے قیام سے قبل ہمارے ملک میں تعلیم نہ دنیا کے لئے مفید سمجھی گئی تھی اور نہ دین کے لئے۔ لیکن اب حالت بالکل بدل چکی ہے۔ اور ہماری تعلیمی ترقی کی تمام شاہراہیں کھلی ہیں۔

موجودہ تعلیم کی بنیاد جدید ترین اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ آج ہم تعلیم کی بدولت ہی دنیا میں زندہ قوم سمجھے جانے لگے ہیں۔ ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اپنی مادی اور معنوی زندگی میں کامیابی حاصل کی جائے۔ ۴ مئی ۱۹۲۴ء کے جدید احکامات کی رو سے ان تمام مدارس کو بند کر دیا گیا جو بیرونی حکومتوں کے سرمایہ سے چلتے تھے۔ جن کا مقصد اپنے اپنے خیالات کی اشاعت و ترویج تھا۔ موجودہ تعلیمی درسگاہیں مذہبی پابندیوں سے آزاد ہیں۔ ابتدائی تعلیم عام اور لازمی ہے۔ اس وقت صرف شہر استنبول میں ۱۴۴۴ درسگاہیں ہیں۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں استنبول میں صرف ۱۹۹ مدارس تھے۔ ترکی کے طول و عرض میں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد ۴۸۷۶۰۰۱ ہے۔ فوجی تعلیم کو لازمی گردانا گیا ہے۔ یہی حال تعلیم نسواں کا ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کی تعداد صرف ۱۰ تھی۔ لیکن دیکھئے تعلیم نسواں میں اس قدر ترقی ہوئی کہ سنہ ۱۹۳۴ء کی تعلیمی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ترکی میں صرف قانون دان خواتین کی تعداد سات سو سے زیادہ ہے جو باضابطہ طور پر وہاں کی عدالتوں میں پریکٹس کر رہی ہیں۔ ۱۵ خواتین ترکی عالیہ کی جج ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ترکی پارلیمان میں عورتوں کو نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ جمہوریہ ترکی نے صرف عام جمہور کے فائدے کے لئے ہی سب کچھ نہیں کیا بلکہ ان طبقات کا بھی خیال رکھا جو در اصل قوم کے معمار ہیں جنہیں دوسرے معنوں میں ہم کسان اور مزدور کہتے ہیں۔ ملک میں زراعتی بنک کھولے گئے جو صرف کاشتکاروں کو بلا سود روپیہ قرض دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ زراعت کے لئے ہر طرح کے جدید آلات فراہم کئے گئے۔ اس طرح سے زراعت پیشہ آبادی کو بہت بڑا فائدہ حاصل ہوا۔ انقلاب روس کے اثرات نے یورپ کے تمام ممالک کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کا سامان مہیا کریں۔ اس اثر سے ترکی کب بچ سکتا تھا۔ روس اور ترکی کے باہمی تعلقات نے ترکی کے مزدوروں کی اصلاح میں بہت بڑا حصہ لیا۔ جس کی وجہ سے مزدوروں کے مفاد کے قوانین نافذ کئے گئے جس میں اُن کے کام کی اجرتیں۔ وقت کا تعین۔ اُن کے حقوق کی حفاظت تندرستی غرض کہ ہر طرح سے ان قوانین میں مزدوروں کے مفاد کو پیش نظر رکھا گیا۔ صرف اسی پر قناعت نہیں کی گئی بلکہ ملکی سرمایہ کو بڑھانے کے لئے ملک میں بنکوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس وقت ترکی میں تقریباً ۴۰ بنک ہیں جن کا

مجموعی سرمایہ بارہ ارب پونڈ ہے ان تمام چیزوں سے قطع نظر ترک مدبروں نے اپنی حفاظت کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کرسکتے ہیں۔ آج کا ترکی جدید جنگی تنظیم سے مالا مال ہے۔ آج سے ایک سال قبل ترکی کی میدانی فوج ۳۰ انفنٹری ڈویژن ایک مسلح بریگیڈ اور ۳ سوار ڈویژنوں پر مشتمل تھی۔ آج فوج کی عملی طاقت پانچ لاکھ ہے۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ یہ جمعیت بڑھ کر ۲۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی تنظیم جدید جاری ہے۔ فوج کو سامان بڑی مقداروں میں برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور روس سے تھوڑی مقداروں میں مل رہا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں ترکی کی ہوائی قوت ۳۶ سکواڈرن پر مشتمل تھی۔ لیکن ۱۹۴۳ء میں اس قوت میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ ترکی بحریہ میں آٹھ عصری تباہ کن جہاز تقریباً ۱۵ آبدوزیں اور ایک جنگی کروزر "گوابن" بھی ہے۔

یہ ہے موجودہ ترکی .... جس نے اپنے ملک والوں کو جمہوری اصولوں پر گامزن کرکے اقوام عالم میں ایک نمایاں جگہ کا مستحق ثابت کردیا اور بتایا کہ قومیں کس طرح سے زندہ رہتی ہیں۔ موجودہ جنگ کی ابتدا ہی سے اتحادیوں اور نازیوں دونوں نے ترکوں کو اپنے اپنے ساتھ ملانے کی پوری پوری کوششیں کیں مگر ترک مدبرین نے جنگ کی ان شعلہ فشانیوں اور خون آشامیوں سے جو پانچ سال سے متمدن یورپ کے جدید تمدن کی بربادی کا اعلان کررہی ہیں اب تک اپنا دامن محفوظ رکھا۔ حالانکہ سقوط فرانس کے بعد اور روس پر جرمنی کے حملہ آور ہونے سے پہلے نازیوں نے اس امر کی شدید کوششیں کیں کہ ترکی اُن کا حلیف بن جائے اور اس کے لئے انھوں نے اس بات کا لالچ بھی دیا تھا کہ وہ شام اور فلسطین پر قبضہ کرے۔ لیکن ترکی غیر جانبدار ہی رہا مگر ۲ اگست ۱۹۴۴ء کی سہ پہر کے بعد سے اس کے اس اعلان نے کہ ترکی نے جرمنی سے اپنے سیاسی اور اقتصادی تعلقات منقطع کرلئے ہیں اُسے پورے طور پر اتحادیوں کی صف میں لا کھڑا کردیا ہے۔ ترکی کے اس فیصلے سے جو عملی نتائج برآمد ہوں گے وہ یہ ہیں:

(۱) جرمن اقتدار اور اس کی سیاست پر یہ ایک کاری ضرب ہے کیونکہ اب تک جنوب مشرقی یورپ کی قومیں اور اسلامی ممالک کے باشندے ترکی کی سیاست سے اپنی پالیسی کو ترتیب

دیا کرتے تھے لیکن ترکی کے اس فیصلے کے بعد انہیں یقین ہو جائے گا کہ محوری اس جنگ میں فتح حاصل نہیں کر سکتے اور وہ ایک معین پالیسی پر کاربند ہو سکیں گے

(۲) کھالو، تانبا، کیمیائی اشیاء، اور دوسری خام پیداوار سے جرمنی کو بہت بڑی حد تک محروم ہونا پڑے گا۔ جو جنگ کے اس آخری مرحلے پر اس کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

(۳) جرمنوں کو ترکی کے اس فیصلے سے ایک ایسے مقام سے ہاتھ دھونا پڑ رہا ہے جہاں سے وہ بلقان کے تمام معاملات کے متعلق بہترین معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ آج اس کی اس وجہ سے بھی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ یہ ممالک محوریوں کے خلاف بغاوت کر چکے ہیں

یہ تھے وہ سیاسی نتائج جن کی وجہ سے جرمن ہمیشہ ترک مدبرین کی خوشامد کیا کرتے تھے۔ لیکن ترکی کے ۲ اگست ۱۹۴۴ء کے اس واضح اعلان نے نازی سیاست میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے کہ اسے کسی طرح بھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اب وہ دن دور نہیں ہے جب محوریوں کی شکست کے بعد تاریخ کا ایک خونیں باب ختم ہوگا اور ایک نئے باب کے سرنامے پر امن اور آزادی کی پرستش امیدوں کے نئے نقوش ابھر رہے گے۔

۱۰ جنوری ۱۹۴۵ء

سری نواس لاہوتی
(حیدرآباد دکن)

شاعرزادہ

(ایک طنز)

قمر قطبی فرنسی ہیں،

میں اپنی داستان قلم بند کرنے سے قبل اپنی بہنوں اور بھائیوں سے درخواست کروں گی کہ وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کریں کہ انسان جتنا تنوع پسند اور متلون مزاج واقع ہوا ہے۔ اور جتنا یہ بیزار زندگی کی یکسانیت سے گھبراتا ہے۔ اگر برس کے بارہ مہینے ایک ہی موسم رہے۔ اور روزانہ ایک ہی قسم کی غذا کھانے کو اور ایک ہی قسم کا کپڑا پہننے کو ملے تو کیا آپ اکتا نہ جائیں گے؟ یقیناً آپ اس یکسانیت اور یک رنگی قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ سوائے چند خاص صورتوں کے۔ جیسے آپ کسی جیل خانے کے قیدی ہوں، فوج کے سپاہی ہوں یا یتیم خانے کے بچے ہوں یا پھر آپ انسان نہیں فرشتہ ہوں اور دنیا کو جنت سمجھ کر رہتے ہوں۔

تو خیر، جب میں نے ہوش سنبھالا اور اپنے پرائے کو سمجھنے کے لائق ہوئی تو ابا اور اماں اور دو بڑے بھائیوں کے علاوہ دادا اور دادی بھی زندہ تھے۔ اس زمانے میں ہم جس مکان میں رہتے تھے وہ کچھ اس وضع پر تھا کہ زنان خانے میں دو بڑے بڑے دالان اور ساتھ کے کمرے ایک دوسرے کے بالمقابل تھے، باہر مردان خانے کے بھی دو حصے ہو گئے تھے جو دو دیوان خانے بن گئے تھے۔ زنان خانے میں ایک طرف ہم لوگ رہتے تھے اور ایک طرف دادا اور دادی۔ اسی طرح مردان خانے کے دو حصوں میں سے ایک پر ابا کا قبضہ تھا اور ایک پر دادا کا۔

دادا کے پاس بھی بہت سے لوگ ملنے آتے تھے۔ اور ابا کے ملنے والے بھی بہت تھے جن کا تانتا ابا اور دادا کی موجودگی اور غیر موجودگی میں یکساں بندھا رہتا تھا۔ جب ابا اور دادا اپنے اپنے دوست احباب میں بیٹھے رہتے۔ میں کبھی ابا کے پاس چلی جاتی اور کبھی دادا کے پاس۔ میں دیکھتی کہ جو رنگ دادا کے پاس

جار بیٹا وہیں ابا کے پاس بھی رہتا۔ یعنی جو لوگ دادا کے پاس آتے وہ بھی دادا کو کچھ سناتے اور کچھ لکھے ہوئے پرچے دکھاتے اور جو لوگ ابا کے پاس آتے وہ بھی ابا کو کچھ سناتے اور کچھ لکھے ہوئے پرچے دکھاتے۔ ان پرچوں میں دادا بھی کچھ کاٹ چھانٹ کرتے اور بتلاتے اور ابا بھی یہی کرتے۔ کبھی کبھی دادا بھی ان لوگوں کو کچھ سناتے اور وہ لوگ باادب بیٹھتے۔ تھوڑی تھوڑی دیر سے واہ وا، سبحان اللہ۔ استادی ہے۔ استادی کہتے جاتے۔ اور اسی طرح ابا بھی جب کچھ سناتے تو ان کے ہم نشیں اچھل اچھل کر، رانوں پہ ہاتھ مار مار کر اور عجیب عجیب شکلیں بنا بنا کر تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔

جب میں بہت دنوں کے بعد بھی کچھ نہ سمجھ سکی تو ایک دن اماں سے پوچھا "اماں! یہ ابا اور دادا کے پاس جو لوگ آتے ہیں۔ یہ آپس میں کیا سننے سنانے ہیں اور ابا اور دادا کو پرچوں پر لکھ کر کیا دکھاتے ہیں؟" تو اماں نے کہا "بیٹی! تمھارے ابا اور دادا شاعر ہیں اور جو لوگ ان کے پاس آتے ہیں وہ یا تو ان کے شاگرد ہیں یا شاعر احباب۔ اور یہ لوگ جو سنتے سناتے اور پرچوں پر لکھ کر دکھلاتے ہیں۔ اس کو شاعری کہتے ہیں۔" پھر میں نے شاعر اور شاعری کے متعلق پوچھا۔ جس پر اماں نے جانے کیا کیا بتایا جو میرے پلے خاک نہ پڑا۔

کبھی کبھی ابا اور دادا گھنٹوں دالان میں ٹہلتے ہوئے۔ گنگناتے اور گنگناتے ہوئے ٹہلتے۔ میں اگر ایسے اوقات میں ان میں سے کسی کے پاس جاتی تو مجھے دوسرے وقتوں کی طرح پیار نہیں کیا جاتا بلکہ جھڑک دیا جاتا۔ اور اگر گھر میں بھی اس وقت کوئی گڑبڑ کرتا تو اس پر ڈانٹ پڑتی۔ میں نے ایک دن اماں سے دریافت کیا "اماں یہ ابا اور دادا کو کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے؟" تو اماں نے کہا "ہو کیا جاتا ہے۔ شاعری کے دورے پڑتے ہیں۔ شعر موزوں ہوتے ہیں۔"

یوں تو گھر میں ابا تھے۔ دادا تھے۔ ابا ملازم تھے۔ دادا کی پنشن آتی تھی اور ساتھ ہی کسی امیر کے استاد اور مصاحب ہونے کا وظیفہ بھی ملتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود گھر کو دیکھ کر ویرانہ یاد آ جاتا تھا۔ نہ ابا کو خانہ داری کے کاروبار سے سروکار اور نہ دادا کو۔ دادی مختار کل تھیں جو چاہتیں کرتیں لا

ظاہر ہے کہ ایک عورت کیا کرسکتی ہے۔ اس پر دادی کی ہتھیلی میں گویا سوراخ تھا جو کچھ آتا کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بے ڈھنگے طور پر اڑ جاتا۔ لیکن کون تھا جو دادی سے باز پُرس کرتا۔ ابا اِدھر شعر و شاعری میں گم، دادا اُدھر۔ انتہا ہے کہ ایک گھر میں رہنے کے بعد بھی ابا اور دادا آپس میں بہت کم بولتے تھے۔ بالفاظ دیگر انھیں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

اسی صورت سے گذر رہی تھی کہ ابا کا تبادلہ دوسرے دفتر میں ہوگیا اور جس مکان میں ہم رہتے تھے وہ دفتر سے بہت فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ہم کو مجبوراً دادا سے علیحدہ ہونا پڑا۔ بعض سہولتوں کے مدنظر دادا وہیں رہ گئے۔ اور ہم دفتر سے قریب دوسرے مکان میں اٹھ گئے۔ جس مکان میں ہم اٹھ کے گئے تھے۔ وہ شہر سے کافی دور تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ منحوس صورتیں جو ابا کے دیوان خانے میں اکثر نظر آتی تھیں، یہاں بھی برابر دکھائی دیتیں۔ مجھے حیرت ہوتی کہ اے خُدا! اس نگوڑی شاعری میں ایسا کیا مزہ اور رس ہے جو یہ لوگ اس کو نہیں چھوڑتے۔ یا یہ شاعری کوئی بلا ہے جو ان کو نہیں چھوڑتی۔ بے دے کر اماں ہی تھیں جن سے میں کچھ پوچھ سکتی تھی۔ میں نے ان پر اپنا یہ خیال ظاہر کیا تو انھوں نے کہا "بیٹی! شاعری میں کوئی فائدہ نہیں ہے سوائے نقصان اور تضیع اوقات کے۔ لیکن جب کسی کو اس کا چسکا پڑ جاتا ہے تو پھر وہ اسی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ دنیاداری کے کام کا نہیں رہتا۔ یہی دیکھو کہ تمھارے ابا اس وقت ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ کون ہے جو ان کو نہیں جانتا اور نہیں مانتا۔ لیکن اس کے باوجود ان کو ٹکے کی آمدنی نہیں۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر دفتر میں سڑتے ہیں۔ سرکار انھیں اس وجہ سے ترقی نہیں دے دیتی کہ وہ بڑے شاعر ہیں۔ اور نہ ان کو اپنی ترقی اور تنزل کی پروا ہے نتیجہ ظاہر ہے۔ جہاں تھے۔ وہیں ہیں۔ ورنہ خدا جانے کہاں رہتے"

میرے ذہن میں کبھی اس سے پہلے یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوا تھا کہ شاعری کیسی چیز ہے؟ لیکن اماں کی ان باتوں کے بعد شاعری کے متعلق میری رائے بری ہو گئی۔ واقعی میرے سامنے دادا کی مثال تھی۔ ابا کی مثال تھی اور گھر کا نقشہ۔ دونوں بڑے بھائی آوارہ پھرتے۔ جب چاہتے اسکول جاتے۔ جب چاہتے

دجانے۔ لیکن ابّا انھیں کچھ نہ کہتے۔ میں اکثر کھیل کود میں مشغول رہتی۔ لیکن کبھی ابا کو میری تعلیم و تربیت کا خیال نہ آیا۔ اگر کسی کو ہماری اور ہمارے مستقبل کی فکر تھی تو اماں کو تھی۔ وہ بے دست و پا تھیں۔
ابّا نے کبھی اپنے لڑکوں سے کچھ کہا تو یہی کہ اپنے باپ اور دادا کے نقشِ قدم پر نہ چلنا۔ ورنہ پچھتاؤ گے کیونکہ

شاعر اوروں کو پلا سکتا ہے پی سکتا نہیں — زندگی کا درس دے سکتا ہے جی سکتا نہیں

لیکن شاید یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ جس کام سے اس کو باز رکھا جاتا ہے۔ وہ اس کو نہ کرنے والا بھی ہو تو ضرور کرتا ہے۔ چنانچہ ابا کی نصیحت کا یہی اثر ہوا کہ بڑے بھائی صاحب نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا ہے۔ ابا نے ان کو اس پر روکنا چاہا تو ان کی ضد اور بڑھی اور پھر تو انھوں نے اپنے باضابطہ شاعر ہونے کا اعلان کر دیا۔ بھائی صاحب کو پہلے تو شاعری ورثہ میں ملی تھی۔ پھر شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ پھر وہ شاعری میں کس طرح پیچھے رہتے، دیکھتے دیکھتے ترقی کی منزلیں طے ہو گئیں۔ اور دو تین ہی برس کی مشق و مزاولت نے انھیں ایک خوش گو شاعر بنا دیا۔ پھر تو کوئی مشاعرہ اور جلسہ ایسا نہ ہوتا جس میں بھائی صاحب مدعو نہ کیے جاتے ہوں۔ مقامی ریڈیو پر بھی انھیں بلایا جاتا۔ اور دور دور سے بھی اُن کے نام دعوتی رقعے آتے اور اُن کو شکریے کے ساتھ سفر خرچ پیش کیا جاتا اور جب تک وہ وہاں قیام کرتے پرتکلف ضیافتیں اڑائے رہتے۔ چشم بد دور اس جوان سالی میں یہ پذیرائی۔ کہنا پڑتا ہے کہ قبولِ عام و لطفِ سخن خداداد چیز ہے۔

لیکن افسوس کہ بھائی کی اتنی قدر و منزلت، اور بڑے بڑے لوگوں سے جان پہچان اور ان تک رسائی ہونے کے بعد بھی، اُن کے پاس کوئی ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے، کوئی انھیں بیس تا سا ٹھ کی نوکری بھی نہ دلا سکا۔ مجھے اگر کوئی خوشی اس خیال سے ہو جاتی کہ میں ایسے ارباب ادب کی، جن کو کیا عوام اور کیا خواص اپنے سر آنکھوں پر بٹھلاتے، دل میں جگہ دیتے ہیں۔ بیٹی، پوتی اور بہن ہوں تو معاً ان کی ناکام زندگیوں کے کھنچے مرقعے میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے اور مجھ پر ان کی حرت، شہرت، ماتھ کا اور مفلوک الحالی کا کھوکھلا پن پوری طرح عریاں ہو جاتا۔ اور میں سوچتی کہ کیوں یہ لوگ ایسے شعر

کی آبیاری میں اپنی عمرِ عزیز ضائع کر رہے ہیں۔

بھائی صاحب کے شاعر ہونے کی دیر تھی کہ ہمارے ایک ماموں صاحب نے بھی پیٹ میں سے پاؤں نکالے۔ حالانکہ ان کی سات پشتوں میں بھی کوئی شاعر تو شاعر "مداح" بھی نہ ہوا ہوگا۔ لیکن انھیں اس سے کیا۔ ان کی بھی تو غیرت ہے۔ بھانجہ شاعر ہو جائے اور ماموں صورت دیکھتا رہ جائے۔ ڈوب مرنے کا مقام تھا ماموں کے لئے۔ لہٰذا انھوں نے بھی شاعری شروع کر دی۔ اور اپنے خاندان میں شاعری کا بیج بو دیا۔

ماموں صاحب کے شاعر بنتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ اب تو میں بھی شاعر بن جاؤں گی۔ اماں بھی شاعر بن جائیں گی۔ اور گھر کی ماما بھی شعر کہنے لگے گی اور غالباً ہمیں شعر ہی کھلائے گی۔ غرضکہ گھر کے در و دیوار، زمین و آسمان اور بالآخر کائنات کا ذرہ ذرہ شاعر ہو جائے گا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔ تاہم یہ بھی غنیمت کیا کم تھا کہ جب بھائی صاحب کی کوئی تازہ نظم یا غزل ہوتی۔ یا انھیں کسی مشاعرے یا جلسے میں کچھ سنانا ہوتا تو وہ دن بھر پڑھنے کی مشق کیا کرتے اور نئی نئی طرزیں دریافت کرتے رہتے۔ اس دوران میں اُن کا جو بھی دوست ملنے آتا وہ اُن سے بغیر کچھ سنے نہیں جاتا۔ اور اگر خیر سے وہ خود بھی شاعر ہوتا تو وہ بھی ضرور کچھ فردوس گوش کرتا۔

یہ شاعری کا چکر اگر اب بھی ختم ہو جاتا تو کوئی بات نہ تھی۔ بہت ممکن تھا کہ میں ایک نئے ماحول اور نئی دنیا میں پہنچ کر اپنے گذشتہ ایام کو بھول جاتی۔ لیکن مشیت الٰہی میں کون دم مار سکتا ہے۔ غالباً یہ بھی شاید خدا بھی شاعر ہے یا پھر یہ اس کی ستم ظریفی ہے کہ اس نے میری شادی بھی کرا دی تو ایک شاعر کے ساتھ جو ابا کے بڑے عقیدت مند اور چہیتے شاگرد اور بھائی صاحب کے قریبی دوست ہیں۔ کاش یہ حضرت مزدور ہوتے۔ پہلوان ہوتے، بنیے ہوتے۔

میرے شوہر صاحب بھی بھائی صاحب اور ماموں صاحب یا آج کل کے اکثر ہندوستانی نوجوانوں کی طرح بے روزگار ہیں۔ باپ کا سایہ سر پر ہے۔ کھانے پینے کی طرف سے بے فکری ہے۔ اس کو چھوڑئیے کہ شادی کرنے کے بعد بھی اُن کی غیرت کیسے گوارا کرتی ہے کہ باپ کے ٹکڑوں پر پڑے رہیں۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے لیکن اُن کا وہی چلن ہے۔ جب دیکھو شاعری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور یاروں کے ساتھ آوارہ گردی ہو رہی ہے۔ معمولاً آدھی رات گئے مراجعت عمل میں آتی ہے۔ آپ کہیے مجھے اس بات سے کیا؟ مگر رونا تو اس کا ہے کہ رات کے دو بجے بھی پڑ کے سو نہیں رہتے۔ بلکہ دن بھر کی آوارگی اور اتنی رات گئے جگے رہنے کے باوجود اس وقت فکر شعر ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے! سارا گھر آرام کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔ میں بھی تارے گن گن کر، کروٹیں بدل بدل کر اور "شاعری کا تعلق دنیا کی اور شعر کا تعلق خدا سے" کے موضوعات پر سوچ سوچ کر سونے لگتی ہوں کہ آہستہ سے دروازے کا کواڑ کھلتا ہے اور آپ چوروں کی طرح دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ اور میری طرف ڈرتے ڈرتے دیکھ کر، اس امر کا اطمینان ہو جانے کے بعد کہ میں سو چکی ہوں۔ لیمپ کی روشنی تیز کرتے ہیں اور سگریٹ جلا کر دس پندرہ منٹ میں پہنے ہوئے کپڑے اتارتے اور شب خوابی کا لباس پہنتے ہیں پھر لیمپ کی روشنی دھیمی کر کے لحاف میں گھس جاتے ہیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں اور صبح کی خیر منانے کے لئے دوسری کروٹ بدلتی ہوں کہ لحاف کے اندر سے جھینگر کے پکارنے کی سی آواز آنے لگتی ہے میں گھبرا جاتی ہوں۔ کبھی یہ سوچتی ہوں کہ آپ کراہ رہے ہیں اور کبھی یہ کہ آپ خراٹے لے رہے ہیں۔ ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پائی کہ آپ کلبلاتے ہیں اور منہ پر سے لحاف سرکا کر اس میں سے بلّی کی طرح باہر نکل آتے ہیں۔ پھر لیمپ کی روشنی تیز کر کے کاغذ اور قلم ڈھونڈتے ہیں۔ پھر کاغذ قلم لے کر لکھتے اور سوچتے، سوچتے اور لکھتے ہیں۔ پھر گنگناتے گنگناتے ٹہلتے ہیں اور ٹہلتے ٹہلتے گنگناتے ہیں۔ یہ دورہ کبھی تو جلد ختم ہو جاتا ہے اور کبھی تو صبح کا پیغام لاتا ہے اور بھور ہو جاتی ہے۔

اب آپ ہی بتلائیے کہ ان حالات کے تحت میرا شاعری سے متنفر ہونا کس حد تک حق بجانب ہے۔ مانا کہ شاعری بجائے خود اعلیٰ و ارفع چیز ہے لیکن شاعری کو اپنے اور دوسروں کے لئے لعنت بنا دینا یہ کہاں کی شاعری ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ میری مصیبت کو دور کر دے یعنی میرے شوہر صاحب میری سوت کو طلاق دیدیں اور کھانے کمانے کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی کوئی ٹھوس اور اعلیٰ عملی خدمت کریں۔ آپ بھی اگر شاعر ہیں تو مجھ شاعر زدہ کے لئے دعا فرمائیے ممنون ہوں گی۔

شہناز۔ سلیمان اریب

مجبور

جو دل محسوس کرتا ہے لبوں پر آ نہیں سکتا
تڑپ سکتا ہوں، اوروں کو مگر تڑپا نہیں سکتا
جہاں میں اپنے دل کی دھڑکنیں پھیلا نہیں سکتا
میں شعلے پی تو سکتا ہوں، مگر بھڑکا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

بھڑکتی بجلیاں مستور میرے فکر پاروں میں
دہکتی آگ روشن ہے مرے تخئیل زاروں میں
سلگتے راگ خوابیدہ ہیں میرے دل کے تاروں میں
مگر اس ساز سے جھنکاریاں برسا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

اگرچہ ہر نفس چلتی ہوئی تلوار رکھتا ہوں
اگرچہ روح میں کچھ کھولتے اسرار رکھتا ہوں
اگرچہ دل میں غم کی دولت بیدار رکھتا ہوں
یہ سوز اندروں لیکن زباں تک لا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

ترنم ریز ہے اک ساز بے مضراب سینے میں
چھپا رکھے ہیں کتنے انجم و مہتاب سینے میں

وہ جس دھن میں دھڑکتا ہے دلِ بیتاب سینے میں
اُسی دھن میں دلِ کون و مکاں دھڑکا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

پریشاں خواب ہیں میرے زبوں بیداریاں میری
مرے بکھرے ہوئے افکار ہیں دشواریاں میری
ارادے بیکراں میرے بجُور خودداریاں میری

خودی کے سبز پرچم کو یہاں لہرا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

ہزاروں بےکسانہ شعلہ ہائے راز ہیں دل میں
کئی اشعارِ بے الفاظ و بے آواز ہیں دل میں
مرے جذبات کے کتنے دھڑکتے ساز ہیں دل میں

مگر میں اک شکستہ تار بھی لرزا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

میں یہ بے رنگیٔ رنگِ چمن محسوس کرتا ہوں
میں یہ مجبوریٔ اربابِ فن محسوس کرتا ہوں
سلاسل بندیٔ اہلِ وطن محسوس کرتا ہوں

مگر مجبور ہوں دل کو زباں پر لا نہیں سکتا
کہ میں اپنی خوشی سے کوئی نغمہ گا نہیں سکتا

سید ضمیر جعفری

حالاتِ حاضرہ

۱- ہندوستان

ایک کمرے کے منصوبے کا دوسرا حصہ

نومبر کے جامعہ میں ہم نے ہندوستان اور تنظیم مابعد جنگ کے عنوان کے تحت اس معاشی منصوبے کا خلاصہ شائع کیا تھا جسے ہندوستان کے آٹھ ممتاز صنعتی رہنماؤں نے تیار کیا تھا۔ اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ پندرہ سال کے دوران میں ہندوستان کی اوسط سالانہ آمدنی کس کو جو جنگ سے قبل کی قیمتوں کے حساب سے برطانوی ہند کے لئے ۶۵ روپے ہوتی تھی بڑھا کر تقریباً دوگنا یعنی ۱۳۵ روپے کر دیا جائے۔ لیکن اس میں صرف اوسط آمدنی کے اضافے کو سامنے رکھا گیا تھا۔ یہ نہیں بتلایا گیا تھا کہ اس اضافے میں مزدوروں اور غریبوں کا حصہ کیا ہوگا اور امیروں کا کیا۔ اس بنا پر اس پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ یہ منصوبہ سرمایہ داروں نے اپنی دولت بڑھانے کے لئے بنایا ہے۔ اس کا جواب ایک کمرے کے منصوبے کے مصنفوں نے جنوری ۱۹۴۵ء میں اپنی تصنیف کے دوسرے حصے کو شائع کرکے دیا ہے۔

اس دوسرے حصے میں ایک طرف تو اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ آبادی کے مختلف طبقوں میں مجموعی آمدنی کو کس طرح تقسیم کیا جائے گا۔ اور دوسری طرف یہ بتلایا گیا ہے کہ معاشی کاروبار کے انتظام و انصرام میں حکومت کا حصہ اور اس کی حیثیت کیا ہوگی۔

منصوبے کے مصنفوں نے شروع ہی میں اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ وہ نجی ملکیت اور آزاد اقدام (یعنی سرمایہ داری) کے نظام کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کو اپنی موجودہ حالت پر قائم رکھنے کے بھی وہ طرفدار نہیں ہیں۔ وہ جہاں اس کی خوبیوں کے معترف ہیں وہاں اس کی خامیوں کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کی بڑی خرابی یہ ہے کہ اس نظام کے ماتحت قومی آمدنی کی تقسیم کا کام اطمینان بخش طریقے پر نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں پیدائش دولت کے سلسلے میں

اس کی کارگزاری نہایت شاندار اور پائدار نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ انفرادی اقدام کو ختم کرنا نہیں چاہتے۔ البتہ وہ اس بات کی ضرور ضمانت کرنا چاہتے ہیں کہ مزدور اور سرمایہ دار کی مشترکہ کوشش سے جو پیداوار حاصل ہو اس کا واجبی حصہ سب کو ملے۔ یہ نہ ہو کہ کچھ لوگ ناانصافی کے ساتھ باقی سب لوگوں کے حق کو ہتھیالیں۔

ہندوستان میں ۱۹۳۱-۳۲ء کی ایک تحقیقات کے مطابق صورت یہ تھی کہ سالانہ آمدنی فی کس کا اوسط ۶۵ روپئے ہوتا تھا۔ لیکن یہ غریب اور امیر سب کی آمدنیوں کا اوسط تھا، یعنی آبادی کی اکثریت کی آمدنی اس اوسط سے بھی کم تھی۔ اس کی وجہ اول تو یہ تھی کہ شہر اور دیہات کی آمدنی کے اوسط میں فرق پایا جاتا تھا۔ شہر کا اوسط ۱۶۶ روپے فی کس تھا تو دیہات کا صرف [illegible] روپے تھا۔ دوسرے شہر کی آمدنی کے میزان کا تقریباً نصف حصہ ۱۰ فی صدی سے کم شہری کارکنوں کو ملتا تھا۔ اگر محض ان لوگوں کا شمار کیا جائے جن کی آمدنی دو ہزار روپئے سالانہ سے زیادہ تھی تو اس طبقے میں بھی ۳۰ فی صد اپنی مجموعی آمدنی کے صرف ۱۷ فی صد حصے پر مطالبہ کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ایک فی صد لوگ اپنی مجموعی آمدنی کے دس فی صد حصے کے مالک و مختار تھے دیہات کی زیادہ تر آبادی کی آمدنی ۵۰ روپے فی کس سالانہ سے کم تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسانوں کی اکثریت کی جوت میں دو ایکڑ سے کم رقبہ تھا۔ اس کے علاوہ زراعتی مزدور جس کی اجرت بعض وقت صرف دو تین آنے یومیہ ہوتی ہے اور خود کسان سال میں تین سے چھ مہینے بیکار رہنے کے لئے مجبور ہیں۔ پھر ۱۹۳۹ء سے اب تک آبادی میں جو اضافہ ہوا ہے اس نے بھی بلاشبہ اس غریب طبقے پر دباؤ کو پہلے سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ غرض جنگ سے پہلے کی صورت حال یہ تھی۔

مجوزہ منصوبے کی تکمیل کے بعد یہ تو امید ہے کہ اوسط آمدنی سالانہ فی کس میں اضافہ ہوگا لیکن اگر غریبوں کا حصہ رسد وہی رہا جو ۱۹۳۱ء میں تھا یا اس وقت کے مقابلے میں بھی ان کا نسبتی حصہ کم ہو گیا تو پھر اس منصوبہ بندی کو عوام کے حق میں کسی طرح مفید قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے نسبتی حصے میں اضافہ کرنے کے لئے دو قسم کے طریقے منصوبے کے مصنفوں نے تجویز

ئے ہیں۔ ایک کا تعلق اس کی آمدنی کی سطح کو بلند کرنے سے ہے اور دوسرے کا اس کے مصارف زندگی
کو کم کرنے سے۔
آمدنی کو بلند کرنے کے سلسلے میں منصوبہ بندی کرنے والوں نے پانچ طریقے تجویز کئے ہیں:
۱۔ سب لوگوں کے لئے پورے سال کے لئے روزگار فراہم کرنا۔
۲۔ ان کی کارکردگی کو بڑھانا۔
۳۔ شہری اور دیہاتی اُجرتوں میں بہتری پیدا کرنا۔
۴۔ زرعتی پیداوار کی قیمتوں کی ضمانت کرنا اور متعدد مقاصد رکھنے والی امداد باہمی
کی انجمنوں کو ترقی دینا اور
۵۔ نظام اراضی میں اصلاح کرنا۔
منصوبے بنانے والوں کو امید ہے کہ ان طریقوں کو اختیار کرنے سے شہر اور دیہات
کے کام کرنے والے عوام کی آمدنی کے تناسب کو بڑی حد تک زیادہ کیا جا سکے گا۔
مصارف زندگی کو کم کرنے کے سلسلے میں انھوں نے حسب ذیل طریقے تجویز کئے ہیں:
۱۔ جماعتی خدمات کو مفت فراہم کرنا مثلاً ابتدائی ثانوی اور بالغوں کی تعلیم اور طبی امداد مفت
مہیا کی جائے۔
۲۔ ناگزیر افادی خدمات مثلاً بجلی اور نقل و حمل کا انتظام کم قیمت پر کیا جائے۔
ان کے علاوہ ایک قومی امدادی فنڈ قائم کیا جائے جس کے ذریعے ان مصیبتوں میں سکون پیدا
کیا جائے جو آفات ارضی و سماوی کی وجہ سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔
ان امدادی انتظامات کے بعد بھی بہت سے کام رہ جاتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بڑھاپے
اور بے روزگاری کے موقع پر امداد جو نئی مشینوں کے ایجاد ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی
ہے۔ ان سب کا علاج جماعتی بیمہ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ لیکن موجودہ حالات میں اس
کو پورے طور سے عملی جامہ پہنانے سے منصوبہ سازوں نے اپنی معذوری ظاہر کی ہے۔

اب تک جو باتیں بیان کی گئیں ان کا مقصد کم آمدنیوں کا زیادہ کرنا تھا۔ لیکن آمدنیوں کی مساوی تقسیم کے لئے یہ بھی ضروری ہی کہ بڑی آمدنیوں کو کم کیا جائے۔ اس سلسلے میں منصوبہ سازوں نے ایسا انکم ٹیکس تجویز کیا ہی جس کی شرح آمدنیوں کے اضافے کے ساتھ تیزی سے بڑھتی جائے اس کے علاوہ محاصل ترکہ تجویز کئے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف علاقوں کی آمدنیوں میں عدم مساوات کو دور کرنے کے لئے علاقہ وار معاشی ترقی کی اسکیم تجویز کی گئی ہی۔ خصوصاً ایسی ریاستوں اور برطانوی ہند میں جو معاشی فرق پایا جاتا ہے اس کو دور کرنے پر خاص زور دیا گیا ہی۔

منصوبے میں چونکہ مرکزی نظام پیدائش دولت کی پوری گنجائش رکھی گئی ہی اس لئے امید ہے کہ کارگذاری کے اضافے کی کوششوں کے ساتھ چھوٹے پیمانے پر کام کرنے والے دستکاروں اور مزدوروں کو اپنی آمدنی بڑھانے کا پورا موقع حاصل رہے گا۔

غرض یہ تجویزیں تقسیم دولت کو منصفانہ بنیاد پر قائم کرنے کے لئے کی گئی ہیں۔

معاشی کاروبار کے انتظام و انصرام میں حکومت کے دخل کے سلسلے میں منصوبہ سازوں نے اپنی تجویزوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہی۔ ایک کا تعلق جنگ کے بعد کے عبوری زمانے سے ہے اور دوسرے کا امن کے مستقل زمانے سے۔ ان کا خیال ہے کہ بڑے پیمانے پر معاشی منصوبہ بندی کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ حکومت کے انتظامی اور امتناعی فرائض بہت بڑھ جائیں گے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں سمجھنے چاہئیں کہ جمہوری حکومت ختم ہو جائے گی۔ منصوبہ بند معیشت کے لئے افراد کی آزادی پر پابندی لگانا چونکہ ضروری ہوگا اس لئے حکومت اگر جمہوری ہوگی تو یہ پابندیاں صرف خاص خاص مقاصد کے لئے اور محدود عرصے کے لئے لگائی جا سکیں گی۔ منصوبہ سازوں نے جمہوریت کو منصوبہ بندی کے منافی نہیں سمجھا بلکہ انھوں نے اس رائے کو ظاہر کیا کہ اگر منصوبہ بندی کی نگرانیوں اور پابندیوں کو لوگ اختیاری طور پر قبول کر لیں گے تو اس کے مقاصد زیادہ موثر طریقے پر پورے کئے جا سکیں گے۔

بنیادی اصول کے طور پر انھوں نے اپنی بحث کی ابتدا اس طرح کی کہ سرمایہ داری نظام سے شغل زمرے کے

مزدوروں کو عملی زندگی میں بہت نظر انداز کرنا پڑے گا اور دونوں کی کچھ کچھ باتوں کو حکومت کی پالیسی مقرر کرتے وقت قبول کرنا پڑے گا۔

اس کے معمولی حالات میں حکومت کے معاشی فرائض کا تعین کرتے ہوئے منصوبہ سازوں نے سرکاری مداخلت کو تین عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا (۱) مداخلت بذریعۂ قیام ملکیت (۲) مداخلت بذریعہ نگرانی اور (۳) مداخلت بذریعۂ انتظام ان تینوں طریقوں میں اجتماعی بہبود کے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے نگرانی کے طریقے کو ملکیت اور انتظام کے مقابلے میں زیادہ اہم قرار دیا۔ کاروبار کے ایک وسیع رقبہ پر ان کے خیال میں حکومت کو ملکیت اور انتظام قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ مناسب اور موثر نگرانی ہی سے اس کا کام چل جائے گا۔ لیکن اس نگرانی کی وجہ سے نجی اقدام کی آزادی پر اہم پابندیاں عائد کرنا ہوں گی قانون نے ملکیت کو جن خصوصیات کا اس وقت حامل بنا رکھا ہے۔ ان میں سے بہت سی غائب ہو جائیں گی خصوصاً معاشی وسائل کے استعمال اور منتقل کرنے کی آزادی بڑی حد تک ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح اجارہ داروں کو اپنا منافع بڑھانے کے لئے اپنی پیداوار کو محدود کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا جنگ کے بعد کے عبوری دور میں حکومت کی نگرانی کی صورت تقریباً وہی ہوگی جو اس وقت جنگ کے زمانے میں ہے اور جس کا ملک ایک حد تک عادی ہو چکا ہے لیکن ان میں زیادہ یک جہتی پائی جائے گی اور ان کا انتظام بہتر طریقے پر کیا جائے گا۔

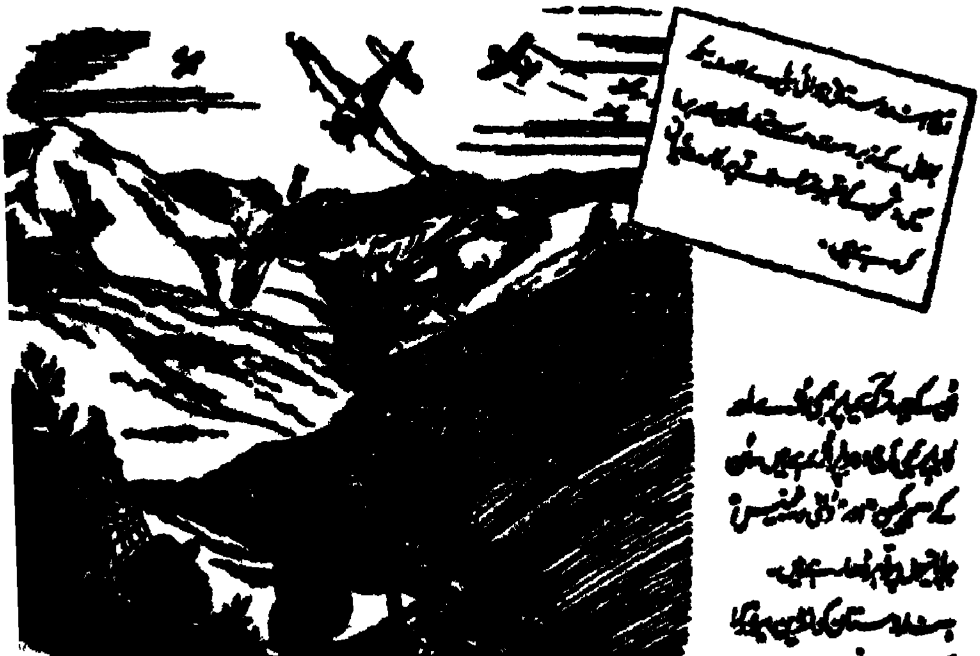
یہ نگرانیاں حسب ذیل معاملات میں کی جائیں گی :۔

(۱) پیدائش دولت (۲) تقسیم دولت (۳) صرف دولت (۴) سرمایہ داری (۵) خارجی تجارت اور مبادلہ اور (۶) اجرتیں اور حالات ملازمت۔

غرض یہ نقشہ ہے جو ایک گروپ کے منصوبہ سازوں نے آیندہ کی معاشی تنظیم کا پیش کیا ہے۔ سرمایہ داروں کی جماعت کی طرف سے اختیاری طور پر جس قدر زیادہ پیش قدمی کی توقع قائم کی جا سکتی تھی اس کو یہ منصوبہ پورا کرتا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ مزدور طبقے کے انتہا پسند حامیوں کو یہ وعدے کبھی اطمینان بخش نظر نہیں آئیں گے۔

ہمارے طیارے

کوہیما اور کاباؤ



جنگوں سے ثابت کر دیا کہ

ہم جاپانیوں کو ہرا سکتے ہیں اور ہرا رہے ہیں

قومی جنگی محاذ نے شائع کیا

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۴ نمبر ۵	بابتہ ماہ فروری سنہ ۴۵ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن، محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

اردو شاعری پر سیاسی خیالات کا اثر

(سرسید، آزاد اور حالی کا زمانہ)

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سلطنت مغلیہ کی آخری سانس بھی توڑ دی اور وہ سیاست جو در پردہ اپنا کام کر رہی تھی فاتحانہ انداز سے حکومت کی صورت میں رونما ہوئی۔ اس کی سیاسی تگ و دو کا بیان یہاں اس لئے بے سود ہے کہ ہمارے شعراء کو یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ کب اور کس طرح یہ تغیرات رونما ہوئے۔ البتہ اب انقلاب کی آگ نے ان کے گھروں کو بھی جلا کر خاکستر کر دیا تھا وہ گھبرا کے اٹھے۔ کچھ تو نوابوں کے دروازوں پر دریوزہ گری کو چلے گئے کچھ اسی آگ میں جل کر خاک ہوگئے۔ حکومت کا پرچم سامنے تھا اور عبرت کے مرقعے سڑکوں اور گلیوں میں گویا کہتے پھرتے تھے

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

دلی کی گلیاں جس بے بسی اور بے کسی کا مرقع بنیں اس کی شبیہیں کہیں کہیں غالب کے خطوط میں بھی مل جاتی ہیں جو ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔

بہادر شاہ ظفر کلکتہ میں نظر بند۔ دل خوش کرنے یا عہد ماضی کی داستان سنانے کو چند رفیق شاعر ساتھ ہیں لیکن جب خود اس کے لب ہلتے ہیں تو ایک دردناک حقیقت اور فسوں کی اصلیت کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں، نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں، جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

اس عظیم الشان انقلاب نے ہندوستان کے رسوم قدیمانہ یا وضع دیرینہ کا نقشہ بدلنا شروع کیا۔ خیال و عمل کا کوئی جز ایسا نہ رہا جو اس انقلاب سے اثر پذیر نہ ہوا ہو۔ لیکن ہم صرف چند تحریکات پر نظر ڈالیں گے جن کا تعلق قومی اور ملکی بیداری سے تھا اور جن کا اثر کسی نوعیت سے

ہماری شاعری پر پڑا۔ یہاں سرسید کے ان احساسات کا ذکر جو ان کے قلب میں اپنی گرتی ہوئی قوم کی پستیوں کو دیکھ کر پیدا ہوئے تھے اور اس سلسلے میں ان کی سعیِ پیہم کا تجزیہ کرنے سے پہلے ان سیاسی تحریکات کا ذکر کرنا زیادہ مناسب ہوگا جن کو قوم کی عملی جدوجہد کا پیش خیمہ کہنا چاہیے۔

اس وقت اس ملک میں مختلف تحریکیں شروع ہو رہی تھیں لیکن ان سب میں "انڈین نیشنل کانگریس" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ غدر کے تقریباً تیس سال بعد اس کا سنگِ بنیاد ۱۸۸۵ء میں رکھا گیا اور ۱۹۰۵ء تک کم و بیش اس کی پالیسی برٹش حکومت کے جاہ و اقتدار کو قبول کرتے ہوئے اور اس کی حکومت کے قانون کی پابندی کرتے ہوئے صرف ان باتوں پر صدائے احتجاج بلند کرنا رہا جو اس کے نزدیک ہندوستانیوں کی فلاح اور بہبودی کے خلاف تھیں۔ اس وقت تک یہ انتہائی اعتدال پسند جماعت تھی بالقول "پنڈت جواہر لال نہرو" ایک انگریزی داں طبقے کے لوگوں کا میلہ"۔ .... اس پر کسی سیاسی جلسے کا شبہ تک نہ ہوتا تھا۔ اس میں نہ کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کوئی زندگی کی حرارت۔ اس کے سال بہ سال جلسے ہو جاتے اور سبھی تجویزیں منظور ہو جاتیں۔

ادھر مسلمان ہر طرح موردِ عتاب تھے۔ انگریزوں نے حکومت ان سے لی تھی۔ شکوک بھی انھیں کی طرف سے تھے۔ ادھر حکومت بدظن، ادھر اخلاق کی پستی، غرض داخلی اور خارجی دونوں اسباب ان کی ہلاکت اور بدبختی کا باعث ہو رہے تھے۔ سرسید پہلا شخص تھا جس کے قلب میں قومی اصلاح کی بجلیاں تڑپیں۔ مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ جن کا تعلق گویا قوم کی اصلاحِ نفس سے تھا ان اسباب پر نظر ڈالی جو خارجی طور پر اس کی بربادی کا باعث ہو رہی تھیں۔

سرسید سوشل ریفارمر بھی تھے اور مذہبی تحقیقات کے دلدادہ بھی لیکن ان کی مختلف لیاقتوں میں سب سے نمایاں جز سیاست کا ہے۔ اور یہی دراصل وہ چیز تھی جس نے اپنا اثر کچھ اس طرح دکھایا کہ قوم میں بھی بیداری کے کچھ آثار پیدا ہونے کی گنجائش ہو گئی۔ ان کی اس سلسلے میں سب سے پہلی تصنیف "اسبابِ رسالہ بغاوتِ ہند" تھی، جس کو انھوں نے پارلیمنٹ میں بھیج دیا تھا۔ یہ

وہ نازک زمانہ تھا کہ اظہار خیال کی جرأت کرنا بھی مشکل تھا۔ "مارشل لا" کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان قانون تھی۔ سرسید نے اپنے اس رسالے میں ہندوستانی رعایا اور خصوصاً مسلمانوں کو جن پر انگریزوں کی بدگمانی کا سارا بوجھ تھا بغاوت کے الزام سے بری کرنے کی کوشش کی۔ یہ سرسید کی بڑی جسارت تھی جو ہمیشہ ان کی قوم پرستی اور وطن پرستی کی شاہد رہے گی۔ دوسرا رسالہ جو سرسید نے مسلمانوں کو ایک عذاب جانکاہ سے بچانے کے لئے لکھا "لائل محمڈنز آف انڈیا" تھا۔ یہ سرسید کے ابتدائی قدم تھے جو سیاسی راہ میں اٹھے۔

اس سلسلے میں سرسید کو جو دشواریاں اٹھانی پڑیں۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ...
......خارجی اسباب سے ایک گونہ سکون ملنے پر سرسید نے داخلی پہلو پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ اہل وطن ترقی کے راستوں میں آگے نکل چکے ہیں اور یہاں آنکھوں پر ابھی وہی کوتاہ نظری اور تعصب کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ وہاں ۱۸۵۷ء ہی میں مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں یونیورسٹیاں قائم ہو چکی تھیں اور یہاں ابھی یہی بحث تھی کہ انگریزی تعلیم علم ہے یا کفر۔ وہاں غدر کے تیس سال بعد ہی ایک ایسی جماعت تیار ہو چکی تھی جو ملک و قوم کی فلاح و بہبودی کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی جس نے ۱۸۸۵ء میں "کانگریس" کی بنیاد ڈالی تھی اور یہاں ہنوز روز اول تھا۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ اسکول ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج کی بنیاد ضرور پڑ چکی تھی لیکن ابھی اس نسل کو دس سال بھی بمشکل گزرے تھے۔ سرسید نے اس لئے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال مسلمان تعلیم پر توجہ دیں اور میدان سیاست میں قدم نہ رکھیں۔ سرسید کو اس سوتی ہوئی قوم کو جگانا تھا اور اس مردہ قوم میں پھر ایک روح بیداری پھونکنا تھا۔

قوم میں جو بیداری سرسید نے اپنے مضامین سے پیدا کی تھی۔ حالی نے اپنی مشہور نظم مسدس حالی سے اس پر زندگی کا اضافہ کیا۔ حالی نے یہ نظم خاص سرسید کی تحریک سے لکھی تھی۔ جیسا کہ خود دیباچے میں فرماتے ہیں:۔

"قوم کے ایک سچے خیرخواہ نے .... غیرت دلائی .... قوم کی حالت

تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ چکے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑیاں ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہیں۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے بہتر ہے" حالی ملت مرحومہ کا سوگ منانے اُٹھا تو اس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا قطرہ اور اس کے لب کی ہر صدا فریاد کی لے بن گئی۔ حالی نے قوم کو جھنجھوڑ کر اُٹھایا ؎

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے　　فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے　　چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
"کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم　　ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم"

اور پھر جوش و الہانہ سے اسلام کے دھندلے نقوش کچھ اس طرح ابھار کر اُن کے سامنے پیش کیے کہ ان کی نگاہیں چکا چوندھ ہونے لگیں۔ اس کے ان دردناک نالوں میں قوم کو بھولی ہوئی داستان کے ٹکڑے یاد آ گئے۔ اُن کے منجمد خون میں حرکت پیدا ہو گئی۔ اُن کے سرد قلوب میں حرارت آ گئی۔ قوم انگڑائی لے کر اُٹھی تو کچھ اپنی غفلت پر ندامت اور کچھ اپنی بے حسی پر شرم آئی اور ان اسباب پر نظر پڑی جو روز بروز اس کے زوال کا باعث ہو رہی تھیں۔

مسدس حالی خود انھیں اسبابِ تنزل کی گویا پردہ کشائی تھی۔ شاعر نے جہاں ان اسباب کا ذکر کر کے خون کے آنسو بہائے وہیں مسلمانوں کی رگ حمیت کو حرکت دینے میں تدبیر سے کام لیا اور قوم کے ہر عضو کی کمزوری پر نظر ڈال کے اس کی اصلاح کی فکر کی۔ بعض حضرات کا کہنا ہے کہ مسدس حالی نے اپنا کام کر دیا اور اب صرف اس کی تاریخی اہمیت باقی ہے لیکن درمند قلوب سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حالی کے نغمے فضا میں اس وقت تک گونجتے رہیں گے جب تک یہ مردہ قوم

اپنی شان جلالی سے خود سحر کر "پیغام بیداری" نہ سنائے اور کائنات پر چھا کر اس کے ذرہ ذرہ کو درخشاں نہ کر دے۔ مسدس حالی کی اصلاحی شان سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن در اصل یہ مسلمانوں کو سیاسی بیداری سے قریب ترلانے کی شاعری کی دنیا میں پہلی کوشش تھی۔

وطنیت کا تصور آزاد ... حالی | عجیب بات ہے کہ ہمارے ملک اور خصوصاً ہماری شاعری میں وطنیت کا تخیل اس درجہ محدود تھا کہ جو شخص جس شہر میں پیدا ہوا اور جہاں پھلا پھولا اُسی کو اپنا وطن سمجھا اور وہیں اپنی زندگی کے دن کاٹ دینا وضع داری تصور کی یہی محدود جذبہ وطنیت تھا جو ذوق کو آخر زمانے میں بھی "دلی کی گلیاں" چھوڑنے نہ دیتا تھا۔

شاعر پر کیا منحصر ہر فن کے استاد اپنے ہی وطن مالوف میں دن کاٹ دینا وطن پروری سمجھنے لگے تھے شاید وجہ یہ تھی کہ اس زمانے تک ذرائع آمد و رفت اس قدر محدود اور سفر اس درجہ دشوار گذار تھا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا گویا ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ حوصلوں میں پستی اور ملک کی بد امنیوں کے ساتھ ساتھ ہر شخص کی دنیا محدود ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا مجموعی تصور کسی کے ذہن میں مشکل ہی سے باقی رہ گیا۔ وطن پرستی کے اس محدود تخیل نے انھیں قناعت اور توکل کا اور بھی شیدائی بنا دیا وضع داری کو درویشانہ توکل سمجھ کر خود اپنے نفس کو دھوکے میں ڈال لیا۔ اب بھی خال خال ایسی مثالیں مل جاتی ہیں۔ خاکِ بلگرام کی آخری یادگار خود حضرت محمود صاحب حسنؔ اسی وضع داری پر آج بھی قائم ہیں۔ کسی شاہراہ پر بھی حیدرآباد جانا قبول نہ کیا اور ایک پرائمری اسکول کی مدرسی گوارا کی اور آج تھوڑی سی پنشن پر گذارا کر رہے ہیں۔ بلگرام کی زیارت در اصل اب ان کی زیارت ہے۔ ورنہ ان منہدم عمارتوں کی تاریخی اہمیت کو جاننے والا بھی کوئی نہیں۔

پھر خیال کیجئے کہ آج سے سو برس پہلے اس "شہر پرستی" یا محدود جذبۂ وطن پرستی

کا کیا حال ہوگا۔ آنحضرت نے اپنی ایک مثنوی حب وطن میں نہایت خوبی سے اس محدود جذبہ وطنیت کی تشریح کرکے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے ؎

حب وطن اُسے نہیں کہتے کہ باغ سے نکلے جو گل تو خاک ہو نزہت کے داغ سے

حب وطن اُسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں بچوں کا منہ ہی چومتے آٹھوں پہر رہیں

اے دوست یہ دوستیٔ سنگ و خشت ہے یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

اس کے بعد دلی کے ایک ستارئے کی ایک نقل سنا کر جسے حیدر آباد سے بلانے ایک سفیر آیا تھا۔ اس وطن پرستی کا مذاق اڑایا ہے کہ وہاں ہماری دلی جیسی جامع مسجد اور یہ بہتی جمنا نہیں، اس لئے ہمیں جانا منظور نہیں اور اسی قناعت پرستی پر حکایت ختم کی ؎

ہم اپنی دلی چھوڑ، دکن کو نہ جائیں گے گریاں بہت نہ کھائیں گے تھوڑا ہی کھائیں گے

اس کے بعد حب وطنی کے وسیع تصور کو مولانا آزاد نے نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے ؎

اب میں تمھیں بتاؤں کہ حب وطن ہو کیا وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوئے چمن ہے کیا

وہ رحمتِ خدا ہو کہ بندوں پہ عام ہے وہ لطف عام جس سے جہاں شاد کام ہے

وہ نور مہر جس سے زمانے میں نور ہے وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے

حب وطن ہے جلوہ اسی نور پاک کا اور روشن اس کے نور سے عالم ہو خاک کا

مولانا نے مختلف قوموں کی جاں نثاری، ایثار اور وطن پرستی کے نمونے پیش کرکے

مزید وضاحت کی ہو کہ اہل وطن میں بھی وطنیت کا تخیل پیدا ہو جائے لیکن اسے کیا کیا جائے کہ زمانہ ہی ماتم کا تھا جس طرف آنکھ اُٹھتی، قوم کی بے راہ روی اور عبرت کے ایسے مرقع نظر آتے کہ اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتیں۔ آزاد نے بھی جب بغض و عناد کی تاریکیاں دیکھیں اور دلوں کو نورِ وطن سے خالی پایا تو آفتاب حب وطن کو مخاطب کر کے چلا اُٹھے ؎

اے آفتاب حب وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج

تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظام دل زبر و زیر ہو رہا

تجھ بن سب اہل درد ہیں دل مردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو گئے

ٹھنڈے ہے کیوں دلوں میں تیرے جوش ہو گئے
کیوں سب تیرے چراغ ہیں خاموش ہو گئے

عالم ہے تا کہ تیرہ دلی دور ہو تمام
اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام

الفت سے گرم سب کے دل سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہم وطن ہیں وہ ہمدرد ہوں بہم

تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں
اور گردنِ حریف پہ خنجر کے دھار ہوں

علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں
اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریزِ جوش حب وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

اسی سال مولانا حالیؔ نے بھی ایک نظم "حب وطن" کے عنوان سے لکھی جو اسی لاہور کے مشاعرے میں پڑھی گئی۔ حالیؔ نے بھی نظم کے ابتدائی حصوں میں اسی محدود وطنیت کا ماتم کیا ہے۔ جس کے نزدیک حب وطن گھر کی چوکھٹ کے چومنے کے سوا اور کچھ نہیں ؎

اے دلِ بندۂ وطن ہشیار
خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار

او شرابِ خودی کے متوالے
گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے

نام ہے کیا اسی کا حبِ وطن   جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن

حالی نے بھی قومی اتفاق، بے راہ روی تعصب کے جو نتائج ہندوستان کی تاریخ پر رونما ہوئے تھے اس کی طرف اشارہ کر کے ان امراء، فضلاء، پنڈتوں اور مولویوں کی حالت پر آنسو بہائے ہیں اور وطن کے شیدائیوں کے فقدان پر ماتم کیا ہے اور چند وہ نصیحتیں کی ہیں جو وطنیت کی عالیشان عمارت کی سنگِ بنیاد ہیں۔

غور سے دیکھئے تو آزاد اور حالی نے جذبۂ وطنیت کو وسعت دے کر خشت پرستی سے ملک پرستی کی طرف لوگوں کی توجہ مائل کر دی ہے۔ لیکن یہ حب وطنی کے ابتدائی نقوش ہیں جن میں ذاتی اصلاح اور کشادہ ذہنیت کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس وقت تک کی سیاست معاشرتی اصلاحوں تک موقوف تھی اور اس سے زیادہ زبان کھولنا جسارت بے جا تصور کیا جاتا تھا چنانچہ آزاد نے بھی اپنے تخیل حب وطن میں حاکموں کے لئے جان نثار کرنا اور گردن حریف پر خنجر کی دھار رکھنا ضروری قرار دیا ہے۔

حالی نے حکومت کی عنایتوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر "ہند کی نسلوں پر سایہ قیصر" کی تمنا کی ہے۔ اس وقت تک سیاست کی حد بھی یہیں تک تھی اور اُن کی شاعری کے یہ اجزاء خود تقاضائے سیاست تھے۔

وطنیت کا یہ ابتدائی تصور تھا جس میں وطن پرستی اور حکومت پرستی میں کوئی فرق نہ تھا۔ سرسید نے خود اپنی تقریروں میں کانگریس اور اس کی تمام تحریکات پر اعتراضات کی بوچھار کی ہے۔ جہاں کہیں کانگریس نے حکومت سے کسی قسم کے بھی مطالبات کئے ہیں اس پر نکتہ چینی کی ہے ——— "اگر کوئی ملک گورنمنٹ فتح کرے۔۔ برہما سے۔ افغانستان سے لڑے۔ اس سے صلح کرے اس سے ہم لوگ جو ملک کے باشندے ہیں کچھ سروکار نہیں رکھتے" ان کے زمانے کی اقتدار پسندی اور روایات پرستی کا نمونہ بھی اسی تقریر سے ملاحظہ ہو۔

"کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کریں گے کہ ادنیٰ قوم یا ادنیٰ درجے کے آدمی

خواہ اس نے بی۔اے کی ڈگری لی ہو یا ایم۔ اے کی اور گو وہ ولی ہی ہو ان پر بیٹھ کر حکومت کرے اُن کے مال و جائداد اور عزت پر حاکم ہو؟ کبھی نہیں کوئی ایک بھی پسند نہ کرے گا۔ گورنمنٹ کی کونسل کی کرسی نہایت معزز ہے۔ گورنمنٹ مجبور ہے سوائے معزز کے اور کسی کو نہیں دے سکتی ...."

کیا آج گورنمنٹ کا بھی حکومت کے بارے میں یہ تخیل ہے؟ دراصل یہ خیالات اس زمانے میں عام تھے حکومت کی مدح سرائی سب کا شیوہ تھا۔ آزاد کی مثنوی "خواب امن" ایسے ہی خیالات کا آئینہ ہے۔ جہاں علم و دولت۔ زراعت اور قناعت۔ خسروِ امن کے دربار میں شکر گزار نظر آتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سیاسی پہلو صرف یہ تھا کہ کیسے برادرانِ وطن سے ترقی کے راستوں میں آگے جاؤ اور ترقی نام تھا حکومت کی نظر التفات کا۔

ہندوستانیوں نے ابھی جمہوری نظام کا خاکہ نہ دیکھا تھا اور ان کے سامنے وہی شخصی حکومت کا تخیل تھا جہاں قصیدہ گوئی ذریعۂ عزت تھی۔ اس لئے شاعری کا ڈھانچہ تو بدل گیا لیکن وہی پرانے خیالات نئے انداز سے پیش ہوئے۔ حالی کی نظم "جشن جوبلی" ایک ایسے ہی زمانے کی یادگار ہے۔

شاعری کے نصب العین کی تبدیلی

اردو شاعری کے نصب العین کا تغیر، انقلاب کا نتیجہ تھا۔ اب تک ہماری شاعری شخصی حکومت کے اس دور دورہ سے گذر چکی تھی جہاں عوام تو کیا خود خواص و سلاطین تک سیاسی مسائل سے نا آشنا ہو رہے تھے اور عنانِ سیاست غدر سے قبل تک ہر جگہ چند شخصی ترقیوں کے دلدادگان کے ہاتھ میں تھی شاعری پر اس کا بجا طور پر اثر پڑا تھا... ...... وہی مایوسی اور نا امیدی جو زندگی میں تھی شاعری میں سرایت کر گئی۔ اور ہماری شاعری غم و اندوہ۔ یاس و الم، حرماں نصیبی اور بدبختی کا آئینہ بن گئی۔ قنوطیت کے تاریک بادل اس پر چھا چکے تھے اور شاعر ان گھنگھور گھٹاؤں سے گھبرا کر اپنے دردناک نغموں اور دلکش ترانوں میں کھو جانا چاہتے تھے۔ جیش و طرب کی محفلوں

اور بادہ و جام کی مجلسوں میں اس کے دور چلتے اور اسی میں لوگوں کو لطف آتا تھا گویا شاعری کا نصب العین حالی اور آزاد سے قبل تک ایک سرور و انبساط کی فراہمی تھی جہاں شورید ہ سروں کی جنون نوازیوں کے لئے ایک گوشۂ عافیت اور آلام روزگار کے ماروں کے لئے ایک دامن سکون موجود تھا۔ شاعری کا بلند ترین مقصد یا تو داخلی کیفیات اور جذبات کی ترجمانی تھا یا خارجی واقعات کا اس طرح ذکر کہ وہ بھی داخلی زندگی کا ایک جزو بن کر ہمارے سامنے آجائیں شاعر گویا اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس کے حدود و قیود سے آزاد تھا۔ یہاں کوئی چیز اسے اپنا گرویدہ نہ بنا پاتی تھی۔ ہمارے معترضوں کا کہنا ہے کہ ہمارے شعراء نے غیر ملک کی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا جا و بے جا استعمال کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فارسی کے اثرات تھے۔ اور طبیعت کی ملکی چیزوں سے نامناسبت کی دلیل۔ لیکن یہاں ایک راز اور بھی پنہاں تھا۔ ہمارے شعراء خارجی زندگی کی کیفیات سے اس وجہ سے بیزار تھے کہ یہاں کی دلکش سے دلکش چیز کو بھی وہ اپنے بے پایاں محسوسات کے لئے ناممکن پاتے تھے لہٰذا ان دیکھی چیزوں کے مقابلے میں انھوں نے ان خیالی چیزوں کو پسند کیا جن کی تعریف میں یا تو کلام حق شاہد تھا یا فارسی شعراء نے جسے اپنی بلاغت سے بے پناہ حسن کا مجسمہ بنا دیا تھا اور یہ چیز خود ایک خیالی مجسمہ بن چکی تھی۔ داخلی کیفیات کی ترجمانی میں اس طرح بیشتر غیر ملکی اور نادیدہ اشیاء ہماری شاعری کا جزو بنتی چلی گئیں یہاں تک کہ اردو کے ایک ندرت پسند شاعر نے ان سے اپنا دامن بچانا بھی چاہا تو اپنے کو مجبور پا کر کہہ اٹھا۔

"بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر"

غرض غالب کے زمانے تک شاعری کا نصب العین ایک دامانِ باغبان اور کفِ گل فروش کی آراستگی تھا۔ جہاں ہر کس و ناکس کے لئے سامانِ خود فراموشی مہیا تھا۔ میر، غالب مومن، ذوق جیسی ہستیوں کا بیشتر کلام گویا "ایک گونہ بے خودی" کے کیف آور جام ہیں۔ لیکن جیسا آفتاب انقلاب نے مجذ برستان پر کچھ تیز شعاعیں ڈالیں تو فلک پرستی

چوٹیاں پگھل پگھل کر ارض آدم کی طرف آنے پر مجبور ہو گئیں اور وہ تخئیلی پیکر آب وگل میں ظاہر ہونا شروع ہوا۔ اس میں زندگی کی حرارت تھی۔ دل و دماغ کو مسخر کرنے والی بے پناہ قوتیں تھیں۔ نظام عالم کو بدل دینے والی جبارتیں مضمر تھیں۔ حالی اور آزاد کے زمانے تک اس کی رفتار نرم اور نا تاباک رہی۔ لیکن شاعری کے منتہائے نظر بدل دینے کے لئے یہی کافی تھا شاعری اب صرف ایک "نہالۂ خیال" نہ رہی تھی وہ اس ارض محترم کی ایک چیز بن گئی۔ جس کا مقصد خود لوگوں میں بیداری پیدا کرنا تھا۔ اس کی نظر کے سامنے اب داخلی اور خارجی ہر طرح کی چیزیں تھیں۔ اب وہ حقیقتوں کے روبرو تھی اور واقعات اور حالات کے دوش بدوش۔ اس کا مقصد ناامیدی کی سانسیں لے لے کر سسکنا نہ تھا بلکہ میدان عمل میں اپنی زندگی اور اپنے وجود کا ثبوت دینا تھا۔ وہ مرنے کے لئے نہیں بلکہ زندہ اور باقی رہنے کے لئے قائم تھی۔ موت کا خوفناک تخیل۔ قناعت اور توکل کی درویشانہ شان اس کے نزدیک خود موت اور غلامی کے مترادف تھا۔ وہ ہاتھ جو سر ہانے دھرے دھرے سو گئے تھے۔ ان میں تحریک عمل پیدا کرنا اس کا کام تھا اور وہ قالب جو بے جان ہوتے جاتے تھے ان میں حیات بخش روح پھونکنا اس کا منتہائے نظر۔ اس کی آواز ایک سماج کی آواز تھی اور اس کا پیغام گویا ایک قوم کی دلی تمناؤں کا اظہار۔ شاعری اس کے نزدیک ایک جاگتی ہوئی قوم کی آواز تھی جو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے موت کو آغوش مادر سمجھنے لگی تھی۔ بے شک یہ جدید نصب العین رفتہ رفتہ سامنے آیا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ابتدا اسی انقلاب عظیم کے سیاسی اثرات کی رہین منت ہے۔

حامد بلگرامی

تعلیم میں ہاتھ کا کام

(تاریخی نشوونما)

روسو ہاتھ کے کام کا دو وجوہ کی بنا پر حامی تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ جمہوریت کا قائل تھا اور چاہتا تھا کہ ہاتھ کے کام کرنے والوں اور دماغ کے کام کرنے والوں میں جو بیر اور خلاف ہے دور ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ہاتھ کے کام کو اپنے فطری اصولوں کے عین مطابق پاتا تھا۔ اس لئے وہ اس کا حامی تھا۔ ایک جگہ وہ "ایمیل" میں لکھتا ہے:

> "یہ نہایت ضروری ہے کہ ایمیل کوئی نہ کوئی کام ذریعہ معاش کے خیال سے سیکھے۔ یہ کام کام سیکھنے کے خیال سے اتنا نہ ہوگا۔ جتنا ان تعصبات کو دور کرنے کی نیت سے جن کی بنا پر ہاتھ کا کام ادنیٰ اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔"
>
> (ایمیل ایڈیشن ہر شخص کا کتب خانہ صفحہ ۱۵۹)

ایک جگہ اور لکھتا ہے:-

> "میں اس کا مرتبہ اتنا اونچا کرنا چاہتا ہوں جس سے نیچے وہ کبھی نہ اترے اور اس کی وجہ سے وہ عمر بھر عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔"

ایک جگہ وہ اور کہتا ہے:-

> "ان سب کاموں سے جن سے انسان روزی پیدا کرتا ہے، ہاتھ کا کام فطری زندگی سے سب سے قریب ہے۔"

روسو کے نزدیک ہاتھ کے کام کا اس کے علاوہ ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے وہ دماغ اور جسم کے کام میں ایک طرح کا توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

" یہ بات اب صاف ہو جانی چاہئے کہ جسم کی متواتر ورزش اور ہاتھ کی پیہم محنت سے میں اپنے شاگرد کو غیر محسوس طور پر غور و فکر کا عادی بنانا چاہتا ہوں تاکہ اس آرام طلبی اور سہل انگاری کی تلافی ہو سکے جو لوگوں کے متعلق غلط فیصلے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مثل ایک کسان کے کام کرے گا اور ایک فلسفی کی طرح فکر کا عادی ہوگا تاکہ وہ وحشیوں کی مانند سست اور کاہل نہ ہو"

ایک جگہ وہ اور لکھتا ہے:۔

" بجائے اس کے کہ بچہ اپنی کتابوں سے چمٹا رہے اگر میں اسے کاریگر کے کام میں لگا رکھوں تو اس کے ہاتھ گویا اس کی دماغی ترقی کا کام دے رہے ہوں گے اور جب تک وہ اپنے آپ کو ایک کاریگر سمجھ رہا ہے گویا وہ فلسفی بن رہا ہے"

روسو ہاتھ کے کام کو جسمانی تربیت اور نشو و نما کا بھی ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ لوازم و آلات کے بنانے اور ان سے سائنٹفک تحقیقات کے کام لینے کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے:۔

" ان آہستہ اور محنت طلب تحقیقاتوں کا سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ طالبعلم جب تک اس قسم کے نظری مطالعوں میں لگا رہتا ہے وہ اپنے جسم کا بھی کافی استعمال کرتا رہتا ہے"

روسو معاش کا ذریعہ ان کاموں کی بجائے جو ذہنی کہلاتے ہیں، ان پیشوں کو قرار دینا چاہتا ہے جو ہاتھ سے کئے جاتے ہیں تاکہ اس سے ذہنی کام کرنے والوں اور ہاتھ کے کام کرنے والوں کی تفریق مٹ جائے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

" بجائے اس کے کہ ان علوم کو جو جسم کی نہیں بلکہ روح کی پرورش کی غرض سے حاصل کئے جاتے ہیں، معاش کا ذریعہ بنایا جائے ضرورت ہو تو اپنے ہاتھوں اور ان کے اس ہنر کو جو انھوں نے پیدا کیا ہے۔ روزی کا ذریعہ

بنایا جائے تو تمام دشواریاں رفع ہوجائیں اور تمھارے پاس بوقت ضرورت ہمیشہ وسائل موجود ہوں"

وہ اسے سماجی تعلق کا بھی ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :۔

"جب آپس کے تعلقات تمہیں مجبور کریں کہ تم اسے یہ بتاؤ کہ کس طرح تمام انسانوں کا ایک دوسرے پر مدار ہے تو ان تعلقات کے اخلاقی پہلو تلاش کرنے کی بجائے تم اس کی توجہ صنعت اور دوسرے ہاتھ کے کاموں کی طرف مبذول کرو جن سے انسان ایک دوسرے کو نفع پہنچاتا ہے اسے ایک کارخانہ کے بعد دوسرا کارخانہ دکھانے میں اس کی توجہ محنت کی فضیلت پر اس وقت تک نہ جانے دو جب تک وہ خود اپنا ہاتھ بھی کام پر نہ لگائے اور نہ اسے اس وقت تک وہاں سے نکلنے دو جب تک وہ ان سب چیزوں کی جو وہاں ہورہی ہیں، وجہ نہ معلوم کرے۔ یا کم سے کم ان چیزوں کی جو اس نے دیکھی ہیں۔"

روسو صرف مجمل طور پر ہی ہاتھ کے کام اور ہاتھ کے کام کرنے والوں کا ذکر کر کے نہیں چھوڑ دیتا ہے بلکہ وہ بعض ہاتھ کے کاموں کا ذکر بھی کرتا ہے اور ان کی نوعیت اور فضیلت سے بحث کرتا ہے : مثلاً لکڑی کے کام کے متعلق وہ لکھتا ہے :

"یہ سب سے صاف ستھرا اور کارآمد کام ہے۔ یہ گھر پر بھی کیا جاسکتا ہے اس سے کافی ورزش ہوتی ہے۔ اس سے ہنرمندی اور ہاتھ کی مہارت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بنانے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ مذاق اور بلند معیار کے اظہار کا بھی موقع ہے۔"

اس کے علاوہ وہ اینیل کو اور ہاتھ کے کاموں کے کرنے کا بھی موقع دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :۔

وہ ہر کام کے کرنے کے لئے تیار ہے۔ وہ کھرپے اور پھاوڑے بھی چلا سکتا ہے۔ وہ ہتھوڑا، رندہ اور ریتی بھی استعمال کرسکتا ہے۔ وہ ان تمام اوزاروں کا استعمال جانتا ہے۔ جو روزمرہ کے اکثر کاموں میں کام آتے ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک کے استعمال کی کافی مہارت ہونی چاہئے تاکہ ہر کام میں اسے پوری مہارت، پھرتی اور ایک اچھے کاریگر کی تمام خوبیاں پیدا ہوجائیں۔

سب سے آخر میں روسو ہاتھ کے کام کا وہ درجہ رکھتا ہے جو ترقی پسند ماہرِ تعلیم دینا چاہتا ہے۔ یعنی ہاتھ کا کام اور تعلیم دونوں ساتھ ساتھ۔ ایمیل میں ایک جگہ وہ لکھتا ہے:۔

"اسے اپنے حصے کے استاد کے حکم سے کام کرنا ہے اور اس کے ساتھ کھانا بھی کھانا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اپنے ذہنی کاموں میں لگ سکتا ہے۔ اس طرح ہاتھ کا کام اور دماغ کا کام دونوں ساتھ ساتھ ہوں گے اگرچہ ثانی الذکر کام پر زیادہ توجہ ہوگی۔ اس لئے کہ ہمیں امیدوار کاریگر ہی نہیں بننا ہے بلکہ امیدوار فلسفی بننا ہے اور اس دوسرے کام کی امیدواری پہلی سے زیادہ لمبی اور مشکل ہے۔"

روسو کے ان نظری خیالات کو جس نے عمل کا جامہ پہنایا، وہ اس کا ایک شاگرد بیسڈو تھا۔ روسو نے اگرچہ کسی قدر جمہوری خیالات کا اظہار کیا تھا۔ لیکن اس کا ایمیل ایک امیر گھرانے کا بچہ تھا۔ بیسڈو نے چنانچہ اپنا تمام عملی تجربہ امراء کے بچوں کے لئے محدود رکھا۔ اس نے ہاتھ کا کام اس غرض سے اختیار نہیں کیا کہ امیر غریب کا امتیاز اٹھے۔ بلکہ اس لئے کہ اس سے درستی صحت اور تفریح کا کام لیا جائے۔ اس نے اپنے مدرسہ رفاہ عام میں ہاتھ کے کام کا خاص اہتمام اسی غرض سے رکھا تھا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:۔

"امراء کے لڑکوں کو اپنی نوجوانی کے تمام زمانے میں ہاتھ کے کام
[illegible] مشغلے [illegible]

گھٹتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے تنگ جاتے ہیں اور انھیں تفریح کا کوئی اور موقع نہیں ملتا ہے تو وہ ہر قسم کی بیہودگیوں اور حماقتوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔
اپنی مشہور کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ

"ان چار گھنٹوں میں جو خالی رہ گئے ہیں، طالب علم کو چاہیے کہ وہ ہر قسم کے ایسے تجربے حاصل کرے جو ایک مہذب سماج کی انسانی زندگی کے متعلق اس کے معلومات کو بڑھائیں۔ اُسے بڑھئی، لوہار اور دوسرے ایسے کاریگروں کے اوزاروں کا کچھ نہ کچھ استعمال جاننا چاہیے جو گھر سے متعلق اکثر کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔ انسانی مشاغل کے مختلف شعبوں کے متعلق اپنی معلومات بڑھانے کے لیے اسے کچھ ابتدائی ہدایتوں کے ساتھ کاریگروں کے کارخانوں میں جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اپنی عمر کے سولھویں سال میں اسے چاروں موسموں میں سے ہر ایک کے دو دو ہفتے کسانوں کے ہاں گزارنے چاہئیں تاکہ وہ زراعت سے متعلق معلومات حاصل کرسکے۔ اسی زمانے میں اُسے دو ہفتے کیمپ میں بھی بسر کرنے چاہئیں، دو ہفتے کسی کان میں۔ ایک ہفتہ کسی بندرگاہ پر جہاں جنگی جہاز ٹھہرتے ہوں، ایک ہفتہ کسی بڑے کاروبار کے دفتر میں، ایک ہفتہ کسی بڑے شہر کے مدرسے میں بہ حیثیت سامع کے۔ ایک ہفتہ کسی بڑے یتیم خانے کے ساتھ، اور آخر میں ایک مہینہ کچہری میں۔"

لیکن کتاب کا چھٹا حصہ تمام تر مختلف قسم کے پیشوں اور ہاتھ کے کاموں کی تعلیم پر وقف ہے۔ کتاب کی تمام عبارات اور تصویروں سے باغبانی کے کام، راج اور معمار کے کام، جوتا بنانے والوں، درزی اور لوہار کے کام، گاڑی بنانے والوں، میز کرسی بنانے والوں، جلد بندوں، چرخہ کاتنے والوں، ٹوپی بنانے والوں، رنگ سازوں، خراد کرنے والوں کے کام کا پتہ چلتا ہے۔

ہاتھ کے کام کی اخلاقی، معاشی اور جمالیاتی خوبیوں کے متعلق وہ ایک جگہ لکھتا ہے:-

"میری اسکیم کا یہ ایک جزو ہوگا کہ ریاست کا ہر شہری، شہزادے سے لے کر ادنیٰ مزدور کے بچے تک کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام خوبی اور صفائی کے ساتھ کرنا ضرور سیکھے تاکہ اُسے یہ معلوم ہو جائے کہ اچھی دستکاری کیا ہے اور پھر اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی باتیں جان جائے۔ اس کا نتیجہ بعد میں یہ نکلے گا کہ گھر کا بہت سا سامان خود اس کے اور اس کے بیٹوں کے ہاتھ کا بنا ہوگا اور بہت سی بد مذاقی اور بدنما دستکاری کا اس طرح خاتمہ ہو جائے گا"

چنانچہ اس کی تجویز تھی کہ:-

"ہر قصبے کے مدرسے میں ایک باغیچہ ہو، ایک کھیل کا میدان ہو اور اس کے ارد گرد زراعت کے قابل کافی زمین ہو جس میں بچے کھلی ہوا میں کام کر سکیں۔ عمارت سے ملحق بچوں کا ایک کتب خانہ ہو اور ایک معمل ہو، کچھ کام کرنے کے کمرے ہوں جن میں ایک بڑھئی کے کام کا خاص طور پر ہو، اور پھر اس کے بعد جس چیز کا کمرہ ہو وہ مٹی کے کام کرنے کا ہو"

رسکن کے بعد اس کے شاگرد موریس نے حرفے کے ساتھ آرٹ کے کام پر بھی بہت زور دیا جس سے ہاتھ کے کام میں ایک نئے جزو کا اضافہ ہو گیا اور اب سے اس میں جمالیاتی پہلو کا بھی خیال رکھا جانے لگا۔

لیکن صنعتی انقلاب کے بعد سے تعلیمی اصلاح کا سب سے نمایاں پہلو یہ رہا کہ غریب کے طبقے سے افلاس، بے روزگاری اور دوسری خراب عادتیں دور کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ چنانچہ اس غرض سے بہ کثرت صنعتی مدرسے یا عام مدرسوں میں صنعتی کام جاری کیے جانے لگے۔ انگلستان اور امریکہ میں اس تحریک نے خصوصیت سے زور پکڑا لیکن اس کا مقصد

زیادہ تر صنعتی تعلیم کی طرف تھا۔ اسے عام تعلیم کا ذریعہ بنانے میں سب سے زیادہ توجہ جرمنی میں دی گئی جس کی ابتدا ارکنڈرمان نامی ایک شخص سے ہوئی۔ وہ لکھتا ہے:-

"عام مدرسوں کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد میں نے اندازہ کیا کہ ان میں انھی چیزوں کی تعلیم سب سے کم ہے جن کی عوام کو سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اور جو چیزیں سب سے زیادہ بے کار ہیں، وہی وہ سب سے زیادہ سیکھتے ہیں اور وہ بھی غلط طریقے پر۔ اس مدرسوں کو میں نے لڑکوں کے اخلاق اور دوسری بھلائیوں کا دشمن پایا ...... مجھے یقین ہے کہ ہمارے ان عوام کے مدرسوں کو علاوہ عام مضامین پڑھانے کے اپنے نوجوانوں کے اندر محنت کی عادت بھی پیدا کرنی چاہیے۔ ان مدرسوں میں ہاتھ کے کام کی جماعتیں شروع کرنی چاہئیں اور اس کام کا دوسرے مضامین سے گہرا تعلق ہونا چاہیے اور ان کاموں کی لڑکوں کو شروع بچپن سے تعلیم دینی اور ان کا عادی بنانا چاہیے۔"

چنانچہ جرمنی کی ایک ریاست پراشا میں اس قسم کی ایک تحریک اٹھی کہ گاؤں کے نوجوانوں کو ابتدائے عمر سے محنت کا عادی بنانے اور انھیں ایسے پیشوں کی تعلیم دینے (مثلاً بننا، سینا، درخت لگانا، باغبانی کا کام۔ ریشم کے کیڑے پالنا وغیرہ) جو ان کی آیندہ زندگی میں کارآمد ہوں۔

پستالوزی نے آکر اس تحریک کو اور تقویت پہنچائی۔ اس کا تعلیم میں ہاتھ کے کام کو رواج دینے کا سب سے بڑا منشا یہ تھا کہ غریبوں کی حالت درست ہو اور انھیں معاشی آزادی حاصل ہو۔ چنانچہ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:-

"ادنیٰ طبقے کے بچوں کی تعلیم میں ہمیں سب سے بڑا مقصد یہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ کس طرح بغیر کسی بڑے سرمائے کے اپنی معاش

حاصل کرسکیں اور مختلف قسم کے حرفے اور دستکاریاں سیکھنے لگ جائیں ؛

چنانچہ نیو ہوف کے مدرسے میں اس نے جو نصاب رکھا تھا وہ زیادہ تر ان چیزوں پر مشتمل تھا، مثلاً سینا، پرونا، کتائی، باغبانی اور زراعت کا کام وغیرہ

لیکن رفتہ رفتہ پستالوزی ہاتھ کے کام کو عام تعلیم کا ذریعہ بھی سمجھنے لگا۔ اس کا قول تھا کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے انسان کو صرف جاننا اور سوچنا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ کرنا بھی ضروری ہے۔ خیال اور عمل کی ہم آہنگی جو حقیقی اطمینان کے لئے ضروری ہے سوچنے اور جاننے کی قوتوں کے ساتھ عمل کی طاقت پر بھی منحصر ہے۔ علم کی طاقت کو بڑھانا اور عمل کی قوت کو نظر انداز کرنا ناقص تعلیم ہے اور خود کو اپنے آپ اور اپنے سے خارج کی دنیا سے بے تعلق کردیتا ہے۔ ہاتھ کے کام کی تعلیم نہ صرف باطنی اور خارجی ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ بلکہ اس سے فہم اور ذکاوت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جذبات پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور مختلف حیثیتوں سے مفید نتائج پیدا ہوتے ہیں ؛

پستالوزی کے نزدیک ہاتھ کی تعلیم غریبوں یعنی ادنیٰ اور متوسط طبقے کے لئے نہایت ضروری تھی وہ اسے تمام مدرسوں میں رواج کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ مدرسوں کی عام تعلیم کے ساتھ کچھ ایسے مضامین بھی شامل کرلئے جائیں جن میں ہاتھ سے کام کرنا پڑتا ہے اور جو آگے چل کر کسب معاش کا بھی ذریعہ بن سکیں، مثلاً کھیتی باڑی، امور خانہ داری اور ایک آدھ ہاتھ کے کام۔ ان مضمونوں کے ساتھ ساتھ پڑھنا لکھنا اور حساب بھی سکھایا جاسکتا ہے

پستالوزی کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ان مضمونوں کی تعلیم ہاتھ کے کام سے مربوط بھی کی جاسکتی ہے اور اس طریقے کے اس نے بہت سے نمونے بھی دیے ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق مدرسے میں جن چیزوں کا سکھانا بہت ضروری ہے۔

(۱) امور خانہ داری (۲) کھیتی باڑی اور (۳) کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام۔ ان

کام کے لئے مدرسے سے ملحق ایک باغیچہ، ایک ورکشاپ اور ایک گھر ضرور ہونا چاہیے"۔

پستالوزی جس طرح نظری مضامین کے متعلق یہ سمجھتا تھا کہ ان کے چند بنیادی اصول ہیں جن کی مشق پہلے ہونی چاہیے، جس کے بعد پھر آگے کی منزلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح وہ حرفہ یا دستکاری کے متعلق بھی یہ سمجھتا تھا کہ اس کی کچھ بنیادی حرکات ہیں جن کے بعد آگے کا تمام کام بہت سہل اور آسان ہو جاتا ہے مثلاً مارنا، توڑنا، اٹھانا، کھینچنا، گھمانا، پھیرنا وغیرہ۔ وہ کہتا تھا جس طرح سیدھی اور مدور خطوں کی مشق کے بعد لکھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہاتھ کا کام بھی ان حرکتوں کی مشق کے بعد سہل ہو جاتا ہے۔

پستالوزی کے بعد اس کے ایک بڑے عزیز دوست کے بیٹے فیلن برگ نامی نے اس کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے اور انھیں عام بنانے میں بڑی مدد دی۔ اس کے کام کے نمونے غریبوں، یتیموں اور جرائم پسند بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت مقبول ہوئے۔ فیلن برگ کے ایک مدرسے کے اُستاد نے بچوں کی تعلیم کا جو طریقہ اپنے ہاں رکھا تھا، وہ پستالوزی کے ربط کے اصول کی بہترین مثال اور عملی اعتبار سے بہت کامیاب تجربہ کہا جا سکتا ہے:-

"جس وقت وہ بچوں کے ساتھ کھیت میں کام کرتا تھا، وہ انھیں اس کے ساتھ ساتھ اچھی اچھی کہانیاں بھی سناتا جاتا تھا۔ حساب کے سوالات حل کرنے کے لئے دیتا اور کوشش کرتا کہ کھیتی کے کاموں کے سلسلے میں ان کے حل کے مواقع بھی پیدا ہوں وہ انھیں مٹی کے متعلق بتاتا کہ اس میں کون کون سے اجزا ملے ہوئے ہیں۔ پھر ان سے اس کا تجزیہ کراتا اور بتاتا کہ وہ کس طرح گرمی اور نمی کو اپنے اندر جذب کرتی اور محفوظ رکھتی

ہے اور پھر وہ ان کی توجہ پودوں کی طرف مبذول کراتا اور ان کی نشوونما سے متعلق تمام ضروری باتیں بتاتا۔ اور طرح طرح کی کیاریاں بنوانے کے سلسلے میں وہ انھیں علم ہندسہ کے تمام بنیادی اصول ذہن نشین کراتا؛

فیلن برگ کے یہ عملی تجربے جرمنی، فرانس، بلجیم اور انگلستان میں بہت مقبول ہوئے۔ جرمنی میں ہامبرگ کے قریب ایک مدرسہ قائم ہوا جس میں بچے امور خانہ داری اور کھیتی باڑی کے علاوہ مختلف قسم کی دستکاریوں کے ذریعے اپنے کپڑے لتے برتنے کی دوسری چیزیں اور مدرسے کی تمام ضروریات فراہم کرتے۔ مدرسے سے متعلق بہت سی ورکشاپ تھیں جن میں وہ اون کے موزے بنانے اور درزی کے کام کرتے تھے۔ مدرسے کی عمارت بھی خود لڑکوں ہی نے مل کر بنائی تھی۔

ہاتھ کے کام کو اگرچہ عام تعلیم کے ایک جزو کی حیثیت سے پستالوزی نے سب سے پہلے بار پیش کیا تھا، اور فیلن برگ نے اُسے عملی اعتبار سے بہت عام بنایا، لیکن اس کی نفسیاتی حیثیت کو سب سے پہلے ہوائزنگر نامی ایک شخص نے واضح کیا۔ اس نے [illegible]ء میں ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا "عمل کی جانب بچے کے میلانات کا استعمال" اس رسالے کی اشاعت کے بعد مدرسوں میں ہاتھ کے کام کی حیثیت نفسیاتی اعتبار سے تسلیم کی جانے لگی۔ اس رسالے میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ علم کے میلان اور عمل کے میلان دونوں میں ایک گہرا تعلق ہے۔ اس لئے دونوں کی تشفی کسی ایسے ہاتھ کے کام سے ہو سکتی ہے جو تعلیمی غرض سے استعمال کیا گیا ہو۔ اس رسالے کے بعد ہوائزنگر یہ بھی کہتا تھا کہ تعلیم میں سب سے مقدم چیز سیرت کی تشکیل ہے، یعنی یہ کہ انسان جو کام شروع کرے اُسے اچھا سمجھے۔ اُسے آخر تک پورا کرکے چھوڑے۔ اس غرض کے لئے ہوائزنگر کے نزدیک سب سے ضروری بات یہ ہے کہ بچوں کو کوئی نہ کوئی ہاتھ کا کام دیا جائے تاکہ انھیں اپنی سیرت کی تشکیل کا پورا موقع ملے۔ اس کے خیال کے مطابق تمام تعلیم میں ہاتھ کے اس قسم کے کاموں کا ایک مرتب سلسلہ ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک اس کے جو فوائد ہو سکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اس سے دماغ ہر وقت کام میں مصروف رہے گا اور سستی سے محفوظ رہے گا۔
۲۔ دماغ اور ہاتھ دونوں کے ساتھ ساتھ کام کرنے کے فطری میلان کو تشفی ہو گی۔
۳۔ تندرستی کے لئے مفید ثابت ہوگا۔
۴۔ اس سے دماغی صلاحیت اور ہاتھ کی مہارت دونوں کو ترقی ہوگی۔
۵۔ آیندہ کسی نفع بخش کام کے قابل بنائے گا جو بطور پیشہ کے کیا جاسکے۔
۶۔ اس سے آرٹ کے ذوق کو مدد ملے گی۔
۷۔ اچھی دستکاری کا مذاق پیدا ہوگا۔
۸۔ ایسے مضامین کا علم ہوگا جو عام طور پر نظر انداز کردئے جاتے ہیں
۹۔ اس سے فطری اور صحیح اصول کے مطابق تعلیم ہوگی۔
۱۰۔ ان سب کے علاوہ یہ کہ اس سے دوسرے مضامین کا ربط ہو سکتا ہے۔
چنانچہ وہ کہتا ہے :۔

"ایسے ہاتھ کے کام جن سے قدرتی طور پر میکانیکی، علم ہندسہ، سائنس وغیرہ کے اصول مترتب ہوتے ہیں اور جن سے بہت سے عملی تجربے کئے جاسکتے ہیں اور بہت کچھ مشاہدہ اور علم حاصل ہو سکتا ہے وہ بہت مفید اور کار آمد کہے جاسکتے ہیں "

انہی اسباب کی بنا پر ہوائز نگر نے کاغذ، لکڑی، ٹین، تانبے مٹی اور موم وغیرہ کے کام شروع کئے۔ ہاتھ کے کام اس کے نزدیک حصولِ علم کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ اس کے نزدیک حصولِ علم کے تین بڑے ذریعے ہیں :۔

۱۔ حواس
۲۔ جذبات اور
۳۔ تجربہ

آخری ذریعے کو وہ سب سے بہتر ذریعہ سمجھتا ہے۔ اور اس بنا پر وہ ہاتھ کے کام کو اپنے نصاب کا مرکز قرار دیتا ہے۔

لیکن ہاتھ کے کام کو جس نے ابتدائی سے ابتدائی تعلیم کا سنگ بنیاد قرار دیا اور جس نے اس میں خلاقیت کا ظہور دیکھا۔ وہ فروبل تھا۔ فروبل پر سب سے زیادہ شوپن ہار کے فلسفے کا اثر پڑا اور اسی بنا پر وہ اس میں حد درجہ الوہیت اور روحانیت کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک فرد اور قوم دونوں کی نشوونما میں احساس نہیں بلکہ ارادہ سب سے بڑا حصہ رکھتا ہے۔ انسانی ارتقا میں عمل اور کردار کا فکر اور خیال سے زیادہ دخل ہے، اس لئے تعلیم میں عمل اور کردار کا درجہ فکر اور علم سے بلند ہونا چاہیے۔ بچہ کو اپنا فکر اور علم آپ پیدا کرنا چاہیے جو ہمیشہ نشوونما اور ترقی پاتا رہے گا۔

فروبل کا یہ بھی خیال تھا کہ تعلیم بچے کی نشوونما کا نام ہے۔ نشوونما اس حد تک جہاں تک وہ اپنے اندر کی الوہی قوت کو ظاہر کر سکے۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسان کو بھی خدا کی طرح خلاق ہونا چاہیے اس خلاق روح کو اس طرح کارفرما ہونا چاہیے کہ چیزیں صورت پذیر ہوں اور ان میں زندگی کی رو دوڑے۔ یہ ہے ہاتھ کے کام یا کسی تعلیمی مشغلے کی سب سے بڑی غرض و غایت۔ اس کے نزدیک یہ خیال کہ انسان کام کرتا ہے، نیست سے ہست میں لاتا ہے، پیدا کرتا ہے تاکہ اپنے جسم و جان کے لئے ضروری وسائل پیدا کرے۔ گوارا تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس خیال کی تلقین و اشاعت نہیں کی جا سکتی ہے اصل یہ ہے کہ انسان کوئی کام اس غرض سے کرتا ہے کہ اس کے ذریعے اس کا روحانی اور الوہی وجود خارجی صورت اختیار کرے اور اس سے وہ اپنی ذات اور خدا کی معرفت حاصل کر سکے۔ اس لئے بچے کو ابتدا ہی سے خارجی اور تخلیقی کاموں کے کرنے کی تعلیم دینی چاہئے۔ ہر بچے کو خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا امیر ہو یا غریب، ہر روز کم سے کم ایک یا دو گھنٹے کسی سنجیدہ کام میں صرف کرنا چاہئے

جس سے خارج میں کوئی متعین نتیجہ نکل سکے۔ وہ اسباق جو کام کے ذریعے دیے جائیں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ ذہن نشین ہوتے ہیں ...... مدرسوں میں سب سے مناسب انتظام یہ ہوگا کہ جس طرح آج کل پڑھائی کے گھنٹے مخصوص ہوتے ہیں، ہاتھ سے کام کے گھنٹے بھی متعین رکھے جائیں۔"

فروبیل کا یہ بھی خیال تھا کہ ہاتھ کے کام سے جسمانی اور ذہنی نشو ونما ہوتی ہے اور اسے نہ صرف ابتدائی بلکہ ثانوی مدرسوں میں بھی داخل کرنا چاہئے۔

"یہ یقیناً ایک بہت بڑی غلطی ہے کہ ہمارے مدرسوں کے موجودہ انتظام میں، خصوصاً ہائی اسکولوں میں لڑکے تخلیقی کاموں سے بالکل محروم رکھے جاتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہاتھ کام کے ساتھ ساتھ کوئی نہ کوئی تخلیقی جسمانی کام نہ صرف جسم کو مضبوط بناتا ہے، بلکہ دماغ کو بھی تقویت بخشتا ہے۔"

فروبیل نے یہی نہیں کیا کہ ہاتھ کے کام کی صرف زبانی ترجمانی کی بلکہ اس نے مدرسے کے روزانہ پروگرام میں بھی اُسے عملی طور پر داخل کرایا۔ فرانکفرٹ میں ایک اتالیقی کی حیثیت سے اس نے ہاتھ کے کام کی ابتدا کاغذ پر بیل بوٹے چھاپنے سے کی۔ اس کے بعد اس نے کاغذ کاٹنا، پھر گتّہ اور لکڑی کا کام شامل کیا۔ ہلبا کے مدرسے میں اُس نے صبح کا نصف وقت تو لکھنے پڑھنے کے لئے رکھا اور سہ پہر کا نصف وقت صرف ہاتھ کے کام کے لئے مخصوص کردیا۔ ان کاموں میں مطبخ کے لئے لکڑی کاٹنا، برتن بنانے، چٹائیاں بننی، جلد سازی، چیزیں جمع کرنا۔ باغیچہ یا کھیت کی دیکھ بھال رکھنا، مرغیاں پالنا، علم ہندسہ کی مختلف شکلیں موڑ کر کاٹنا اور بنانا، کاغذ کی مختلف چیزیں بنانا۔ گولیوں وغیرہ سے کھیلنا، کشتیاں اور بادبانی چرخیاں چلانا۔ تار سے زنجیرے اور ٹوکریاں تیار کرنا، مٹی کا کام اور نقاشی وغیرہ۔

یہ سب چیزیں فروبیل نے کنڈرگارٹن میں داخل کی تھیں اور چھوٹے بچوں کے

ان مدرسوں کی مقبولیت سے ان کا صولوں نے بھی بڑی شہرت پائی۔ اس اصول کی بناء پر کہ کھیل ہی کام ہے، فروبل نے کنڈرگارٹن میں دو طرح کے مشغلے رکھے: ایک وہ جو مقصود بالذات ہیں اور دوسرے وہ جن سے کوئی اور مقصد حاصل کرنا ہو اور بغیر جبر کے انجام دئے جائیں۔

فروبل نے اگرچہ ہاتھ کے کام کو مدرسے کی تعلیم میں باقاعدہ طور پر داخل کیا تھا لیکن جو لوگ اس کو آیندہ کی صنعتی تعلیم کی تیاری کے طور پر مانتے تھے، اُن کے نقطۂ خیال سے کنڈرگارٹن کے تعلیمی سامان میں بہت کچھ ایسی ترمیموں کی ضرورت تھی جو صحیح معنوں میں اس منزل کی تعلیم کو آیندہ کی باقاعدہ صنعتی تعلیم سے مربوط کرسکے۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں امریکہ کی ایک خاتون مس ایملی ہنٹگٹن نے کنڈرگارٹن کے سامانوں میں فروبل کے گول، چوکور اور دوسرے ہندسی شکل کے ٹکڑوں کی بجائے مختلف قسم کے کھانے پکانے کے برتن، اور تفریحی کھیلوں کی جگہ جھاڑو دینا، کپڑے دھونا، کھانا لگانا وغیرہ شامل کیا۔ اس مناسبت سے اس کا نام کنڈرگارٹن کی بجائے "کچن گارٹن" رکھا گیا۔ اور اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور ادارہ کھلا جس میں کھیتی باڑی سے متعلق زیادہ تر مشاغل گئے تھے۔ اس بنیاد پر اس کا نام "فارم گارڈن" رکھا گیا۔

فروبل کے بعد جس نے ہاتھ کے کام کو تعلیمی وقعت بخشی، وہ ہربارٹ تھا اس نے اسے تعلیمی سے زیادہ نفسیاتی حیثیت دی۔ وہ اپنی کتاب "نظریۂ تعلیم" میں لکھتا ہے ہاتھ کے کام کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے:-

"ہر نو پید بچے اور لڑکے کو بڑھئی کے اوزاروں کا استعمال اور طلبا کا فائدہ جاننا چاہئے۔ میکانیکی مہارتیں، ورزشی مشغلوں سے زیادہ مفید ہوتی ہیں، اول الذکر دماغ کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور آخرالذکر جسم کو......
ہر انسان کو ہاتھ کا استعمال یا ہاتھ سے کام لینا جاننا چاہئے۔ زبان نے

جہاں انسان کو وحشت کے درجے سے نکالا، ہاتھ انسان کو عزت و شرف کے مرتبے پر لے جائے گا۔

لیکن اس زمانے میں ہاتھ کے کام کی تحریک میں ایک جرمن مصنف ایرتیبو ماتھو آ کی کتاب سے بڑی جان پڑ گئی جو اس نے کام کا مدرسہ" کے نام سے لکھی۔ مصنف کا خیال تھا کہ اکثر لوگ آج یا تو سوچنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، یا اگر سوچتے ہیں تو بہت مجہول اور مبہم طور سے۔ اُن کی نہ اپنی کوئی رائے ہوتی ہے، اور وہ مشکل کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں۔ ان کے اندر قوت عمل نام کو نہیں ہوتی اور وہ اکثر کام سے خائف رہتے ہیں۔ یہ باتیں ان میں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ موجودہ مدارس انھیں اس قابل نہیں بناتے کہ ان کو واضح طور پر سوچنے کی عادت ہو۔ اس کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ مدرسوں میں ہاتھ کا کام جاری کیا جائے۔ ہاتھ کے کام کے سلسلے میں جو علم حاصل ہوگا وہ بہت واضح اور پائدار ہوگا جو عام مدرسوں کی تعلیم سے کبھی نہیں حاصل ہوتا۔ یوں دیکھا جائے تو ہاتھ کے کام کے بہت سے فائدے ہیں مثلاً

۱۔ ہاتھ کا کام نہ صرف بچے میں قوت عمل پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی قوت تخلیق کو بھی بڑھاتا ہے اور اس کی فردیت کو نشو و نما کا موقع دیتا ہے۔

۲۔ ہر بچے کو اپنی انفرادی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا موقع دیتا ہے جو ان کے کاموں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

۳۔ اس میں بچوں کے اندر رشک و حسد کی کوئی گنجائش نہیں، اور استاد کی داد اور شاباشی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔

۴۔ اس میں بچوں کے اندر آپس کے اشتراک عمل اور تعاون کا زیادہ موقع ہے اس لئے کہ اس میں کمزور لڑکوں کو اچھے لڑکوں سے سیکھنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا

۵۔ ہاتھ کے کام کے ذریعے تعلیم زیادہ فطری اور فائدہ مند ہو سکتی ہے۔

اس صدی میں ہاتھ کے کام کی اہمیت سب سے زیادہ پروفیسر جان ڈیوی کے تجربی مدرسے ہوئی جو انھوں نے شکاگو میں کھولا تھا۔ اس مدرسے میں انھوں نے عام تعلیم کو نئے اصولوں پر دئے جانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ کے کئی ایک کام بھی رکھے تھے۔ پروفیسر ڈیوی کا خیال تھا کہ ہماری صنعتی زندگی میں جو تغیرات ہو رہے ہیں۔ ان کا تقاضا یہ ہے کہ مدرسے کی زندگی میں بھی اسی اعتبار سے تبدیلیاں کی جائیں۔ صنعتی انقلاب نے صنعت و حرفت کے کام کو گھروں کی چہار دیواری سے نکال کر کارخانوں میں پہنچا دیا ہے۔ اس بنیاد پر ہم کو گھروں کے معمولی کھیل کود کے کاموں میں اپنی تخلیقی اور سماجی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا اب موقع نہیں رہا ہے۔ ہمارے مدرسوں کو چاہئے کہ وہ صنعتی زندگی کے مسائل کو بچوں سے روشناس کرائیں جو پہلے وہ صرف گھر اور اپنے ارد گرد کے حالات کے مشاہدے سے حاصل کرتے تھے۔ چونکہ صنعتی طریقے بہت زیادہ مخصوص اور منضبط ہو گئے ہیں، اس لئے ان کی باقاعدہ تعلیم اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔

پروفیسر ڈیوی نے نہ صرف معاشی اور سماجی بنیاد پر ہاتھ کے کام کو ضروری سمجھا بلکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی اس کو اہمیت دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچے کا علم اس کے ہاتھ کے کام سے پیدا ہوتا اور نشوونما پاتا ہے۔ ہاتھ کے کام اس کی تلاش و جستجو، چھونے اور ٹٹولنے، بنانے اور بگاڑنے کی فطری صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں۔ اس سے وہ فرق بھی مٹ جاتا ہے جو مدرسہ اور باہر دونوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس سے اشتراک عمل کی تعلیم ہوتی ہے جو بچے کی آئندہ زندگی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس سے بچہ کو اکثر چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس سے سماج کے علم اور عام سائنس کے مطالعے کا موقع بہم پہنچتا ہے۔ اس سے دوسرے مضامین کی تعلیم میں باہم ربط اور تعلق پیدا ہوتا ہے۔ نیز ہاتھ کے کام کو عام مدرسوں میں شامل کرنے [illegible]

پروفیسر ڈیوئی نے اپنے تجربی مدرسہ میں ہاتھ کے کام میں کھانا پکانا، سینا پرونا، کپڑا اور بنائی کا کام رکھا تھا، اس لئے کہ ان میں روزمرہ کی زندگی کے بعض اہم مشاغل آجاتے ہیں اور ان سے مختلف صلاحیتوں اور مختلف قوتوں کی تربیت اور مختلف انداز فکر کا موقع ملتا ہے۔

لیکن جان ڈیوئی کے نزدیک نفس ہاتھ کے کام میں جو تعلیمی اور خوبیاں سمجھی جاتی تھیں، وہ مقصود نہیں تھا بلکہ اصل غرض اس سے زندگی کا مطالعہ اور اس کے ذریعے عملی شرکت تھی۔ ڈین رسل نے اسی خیال کو اپنے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:-

"بعض لوگوں کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ ہاتھ اور آنکھ کی تعلیم میں کوئی طلسمی اثر ہے۔ آج کل یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہاتھ کے کام سے آنکھ، ذہن اور جسم کے تمام عیب دور ہو جائیں گے اور عام طور پر یہ پختہ عقیدہ ہو گیا ہے۔ کہ بچہ چاقو چلانے سے گویا اپنی سیرت کی تشکیل کر رہا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہاتھ کے کام کے علمبردار یہ سمجھتے تھے کہ یہ ذہنی اور اخلاقی تربیت کا ایک بڑا آلہ ہے۔ ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ہاتھ کے کام میں اتنی ساری خوبیاں کیوں قرار دی جا رہی ہیں اور پڑھنے لکھنے کی کیوں اتنی مذمت ہو رہی ہے؟"

اس خیال کے ماتحت ہاتھ کے کام کی مدرسوں میں کوئی جداگانہ اور مستقل حیثیت نہ ہوگی بلکہ وہ موجودہ صنعتی زندگی کے مطالعہ اور اس میں شرکت کا محض ایک ذریعہ ہوگا۔ نصاب میں اس کا درجہ بس اسی طرح پر ہوگا جس طرح پڑھنے، لکھنے، حساب، تاریخ، جغرافیہ اور دوسرے مضامین کا ہے۔ اس غرض سے کہ بچوں کو موجودہ زندگی کے مطالعہ اور اس میں شرکت کا پورا موقع مل سکے۔ صرف چند مشاغل ایسے چن لئے جائیں گے جن میں یہ صلاحیتیں موجود ہوں گی۔ اس اصول کا ایک عملی تجربہ ۱۹۱۵ء میں

میں ٹیچرس کالج، کولمبیہ یونیورسٹی کے ماتحت "اسپیر اسکول" میں کیا گیا اور [illegible]ء میں اس کا پورا نصاب شائع ہوگیا۔ اسی اصول کی تشریح ڈاکٹر پرسی وال کول نے ان لفظوں کیا کی جس میں وہ سارے پروگرام کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں :-

(۱) تعلیم (۲) مشاہدہ اور (۳) ہاتھ کا کام اس کے آگے وہ لکھتے ہیں :-

"تعلیم تو ان صنعتوں کی تاریخ اور تذکرے دی جائے گی جو مدرسے کے اردگرد جاری ہیں اور پھر ان کے ذریعے ملک کی دیگر صنعتوں کا حال آئے گا۔ مشاہدے کا کام اس طرح پر ہوگا کہ بچے پاس کے کھیتوں، کارخانوں اور دوسری چیزوں کی سیر کے لئے جائیں گے اور ہاتھ کا کام اس تعلیم اور مشاہدے کے لئے مواقع بہم پہنچانے کی غرض سے ہوگا"

لیکن اس سے بھی ایک قدم آگے پروفیسر بونس اور موسین نے بڑھایا ہے جو اسی ٹیچرس کالج میں تعلیم دیتی ہیں۔ وہ اپنی کتاب "ابتدائی مدارس کے لئے ہاتھ کے کام" میں لکھتی ہیں کہ ابتدائی تعلیم کو صنعت و حرفت کی صرف چار پانچ چیزوں کو مثلاً کھانے پینے کی چیزیں، کپڑے، لتے، لکڑی، لوہا، مٹی وغیرہ جو کہ بالکل الل ٹپ طور پر منتخب کر لئے گئے ہیں، مبنی نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ان ضروریات کی تعلیم پر مبنی ہونا چاہیئے۔ جن پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے مثلاً خوراک، پوشاک، مکان، برتن، پڑھنا لکھنا اور اوزار وغیرہ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھوم پھر کر ہم وہیں آگئے۔ جہاں سے چلے تھے۔ سولھویں صدی میں رابلے نے اور سترھویں میں کیمونیس نے بھی اسی قسم کا خیال ظاہر کیا تھا جس سے ہاتھ کے کام کی حیثیت محض ایک ضمنی اور اس کے فواید صرف خیالی رہ جاتے ہیں۔

سعید انصاری

اردو اور فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شعرا

اردو ادب کی تاریخ سے "تاریخ اردو" کے مشہور مصنف رائے بہادر رام بابو سکسینہ صاحب ایم اے، ال ال بی، پی سی ایس کو جو غیر معمولی شغف حاصل ہے اس کی تازہ ترین مثال ان کی اس کتاب سے ملتی ہے جو حال میں صاحب موصوف نے اردو اور فارسی کے یورپین اور انڈو یورپین شعرا کے حالات میں انگریزی زبان میں شائع کی ہے*۔ شاید ہی کوئی تذکرہ نگار اس موضوع کو انتخاب کرنا پسند کرتا جس کی معلومات فراہم کرنے میں اتنی کاوش اور وقت درکار تھی۔ ان شعرا کا حال تاریخ اردو کی ایک گمگشتہ کڑی خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن اس کتاب کی بدولت اب انھوں نے وہ جگہ حاصل کر لی ہے جس سے وہ تذکرہ نگاروں کی عام سرد مہری اور بے پروائی کے باعث اس وقت تک محروم تھے۔

ہندوستان میں ایک دور ایسا گذرا ہے جب سخن گوئی اور سخن فہمی اعلیٰ تہذیب و تربیت کا خاص نشان سمجھے جاتے تھے اور شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا۔ یورپ کے باشندے جب یہاں آئے تو انھوں نے ہر گھرانے کو شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا پایا۔ یہاں تک کہ طوائفوں، خادموں اور اپنی داشتہ عورتوں تک کو کلام موزوں کرتے دیکھا۔ ان میں جو یہاں کی تہذیب سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور جنھوں نے یہاں زبان سیکھی۔ یہاں کی طرز معاشرت اور بود و باش کو اختیار کیا۔ انھیں شعر گوئی کا بھی چسکا پڑ گیا۔ مشاعروں کی شرکتوں اور اہل زبان شعرا اور ادیبوں کی

---

* "European and Indo European Poets of Urdu & Persian", Nawal Kishore Press, Lucknow, 1941. Price Rs 10 only.

صحبتوں سے ان کی زبان نکھرتی اور با محاورہ ہوتی چلی گئی۔

شعر و سخن کے اس ہنگامے میں زیادہ تر وہی کلام شہرت عام و بقائے دوام کا مستحق ہوا جو ازروئے معیار بلند و ممتاز سمجھا گیا۔ عام شعراء کے مجموعے ناقابل التفات ڈھیروں میں شامل ہو کر گم ہوں اور دیمک کے نذر ہو گئے۔ ان ابھرنے والوں کا محض ادبی نقطۂ نظر سے زیادہ سے زیادہ اس زمانے کے اوسط درجے کے درجے کا ہے، یہ ہے کہ عام طور پر اتنا معمولی تھا کہ اہل زبان نے اسے کسی خاص تو کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج جب کوئی اس خاص موضوع پر قلم اٹھانے کا خیال کرتا ہے، کوششیں ہی بہت شکل ثابت ہوتی ہیں۔ اول تو ان شعراء کے نام ہی نہیں ملتے تو کلام نہیں ملتا۔ کلام ملتا ہے تو حالات نہیں ملتے۔ غرضیکہ دقتوں پہ دقتیں نکلتی چلی جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر متداول تذکروں کو اٹھا کر دیکھئے۔ تو ان کے صرف اتنے نام ملیں گے جو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور کلام ہو تو کسی کے دو شعر، کسی کے تین!

اس کتاب کے شروع میں ماخذ کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی تحقیقات میں ہر ممکن ذریعہ معلومات سے کام لیا ہے۔ جو کچھ معلومات اداروں، ریاستی، ذاتی اور بیرونی کتب خانوں سے مل سکتی تھیں۔ ان سب کو جمع کیا۔ کے علاوہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین اور قلمی بیاضیں تک حاصل کیں اور تاریخی کتب کے لئے تاریخوں، تذکروں اور سیاحت ناموں سے مدد لی۔ شعراء کے حالات و واقعات معلوم کرنے کے لئے سفر کئے۔ پیدائش اور موت کی صحیح تاریخیں دستیاب کرنے کے لئے گرجا گھروں کے رجسٹر اور قبرستانوں کے کتبے تک چھان مارے۔ اس طرح پندرہ برس کی مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہمارے سامنے اس مبسوط و ضخیم تذکرے کی صورت میں موجود ہے۔

ان شعرا کے کلام کی خالص ادبی لحاظ سے وہ قدر و قیمت نہ سہی جو میر و غالب کے کلام کی ہے۔ لیکن وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بیش بہا یادگاروں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اردو زبان کی دلکشی و ہمہ گیری کا ایک بڑا بین ثبوت ہیں۔ اردو نے ان اجنبیوں سے بھی اس حقیقت کا کھلے اعتراف کرایا کہ وہ اس ملک کی مقبول ترین زبان ہے۔ فاضل تذکرہ نگار نے اس صداقت پر کمال انصاف کے ساتھ کتاب کے پندرھویں باب میں روشنی[1] ڈالی ہے جہاں وہ لکھتے ہیں:-

> ان یوروپین اور انڈو یوروپین شعرا نے ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو میں کیسی دلکشی ہے۔ اور ایک زبان کی حیثیت سے کتنی لوچدار ہے۔ یہ ایک مزید ثبوت ہے، اگر کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہو کہ یہ ہندوستان کی لنگوا فرانکا (زبان مشترک) ہے:" (صفحہ ۹۰)

کتاب کے ابتدائی ابواب ان اثرات سے بحث کرتے ہیں جو ہندوستان نے مغربی نو واردوں کی پوری زندگی اور خیالات پر ڈالے۔ مصنف نے اُن کی بود و باش میل جول ہندی تمدن کی بعض خصوصیات سے موافقت اور یہاں کے تخیل و جذبات سے ہم آہنگی کو اچھی طرح واضح کیا ہے جو ان شعرا کے کلام کا تاریخی پس منظر پیش کرتے ہیں۔ اور اس دور کی تاریخ کے عام مطالعہ میں بھی مفید و دلچسپ ثابت ہوں گے۔

یوروپین شعرا میں صرف چھ نام دستیاب ہوئے ہیں اور بدقت اُن کا تھوڑا سا کلام ہاتھ لگا ہے۔ اور وہ بھی ادبی لحاظ سے بہت معمولی ہے۔ طرز بیان میں عزت و اہمیت اور زبان میں خامیاں پائی جاتی ہیں۔ تاہم وہ ان کی اس محبت کی قابل قدر

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۷۸، ۲۹۰

یادگاریں جوان کو اردو سے تھی۔

زبان اور ملک تمھارے کاش اگر ہوں
یہ صدق دل سے کہتا ہوں، کچھ اشتہار نہیں

(ڈیوہرسٹ ثاقب جو سنہ... تک زندہ

نمونے کے لئے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں:۔

آنسوں سے بھرا جاتا ہے اپنا دل پر غم
برسات میں گرتا ہے یہ گھر، کوئی خبر لے

(ڈاکٹر ہوئی جو سنہ... تک حیات سے تھے۔

جنوں کی فوج کی سن آمد آمد
خرد کا پاؤں کچھ چل سا رہا ہے

(اسمتھ متوفی سنہ... ء)

دوسری جماعت آرمینین شعرا کی ہے۔ تعجب ہے کہ اہل آرمینیہ جو اپنے ملک
شعر و ادب سے بیشتر بے نیاز رہے۔ وہ فارسی اور اردو کے ادیب اتنے اثر پا
ہوئے۔ سرمد شہید۔ (متوفی سنہ۱۶۶۱ء) کو فارسی ادب میں جو مرتبہ حاصل ہے،
محتاج بیان نہیں۔ اُن کی شخصیت و کلام جداگانہ تذکرہ و تبصرہ کی محتاج ہیں۔ مو
کے مد نظر اس کتاب میں بھی اُن کا مختصر تذکرہ اور کچھ کلام ہے۔ سرمد کو چھوڑ کر دوسر
آرمینی شعرا کا کلام بھی خاصہ ہے۔ ایرن جیکب فرحت کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

نہ چھپکی حشر میں بھی ان کی آنکھ
خدا کے سامنے بھی لے لیا دل

نگلیں اگست ۱۹۵۸ء

ملا لطف شہادت اس کے دم ہی دیر تک مجھ کو
گلے پر خوب رگ رگ کے چلی تلوار قاتل کی
وفا دیکھو لپٹتک آئی ہیں ہمراہ فرحت کے
تمنائیں، مرادیں، آرزوئیں حسرتیں دل کی
(دگلیپس اکتوبر ۱۹۰۲ء)

اینگلو انڈین طبقے کی ہندوستان وابستگی ظاہر ہے۔ وہ خاص طور پر یہاں کی تہذیب و ادب سے اثر پذیر رہے ہیں۔ اور ان سب شعراء میں سب سے زیادہ انکی کی تعداد بھی دستیاب ہوئی ہے۔ یقیناً ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہوگی۔ لیکن زمانے نے ایسا گہرا پردہ ڈال دیا ہے کہ یہ تعداد بھی بسا غنیمت معلوم ہوتی ہے۔

ان شعراء نے مختلف اصناف سخن پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان کے کلام میں غزلوں کے علاوہ قطعات، تضمینیں، مثنویاں، تاریخی قطعے، مذہبی نظمیں اور مرثیے سبھی چیزیں ملتی ہیں۔ بعض صاحب دیوان ہیں۔ بعض نے مثنویاں چھوڑی ہیں۔

ان میں سب سے دلچسپ خاندان گارڈنرس کا ہے جو اپنے زمانے کے سربرآوردہ اینگلو انڈین گھرانوں کی دلچسپ جھلک دکھاتا ہے، اور ظاہر کرتا ہے کہ ان کی تعلیم و معاشرت کس حد تک مشرقی طرز پر تھی۔

سلیمان شکوہ گارڈنر فاد جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ شاہزادہ سلیمان شکوہ کی منہ بولی بیٹی قمر چہرہ کے بیٹے تھے) انگریزی اور پشتو کے عالم تھے، اور اچھے پائے کے شاعر۔ ان کی تمام اولاد بھی شاعر ہوئی۔ بڑا لڑکا شکر تخلص کرتا تھا لڑکی رقیہ بیگم بھی شاعرہ تھیں۔ دو چھوٹے لڑکوں ادریس اور فلک کے کلام بھی موجود ہیں۔ ادریس کا بیٹا بھی شاعر تھا جن تخلص کرتا تھا اور رئیسوں کی بگڑی اولاد کی طرح ہزلیات اور مبتذل

دوحیہ کلام کہتا تھا۔ تھا اور شکر نے اپنے دیوان اشاعت کے لئے مکمل کئے تھے۔ خدا معلوم ان کا کیا حشر ہوا۔ اس خاندان میں اور بھی کئی شاعر ہوئے جن کا کلام اب بھی محفوظ ہے

ایک اور ممتاز شخصیت آزاد کی ہے۔ ان کا ذکر تقریباً سب تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ آزاد، غالب کے منہ بولے بیٹے عارف کے شاگرد تھے۔ زبان کی شائستگی و شستگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اہل زبان شعراء کا پورا پورا فیضانِ صحبت حاصل ہوا تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ اور ان کا دیوان بتاتا ہے کہ انھوں نے سب اصناف میں کافی کامیابی کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے۔ کلام ممتاز اور لطافت خیال، حسن ترکیب اور پاکیزگی زبان سے آراستہ ہے۔ نئی نئی ترکیبیں باندھے ہیں انھیں کمال حاصل ہے اور پرشکوہ انداز بیان کے خاص دلدادہ ہیں۔ وادی اقلیم تھا۔ کف ارباب ہمت، دم زیرِ سلب۔ اور اسی قسم کی ترکیبیں ان کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد کی جواں مرگی پر جو مرثیہ لکھا ہے وہ غالب کے مرثیہ کا ہم پلہ نہ سہی، پھر بھی اثر سے خالی نہیں۔

یاں بعد مرگ حشر کا رکھتے تھے انتظار — لو سر پہ جیتے جی ہی قیامت بپا ہے آج
پھر ہوگا شور خلق میں طوفانِ نوح کا — اے اہل گریہ گریہ بھی جوش بکا ہے آج
جو عندلیب باغ سخن تھا تو ہم صفیر — قسمت سے صید پنجۂ باز قضا ہے آج
ہے بے کسی کٹے گی مری عمر کس طرح — جو میرا جاں نواز تھا سو مر گیا ہے آج

آزاد کا ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔

اور بھی کئی ممتاز شعراء کے نام ملتے ہیں۔ ولیم بیل ٹامس ایک ممتاز مصنف تھے ان کی انگریزی زبان میں مشرقی سوانح عمریوں کا مجموعہ

The oriental biografical Dictionary

مشہور ہے جس کی قدر و قیمت کا اعتراف مغربی مصنفوں نے بھی کیا ہے۔ ان کی دوسری کتاب دو جلدوں میں مفتاح التواریخ کے نام سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں

ملتی ہے جس میں انھوں نے مسلمان بادشاہوں، فلسفیوں، مشاہیر اور دیگر ممتاز شخصیتوں
کی پیدائش و وفات کی تاریخیں تحقیقات کے بعد فراہم کی ہیں۔ خاص کر مادہ تاریخ نکالنا
میں بڑا ملکہ حاصل ہے اور اس کے علاوہ انکا اور کوئی کلام نہیں ملتا۔ ستارہ بیگم کی تاریخ
وفات کیا خوب نکالی ہے

ستارۂ فلک حسن و ناز گشت نہاں

(۱۸۶۵ء)

جوزف نبلی فنا (متوفی ۱۸۶۶ء) نے بہت تھوڑی عمر پائی۔ پھر بھی کافی کلام چھوڑا
ہے اور مکمل دیوان ملتا ہے۔ انھیں ہندوستانی موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ شاعری میں کم
کے شاگرد تھے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

آنکھوں میں دم ہے، جاں حزیں لب پہ بیقرار
میرے مریض ہجر کا کیا پوچھنا علاج
اچھا ہوا کہ جسم سے خوں ہوکے بہ گیا
مدت سے بے قرار دلِ ناصبور تھا

کچھ اور شعراء کے کلام کا نمونہ دیکھیے:۔

جب مصیبت آپڑی جز صبر بن آتا نہیں
دگرفتار قفس پھڑ کا پھڑک کر رہ گیا (آزاد)
شراب روز تو ہم مانگتے نہیں ساقی
کوئی پیالہ دم ریزش سحاب تو دے (ایضاً)
بھیک مانگی جو ترے عارض سے
بھر دیا کاسہ ماہِ کامل کا
(ایضاً)

زاہد و جلوۂ فنا فی اللہ
مستی بے حساب میں دیکھا (رفاعت
جی میں آتا ہے کہ اتنا تو کہوں
اگلی باتیں کچھ بھی تم کو یاد نہیں (ایضاً
نہ ہوئے کچھ دل کو ہلکے تو تسلی ہو
کوئی یہ جھوٹ ہی کہہ دے کہ تم کو یاد کرتے ہیں (ایضاً
وہ بال کھولے تبسم کناں ہیں گلشن میں
کہ برق کوند رہی ہے کہیں سحاب کے ساتھ (میرستو
گریں بجلیاں میرے دل پہ ہزاروں
مزا دے گیا مسکرانا کسی کا (ے ڈیرونگسٹر

نواں باب پرتگالی شعراء اردو سے تعلق رکھتا ہے۔ سات شعرا تو ڈی سا
کے ہیں جو عالموں اور حکیموں کا ممتاز گھرانا ہے۔ ان کے علاوہ پانچ اور شعراء ہیں ..
کا کلام دیکھئے :-

قاتل کو رحم دیکھئے آیا ہے کس گھڑی
پہلو میں جب کہ غرق ہوا تیر ہاتھ بھر

عشق انگیز یہ صحرا وہیں حسن انگیز
نہ کہ خار کہاں گلشن کشمیر کے پھول
(ڈاکٹر ڈی سلوا مفتوں متوفی ...)

قیامت اور قیامت میں ہو گئی برپا
وہ شوخ وعدۂ محشر میں بے نقاب آیا

زاہد کی ہے یا شیخ کی معلوم نہیں ہے
ہاں رند لئے پھرتے ہیں دستار کسی کی

(جان فِڈ کا شاسیف متوفی ۱۸۲۳ء)

طبع نازک میں ہے اتنی نازکی
ناپسند اس کو ہے رنگ شوخ بھی
دے نہ دینا پھول سوسن کے کبھی
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہیں ایک کم سن کے لئے

(تضمین خمسہ بر غزل امیر مینائی)

فرانسیسی شعرا میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت جان پیئر شوروکی ہے۔ ان سے زیادہ بسیار گو اور بسیار نویس غیر ملکی شعرا سے قطع نظر یہاں کے شعرا میں بھی شاید کم ہی ملیں گے۔ وہ چھ مکمل اردو دواوین ایک فارسی دیوان ایک مثنوی حالات غدر اور ایک ذاتی حالات اور ایک مذہبی نظموں کے مجموعے کے مصنف ہیں اور آخرالذکر مجموعے کے علاوہ باقی سب اپنی زندگی میں ہی شائع کر چکے تھے ان کی زبان میں اپنے طبقے کے دوسرے شعرا کی بہ نسبت زیادہ سلاست اور روانی ہے اُن کے خیالات میں مذہبی پاکیزگی پائی جاتی ہے اپنا مسلک صلح کل رکھتے تھے اور مذہبی رسوم و رواج کو صوفیوں کی نظر سے دیکھتے تھے۔

حرم میں دیر میں گرجے میں ہر ایک
یہ بھید اہل دوئی پہ کب عیاں ہو

دل میں جو کیف دو عالم کا بھرا ہو اپنے
جستجوئے حرم و دیر و کلیسا کیا ہے؟

ان کے دل پر دنیا کی بے سر و سامانی کا گہرا اثر ہے اور سارے اشعار سے پر ہیں :-

ترک دنیا میں ہے ثواب بڑا
یہ تو بستی عذاب کی سی ہے

باغباں نے بنا بنا کے چمن
نکیل کی طرح پھر بگاڑ دیا

افسوس ہے کہ بسیار گوئی نے اُن کے کلام کا درجہ گرا دیا، ورنہ اُن کے اور سطحی کلام کے انبار میں ایسے ایسے پاکیزہ شعر بھی ملتے ہیں :-

پوچھتے کیا ہو دل کی ویرانی
یہ ہمیشہ سے دل خراب رہا

تھی گل و شبنم کی صورت وقتِ رخصت صبحدم
ہنس کے جانا اس کا، میرا چشمِ تر سے دیکھنا

ٹھکانے لگی آج مٹی مری
کھڑے وہ رہے گور پر دیر تک

شوق مرحوم کے انداز میں مرصع و مقفّیٰ نثر بھی لکھتے تھے :-

دیکھا کر ایک صرف شاہزادے سلطانِ اُوردہ سلئے پر تکیں صرف اسباب پیو

پر پوشاک مرصع وصورت مرقع سوار ہیں۔ آگے آگے اُن کے ماہی ومراتب و: ریں عصا بردار ہیں :

۱۸۸۰ء میں وفات پائی۔

بعض دوسرے فرانسیسی شعرا کے کلام میں بھی خوش سے اچھے اشعار ملتے ہیں

غنیمت نہ کر اپنی ہستی پہ گل
جہاں میں جو آیا بہت کم رہا

ہستیٔ موہوم ہے صرف امتزاج اضداد کا
آب و آتش و باد و گل نے لگائی ہے گرہ

(جارج فانتوم صاحب۔ متوفی ۱۲۹۶ھ)

لوگ کیوں انگلیاں اُٹھاتے ہیں
جسم لاغر مرا ہلال نہیں

(ولیم جوزف برویٹ متوفی ۱۹۰۸ء)

چشم ساغر نم ہے شیشے کو بھی ہے ہچکی لگی
میکدہ بے ساقیٔ گل رو کے ماتم خانہ ہے

(ولیم بررلٹ ولیم متوفی ۱۹۱۵ء)

دل چاہتا ہے کہ دوسرے ابواب پر بھی مفصل روشنی ڈالی جائے۔ لیکن اس مختصر سے تبصرے میں یہ ممکن نہیں ان میں جرمن اطالوی اور متفرق مغربی شعرا کا تذکرہ ہے۔ ایک باب شاعرہ خواتین پر مشتمل ہے۔ جن کا بہت تھوڑا سا اور معمولی درجے کا

کلام ہے۔ بعض اچھے اشعار بھی مل جاتے ہیں:۔

دل صد چاک پرانی جان جہاں فرقت میں
کیا گذرتی ہے خدا ہوش میں آؤں تو کہوں

ملکہ عمر اپنی غفلت میں کٹی
کیا کہیں گے داورِ محشر سے ہم

(ملکہ۔ مخزن الفت ۱۹۰۳ء

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کو تا صبح حرام
میں نے جو نالہ کسی رات سرِ شام کیا (ایضاً)

نہیں کچھ ہنس کے کچھ جھنجھلا کے کہتا ہے وہ شوخ
ہم نہ سمجھے کچھ کہ اس فقرے کا کیا حاصل ہوا

(پری ۱۲۹۹ھ تک حیات تھیں

کتاب کی ایک اور نمایاں خصوصیت ان تمام شعرا کا انتخاب کلام ہے جو چار سے زیادہ صفحوں پر پھیلا ہے۔ اس پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ہر لحاظ سے خالص مشرقی رنگ رکھتی ہے۔ انداز بیان، تخیل، تشبیہات، استعارے مثالیں اور محاورے سب ہندوستانی ہیں۔ مضامین و خیالات، جذبات و احساسات پھیکے ہیں۔ وہی حزن و یاس، وہی دنیا کی بے ثباتی کا نوحہ۔ وہی عملی زندگی سے قطعی گریز۔ وہی عاشقانہ نالہ و زاریاں اور شب بیداریاں، وہی جفائے محبوب بے نیازیاں اور ستم کاریاں۔ وہی زاہد خشک پر تمسخر۔ قصیدوں میں وہی تشبیہیں ۱۵۱

مبالغہ آرائیاں ۔ الغرض سب کچھ وہی ہے ، جو ہماری پرانی شاعری کا سرمایۂ ادب سمجھا جاتا ہے ۔

کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ ان شعرا کے دل میں پرانی روش سے ہٹ کر اپنے ملکوں کے انداز بیان میں غور و فکر اور جذبات و احساسات کو اردو میں پیش کرنے کا خیال کیوں نہ پیدا ہوا ۔ ان میں سے کچھ تو خود اپنی زبان پر بھی کافی عبور رکھتے تھے اور بعض اپنے ادب میں شاعری بھی کرتے تھے ۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے ادب و شاعری کو اردو میں روشناس نہیں کیا ۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ذہنی لحاظ سے ان میں سے کوئی بھی اتنا غیر معمولی پایہ نہیں رکھتا تھا کہ اردو میں نئی راہیں نکالتا یا یہ کہ اردو شاعری خود اتنے عروج پر تھی کہ اپنی رنگینیوں اور جدتوں میں کسی سے کم دلکش نظر نہ آتی تھی ۔ بہر کیف یہ سہرا بھی ملکی شعرا و ادبا کے سر ہی بندھنا تھا کہ وہ مغربی ادب اور شاعری کو اپنی زبان کا جامہ پہنائیں ۔

مختصر یہ کہ یہ تذکرہ کافی دلچسپ و مفید ہے اور اعلیٰ درجوں اور ریسرچ کے طالب علموں کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ امید کہ اردو ادب اور ملکی تاریخ تمدن سے عام دلچسپی رکھنے والے اصحاب بھی اسے ایک بیش بہا ذخیرۂ معلومات پائیں گے ۔

سید حسن برنی

حالات حاضرہ

فروری کے دوسرے ہفتے میں پریذیڈنٹ روزولٹ، مارشل سٹالن اور
کے درمیان یالٹا میں وہ کانفرنس ہوئی جس سے اُمید کی جاتی تھی کہ وہ اتحادیوں کی با
فہمیوں اور رنجشوں کو دور کر دے گی اور یہ بات کہ جنگ کا خاتمہ قریب ہے اندیشے
بڑھانے کے بجائے ہر ایک کے دل میں اطمینان پیدا کرے گی۔ یالٹا کانفرنس بہت
رہی، خاص طور پر روس کے لئے۔ روسی سیاست نے جون ۱۹۴۱ء سے جرمنی کی
کو نظر کے سامنے رکھا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتی کہ اس کے اتحادیوں کی نظر کسی اور طرا
روسیوں نے اس مسئلے پر بحث کی نہ دوسروں کو کرنے دی کہ اسٹونیا، لیتویا ا
آزاد ملک ہیں یا روسی وفاق کے اراکین۔ جب تک وہ اس سرحد تک پہنچ نہیں گئے جو ستمبر
میں پولستان کو تقسیم کرتے وقت مقرر ہوئی تھی۔ انھوں نے پولستان کی حدود کے
کو باضابطہ سیاسی گفتگو سے الگ رکھا۔ جنوب مشرقی یورپ میں انھوں نے اپنی مصا
دیکھ کر کارروائیاں کیں، اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں سے اُن کی تصدیق کرالی یا
کو صرف اطلاع بھیج دی۔ یہ طریقہ ایسا تھا جس سے اصولی بحث کرنے والے بہت غیر مطمـ
تھے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں دونوں جن اصولوں کی خاطر لڑ رہے ہیں ان کا اعلان
اٹلانٹک چارٹر میں کیا جا چکا ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے وہ ملک جو جنگ سے پہلے آ
تھے سیاسی مصلحت پر قربان نہیں کئے جا سکتے۔ چاہے وہ ملک جو آزاد نہیں تھے کسی بہتر حیثیت
کے حقدار نہ مانے جائیں۔ غالباً پریذیڈنٹ روزولٹ پر پولستانی امریکیوں کی طرف سے
دباؤ پڑ رہا تھا کہ وہ پولستان کے متعلق کوئی اصولاً صحیح فیصلہ کرائیں۔ اعلان پر اس دباؤ سے
زیادہ ان لوگوں کے اعتراضوں کا اثر ہوگا جو یہ کہتے تھے کہ امریکہ کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپ

پر روس کا قبضہ ہوگیا۔

یالٹا کانفرنس کے فیصلوں کا اعلان جس طرح سے شروع ہوا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ روسی ہر لحاظ سے حاوی رہے۔ اتحادیوں کا اصل اور سب سے اہم منصوبہ یہ قرار پایا کہ جرمنی کو جلد سے جلد شکست دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنی ابھی تک لڑ رہا ہے، مشرقی اور مغربی محاذوں پر بہت نقصان اٹھانے کے باوجود اس میں ابھی اتنی قوت ہے کہ جنگ کو جاری رکھ سکے اور اتحادیوں کی غفلت اور سستی سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اصل میں جرمنی کو شکست اسی وقت ہوگئی تھی جب العالمین اور سٹالن گراد سے جرمن فوجیں پسپا ہوئیں اور یہ معلوم ہوگیا کہ جرمنی نے جتنا کر لیا ہے اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ اتحادی پیش قدمی کے شروع ہونے کے بعد جنگ کا مقصد ایک کارروائی کی تکمیل تھی جس کی ابتدا ہوچکی تھی، اور شاید یہ تکمیل کچھ پہلے ہی ہوجاتی اگر اس میں فوجی حملوں کے ساتھ سیاسی حربے بھی استعمال کئے جاتے۔ یہ خیال بعض لوگوں نے اسی وقت پیش کیا تھا۔ لیکن یہ توجہ کے قابل نہیں سمجھا گیا اور روسی بھی اس پر مصر تھے کہ جرمنی کو شکست دینا مقدم سمجھا جائے۔ روس کو جرمنی سے جو نفرت اور عداوت ہے اس میں کسے شبہ ہوسکتا ہے، اور جرمنی نے سب سے زیادہ نقصان بھی روس کو پہنچایا ہے۔ لیکن یورپ کی نئی تنظیم جذبات کے ماتحت کرنا مفید نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات سب سے زیادہ ان مدبروں کے دل نشیں ہونا چاہئے جو ورسائی کے صلح ناموں کا نتیجہ دیکھ چکے ہیں۔ روس کا اصرار کہ جرمنی کی شکست کو مقدم سمجھا جائے جذبات پر نہیں بلکہ مصلحت پر مبنی ہوگا۔ اور مصلحت یہ تھی کہ روس اپنے تحفظ کا بہترین انتظام اسی حالت میں کر سکتا تھا جب وہ جرمنی کو شکست دے اور اس سلسلے میں ان قوموں کی سیاست کو اپنے قابو میں کرے جن سے اس کی سرحد ملتی ہے اور جن سے ان کی مخالفت یا کمزوری اس کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ لیتھونیا، استھونیا اور لیٹویا ۱۹۴۰ء ہی میں روسی وفاق میں شامل ہوگئے، چیکوسلوواکیہ کی جلاوطن حکومت ۱۹۴۳ء کے آخر میں روس سے معاہدہ کرکے اس کے حلقہ اثر میں آگئی۔ پولینڈ، رومانیہ اور بلغاریہ پر روس کا جنگ کے سلسلے میں قبضہ ہوگیا اور یوگوسلاویہ

میں پہلے ہی مارشل ٹیٹو، جو خیالات کے لحاظ سے کمیونسٹ ہیں، اپنا اقتدار قائم کرچکے تھے
نے اپنی سیاسی کارروائیوں کو حسب منشا کرنے کی آزادی کے بدلے میں اتحادیوں کو شمالی
اٹلی، یونان اور مغربی یورپ میں اتنی ہی آزادی دیدی۔ متحدہ ریاستوں اور برطانیہ
خارجی سیاست میں اتنے اختلافات رہے ہیں اور انھوں نے ایک دوسرے پر ایسے ا
کیے ہیں کہ اب وہ روس پر کوئی نیا الزام نہیں لگا سکتے۔ لیکن اتحادیوں نے جو غلطیاں کیں
تدبیریں تھیں جن سے گمان ہوتا تھا کہ اصول کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ روس نے البتہ ا
اختیار کیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایٹلانٹک چارٹر کے اصولوں کو ہی نہیں مانتا۔ یہ
سے پتہ چلتا ہے کہ پریذیڈنٹ روزولٹ نے ارادہ کیا تھا کہ اگر روس راہ راست پر نہ آ
یورپی سیاست سے قطع تعلق کرلیں گے۔

اس کی نوبت نہیں آئی۔ یالٹا کانفرنس میں سمجھوتہ اس پر ہوا کہ جو کچھ ہو چکا۔ ا
اتحادیوں میں سے کوئی فریق یک طرفہ معاہدے نہ کرے گا۔ کسی نو آزاد ملک کے معاملات
دخل نہ دے گا۔ سوا اس کے کہ بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہو، اور مداخلت ضروری ہوئی تو
کا اہتمام کرکے اور ملک والوں کو اس کا موقع دے کر کہ وہ اپنی پسند کی حکومت قائم کریں
ہوجائے گا۔

یالٹا کانفرنس میں یہ بھی طے ہوا کہ ۲۵ر اپریل کو سین فرینسسکو میں ایک بین الا
کانفرنس ہوگی جس میں تمام اتحادی ریاستیں شریک ہوں گی۔ جو ریاستیں جنگ میں غیر جا
تھیں انھیں موقع دیا گیا کہ وہ یکم مارچ تک جرمنی اور جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر
رعایت سے ترکی، مصر، سعودی عرب، شام اور لبنان نے فائدہ اُٹھایا۔ اور اب ا
بھی اتحادی قوموں میں ہوگیا۔ سین فرینسسکو میں ایسے بین الاقوامی نظام کی بنیاد رکھی ا
گی جو دنیا میں امن کے قائم رکھنے کی ذمے داری لے سکے، وہاں ان تجویزوں پر غور کیا
گا جو مختلف کانفرنسوں اور خصوصاً ڈمبارٹن اوکس میں مرتب ہوئی ہیں، اور یالٹا کانفر

جو فیصلے جرمنی کے متعلق کئے گئے ہیں ان کے بارے میں اتحادیوں کی رائے لی جائے گی۔

سین فرنسسکو کانفرنس تک جرمنی کو شکست دی جا سکی تو اتحادیوں کا کام بہت آسان ہو جائے گا اس لئے کہ جو فیصلے کئے جا چکے ہیں ان پر عمل درآمد شروع ہو گیا ہوگا اور مصلحت اندیش لوگ چالو کام کو رد کر کے نئے سرے سے شروع کرنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ جرمنی نے اس وقت تک ہتھیار نہ ڈالے تو ممکن ہے کانفرنس امن کا مستقبل طے کرنے میں زیادہ دخل دے۔ جرمنی نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اور سین فرنسسکو میں صلح کی جو شرطیں پیش کی جائیں گی وہ زیادہ سخت بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن دنیا کی ساری قومیں جنگ سے عاجز آگئی ہیں اور جرمنی آخر اپریل تک مقابلہ کرتا رہا اور اس کا یقین ہو گیا کہ اس میں لڑنے کا اور دم باقی ہے تو ممکن ہے کانفرنس ضد کے جواب میں ضد نہ کرے بلکہ مفاہمت کی کوئی کوشش کرے۔ مگر جرمنی پر مشرقی، مغربی اور جنوبی محاذ تینوں طرف سے ایسی مار پڑ رہی ہے کہ اس کا جلد ہار مان لینا بعید از قیاس نہیں۔ حال ہی میں سویڈن سے خبر آئی ہے کہ جرمنی کی طرف سے صلح کی شرطیں پیش کی گئیں اور اتحادیوں نے ان کو نہیں مانا۔ شرطیں یہ تھیں کہ جرمنی ان غیر ملکوں کو خالی کر دے جن پر اس کا اب تک قبضہ ہے، اور جرمنی میں نازی حکومت برقرار رکھی جائے اس لئے کہ نازی پارٹی کے سوا جرمنی میں اور کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو حکومت کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اتحادیوں کو صلح کی شرطیں ماننے پر آمادہ کرنے کے لئے یہ دھمکی دی گئی کہ جرمنی اپنے آپ کو روس کے حوالے کر دے گا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جرمنی میں کمیونسٹ حکومت قائم ہو جائے گی۔ یہی دھمکی جرمنی کے وزیر خارجہ فون ربن ٹروپ چند دن پہلے دے چکے تھے، اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ گفتگو کی جو خبر سویڈن سے آئی ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہوگی۔ نازی پارٹی مدافعت کا بھی ہر ممکن انتظام کر رہی ہے۔ مسٹر ہٹلر ایک تقریر میں کہہ چکے ہیں جرمنی کو فتح کرنے کی کوشش اگر کی گئی تو اس کی تکمیل تک جرمنی میں جو [illegible] سب کچھ نذر ہو جائے گا۔ ایک اور تقریر میں انھوں نے جنگ کے آخری سات آٹھ دنوں میں [illegible] کی دھمکی دی ہے کہ دنیا کو خدا یاد آ جائے۔ جنگ کے آخری دنوں میں

نازی پارٹی بے بس نہ ہو گئی تو کوئی تعجب نہ ہوگا اگر وہ مغربی یورپ کی تہذیب کو اس طرح برباد کر دے کہ وہ پھر پنپ نہ سکے۔ زہریلی گیسوں اور وباؤں کے جراثیم پھیلانے کے ذریعوں پر جرمنی میں کئی سال سے تجربے ہو رہے ہیں، لیکن ان خطروں کے امکانات سے برطانیہ اور متحدہ ریاستہا کے سائنس داں واقف ہیں تو انہیں کوئی ایسی تدبیر کرنا ہو گی جس کا جواب ہلاکت سے پہلے سمجھ میں آ سکے۔ مگر اتحادیوں کی بمباری نے ریلوں اور سڑکوں کو استعمال کے قابل نہیں رکھا ہے۔ نازیوں کے ارادے کچھ بھی ہوں۔ اب جرمنی کی آبادی پہلے کی طرح ان کے قابو میں نہیں رہی ہے۔ اور غالباً یہ آبادی نازیوں کی ضد پوری کرنے کے لئے ہلاک ہونے پر راضی نہ ہو گی۔

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی

اس کتاب میں موجودہ جنگ کے اسباب پر بحث کی گئی ہے اور اس کے پس منظر کو بڑی خوبی سے دکھایا۔ جرمنی اور جرمنی کے موجودہ ڈکٹیٹر ہر ہٹلر کے بھی پوست کندہ حالات لکھے گئے ہیں۔ اور بتایا گیا ہے کہ جرمنی میں کس طرح قومیت اور نسلیت کا جذبہ ابھارا گیا۔ کس طرح یہودی آبادی کے ساتھ بد سلوکی کی گئی۔ کتاب میں جگہ جگہ نقشے بھی دیے گئے ہیں۔ آخر میں اس جنگ سے ہندوستان کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس جنگ کے بارے میں کانگریس اور مسلم لیگ کا کیا رویہ رہا۔ سب سے آخر میں حل طلب الفاظ اور مقامات کی تشریح بھی کی گئی ہے۔

غرض لڑائی کی خبروں کو سمجھنے اور ان پر رائے قائم کرنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ قیمت مجلد عہ

جامعہ

زیرادارت:۔ پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

جلد ۲۰ نمبر ۶	بابتہ ماہ مارچ ۴۵ء	سالانہ چندہ ۔ فی پرچہ ۴

فہرست مضامین

قانون کی ابتدا

قانون کے تحلیلی اساتذہ کے برخلاف بہت سے تاریخی اساتذہ "قانون" یا "لا" کے لفظ کو ان تمام عناصر کے اظہار میں استعمال کرتے ہیں جو معاشرتی زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ پر حاوی ہوں۔ لیکن عام طور پر اس لفظ کو ایک محدود معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ڈین پونڈ کی تعریف کے لحاظ سے یہ دراصل اس معاشرتی قابو یا "سوشل کنٹرول" کا نام ہے جو ایک منظم سیاسی معاشرت کے ذریعے باقاعدہ طور پر عمل کرتا ہے۔ یہ محدود معنی ہی عمرانیاتی تحلیل اور تبویب (Classification) کے لئے مفید ہیں۔ اور اسی لئے قانون کے دائرے کو منظم قانونی تہدیدوں (Sanctions) تک ہی محدود سمجھا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں جہاں قانونی تہدیدیں موجود نہ ہوں افراد پر جو پابندیاں اور فرائض عائد ہوتے ہیں وہ قانون کی نہیں، بلکہ رسم و رواج کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے بعض سادہ معاشروں میں قانون نہیں ہوتا گو کم و بیش تمام معاشروں میں رسوم یا روایات کی پابندی ہوتی ہے اور ان کے پیچھے کچھ تہدیدیں بھی موجود ہوتی ہیں۔

موجودہ زمانے میں دیوانی اور فوجداری قانون میں جو امتیاز کیا جاتا ہے، اسے قدیم ان پڑھ سماج کے مطالعے میں پیش نظر رکھا جائے تو بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن دیوانی اور فوجداری کے فرق کی بجائے قانون کو اگر عام جنایات[1] (Public Delicts) اور خاص یا خانگی جنایات (Private Delicts) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ غلط فہمیاں بڑی حد تک دور ہو جاتی ہیں۔ کسی سماج میں کوئی فعل ایک عام جنایت سمجھا جائے گا اگر اس کی وجہ سے عام طور پر پوری قوم یا پھر سماجی اقتدار کے دستوری نمائندوں کی جانب سے کوئی ایسا باقاعدہ اور

---

[1] فوجداری قانون

نظم ضابطہ متعین ہو جائے کہ اس کے ذریعے قوم کے کسی خاص فرد پر کوئی ذمہ داری یا وجوب عائد ہو سکے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو تو قوم یا اس کے نمائندے خلاف ورزی کرنے والے کو سزا دے سکیں۔ یہ ضابطہ جسے تعزیری تہدید کہا جا سکتا ہے۔ در اصل اس قوم کی طرف سے قوم کے اس خطاکار فرد کے خلاف ایک ردعمل کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ ایک قومی اور متعین اخلاقی جذبے کو ٹھیس لگاتا اور اس طرح سماج کو دکھ پہنچاتا ہے۔ اس ردعمل کا فوری اثر تو یہ ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر اخلاقی غصّے کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں اور اس طرح سماج کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اور اس کا آخری اثر یہ ہوتا ہے کہ اس اخلاقی جذبے کو قوم کے تمام افراد کے دلوں میں محفوظ کر دیا جاتا ہے

ماقبل تحریر زمانے کے معاشروں کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں تعزیری تہدیدوں کا کم پتہ چلتا ہے۔ ابتدائی قسم کے سادہ معاشرے میں وہ بندشیں جو عام جنایات کے تحت آتی تھیں، زیادہ تر زنا پر مشتمل ہوتی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں ازدواجی یا جنسی تعلق، ایسے اشخاص کے مابین جو اس تعلق کے لیے ممنوع ہوں، عام جنایت تھا۔ سحر یا سفلی جادو بھی ایک وجہ تھی یعنی قوم کا ایک فرد کسی دوسرے پر سحر کر دے تو یہ بھی قابل سزا حرکت تھی۔ نیز قبائلی رسم کو مسلسل توڑا جائے تو اسے بھی قابل سزا سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد متبرک پاک چیزوں کی چوری بھی قابل سزا تھی۔ لیکن اس زمانے کے بہت سے معاشروں میں عام طور پر تعزیری تہدیدیں صرف ان صورتوں میں استعمال ہوتی تھیں جیسا کہ عام متبرک رسم کے خلاف کوئی حرکت کی جائے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ تہدید کو بھی مذہبی یا اخلاقی تقدس حاصل رہے۔ مذہبی یا رسمی تہدید کی ابتدا غالباً اس طرح ہوئی کہ بعض افعال یا حوادث کی وجہ سے کسی فرد یا جماعت کو مذہبی یا ذہنی طور پر ناپاک اور نجس قرار دیا جاتا اور اس ناپاکی کو دور کرنے کے لئے کسی خاص حرکت کی ضرورت ہوتی تھی۔ چنانچہ تعزیری تہدید کی بہت سی مثالوں میں یہ تخیل کارفرما ہے کہ کسی فعل قبیح مثلاً زنا کی وجہ سے پوری قوم ناپاک ہو جاتی ہے۔ یعنی ایک فرد کی حرکت سے پوری قوم متاثر

ہوتی ہے اور اسی لئے اس کی سزا جو ممکن ہو کر خاطی کو مارنے ہی میں ڈھونڈی جائے۔ پوری قوم کے پاسداشت کا ذریعہ ہوگی اور جب سیاسی یا عاملانہ اقتدار کسی شخص یا جماعت کو حاصل ہوگیا، گو وہ سادہ شکل ہی میں سہی، تو اس کے اقتدار سے انحراف یا اس کے احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں بھی تعزیری تہدید سے کام لیا جاتا اور اُسے بھی عام جنایات میں شامل کیا جاتا رہا نیز اسی مقتدر ہستی کی ذات کے خلاف کوئی فعل ہو تو اس کے لئے بھی تعزیری تہدید تھی اور اسی طرح جب سماج کا اختیار مختتم کسی سردار کے ہاتھ میں ہو تو ایسا فعل جو عموماً خانگی یا خاص جنایت کی حد تک پہنچتا، اس سردار کے خلاف کئے جانے پر عام جنایت تصور کیا جاتا تھا۔

خانگی یا خاص جنایات کی صورت میں جب کوئی شخص یا جماعت کسی ضرر، نقصان یا ہرجہ سے متاثر ہوتی ہے اور اس کے جائز حقوق پر ضرب لگتی ہے تو وہ عدلیہ کی مقتدر ہستی کے روبرو چارہ کار کے لئے درخواست کرتی ہے، اور یہ مقتدر ہستی قوم کے دوسرے فرد یا جماعت کو مورد الزام ٹھہراتی اور حکم دیتی ہے کہ مدعی علیہ مدعی کے نقصان کی خاطر خواہ تلافی کرے۔ اور یہ تلافی عموماً تاوان یا ہرجہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں خانگی جنایت ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے "بازدہی" یا "بھراؤ" کی تہدید ہوتی ہے اور اسی لئے ماقبل تحریر زمانے کے لئے خانگی جنایات کے قانون کو موجودہ قانون ملک یا سیول لا کے مماثل سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں میں دراصل ایک اہم فرق بھی ہے۔ موجودہ قانون کے لحاظ سے سیول لا کے تحت صرف ایسے ہی افعال آسکتے ہیں جن کے لئے ہرجانہ دیا جاسکے۔ البتہ ان افعال کو پوری قوم کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

گو دیوانی یا سیول قسم کی تہدیدوں سے مدعی علیہ ہرجانہ ادا کرتا اور مالی لحاظ سے نقصان اُٹھاتا ہے۔ تاہم اس کے لئے تادیبی سزا نہیں ہوتی۔ موجودہ سیول لا میں بعض خاص صورتوں میں حاکم عدالت تادیبی سزائیں دے سکتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ جو مضرت پہنچائی گئی وہ پوری قوم کے خیال میں مذموم ہونی چاہئے۔ موجودہ قانون کے بموجب کسی

فعل شخص کے خلاف سرزد ہو اور ساتھ ساتھ معاشرت کو بھی پہنچے تو ایسے فعل کے خلاف دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے چارہ کار ہیں۔ چوری یا قتل کے لئے جو سزا دی جاتی ہے اس میں زیادہ زور اس چیز پر دیا جاتا ہے کہ وہ پوری قوم کے خلاف ایک جرم ہے نہ اس پر کہ اس فعل کی وجہ سے جن اشخاص کو تکلیف یا مضرت پہنچی ہے۔ ان کو اس کا بدل دیا جائے۔

ما قبل تحریر زمانے کے معاشروں میں خانگی یا خاص جنایات عام طور پر چار پانچ چیزوں پر مشتمل تھیں جیسے جان سے مارنا۔ زخمی کرنا۔ چوری۔ زنا، قرضہ ادا کرنا۔ ان افعال کے متعلق ایک تصور تو یہ ہے کہ یہ قوم کے کسی فرد کے خلاف سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں کے ساتھ ہی ایک دوسرا تصور یہ ہے کہ یہ خلاف معاشرہ افعال بھی سمجھے جاتے ہیں جو نظام عامہ کو ٹھیس لگاتے ہیں۔ ایسے افعال کے خلاف "مازدہی" اور "دباؤ" دونوں قسم کی تہدید ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، ایک طرف تو متضرر کے نقصان کی تلافی کا خیال ہوتا ہے دوسری طرف اس شخص کو سزا کا جس نے ضرر پہنچایا۔ مثال کے طور پر بعض افریقی قبیلوں میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کا مال چرائے تو مسروقہ شے کی دوگنی قیمت مالک کو واپس کرنی پڑتی ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو خانگی جنایات کا قانون دراصل ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے جس کے ذریعے معاشرت یا قوم کے اندرونی جھگڑوں سے پیدا ہونے والے "معاشرتی مرض" کا علاج کیا جاتا ہے۔ ایک فرقے کے کسی فرد نے دوسرے فرد کے خلاف کوئی فعل کیا ہو۔ اور اس سے اس دوسرے فرد کو محسوس ہو کہ اسے مضرت پہنچی، تو اس سے عام معاشرتی زندگی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور جب تک متضرر کے نقصان کی تلافی نہ کی جائے، یہ دور نہیں ہوتا۔ اس لئے افریقہ کے مقامی قانون کے لحاظ سے جب تک حاکم عدالت متعلقہ فریقوں کی تشفی نہ کرے اس وقت تک اس کا فیصلہ [illegible] کیا جاتا ہے۔

بہرحال عام جنایات اور خانگی اور خاص جنایات کے فرق سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ قانون کی ابتدار ایک نقطہ سے نہیں ہوئی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فعل جو قوم کے کسی فرد کے خلاف عمل میں آئے اور جس کی وجہ سے قوم کا اخلاقی جذبہ متاثر ہو، اس کے پیچھے تین تہدیدیں ہوتی ہیں عام یا اخلاقی تہدید جس کی وجہ سے قوم خاطی کی ہر طرح کی مخالفت کرتی اور اسے خطاکار سمجھتی ہے۔ دوسرے رسمی یا مذہبی تہدید جس کی وجہ سے خاطی کے اندر مذہبی ناپاکی یا اچھوت پن کی ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہے کہ خود اس کے لئے اور پھر اس کے متعلقین کے لئے بڑا خطرہ رہتا ہے ایسی صورت میں رسم کے مطابق مذہبی طریقے سے اس کو پاک کیا جاتا ہے یعنی پاپ کا پرائشچت ہوتا ہے اگر یہ کفارہ ادا نہ ہو تو خیال یہ ہوتا ہے اس گناہ کی وجہ سے وہ بیمار ہو جائے گا۔ یا مر جائے گا۔ تیسرے تعزیری تہدید ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قوم بعض اشخاص کے ذریعے جن کو وہ عدلیانہ اختیار عطا کرتی ہے۔ خطاکار کو سزا دیتی ہے اور اس سزا کو یا تو اس ناجائز فعل کے خلاف عام اور اجتماعی طور پر "اخلاقی غصہ" کا مظہر سمجھا جاتا ہے یا اس مذہبی یا تخیلی پاپ کو روکنے اور اسے دور کرنے کا ایک ذریعہ یا پھر دونوں۔

اس کے برخلاف اگر کسی فعل کا اثر یہ ہو کہ کسی شخص یا مجموعۂ اشخاص کے حقوق متاثر ہوں تو متضرر "مواخذہ یا جزا" کا مطالبہ کرتا ہے اور جب رسم بھی ایسے مواخذہ اور بدلے کو جائز تصور کرے اور اس کے لئے چارہ کار بھی مہیا کر دے تو ظاہر ہے مواخذہ بھی تہدید کا اثر رکھے گا۔ ماقبل تحریر معاشرے میں جنگ بھی ایسی تہدید تھی چنانچہ جنگ بعض قوموں میں ایک مواخذہ ہی سمجھی جاتی تھی جسے ایک فریق دوسرے خاطی فریق کے خلاف اختیار کرتا تھا اس کے لئے چند رسوم بھی ضابطے کے طور پر رائج تھے جو موجودہ قانون بین اقوام کے مشابہ ہیں۔ چنانچہ آسٹریلیا کے بعض قبیلوں میں

متعلق آج تک یہی تصور ہے۔ باضابطہ اور منظم طور پر بدلہ لینے کا طریقہ بھی اسی "مواخذہ" کی تہدید کی ایک مثال ہے اگر کوئی آدمی جان سے مارا جائے خواہ وہ ارادی طور پر ہو یا بطور حادثہ۔ اس سے اس کے خاندان، قبیلے یا فرقے کو جو مضرت پہنچتی ہے اس کی تلافی ضروری ہے۔ یہ متضرر گروہ کا حق سمجھا جاتا ہے کہ اس کا بدلہ لے بلکہ اکثر و بیشتر تو یہ اس کا فرض ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مواخذہ کو رسم کی طرف سے جواز ملتا تھا۔ بعد میں قانون مواخذہ LEX (TALIONIS) کے لحاظ سے یہ ایک اصول بن گیا کہ جس قدر مضرت پہنچائی جاتی ہے اس کی پوری پوری تلافی ہونی چاہیے اور اجتماعی ذمے داری کے اصول کے لحاظ سے تو بدلہ لینے والوں کے لئے یہ بھی کافی ہو گیا کہ خود قاتل کی بجائے کسی اور کو قتل کر دیں۔ مثلاً قاتل کے بھائی کو یا بعض صورتوں میں قبیلے کے کسی فرد کو۔ جب "بدلہ" کا یہ ادارہ بہت منظم ہو گیا تو قاتل گروہ اپنے کسی فرد کی موت کے بدلے کو گوارا کرنے لگا لیکن اس کے بعد مزید مواخذہ کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مواخذہ کی تہدید اس صورت میں بھی استعمال ہوتی ہے جب کہ ایک شخص دوسرے کو کوئی مضرت پہنچاتا ہے۔ چنانچہ خاص حالات میں ایک شخص کو حق ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کو "دوئل" لڑنے کی دعوت دے۔ آسٹریلیا کے قبیلوں میں جب کوئی شخص کسی دوسرے کے ہاتھوں مضرت اٹھاتا ہے تو متضرر کا یہ حق ہے کہ بزرگوں کی اجازت کے بعد ضرر پہنچانے والے سے مماثل قسم کا بدلہ لے۔ مثلاً اس پر برچھی یا بھالا پھینک دے یا جسم کے ایسے حصے پر جو جان لیوا نہ ہو۔ برچھی چبھو دے۔ مواخذے کی تہدید کی تمام مثالوں میں رسم کا یہ ایک ضابطہ معلوم ہوتا ہے کہ متضرر کے نقصان کی تلافی کی جائے اور اس کے لئے عام طور پر ضرر رساں شخص کو مماثل قسم کا ضرر پہنچایا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حق پر جو حملہ ہوتا ہے اس کی تلافی کی جاتی ہے اور متضرر شخص کے ذہن سے یہ احساس زائل ہو جاتا ہے کہ اُسے ضرر پہنچایا ہے کہ اُسے بدلہ لینا ہے۔ بہت سے معاشروں [illegible] کی قدر و [illegible] کا ایک طریقہ کار ملتا ہے

یعنی ضرر پہنچانے والے اشخاص متضرر فریق کو چند قیمتی اشیا دیتے اور اس کو نقصان کی حد تک مطمئن کر دیتے ہیں۔ اس طریقے پر متضرر کی اطمینان دہانی ماقبل تحریر معاشروں میں کافی رائج معلوم ہوتی ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان سے آج تک کوئی نظام قانون نشو و نما پا سکا

قانون کی ابتدا اور اس کے ارتقا کو سمجھنے کے لئے ان قدیم قبیلوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ہو سکتا ہے جو آج بھی اپنی قدیم روایتوں کے ساتھ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر شمالی کیلی فورنیا کے بعض شکاری قبیلے جو "یورک" کے نام سے موسوم ہیں ان کا مطالعہ اپنے اندر بہت دلچسپیاں رکھتا ہے۔ یہ لوگ چھوٹے دیہاتوں میں بستے ہیں اور ان کی کوئی سیاسی تنظیم نہیں ہے قوم کے خلاف کوئی فعل یا جرم ہو تو اس کے لئے ان کے ہاں کوئی ضابطہ مقرر نہیں اور اسی لئے اُن کے ہاں عام جنایات کا کوئی تصور موجود نہیں۔ اگر ایک سے دوسرے کو مضرت پہنچے یا اس پر حملہ ہو تو عام رسم کے مطابق اوان کی قرارداد" Indemnity سے کام لیا جاتا ہے چنانچہ کسی کی جائداد یا ن پر حملے کی صورت میں مناسب تاوان سے پابجائی کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کو ن سے مارا جائے تو تاوان یا خون بہا مقتول کے قریبی رشتہ داروں کو ملتا ہے ر اگر آپس میں جنگ ہو جائے تو جنگ ختم ہونے کے بعد ہر فریق کا فرض ہوتا ہے کہ سرے فریق کے مقتول لوگوں کا خون بہا ادا کرے۔ صرف امر واقعہ اور ہرجانے کی رقم ہ جاتی ہے۔ نیت، ارادہ، کینہ، غفلت یا حادثہ پر غور نہیں کیا جاتا۔ اگر ایک مرتبہ ن قبول کر لیا جائے تو متضرر شخص کو اس ضرر کی بابت مزید شکایت کرنے کا مجاز نہیں چونکہ تاوان متعلقہ اشخاص کے مابین مصالحت کی بنا پر طے ہوتے ہیں اور عدلیہ ہ حاکم کے پاس بھی معاملہ نہیں جاتا۔ اس لئے یہاں صحیح معنوں میں خانگی جنایات کا ہیں۔ بے شک اسی طرح فلپائن کے بعض قبیلوں کی حالت بھی [illegible] نالی لوزان کے پہاڑی علاقوں میں جا درل [illegible]

نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سیاسی طور پر غیر منظم ہیں۔ ان میں خاندان یا قبیلے کا بھی کوئی تصور نہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ معاشرہ۔ معتزلوں کی صورت میں کوئی سزا تجویز نہیں کرتا بلکہ اسے عام ہی سزا کا کام کرتی ہے دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں عدم جنایات کا قانون نہیں پایا جاتا اور کوئی حقیقی تعزیری تہدید بھی موجود نہیں۔ پھر بھی بعض اصول ضرور قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی فرد پر جادو کرے تو اسے خاندان والے موت کی سزا دیتے ہیں۔ لیکن بھائی بہن زنا کے مرتکب ہوں تو یہ کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا نیز پدر کشی یا برادر کشی کی صورت میں بھی کوئی سزا نہیں دی جاتی گو ممکن ہے کہ ان فعل کے لئے اہم مذہبی تہدیدیں موجود ہوں۔ اگر ایک شخص دوسرے پر حملہ کرے یا دوسرے کے حق کو متاثر کرے۔ تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دونوں افراد کے خاندان ایک دوسرے کے مدمقابل کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں ماں اور باپ دونوں طرف سے تین درجوں تک کے رشتہ دار لازمی طور پر فریق بنتے ہیں۔ قتل، زنا اور تاوان یا قرضہ کی ادائی سے انکار اور اسی طرح کی بعض صورتوں میں مواخذہ یہی ہے کہ خاطی یا اس کے خاندان کے کسی فرد کو موت کے گھاٹ اتارا جائے۔ دوسرے افعال کے لئے تاوان کی ادائی کافی سمجھی جاتی ہے۔ ان قبیلوں میں عدلیہ کی کوئی ایسی ہستی موجود نہیں۔ جس کے روبرو نزاعات لائے جاسکیں۔ تسویے عام طور پر ایسے بزرگ کے ذریعے ہوتے ہیں جس کو متعلقہ فریقوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بعض اشخاص اپنی کامیاب غیر جانبداری کے باعث شہرت بھی رکھتے ہیں اور ان ہی کے پاس بہت سے نزاعات فیصلوں کے لئے آتے ہیں۔ لیکن یہ اشخاص کسی طرح مقتدر نہیں ہوتے اور نہ یہ پوری قوم کی کسی طرح نمائندگی کرتے ہیں۔ تنازعہ کے دوران میں دونوں فریق ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مخالف تصور کئے جاتے ہیں۔ مگر جب باعث نزاع دور ہو جاتی ہے یا تسویہ ہو جاتا ہے تو صلح ایک خاص رسم کے ساتھ ہوتی ہے۔ تسویوں کے لئے [illegible] کوئی معیار مقرر کرتا ہے اور خاص صورتوں میں تو اشخاص کی حیثیت کے

لحاظ سے یہ معیار بدلتا بھی رہتا ہے۔ مثلاً مالدار کے لئے ایک اوسط طبقے کے لیے ایک اور غریب کے لئے ایک اور یہی "رفو گاؤ" کی عدل گستری کا نظام کار ہے جس سے بہرحال کوئی نظام قانون ترتیب نہیں پاتا کیونکہ کسی عدلیانہ اقتدار کا وجود نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ جب سلسلہ ثالث یا حاکم عدالت موجود ہوں اور وہ شہادت کی سماعت کریں اور ذمہ داری یا ہرجانہ کی بابت فیصلہ کریں تو اس سے ایک نظام قانون کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ البتہ اسی صورت میں صرف اس عاملانہ اقتدار کی کمی ہوتی ہے جو ان فیصلوں کی پابندی کروا سکے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض معاشروں میں خانگی یا عام حیاتیات کے تسویوں کے سلسلے ہی میں کوئی نظام قانون نشوونما پاتا ہے یعنی قضیے ثالثوں کے سامنے آتے ہیں اور ثالث رسم کے بنائے ہوئے قواعد عمل کا اعلان کرتے اور پیش شدہ معاملے پر اس کو منطبق کرتے ہیں۔ ثالثی کی یہی عدالتیں رفتہ رفتہ باقاعدہ قانونی عدالتیں بن جاتی ہیں اور پھر معاشرے میں ایک خاص ضابطہ بھی نمو پاتا ہے جس کے ذریعے فیصلوں کی تعمیل کروائی جاتی ہے۔

مشرقی افریقہ کے بعض قبیلوں پر نظر ڈالی جائے تو قانون کا یہ نشوونما اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثال کے طور پر کمبا، کی کو یو، تھراکا اور پانٹو لوگوں کے عمل اور آدجو مونٹ کینیا کے جنوب اور جنوب مشرق میں رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں دلچسپ ہیں۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے خاندانوں میں منتشر ہیں اور مویشی اور بکریاں پالتے اور اناج بوتے ہیں ان میں کوئی سردار یا بزرگ خاندان نہیں ہوتا اور یہ لوگ عمر کے لحاظ سے مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں ایک طبقہ معمر اور بزرگ لوگوں پر بھی مشتمل ہے اور یہی طبقہ مذہبی پیشوائی اور عدلیہ دونوں کے فرائض انجام دیتا ہے جب کسی شخص کو یہ باور کرنے کی وجہ ہو کہ کسی دوسرے نے اسے کسی قسم کی مضرت پہنچائی یا اس کے حقوق متاثر ہوئے ہیں تو خود بیچ بچاؤ کرنے والے اور منتظر رہ دونوں فریقوں کی طرف سے اُن کے دیہات یا ضلع کے

یہاں وہ رہتے ہیں تمام بزرگ بلوائے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عدالت کے روبرو معاملہ
پیش ہوتا ہے۔ یہ عدالت ابتدا میں تو صرف ثالثی کے طور پر کام کرتی ہے اور عام رسم کے
قائم کردہ اصول انصاف کے مطابق تصفیہ کرتی ہے اور تصفیہ کے بعد اپنے فیصلے کی
تعمیل کروائے بغیر معاملے کو خود متضرر فریق کے سپرد کرتی ہے کہ خود وہ اپنے حریف سے
نمٹ لے۔ لیکن بعض خاص اور سنگینی معاملوں میں جب کسی حملہ یا فعل سے پورا فرقہ یا
قوم متاثر ہو یا جب ملزم کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ عادی مجرم ہے یا یہ کہ قوم کے لئے
اس کا وجود خطرناک ہے۔ اور اس طرح اس ایک فرد کے فعل کو پوری قوم کے خلاف
سمجھا جاسکتا ہے۔ تو پھر بزرگوں کی یہ جماعت عاملانہ اقتدار بھی استعمال کرتی اور اپنے
فیصلے کی تعمیل کراتی ہے۔ یہ بزرگ اپنے مذہبی اقتدار کی روشنی میں یہ اقتدار استعمال
کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص ان کے فیصلے کو ماننے سے انکار کرے تو اس پر لعنت یا
پھٹکار بھیجتے ہیں جس سے ان کے عقیدے کے مطابق، مافوق فطری سزا ان پر آپڑتی
ہے اگر ایک خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان کا فرد جان سے مار ڈالے، خواہ
ارادی طور پر یا حادثے میں، تو بزرگوں کی عدالت" اس فعل کو خانگی یا خاص جنایت
سمجھتی ہے اور مقتول کے رشتہ داروں کو تاوان سے مطمئن کرتی ہے جو قاتل اور اس
کے رشتہ دار ادا کرتے ہیں۔ عام جنایات سے متعلق بھی ان بزرگوں کو ایک ضابطہ کے
تحت اختیارات ہوتے ہیں جسے "کن گول" یا موانگ کہا جاتا ہے۔ اگر کسی شخص پر جادو
الزام ہو یا وہ عادی مجرم ٹھہرایا جائے اور اس طرح وہ عوام کے لئے خطرناک وجود بنے
تو بزرگوں کو اختیار رہتا ہے کہ ایسے شخص کو موت کی سزا دیں یا اس کے گھر بار کو تباہ کر کے
اسے اپنے ضلع سے باہر کردیں۔ لیکن ایسی سخت سزا سے پہلے ضروری یہ ہوتا ہے کہ وادی
کے تمام بزرگ اکٹھے ہو کر اس کا فیصلہ کریں۔ نیز خاطی کے خاندان والوں کا بھی اس
رضامند ہونا ضروری ہے۔

مگر اکمبا کے نظام کے برخلاف مغربی افریقہ کے اشانتی لوگوں کے ہاں عام جنایات کا ایک منظم قانون ملتا ہے جو مقامی زبان کے ایک خاص لفظ سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں "امور جو قبیلے میں نفرت سے دیکھے جاتے ہیں"۔ ان میں یہ چیزیں شامل ہیں یعنی قتل، خودکشی، نسلی یا ازدواجی رشتہ داری میں بعض جنسی تعلقات، خاص قسم کی گالی گفتار، جان پر حملہ اور چوری، کسی سردار پر پھٹکار بھیجنا، بغاوت، بزدلی، جادوگری، سلسلہ خانگی رسم و رواج کی خلاف ورزی، اور مرکزی اقتدار کے احکام کی خلاف ورزی وغیرہ بہرحال اشانتی تصور قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام افعال دراصل مقدس یا مافوق فطری طاقتوں کے خلاف سرزد ہوتے ہیں اور ان ہی طاقتوں پر پوری قوم کی بقا ہے اور جب تک ان افعال ناجائز کو خاطی کی سزا کے ذریعے روکا نہ جائے پورا قبیلہ مصیبتوں میں گرفتار رہے گا۔ عدلیانہ اقتدار کے متعلق تصور یہ ہے کہ یہ بادشاہ یا سردار کو حاصل رہتا ہے جو ایک مقدس تخت یا چوکی پر بیٹھتا ہے اسی کے سامنے خاطی کو سزا سنائی جاتی ہے۔ زیادہ سنگین افعال کی صورت میں سر کاٹنا ہی ایک سزا ہے۔ گو بعض صورتوں میں خاطی اور اس کے رشتہ دار خاطی کا سر خرید سکتے ہیں یعنی ہرجانہ یا نقصان ادا کر کے اس کی جان بچائی جاتی ہے۔ بزرگوں کی عدالتیں خانگی جنایات کی صورت میں کوئی اقتدار استعمال نہیں کرتیں۔ بلکہ یہ "گھریلو نزاعات" ہیں جن کے تصفیے یا تو خاندان کے صدر کرتے ہیں یا پھر آپس کے سمجھوتے سے نزاع ختم کی جاتی ہے۔ خانگی جنایات سے متعلق بھی کوئی نزاع سردار کے سامنے لائی جا سکتی ہے۔ مثلاً کسی متعلقہ فریق نے قسم اٹھالی ہو تو وہ عام جنایت ہے اور اس لئے سردار کے روبرو معاملہ آئے گا۔

بہرحال ان قبیلوں کے مطالعے سے بعض کام کی باتیں ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اگر اکمبا کے بزرگ خانگی جنایات سے تعلق رکھتے ہیں تو اشانتی کے سردار عام جنایات کی صورت میں اپنا اقتدار استعمال کرتے ہیں۔ افریقہ اور دوسرے ملکوں

میں بعض قبیلے اور فرقے ایسے بھی بستے ہیں جن کے سردار یا بادشاہ اور اس کے نائب دونوں کے قوانین پر اقتدار رکھتے ہیں۔ ان میں ضابطے کے لحاظ سے فرق بھی کیا جا سکتا ہے۔ خانگی جنایات کے قانون میں۔ اشخاص یا اشخاص کے گروہوں کے مابین تنازعوں کی صورت میں قانونی عدالت کے روبرو معاملہ لایا جاتا ہے۔ عام جنایات کے قانون کے لحاظ سے مرکزی اقتدار کی جانب سے اقدام ہوتا ہے اور خود اپنی طرف سے مرکز کی مقتدر ہستی ملزم کے خلاف چارہ کار اختیار کرتی ہے۔ راست طور پر موجودہ تعزیری اور دیوانی قانون علی الترتیب ان ہی عام اور خانگی جنایات کے قوانین سے ماخوذ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جو افعال آج عام جنایات کے تحت آتے ہیں جیسے قتل یا چوری۔ یہی افعال بہت سے ماقبل تحریر معاشروں میں خانگی جنایات کے تحت تھے اور بے شک اسی طرح وہ افعال جو ان معاشروں میں عام جنایات تھے۔ ان میں جادوگری اور زناکاری اور متبرک اور پاک چیزوں کی چوری شامل تھی۔

اپنی ابتدائی منزلوں میں قانون دراصل سحر، جادو اور مذہب کا دوسرا نام تھا۔ اور قانونی تہدیدیں دراصل مذہبی تہدیدیں تھیں۔ اسی لئے سادہ معاشروں میں قانون کی ابتدا سمجھنے کے لئے معاشرتی تہدیدوں کے تمام نظاموں کا متقابل مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

حفیظ صدیقی

تفصیلی مطالعہ کے لئے ذیل کی چند کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں:۔

1. Post, A. H. "Grundriss der ethnologischen Juriaprudenz" 2 Vols. Oldenburg, 1094-95.

2- Durkheim Emile, "De la division du travail Social", Paris 1893.

3. Kocourek, Albert, and Wigmore, John H., "Evolution of Law", 3 Vols. Boston 1915-18.

4- Hartland, Edwin Sydney, "Primitive Law", Lond. 1924.

5 Malinowski, Bronislaw, "Crime and Custom in Savage Society", New York 1926.

6- Wheeler Gerald C., "The Tribe, and inter-tribal relations in Australia", London 1910.

7- Barton, Roy Franklin, "Ifugao Law" in University of California, publications in American Archaeology and Ethnology Vol. XV 1919-22. 1-186

8- Hobley, C. W., "Bantu Beliefs & Magic", Lond 1922.

9- Rattray, R. S., "Ashanti Law and constitution", Oxford 1929.

10- Torday, Emile, "African Races" London 1930.

صحیفہ وِنڈل وِلکی

وِنڈل وِلکی امریکہ کے غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے روس اور دنیا کے دیگر ملکوں میں اس وقت گئے تھے جب موجودہ جنگ ایک نہایت نازک مرحلے سے گذر رہی تھی اور چین و روس کی مدافعت خصوصیت کے ساتھ بہت آزمائش میں مبتلا تھی۔ وِنڈل وِلکی کے متعلق خیال تھا کہ یہ شاید روزولٹ کے مقابلے میں جمہوریت امریکہ کی صدارت کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس لئے انھوں نے دنیا کے ملکوں کا جو ہوائی دورہ کیا اس میں ایک بڑی رومانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور جب اپنے تاثرات کو انھوں نے "وحدت عالم" نام کی کتاب کی صورت میں شائع کیا تو کروڑوں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ ہندوستان میں بھی اس کتاب کا بڑا چرچا رہا اور اسی زمانے میں جوہر صاحب نے یہ مضمون رسالہ جامعہ میں اشاعت کے لئے مرحمت فرمایا تھا لیکن رسالہ جامعہ پر بھی وہ دور ابتلا و آزمائش کا تھا اس لئے یہ مضمون شائع نہ ہو سکا۔ اب اگرچہ وِنڈل وِلکی مر چکے ہیں اور کتاب کا موضوع بھی کچھ باسی سا ہو گیا ہے لیکن پھر بھی اس کے اندر چند امور ایسے ہیں جن کی دلچسپی اور اہمیت حسب سابق باقی ہے۔ اس لئے ہم اس کو شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں جوہر صاحب کے خیالات و عقائد سے عام طور پر اتفاق نہیں ہے لیکن ہم رسالہ جامعہ کے صفحات کو کسی ایک خاص خیال کی اشاعت کے لئے وقف کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہم اظہار خیال کی آزادی کے حامی ہیں۔ اگر ہمارے قارئین میں سے کوئی صاحب اس سلسلے میں کسی دوسرے نقطۂ خیال کو متانت و سنجیدگی اور واقفیت و معلومات کے ساتھ پیش فرمائیں گے تو ہم اسے بھی ضرور شائع کریں گے۔ (مدیر)

حقیقی و ازلی قدروں کی فطرت میں بلا کی ستم ظریفی ہے۔ چند صدیاں غلط کاری میں گذر جاتی ہیں۔ اس کے بعد اصلی قدریں خود انسان کو اپنے پیدا کردہ تہذیب و تمدن پر خندہ زن کر دیتی ہیں۔ وینڈل ولکی کی کتاب "وحدت عالم" سرمایہ دارانہ تہذیب و تمدن پر حقیقی قدروں کا قہقہہ ہے۔ کل تک جو لوگ انفرادی ملکیت و مفاد کو ہی انسانی ارتقار کا محرک خیال کرتے تھے جن کے نزدیک قوم، ملک رنگ و زبان وجہ امتیاز بنے ہوئے تھے۔ وہ آج اجتماعی مفاد اور بنی نوع انسان کی بنیادی وحدت کے پرستار نظر آتے ہیں۔ دوامی قدریں جو انسانی فطرت کا خاصہ ہیں وہ انسان کے ارتقار پر اسی طرح اثر پذیر ہوتی ہیں جس طرح اجناس کی قدر اصل ان کی رسد و مانگ پر اثر انداز ہو کر اجناس کو اُن کی حقیقی اقدار کی طرف لاتی ہے۔ انسان ابدی قدروں سے دور بھٹک جائے تب غلط راستے میں اس کو اتنے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہ تھک کر دوبارہ صراطِ مستقیم کی طرف رُخ کرتا ہے۔ انسان فکر و تدبر سے کام نہ لے تو قدرت کا اس کو راہِ راست پر لانے کا یہی سخت طریقہ ہے۔ دوامی و ابدی قدروں سے انحراف کرنے کے باعث اس صدی میں بنی نوع انسان دو مرتبہ موت کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ قیامت کے مناظر سامنے آئے تب انسان کی آنکھ کھلی اور اس کو احساس ہوا کہ وحدت عالم امکان کا جزو لاینفک ہے۔ جب تمام کائنات ایک وحدت میں منسلک ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسانی برادری ایک نہ ہو۔ لیکن جب ایک ایسے ملک سے "وحدت عالم" کا نعرہ بلند ہو جہاں قومیت کے فرق نے لاکھوں حبشی نژاد انسانوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہو جس نے بحر الکاہل کے سبز و شاداب جزائر کی آزادی کو اپنے عیش و نشاط پر قربان کر رکھا ہو جو برطانیہ کے وزیر اعظم کے اس جملے پر "میں برطانیہ کا وزیر اعظم سلطنت برطانیہ کو پاش پاش کرنے کے لئے نہیں بنا تھا" سیاسی خاموشی اختیار کرے۔ تب ولکی کا یہ شاہکار مختلف اقوام کو جنگ کے دوران تک سرمایہ دار جمہوریتوں کا گرویدہ رکھنے کا ایک حربہ معلوم ہوتا ہے۔ پروانۂ آزادی یعنی اٹلانٹک چارٹر صرف مخصوص ممالک و اقوام کے لئے مخصوص

ہے۔ دوسری جنگ کے بعد اپنی مغربی حدود متعین کرنے کے متعلق ہنوز خاموش ہے۔ جنگ کے بعد اچھے دمپین حکومت فرانس کی نذر کئے جانے کے وعدے ہو رہے ہیں یہ وحدت عالم تنظیم کرنے کا انوکھا طریقہ نئی دنیا کی تخلیقی قابلیت کا کرشمہ ہے۔ ونڈل ولکی اپنی کتاب کے ۱۸۱ صفحے پر فرماتے ہیں :-

افریقہ، وسط ایشیا، دنیائے عرب، چین اور مشرق بعید کے سلسلے میں جب آزادی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تب اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تنظیم کے ساتھ نوآبادیوں کے دستور کا بتدریج استیصال کیا جائے گا۔ خواہ کوئی لفظ آزادی کے اس مفہوم کو پسند کرے یا نہ کرے لیکن یہ حقیقت ہے۔ برطانیہ اس تدریج ارتقاء کی ایک زریں مثال ہے چونکہ دنیا کے بہت سے حصص میں ہنوز نوآبادیات کا مخصوص سیاسی نظام کارفرما ہے۔ اس لئے برطانیہ کے اس کامیاب تجربے سے دول متحدہ نوآبادیات کے نظام کو تشکیل دینے میں مدد لے گی۔ اگرچہ برطانیہ نوآبادیات کے سیاسی ارتقاء اور ان کو خودمختار حکومتوں کے درجے پر لانے کی نہایت مستحسن طریقے پر سعی بلیغ کر رہا ہے۔ لیکن ہنوز برطانوی سلطنت کے معتد بہ حصوں میں نوآبادیات کا سیاسی دستور جاری ہے ...... ہم نے بھی مغربی انڈیز کی تمام اقوام کو ہنوز آزادی نہیں دی ...... آئندہ زمانے میں بہت سے سیاسی مسائل کو حل کرنا ہوگا اور مختلف نوآبادیات اور Mandates میں آزادی کی نوعیت کو مختلف صورت دینی ہوگی۔ دنیا کی تمام اقوام اس درجہ ترقی یافتہ بھی نہیں ہیں کہ ان کو فوری آزادی دی جا سکے۔ اور اگر دی بھی جائے تو وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ درحقیقت وہ خود فوری آزادی بھی نہیں چاہتیں۔ ان کی خواہش صرف یہ ہے کہ ان کے آزاد ہونے کی صرف ایک تاریخ مقرر ہو جائے اور دول متحدہ تعین کردہ وقت کا اعلان کریں۔

[illegible] صاحب کی خامی افکار کا پتہ ان کے اس خیال سے چلتا ہے کہ وہ آزادی کو

جو اُن کے دل و دماغ کی معنوی کیفیت وار تقار کا نام ہے کسی قوم کو متعینہ وقت پر مرحمت کرنا چاہتے ہیں۔ چند صفحے بعد غالباً ضمیر کے تازیانے سے متاثر ہو کر تحریر فرماتے ہیں

"انصاف سے اگر دیکھا جائے تو ہم برطانیہ سے ہندوستان کو بتدریج آزاد کرنے کے لئے پروگرام معیّن کرنے کا مطالبہ اس وقت نہیں کر سکتے جب تک کہ ہم امریکہ کے تمام باشندوں کو آزاد نہ کر دیں..... ..... فی الوقت جنگی ضرورت نے امریکہ کی رنگین اقوام کو آزادی دلائی ہے۔ ان کو اس وقت آزادی دینا ایک جنگی و فوجی ضرورت تھی۔ اگرچہ جنگ نہ ہونے کی شکل میں بھی رنگ کی تمیز اُٹھ کر رہتی لیکن اس میں تاخیر ہوتی" قدرت کا طریقہ کار دیکھئے، کوئی شے کتنی ہی تخریبی کیوں نہ ہو لیکن تعمیر کا پہلو اس میں ضرور پوشیدہ ہوتا ہے جنگ کے مصائب سے گھبرا کر بتان زرد و لال انسانی وحدت کے پرستار بن گئے اور غلاموں کو اپنے مفاد کی حفاظت کی خاطر آزادی بھی دینی پڑی۔ لیکن حکیمانہ نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ہنوز نقش انسانی ناتمام ہے اور انسان کو انسانیت کے قیام کے لئے ہنوز بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔

وینڈل ولکی امریکہ کے غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے مختلف محاذ جنگ کا معائنہ فرمانے مصر، روس، چین تشریف لے گئے تھے۔ وہاں اصحاب حل و عقد سے نہایت اہم جنگی سیاسی و اقتصادی امور پر گفتگو کی۔ ظاہر ہے کہ وہ اس گفتگو کی بابت اپنی کتاب میں نہایت مختصر و مبہم اشارے کر سکتے تھے۔ چنانچہ کتاب زیادہ تر ممالک کی عام حالت اور مختلف ممالک کے متعدد اشخاص کی صورت و سیرت پر تبصرہ ہے اور بس۔ البتہ چونکہ روس کی زندگی عام سرمایہ دارانہ ممالک کی زندگی سے قدرے مختلف ہے اس لئے ولکی صاحب نے روس کی اقتصادی و تصوری دنیا کے چند مناظر دئے ہیں جو شاید ناظرین کی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ اس خون چکاں ملک کے کارخانوں۔ اشتراکی فارموں۔ جنگی محاذوں پر ولکی صاحب نے جو کچھ دیکھا اور وہاں کے کارکنوں کے تصورات کی بابت جو کچھ معلومات بہم پہنچائی ہیں ان سے

مشفق کتاب کے ۱۷۰ صفحات میں سے ۲۴ صفحے روس پر تحریر فرمائے ہیں ان صفحات کے چند حصص کا خلاصہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ شاید یہ ان کی معلومات میں اضافہ کرے۔

"جس محاذ جنگ پر جانے کا اتفاق ہوا وہاں کے جنرل کی عمر ۴۰ سال تھی اس عمری پر وہ ۲۴ فوجی ڈویژن کمان کر رہا تھا۔ پھر جنرل کی درخواست پر میں جرمن قیدیوں سے جو اسی روز گرفتار ہوئے تھے ملا۔ ان کے جسم پر کافی لباس نہ تھا۔ ٹھڈیاں نکلی ہوئی تھیں اور سب کے سب کچھ مدقوق سے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں چند کی عمر ۵۰ سال ہوگی باقی ۱۷ سالہ لڑکے تھے۔ جنرل نے کہا "باوجود جرمن سپاہی کی زبوں حالت ہونے کے جرمن فوج بہت طاقتور ہے۔ اس کی وجہ ان کے بہتر اسلحہ ہیں۔ اسلحہ و تنظیم کے لحاظ سے جرمن فوج اب بھی دنیا کی بہترین فوج شمار ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ کا ملک ہم کو ضروری ہتھیار و اسلحہ مہیا کر دے۔ تب ہم یقیناً جرمن فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔ ہمارے فوجی نوجوان جسمانی حیثیت سے جرمنوں سے بہت بہتر ہیں۔ دوسرے ہم اپنے ملک کی حفاظت کے لئے لڑ رہے ہیں۔"

روسی سپاہی واقعی جسمانی حیثیت سے بہتر ہیں لیکن مقتول، مجروح و لاپتہ کی تعداد قریب پچاس لاکھ کے پہنچ چکی ہے۔ جنوب و مغربی روس کے تمام زرخیز علاقے جرمن قبضے میں ہیں اور وہاں کی پیداوار جرمنی جا رہی ہے۔ ان علاقوں کے مفتوح روسی باشندے جرمن کے لئے اجناس پیدا کرنے کے لئے لگا دیئے گئے ہیں۔ روس کے کارخانے ملک کا تمام کوئلہ و تیل وغیرہ اپنے صرف میں لا رہے ہیں اس لئے ایندھن کی بہت قلت ہے اور خوراک بھی کم ہو گئی ہے۔ عوام کے لئے کپڑے کا کہیں پتہ نہیں بہت سی ضروری ادویات کا نام و نشان نہیں لیکن اس تمام قلت و اقتصادی بدحالی کے باوجود روسی جمہور جنگ سے منہ موڑنے کا نام نہیں لیتے۔"

ایک ہوائی جہاز کے کارخانے میں جانے کا اتفاق ہوا وہاں آلات کی ترکی تر

لیکن تمام آلات غیر ممالک سے فراہم کئے گئے تھے۔ پچاس فی صد سے زیادہ عورتیں کام کرتی تھیں اور دس برس کی عمر تک کے لڑکے بھی تھے۔ لڑکوں سے نوجوانوں کے برابر پورے وقت کام لیا جا رہا تھا۔ ان میں متعدد ماہر مستری بھی تھے۔ ہمارے خیال کے مطابق اس کارخانے میں ضرورت سے زیادہ مزدور کام کر رہے تھے۔ ہر تیسری چوتھی مشین پر Stack Hanovite کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ ان مشینوں کے مزدوروں کو جنس کی تعداد و مقدار (Piece Work) کے مطابق مزدوری ملتی ہے۔ فیکٹری کے منیجر کو اعتراف تھا کہ روسی مزدور کی کام کی اہلیت امریکی مزدور سے کم ہے اور وہ اس کمی کو بچوں اور عمر رسیدہ عورتوں کو کام پر لگا کر پورا کرتے ہیں۔ اس فیکٹری کا سپرنٹنڈنٹ ایک ہونہار انجینیر تھا جس سے میرا حسب ذیل مکالمہ ہوا۔ (اس مکالمے میں "و" سے مراد وکی صاحب اور "س" سے مراد سپرنٹنڈنٹ ہے)

و:- آپ کی عمر اور خانگی حالات کیا ہیں؟

س:- میری عمر ۳۲ سال ہوگی۔ میں دو بچیوں کا باپ ہوں۔ معمولی سے ذرا بہتر مکان میں میری رہائش ہے اور جنگ سے قبل ایک موٹر بھی تھی۔

و:- آپ کی اور معمولی فیکٹری کے مزدور کی تنخواہ میں کیا نسبت ہوگی؟

س:- میری تنخواہ دس گنی زیادہ ہے۔

و:- اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ کو قریب ۲۰ ہزار ڈالر سالانہ ملتے ہیں۔ امریکہ میں اس قسم کے فرائض ادا کرنے کا قریب قریب یہی معاوضہ ملتا ہے۔

س:- فی الحال اشتالین دور کا اقتصادی تصور یہ ہے "ہر انسان اپنی اہلیت کے مطابق کام کرے اور اس کو اس کے کام کے مطابق معاوضہ ملے۔ جب مکمل طور سے ترقی ہو جائے گی اور ہم اشتمالیت کے دور میں داخل ہوں گے اس وقت ہمارا اقتصادی تصور یہ ہوگا "ہر انسان اپنی اہلیت کے مطابق کام کرے [illegible]

ضرورت کے مطابق معاوضہ لے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس وقت بھی مکمل اقتصادی مساوات کو نصب العین بنانا نہ ضروری ہوگا اور نہ مناسب۔

و۔ اس مشاہرہ میں سے آپ کیا پس انداز کر لیتے ہیں؟

س۔ اوّل تو میری شریک حیات بڑی فراخ ہیں۔ زیادہ پس انداز نہیں ہوتا۔ پہلے جو کچھ پس انداز کیا تھا تب ایک آرام دہ اور کشادہ مکان خرید لیا تھا اور بعد ازیں دیہات میں قطعہ خرید لیا تھا تاکہ تفریح کے۔ سیر و شکار کے خاطر وہاں قیام کر سکیں۔

و۔ خیر وہ تو ہو چکا آج کل جو پس انداز ہوتا ہے اس کا آپ کیا کرتے ہیں؟

س۔ نقدی جمع ہوتی رہتی ہے یا پھر حکومت کے بونڈ خرید لیتا ہوں۔

و۔ اس رقم کو آپ کسی ایسی مد میں کیوں نہیں لگا دیتے جہاں مزید نفع ہو؟

س۔ ایسا کرنا روس میں ممکن نہیں، اور نہ میں اس خیال کا انسان ہوں۔

و۔ اچھا یہ فرمائیے کہ کیا جذبہ آپ کی سعی ترقی کا محرک ہے؟

س۔ یہ تمغے میرے بازو پر دیکھتے ہیں۔ یہ مجھے بالشویک پارٹی اور سوویٹ حکومت کی طرف سے میرے بہتر کام کے صلے میں انعام ملے ہیں۔ تندہی سے کام کروں گا تو تعجب نہیں اس فیکٹری کا ڈائرکٹر ہو جاؤں یا پارٹی حکومت میں مجھے کوئی معقول عہدہ دے دے۔

و۔ عہد پیری میں آپ کی کون مدد کرے گا؟

س۔ کچھ تو میرا اندوختہ ہوگا اور اگر یہ کافی نہ ہوا تو حکومت میری نگہداشت کرے گی۔

و۔ کیا آپ کو کبھی یہ خیال نہیں ستاتا کہ کاش ایک ایسی فیکٹری میری ذاتی ملکیت ہوتی۔

اس پر انھوں نے مارکسی فلسفہ پر ایک مختصر سی تقریر کر دی۔

و۔ [illegible] آپ کے گھر والوں کی آئندہ زندگی کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا

آپ کی یہ خواہش نہیں کہ آپ کی اولاد آپ کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر زندگی بسر کرے ؟ کیا آپ کسی اچانک حادثہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی شریک حیات کے لئے کوئی انتظام کر رہے ہیں ؟

س :۔ شکریہ، آپ سرمایہ دارانہ طریقہ خیال کا اظہار فرما رہے ہیں۔ دیکھئے میں نے اپنی زندگی مزدور کی حیثیت سے شروع کی میرے بچے بھی اسی طرح زندگی شروع کریں گے۔ میری شریک حیات خود کام کرتی ہے اور تنخواہ پاتی ہے۔ جب تک اس کی صحت جواب نہ دے گی۔ وہ برسرکار رہے گی۔ اس کے بعد اس کا بار حکومت پر ہوگا۔

و :۔ اگر آپ اس عہدہ کی ذمہ داری پوری قابلیت کے ساتھ انجام نہ دیں تو آپ کو کیا سزا ملے گی ؟

س :۔ میرا استیصال کر دیا جائے گا۔ (لفظ استیصال سے معمولی سزا سے لے کر قتل تک مراد ہو سکتی ہے)

و :۔ فرض کیجئے کہ امن و امان کا زمانہ ہے اور آپ کے اور ڈائرکٹر کے خوش گوار تعلقات نہ رہیں اور آپ ترک ملازمت کرنا چاہیں کیا آپ یہاں سے ترک تعلق کرنے کے بعد دوسرے کارخانے میں کوئی عہدہ لے سکتے ہیں ؟

س :۔ عام مزدور ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ میں پارٹی کا ممبر ہوں اس لئے میں بلا پارٹی کی اجازت و رضامندی کے ایسا نہیں کر سکتا۔

و :۔ فرض کیجئے کہ آپ کوئی دوسرا کام کرنا پسند کریں کیا آپ اپنا موجودہ عہدہ ترک کر سکتے ہیں ؟

س :۔ پارٹی کے عہدہ دار ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

و :۔ آپ سوویٹ حکومت کی اقتصادی و سیاسی طریقہ کار و دستور کے موافق [illegible]
فرض کیجئے کہ حکومت کے [illegible] سے آپ کا سیاسی و اقتصادی [illegible]

آپ روس میں اپنے خیالات کی تبلیغ کر سکتے ہیں؟ دس منٹ تک میں مختلف سوالات کے ذریعے کوشش کرتا رہا کہ مسٹر پرس آزادی افکار و کردار کے متعلق کچھ جواب دیں لیکن اس مسئلہ پر ان کا جواب شانوں کی حرکت کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ حقیقتاً آپ کو اپنے ملک میں کسی قسم کی آزادی نہیں ہے اس پر مسٹر پرس میں قیل قال کرنے کی نفسی کیفیت پیدا ہو گئی۔

س:۔ مسٹر وکی۔ آپ غور فرمائیں۔ میں اپنے آباد اجداد کی بہ نسبت کہیں زیادہ آزاد ہوں۔ انہیں تعلیم حاصل کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ ان کی زمین ان کے لئے زنجیر پا تھی۔ بیماری میں اُن کے علاج کے لئے کوئی نہ ہوتا تھا۔ میں اپنے خاندان کا پہلا شخص ہوں جس کو تعلیم حاصل کرنے اور زندگی میں نمایاں ہونے کا موقع ملا اور یہی میرے لئے آزادی ہے۔ آپ کو میری آزادی، آزادی نہ معلوم ہوتی ہو لیکن یہ یاد رکھیں کہ ہم اعلیٰ ترقی کی ارتقائی منازل میں ہیں۔ ہمیں سیاسی آزادی بھی کسی دن حاصل ہو جائے گی۔

و:۔ جہاں تمام اشیاء پر حکومت کا قبضہ ہو زبان سیاسی و اقتصادی آزادی کیسے ممکن ہے اس سوال پر مسٹر پرس نے مارکسی فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ذرکی فلسفہ میں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔

"جرمن امیدوں کے خلاف اور دوسرے ممالک کی توقعات کے برعکس روسی فارم اور کارخانے روس کی جنگی ضرورت کو کافی حد تک پورا کر رہے ہیں۔ میں اوسط سے ذرا بہتر فارم پر گیا۔ وہاں سب کام مشین سے ہوتا تھا۔ ۵۵ خاندان اس فارم پر بسے ہوئے تھے۔ ہر گھر میں ایک گائے تھی۔ لیکن فارم کی ملکیت میں پانچ سو مویشی تھے۔ جن میں سے ۳۰۰ گائیں تھیں۔ یہ سب بہت فربہ اور اچھی نسل کی تھیں۔ ان کے رکھنے کے لئے اچھا انتظام تھا۔ فارم پر صرف ایک نوجوان تھا۔ باقی عورتیں، بچے اور ضعیف العمر مرد کام کر رہے تھے

فارم کے نوجوان محاذ جنگ پر چلے گئے تھے۔ میں نے کام کی نوعیت و اجرت معلوم کی تو معلوم ہوا کہ فارم پر کام کرنے والوں کے کام کی نوعیت اور کام کی مدت کا باقاعدہ ضابطہ ہوتا ہے۔ اوسط درجے کے مزدور کی ایک روز کی محنت معیار ہے جس سے تمام مختلف میں نسبت قائم کی جاتی ہے اس سے نسبت قائم کرنے کے لئے قاعدے موجود ہیں مثلاً ٹریکٹر چلانے والا جو ایک خاص طول و عرض کی اراضی کے ٹکڑے پر ایک روز میں ٹریکٹر چلا دے اس کی ایک روز کی محنت اوسط درجے کے مزدور کے دو روز کی محنت کے برابر شمار کی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایک روز میں پولوں کی خاص تعداد باندھ دے تو اس کا ایک روز اوسط درجے کے مزدور کے ایک روز کی محنت سے ذرا زیادہ شمار ہوگا۔ فارم مزدوری آلات زراعت کو ڈپوسے کرایہ پر لیتے ہیں اور یہ کرایہ جنس کی شکل میں ادا ہوتا ہے۔ کسان حکومت کو جنس کی شکل میں ٹیکس بھی دیتا ہے۔ فارم پر کرایہ، ٹیکس اور تمام کارکنوں کو اجرت دینے کے بعد جو غلہ بچ جاتا ہے اس کو کارکنوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کا یہ طریقہ ہے کہ ایک مہینے میں جتنے روز جس نے محنت کی ہے اسی نسبت سے تمام افراد پر غلہ تقسیم ہوتا ہے۔ اس غلہ کو کسان بازار میں فروخت کر سکتا ہے۔ لیکن حکومت مختلف طریقے پر کسان کو مجبور کر کے یہ غلہ خود ہی خریدتی ہے۔ میرے علم میں یہ بات آئی کہ کسان کے پاس نقدی موجود ہے۔ لیکن چونکہ شہروں کی پیداوار تمام و کمال فوج کی ضرورت پورا کرنے میں صرف ہو رہی ہے۔ اس لئے کسان نقدی کو صرف نہیں کر سکتا۔ پراودا اخبار میں ایک خبر تھی۔ چونکہ ایک فارم پر سو گائیں کسی بیماری سے مر گئیں اس لئے اس فارم کے منیجر کو ذمہ دار ٹھیرایا گیا اور اس کو ۱۰ سال کی سزا دی گئی۔

اس کے بعد مسٹر ولکی صاحب نے استالین سے [illegible] گفتگو کا ذکر کیا لیکن گفتگو کی نوعیت کا کچھ ذکر نہیں۔ البتہ استالین کی حقیقت شناسی کی تعریف کی۔ دوران گفتگو میں استالین نے ولکی سے کہا "جرمن افواج میں [illegible]

اور مجھے اس امر پر بہت حیرت ہوئی کہ روس کے مقبوضہ علاقے سے جو ۴۰ فی صدی کارآمد زرعی باشندے وہ اپنے ملک میں رہ گئے ہیں ان کو کس طرح انھوں نے عملی تعاون پر آمادہ کر لیا کہ جرمن فوج اسلحہ کے استعمال میں ماہر ہے اور فوجی افسر قابل ہوتا ہے۔ جرمنی جلد تباہ نہیں ہو سکتا۔ جرمنی کو تباہ کرنے کے لئے جرمن فوج کو تباہ کرنا ضروری ہے اور جرمنی میں احساس کمتری پیدا کرنے کے لئے اس ملک پر شدید ہوائی حملے کرنے ضروری ہیں۔" میں نے یہ دیکھا کہ تمام روسی افسر نوجوان سادہ لباس میں ملبوس اور کم گو ہیں اور گوش و ہوش رکھتے ہیں نوجوان افسروں کو رکھنے سے شاید اسٹالین کا مقصد ملک کے رجحانات کی خبر رکھنا ہے۔"

مجھے یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ ۳۰ لاکھ کمیونسٹ روس کی ۲۰ کروڑ آبادی پر کس طرح حکومت کرتے ہیں۔ جنگشک کے علاقے میں مجھ پر یہ عقدہ کھلا۔ وہاں کی آبادی پچاس ہزار ہے جس میں صرف ۵۰۰ کمیونسٹ ہیں لیکن یہ اس تمام علاقے کے بہترین انسان ہیں ان میں فیکٹری کا ڈائرکٹر، فارم منیجر، حکومت کے عقل ڈاکٹر، سپرنٹنڈنٹ اسکول، علمی و ادبی لوگ اور مدرس غرض اس ملک کے یہ ۵۰۰ بہترین دماغ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے۔ وہ بہترین مکانات میں رہتے تھے۔ ان کا کلب ملک کی بہترین عمارت میں واقع تھا۔ اس قسم کے کلب ملک کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور یہ اس ادارے کا جز ہیں جس کا اسٹالین ہنوز جنرل سکریٹری ہے چونکہ کمیونسٹ پارٹی کے ہر فرد کا ذاتی مفاد پارٹی کے مجموعی مفاد سے وابستہ ہے۔ اس لئے ہر شخص اپنے ذاتی مفاد کے لئے کمیونسٹ پارٹی کو برسر اقتدار رکھنے پر مجبور ہے اور وہ اس میدان میں عملی سعی کرتا ہے۔ اس طرح ۳۰ لاکھ کمیونسٹ تمام روس پر حکومت کرتے ہیں۔"

اکثر یہ دریافت کیا جاتا ہے۔ روس جنگ کے بعد کیا کرے گا؟ کیا یہ از سر نو دنیا کے امن میں خلل ڈالے گا۔ کیا روس جنگ کے بعد ایسی شرائط پیش کرے گا کہ یورپ میں امن قائم کرنا ناممکن ہو جائے گا؟ کیا روس یہ سعی کرے گا کہ مارکس کا فلسفہ و اشتراکی نظام دوسرے ممالک میں رائج

ہو جائے ، صفائی کے ساتھ عرض کر دوں کہ ان سوالات کا جواب کوئی نہیں دے سکتا یہاں تک کہ سٹالین خود بھی نہیں دے سکتے۔ ان حالات میں بڑا مضحکہ خیز ہوگا کہ اگر میں روس کے آئندہ رویہ کی بابت اظہار رائے کروں۔ البتہ مجھے یہ علم ہے کہ روس میں بیس کروڑ صحت مند باشندے آباد ہیں اور ان کے پاس دنیا کا سب سے بڑا رقبہ ہے جس میں لکڑی ، کوئلہ ، لوہا ، تیل کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے ۔ ہم ایسے ملک کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہم روس کو اہمیت دینے پر مجبور ہیں ۔ اس لئے میں روسیوں اور اپنے ہم وطنوں سے کہتا ہوں کہ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں "

اگرچہ وکی صاحب دنیا کو یہ باور کرانے کی سعی فرما رہے ہیں کہ ان کو روس کے رویہ کا علم نہیں لیکن سیاسی نظر رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ اگر سرمایہ دارانہ جمہوریتوں کو روس کے آئندہ مفید رویہ کا علم نہ ہوتا اور وہ اپنی طاقت کو اتنا نہ پاتے کہ روس کو اس رویے پر رہنے کے لئے مجبور کر سکیں گے ، تب مغربی یورپ میں محاذ قائم نہ ہوتا اور جرمنی پر اس شدت سے ہوائی حملے نہ ہوتے کومنٹرن کا استیصال مذہب کی شکل میں رجعی تصورات کی آزادی - بین الاقوامی نغمے میں رجعی ترمیم - روس کے با اثر اخبار میں جنگ کے بعد گولڈ اسٹینڈرڈ قائم کرنے کی حمایت یہ سب علامات ہوا کے رخ کا پتہ دیتی ہیں اور نہ صرف روس کے حکومتی طبقہ بلکہ سرمایہ دار جمہوریتوں کو بھی اس کا علم ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کے مختلف ممالک کی تنظیم کس طرح ہوگی اور ہر ملک کی سربر آوردہ جماعت کے مفاد کو کس طرح برقرار رکھا جائے گا۔

محمد مسعود جوہر

سوویٹ اسکولوں کے تنظیمی تجربات

آج کل دنیا کا قریب قریب ہر ملک عموماً اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والے بدنصیبوں کا ملک ہندوستان خصوصاً اس بحرانی دور سے گذر رہا ہے کہ الامان و الحفیظ۔ اگر جنگ کے بعد اور پھر اس کے بعد بھی رہنمایانِ ملت کا نصب العین دھوتیں دینا اور قبول کرنا ہی رہا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان اس منزل سے نکل جائے گا بلکہ غالباً وہ دور آئے گا جس کے خیال سے اہلِ دانش و بینش ہوش و حواس کھو بیٹھیں تو کم ہے۔

میرا ایمان ہے کہ بے انتہا خوش نصیب ہیں وہ قومیں جو ہم دوشِ زمانہ چلتی ہیں روس بھی ایسے ہی خوش نصیب اور دور بیں انسانوں کا مرکز ہے جو چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے طریقوں سے بذریعۂ تجربات روس کے کم سن بچوں میں عزم بلند، جذبۂ آزادی، قوم پرستی، حب وطن تنظیم اور ملک و قوم کے ساتھ ایثار و وفاداری اور دشمن کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ منجملہ ان کے دوررس نتائج پیدا کرنے والی ایک اسکیم روسی مدارس میں تنظیم قائم رکھنے کی ہے۔ روس کے ماہرینِ تعلیم تنظیم قائم کرنے کے سلسلے میں جنگ کے پہلے تک بہت سے تجربات کر چکے ہیں جو دلچسپ اور مفید کار ہیں۔ ان ہی مختلف تجربات کو اجمال کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ انقلاب روس کے بعد دوسرے شعبوں کی طرح مدارس میں بھی شروع شروع بدنظمی پھیلی رہی مگر جوں ہی تمام روسیوں نے دوسرے شعبوں کی طرح جلد ہی اسکولوں میں بھی تنظیم قائم کرلی۔ ابتداءً تنظیم قائم کرنے کے لئے وہی زدوکوب کا آسان مگر قابلِ نفرین طریقہ عمل میں لایا گیا۔ لیکن ماہرینِ تعلیم اور بڑے بڑے حکما، جلد ہی متاثر ہوئے اور جسمانی سزا کو قانوناً بند کر دیا گیا۔ کیونکہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس سے نہ صرف نشوونما اور صحت

پر برا اثر پڑتا ہے بلکہ افادیت کے مقصد کی تکمیل کے لحاظ سے بھی بالکل بے کار ہے، نیز یہ نقصان رونما ہوتا ہے کہ لڑکے زیادہ شریر و گستاخ، بے شرم اور ضدی بن جاتے ہیں۔

۲۔ دوسرا تجربہ اس طرح کیا گیا کہ لڑکوں کو انہی کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا اس سے یہ ضرور ہوا کہ فطری شوق جن میں موجود تھا اور اتفاقاً پٹ کر ضد میں بگڑ جاتے تھے فطرت صالحہ، فطانت اور روشن ضمیری سے بہت جلد کافی ترقی کر گئے۔ مگر بے فکر اور شریر طلبا کی مفسدہ پردازیاں حد سے متجاوز ہو گئیں۔ اس لئے یہ تجربہ بھی ناکامیاب رہا۔

۳۔ تیسرا تجربہ یہ تھا کہ جو خود شوق کا مظاہرہ کریں ان سے کچھ تعرض نہ کیا جائے لیکن بد شوق اور بلید الذہن لڑکے پیٹے جائیں اور ان کے لئے خاص طور پر جسمانی سزا کی اجازت لے لی جائے۔ لیکن اس سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جو قدرتاً غبی تھے مفت میں پٹتے تھے اور ان غریبوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ چوتھا تجربہ سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا اور ہر طرح کامیاب رہا یہی وہ طریقہ عمل ہے۔ جس پر آج تک سوویٹ یونین کے مدارس میں عمل ہوتا رہا جو طلبا فطرۃً غبی تھے ان کو صنعتی درسگاہوں میں بھیج دیا گیا اور بعد میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں معمولی تعلیم کے بعد دستکاری اور مشین چلا کر حرفے کا کام سکھایا جاتا تھا۔ یہاں کے اساتذہ صنعت کے کاموں میں بڑے ماہر تھے اور ان کو ریاست کی طرف سے خاص مراعات دی جاتی تھیں جو کم کند ذہن تھے اُن کے دماغ کا علاج کیا گیا اور بد ذوق لڑکوں کا یہ علاج کیا گیا کہ ان کے والدین کو نشیب و فراز سمجھا کر اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ ان ہی کی بہبودی کے لئے بغیر جسمانی ضرب یا نقصان پہنچائے ہوئے استاد جو کام چاہیں اُن سے لے سکیں اور حسب مرضی سلوک روا رکھیں۔

ہمارے ہاں مدرسے میں داخل کرنے کے بعد نہ والدین و اقارب بچے کی خبر لیتے اور نہ مدرسین ان کو تکلیف دینے کی ضرورت محسوس کرتے نہ خود خاص مواقع و مقامات اشارۃً

کالمعدوم کے بمصداق ہیں) والدین اور اساتذہ کے باہمی مشوروں سے ایسی ایسی مفید باتیں معلوم ہوں جو دور رس نتائج پیدا کریں اور ایسی مفید اصلاحیں ہو سکیں کہ سطحی نظر سے ان کی تہہ کو پہنچنا محال ہے۔ بہرحال جب والدین نے اپنی مرضی کا اظہار کر دیا تو ان لڑکوں کے لئے ہر درس گاہ میں ایک خفیہ رجسٹر، جاسوس و منتظم لڑکوں کا گروہ (Prefects) اور ایک خاص شریروں کا کلاس قائم ہوا۔

خفیہ رجسٹر میں شریر طلبا کے ناموں کے سامنے والدین سے دریافت کر کے ایک خانے میں وہ وہ چیزیں اور نام لکھ لئے جن سے وہ متنفر تھے اور ایک میں وہ چیزیں اور غذائیں جو ان کو مرغوب تھیں۔ اس کے بعد ان لڑکوں کو شریروں کے کلاسوں اور ہوسٹلوں میں اس طرح رکھا گیا کہ باہر والوں کو ان سے ملنے کا موقع نہ ملے اور ایک وقت میں علاوہ کلاس کے کسی مقام پر تین لڑکوں سے زیادہ جمع نہ ہوں۔ پھر جس کام سے انھیں نفرت تھی انفرادی طور پر ہر ایک سے وہی کام کرایا جاتا تھا اور ناپسند ناموں سے ان کو پکارا جاتا عدم تعمیل کی صورت میں کھانا بند کر دیا جاتا جو شرارت سے باز آ کر سیدھے راستے پر لگ جاتا اور محنت کرنا شروع کر دیتا۔ اس کو مرغوب غذائیں دی جاتیں اور منتظمین (Prefects) کی انجمن میں اس کا انتخاب ہو جاتا۔ یہی انجمن تادیبی سزائیں نیز انعامات دہی دیا کرتی تھی اور تادیب و تنبیہ اور مشاورت میں ماہرین تعلیم کا ہاتھ بٹاتی۔ جس طالب علم کے خلاف کوئی شکایت نہ رہتی اس کو باہر کے عام اسکولوں میں بھیج دیا جاتا۔

اس سے صنعت اور تعلیم دونوں شعبوں نے کافی ترقی کی اور سوویٹ روس کے مدارس میں بتدریج ایسی باقاعدہ تنظیم قائم ہو گئی کہ معائنہ کرنے والے بغیر جسمانی سزا کے اسکولوں کی اس باضابطہ تنظیم کو دیکھ کر نہ صرف حیرت بلکہ دوسرے ممالک سے مقابلہ کر کے رشک کرتے تھے اور ہر ملک کے باشندے روسی ماہرین تعلیم سے مل کر ان تجربات کی بابت معلومات بہم پہنچاتے جن کا نتیجہ یہ تنظیم تھی

ایس ایم عبداللہ سالک الہاشمی

روس میں کتابوں کی اشاعت

آج کل روس میں کتابوں کی بے حد مانگ ہے اور اس میں کوئی موضوع کی تخصیص نہیں۔ ہر قسم کی کتابیں بے شمار چھپی ہیں اور شائع ہوتے ہی چند روز یا ہفتوں میں فروخت ہو جاتی ہیں دنیا میں روس ہی ایسا ملک ہے جہاں کتابیں پڑی نہیں رہ جاتیں۔

۱۹۳۶ء میں ۱۹۱۳ء سے ۵۳ فی صدی زیادہ کتابیں شائع ہوئیں اور ان کی تقسیم آٹھ گنی ہوئی۔ یہ اضافہ کچھ تو آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا لیکن اس کا تناسب بہت کم ہے۔ شہنشاہیت کے زمانے میں کتابوں کی اشاعت کا تناسب ۰٫۷ فی کس تھا ۱۹۳۶ء میں یہ تناسب چھ گنا بڑھ کر ۴٫۱ فی کس ہوگیا۔ ذیل کی فہرست سے ۱۹۱۳ء سے ۱۹۳۶ء تک کتابوں کی اشاعت میں تدریجی ترقی کے اعداد معلوم ہو سکتے ہیں۔

	۱۹۱۳ء	۱۹۱۸ء	۱۹۲۸ء	۱۹۳۶ء
کتب ہزار	۲۶٫۲	۵٫۱	۳۴٫۲	۴۰
تعداد اشاعت دس لاکھ	۸۶٫۷	۴۹٫۶	۲۶۵	۶۹۲٫۷

۱۹۳۶ء کے اعداد شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سال ۴۳٫۸۰۰ کتابیں چھپیں اور ان کی مجموعی اشاعت ۰۰۰،۰۰۰ر۷۰۱ ہوئی۔ روس کی اقلیتوں کی زبانوں میں کتابوں کی اشاعت بہت بڑھی۔ انقلاب روس کا یہ زریں کارنامہ ہے۔

زار کے زمانے میں کتابیں ۴۹ زبانوں میں شائع ہوئی تھیں لیکن ان کی بیشتر تعداد روسی زبان میں چھپتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری زبانوں میں جو کتابیں شائع ہوئی تھیں وہ مذہبی موضوعات پر لکھی جاتی تھیں اور ان کی تقسیم عوام میں کم ہوتی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں [illegible] موضوع پر کتابیں چھپیں اور اس وسیع ملک کے طول و عرض

میں ہر جگہ پہنچ گئیں اس کے لئے روسی ماہرین تعلیم نے چالیس اقلیتوں کی زبان کو مرتب اور منضبط کیا تھا۔

ان کارناموں کی اہمیت کو سمجھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ روس کی قومی حکومت سے پہلے کے حالات کا جائزہ لیا جائے شہنشاہیت کے زمانے میں روسی اقوام مقید تھیں تمام اقوام کی تہذیب و تمدن کو مٹایا جا رہا تھا۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ جملہ قوموں کو روسی رنگ میں رنگا جائے اور اس غرض سے کسی دوسری زبان میں کتابوں، رسالوں اور اخبارات کی اشاعت ممنوع تھی۔ اور اس قانون کی زد سے بچنے کے لئے لوگوں کو بڑی ترکیبوں سے کام لینا پڑتا تھا

زار کے زمانے میں کرغیزیا میں دو سو میں صرف ایک شخص خواندہ تھا۔ بہت سے گاؤں میں کوئی بھی لکھا پڑھا نہیں تھا۔ اور عام لوگ نشان انگوٹھا لگاتے تھے۔ قزاخستان میں حالت کچھ بہتر تھی۔ یعنی ایک فی صدی خواندگی تھی۔ لیکن ازبکستان میں صرف ملا اور امرا خواندہ تھے۔ تعلیم نسواں کے معاملے میں روس کی حالت اس سے بدتر تھی پامیر کے علاقہ گرم کی ۸۲،۰۰۰ عورتوں میں صرف سات خواندہ تھیں انقلاب سے پہلے روس میں گرجے اور خانقاہیں تو ہزاروں کی تعداد میں تھیں۔ لیکن کالج اور یونیورسٹی ایک بھی نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روس کی تین چوتھائی آبادی کی جہالت کی یہی وجہ تھی۔ ایونکس، لسی، خانتے، مانسی اور دوسری چھوٹی قومیں جاہل مطلق تھیں۔ انقلاب نے ان کی جہالت کو دور کیا۔

۱۹۵۳ء میں روس میں ۱۰۹ یونیورسٹیاں کالج اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر مرکز تھے جہاں ۲۰۱،۰۰۰ زیر تعلیم تھے۔ یہ تعداد یورپ کی تمام یونیورسٹیوں کے طلبا کی مجموعی تعداد سے بھی زیادہ ہے۔ کرغیزیا، قزاخستان، ازبکستان اور جنوب بعید جگہ اعلیٰ تعلیم پانے والوں کی کافی تعداد ہے۔ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہو گا کہ موجودہ روسی

تعلیم کا کتابوں کی اشاعت پر کیا اثر ہوا۔

کتابوں کی مجموعی اشاعت (۱۰ لاکھ)

	روسی میں	دیگر زبانوں میں	میزان
۱۹۱۳	۸۰٫۲	۶٫۵	۸۶٫۷
۱۹۲۸	۲۲۱٫۴	۴۳٫۶	۲۶۵
۱۹۳۳	۳۶۱٫۱	۱۲۸٫۴	۴۸۹٫۵
۱۹۳۸	۵۴۵٫۷	۱۴۷	۶۹۲٫۷

کتابوں کی اشاعت دس لاکھ

ریاست	۱۹۱۳	۱۹۲۸	۱۹۳۸
روس	۶۰٫۶	۲۰۸٫۵	۵۳۵
یوکرین	۴٫	۲۲٫۲	۶۲٫۴
بیلو روس	× ×	۱٫۸	۱۲٫۳
آذربیجان	۱٫	۱٫۷	۷٫۶
جارجیا	۴٫	۲٫۲	۶٫۲
آرمینیا	۴٫	۱٫۱	۵
ترکمن	× ×	٫۳	۲٫۴
ازبک	٫۱	۱٫۹	۱۰٫۷
تاجک	× ×	٫۳	۳٫۳
قزاخ	٫۰۰۱	۱٫۵	۶٫۵
کرغیز	[illegible]	٫۲	۲٫۵

۱۹۱۳ء میں جتنی کتابیں روس میں چھپیں ان میں سے نصف ماسکو سے شائع ہوئیں

چوتھائی مِن گراڈ سے اور باقی صوبجات سے نکلیں۔ کئی ادارے جن میں ذاتی مطبع بھی شامل ہیں۔ کتابیں شائع کر رہے تھے۔ ان سب کا کتابوں کی اشاعت میں جو حصّہ تھا وہ ذیل میں درج ہے۔

سرکاری محکمے	۲۲ / ۹	فی صدی
سرکاری دار الاشاعت	۱۵ / ۳	"
کمیونسٹ جماعت	۱۲ / ۸	"
ذاتی مطبع	۸ / ۳	"
تجارتی انجمنیں	۷ / ۸	"
امدادِ باہمی جماعتیں	۵ / ۲	"
دیگر ادارے	۵ / ۶	"

[illegible]ء میں طریقۂ اشاعت کی نئی تنظیم کی گئی۔ بڑے بڑے دار الاشاعت سرکاری دار الاشاعت گوس ذت (Gosizdat) یا گز کے ساتھ شامل کر دئے گئے اور اوگز (Ogiz) ریاست کے ناشروں کا وفاق بن گیا۔ اس میں سائنس، جملہ علوم، زراعت، ادبیات، اخلاقیات اور قصے کہانیاں غرضیکہ ہر موضوع پر کتابیں شائع ہوتی ہیں ہر دار الاشاعت کو کتابوں کے انتخاب اور ترتیبِ کار میں کافی آزادی حاصل ہے۔ لیکن ایک مرکزی ادارے کے ذریعے سے انھیں کاغذ ملتا ہے اور یہی مطبعوں کو بھی چُنتا ہے
مالیات، فروخت اور طریقِ کار، اوگز کے انتظامی بورڈ کے سپرد ہیں۔ [illegible]ء تک ۳ فی صدی تجارت ذاتی مطبعوں کے ہاتھ میں تھی لیکن اس نئی تنظیم سے یہ ختم ہو گئی ہے۔

پانچ دار الاشاعت

[illegible] کے پانچوں دار الاشاعت محکمۂ تعلیم کے ماتحت قائم ہیں۔ ہر دار الاشاعت

کے ایک خاص موضوع سپرد ہے۔ یہ پانچ موضوع ادب، معاشیات، درسی کتابیں بچوں کی کتب اور علمی کتابیں ہیں۔

دارالاشاعت ادب کا صدر لے لوزووسکی (A. Lozovsky) ہے اس کی کتاب مارکس اور تجارتی یونین (Marx and the Trade Unions) کا ترجمہ انگلستان میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکا ہے اس نے موجودہ جنگ کے آغاز میں روسی محکمۂ اطلاعات اور غیر ملکی اخبارات کے درمیان تعاون اور اشتراک قائم رکھنے کی خدمات بھی انجام دی تھیں۔

اس دارالاشاعت میں ہر سال اوسطاً بارہ ہزار مسودے موصول ہوتے ہیں جنہیں ہم ان کی جانچ کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسودہ مسترد ہو جائے تو اس کی داد محکمۂ تعلیم تک ہو سکتی ہے تمام مصنفین کو تعمیری مشورے دئے جاتے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی تصنیف کو بہتر بنا کر معیار پر لایا جائے۔ جن کے مسودات منظور کرلئے جاتے ہیں انھیں ان کے مرتبے کے مطابق ۰۰۰ ۰۰ ۴۰ حرفوں کے لئے چھ سو سے پندرہ سو روبل تک مل سکتے ہیں۔ چوتھائی معاوضہ مسودہ منظور ہوتے ہی مل جاتا ہے۔ سرکاری طور پر کوئی محکمۂ احتساب نہیں۔ لیکن دارالاشاعت اشتراکیت کے خلاف پروپیگنڈا روا نہیں رکھتے مگر تعمیری تنقیدیں عام طور پر ہوتی رہتی ہیں۔

چند نوجوان روسی مصنفین کی کتابوں کی بے شمار اشاعت ہوتی ہے۔ ذیل کے اعداد و شمار سے اردو کے مطبعوں اور مصنفوں کو بہت حیرت اور رشک ہوگا۔

مصنف	زمانہ	اشاعت	کتنی زبانوں میں اس کی کتابیں شائع ہوئیں
ایم اے شولوخوف M.A. Sholokhov	۱۹۲۵ تا ۱۹۳۹	۰۰ [illegible]	۳۶

مصنف	زمانہ	اشاعت	کتنی زبانوں میں ان کی کتابیں شائع ہوئیں
اے۔ایس سیرافیموچ A. S. Serafimovich	۱۹۱۷ تا ۱۹۳۸	۶,۹۰۴,۹۰۰	۳۷
اے۔ایس نوفیکوف پربائی	۱۹۱۷ تا ۱۹۳۸	۵,۸۰۶,۹۰۰	۲۱
اے۔این۔تالستائی	۱۹۱۷ تا ۱۹۳۸	۵,۳۲۸,۲۰۰	۱۹
اے۔اے۔فدیف	۱۹۲۷ تا ۱۹۳۸	۳,۹۰۵,۷۰۰	۴۵
این۔اے۔آسٹرووسکی	۱۹۳۲ تا ۱۹۳۸	۳,۷۷۰,۰۰۰	۳۲
ڈی۔اے۔فرمانوف	۱۹۲۳ تا ۱۹۳۸	۳,۱۰۷,۰۰۰	۳۶
ایف۔وی۔گلیڈکوف	۱۹۲۱ تا ۱۹۳۷	۲,۰۲۵,۷۰۰	۲۳

چند مقبول مصنفین کی کتابوں کے ایڈیشن اور تعداد اشاعت بہت دلچسپ ہیں۔ اے۔ایم گورکی (A. M. Gorky) کی کتاب ماں 'Mother' کے پچاسی ایڈیشن نکلے۔ اور ۱,۰۵۴,۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ ایم۔اے۔شولوخوف 'M. A. Sholokhov' کی تصنیف نرم رو ڈون 'And Quiet Flows the Don' اناسی مرتبہ شائع ہوئی اور ۴,۳۲۴,۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ این۔اے۔آسٹرووسکی نے انقلاب روس اور اشتراکی جماعت کی ترقی پر فولاد کس طرح ڈھالا گیا کے عنوان 'How the Steel was forged'.

سے کتاب لکھی جو انگلستان میں ہیرو کی تشکیل 'The Making of a Hero'
کے نام سے چھپی تھی۔ اس کے ایک سو اٹھاون ایڈیشن نکلے اور ۲،۲۰۶،۰۰۰ جلدیں چھپیں
اے۔ ایس۔ نوفیقوف پریبائی کی روسی جاپانی جنگ پر سوشیما 'Tsushima' نامی کتاب
کے ستاون ایڈیشن نکلے اور ۲،۱۰۴،۰۰۰ جلدیں چھپیں۔ اس فہرست میں اور بھی اضافہ
ہو سکتا ہے۔

انقلاب کے ابتدائی زمانے میں لینن نے روسی تعلیم پر بہت موثر بیان دیا تھا جسے
ہر دارالاشاعت نے پیش نظر رکھا ہے۔

"سرمایہ داری نے جو تہذیب چھوڑی ہے اس سے ہمیں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے،
اور اس سے اشتراکیت کی تعمیر میں مدد لینی چاہیے۔ ہم کو تمام علوم، فنون اور طریقہ کار کو اختیار
کرنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر ہم اشتمالی سماج کی صحیح تشکیل نہیں کر سکتے۔"

اسی اصول پر روسی اور دیگر فلسفیوں کی کتابوں کے بڑے بڑے ایڈیشن نکالے
گئے ہیں۔ والٹیر، ہیگل اور دیڈرو 'Diderot' کی کتابیں لاکھوں اور ارسطو، بیکن
ہلویشیش (Helvitius)۔ ہولباخ Holbach ڈیکارٹ Descartes
ڈیماکرٹیس (Democritus)۔ سپنوزا Spinoza اور فیور باخ (Feuerbach
کی تصانیف ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاروِن، نیوٹن، پاسچر، آئینسٹائن،
لیبنٹز (Leibnitz) لوباچوسکی Lobachevsky۔ لومونوسف Lomonosov
منڈلیف Mendeleev۔ مکنیقوف Mechnikov۔ پَیلوف Pavlov
سیچینوف Sechenov۔ تمریاسوف Timiryasov جیسے سائنس دانوں کی
تصانیف بہت مقبول ہوئیں۔ ۱۹۱۷ء سے پہلے پاسچر اور آئینسٹائن کو روس میں کوئی
بھی نہیں جانتا تھا۔

مغربی ادیب کو بھی روس میں بہت مانگ ہے۔ ۱۹۱۷ء-۱۹۳۰ء کے زمانے میں وکٹر ہیوگو

کا نمبر اول رہا۔ اس کی کتابیں ۳،۲۸۰،۰۰۰ کی تعداد میں ۲۴ زبانوں میں چھپیں۔ ماپساں دوسرا نمبر ہے۔ اس کی کتابوں کی اشاعت ۳،۰۴۲،۰۰۰ تیرہ زبانوں میں ہوئی۔ زولا کی کتابوں کی ۲،۰۰۰،۰۰۰ سے زیادہ اشاعت ہوئی۔ بلزاک، بازلس، ڈکنس رومیں، رولاں، اناتول فرانس اور شیکسپیر کی کتابیں بھی دس، دس لاکھ سے زیادہ چھپیں۔

علوم و فنون کی کتابیں ۱۹۳۸ء میں ۱۹۱۳ء سے ۱۲ گنی شائع ہوئیں۔ اسی سال بچوں کی ۱۵۲۰ کتابیں لکھی گئیں اور ان کی اشاعت ۵۰،۹۰۱،۰۰۰ ہوئی۔ نیز درسی کتابوں کی ۱۶۲،۱۰۰،۰۰۰ جلدیں روس کی تمام زبانوں میں شائع ہوئیں۔

روس میں لڑائی شروع ہونے سے کاغذ کی کچھ کمی پڑ گئی ہے۔ بہت سے لکھنے والے محاذ جنگ پر چلے گئے ہیں یا شہروں میں کسی جنگی کام پر لگے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود جون ۱۹۴۲ء تک ۳۵،۰۰۰ کتابیں شائع ہوئیں اور ان کی مجموعی اشاعت ۶۷۳،۰۰۰،۰۰۰ ہوئی۔ ان میں سے نصف سے زیادہ جنگ کے متعلق تھیں۔ اسٹالین کے بیانات اور تقریریں ۶۰،۹۱۵،۰۰۰ کی تعداد میں ۶۳ زبانوں میں شائع ہوئیں۔

۱۹۴۲ء میں ناولوں کا روسی زبان میں پچاس زبانوں سے ترجمہ ہوا جارجی میں دس سے۔ بائیلو روس، اُزبک اور تاجک میں نو زبانوں سے ترجمے کی گئیں۔ پشکن کی تصانیف کا ۷۰ زبانوں میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں یہ پہلی مرتبہ آوار ([illegible]) اور چوکوت ([illegible]) میں شائع ہوئیں۔

ان تمام اعداد سے ظاہر ہو گا کہ روسی شہنشاہوں نے کس طور سے اپنی غلام رعیت میں تعلیم نہیں پھیلنے دی۔ لیکن سوویٹ حکومت صرف ۲۶ برس سے برسرکار ہے اور اس عرصے میں اُسے خانہ جنگی، بیرونی مداخلت، قحط اور جرمن مظالم اور شورشوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر اس کے باوجود روسی دنیا کی جملہ اقوام سے زیادہ تعلیم یافتہ اور مہذب ہوتے جا رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جرمنی کی فتنہ انگیزیوں کا اس قدر جواں مردی اور ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور ہٹلر کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا ہے۔ مترجمہ شفقت اللہ کرمانی

کیا جنگ کے بعد قیمتیں یکبارگی کم ہو جائیں گی؟

ان معاملوں میں پیشین گوئی غلطی سے خالی نہیں ہوتی۔ قیمتوں پر سینکڑوں اسباب اور حالات اثر ڈالتے رہتے ہیں اور ان سب کے بارے میں یقینی طور پر یہ فیصلہ کرنا کہ ان کی صورت آئندہ کیا ہوگی بہت مشکل ہے۔ لیکن موجودہ قرائن سے جہاں تک اندازہ کیا جا سکتا ہے تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیمتیں ضرور کم ہوں گی۔ شاید یکبارگی اتنی کم ہو جائیں جتنی جنگ سے پہلے تھیں۔ شاید ان سے بھی زیادہ کم ہو جائیں۔ لیکن اتنی کم نہ بھی ہوئیں تب بھی بہت خاصی کم ہوں گی۔ اگر کمی دفعتہً بہت زیادہ ہوئی تو وہ دیرپا ثابت نہیں ہوگی۔ قیمتیں پھر سنبھالا لیں گی اور اگر اس زمانے میں تعمیر نو کا کام شروع ہو گیا جس کی کہ بہت امید ہے تو ان کا میلان بعد میں برابر اضافہ کی طرف رہے گا۔

اس کی دلیلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

جنگ سے پہلے نوٹوں کی تعداد دو ارب روپیہ سے کم تھی۔ اب یہ تعداد دس ارب روپیہ سے زیادہ ہے۔ جنگ کے زمانے میں حکومتِ ہند اور اتحادی حکومتوں کی طرف سے بے انتہا رقمیں ہندوستان کے اندر خرچ کی جاتی رہی ہیں۔ جنگ کے خاتمے پر ایک طرف تو جنگ کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے جتنا خرچ اب کیا جا رہا ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ دوسرے جب اتحادی حکومتیں اپنی فوج کو واپس بلا لیں گی تو ان فوجیوں کی خریداری کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ تیسرے حکومت ہند نے جنگ کے پیمانے کو سامنے رکھ کر اپنے معمولی اخراجات میں جو اضافہ کیا ہے اس میں بھی کمی کرنا ہوگی۔ چوتھے سپلائی کے محکمے کی طرف سے جو ٹھیکے دئے جا رہے ہیں وہ بھی باقی نہیں رہیں گے بلکہ ان میں تو ابھی سے کمی ہونے لگی ہے۔ پانچویں جب موجودہ جیس اکھر فوج میں سے کہتے کم ۱۲،۱۳ لاکھ

کو برطرف کیا جائے گا اور انتظامی خدمات میں سرکاری ملازموں کی جو بڑی تعداد اس وقت معروف ہے اس کو تخفیف کیا جائے گا تو اس کا اثر بھی خریداروں کی کمی کی صورت میں ظاہر ہوگا جب جنگی خرچ کم ہوگا تو اس کا مجموعی اثر صنعتی مزدوروں اور دوسرے ان لوگوں پر جو اس وقت جنگی صنعتوں میں کام کر رہے ہیں اور جن کا دارو مدار حکومت کی فرمائشوں پر ہے ضرور پڑے گا کہ ان میں بھی بے روزگاری پیدا ہوگی۔ غرض جب قوتِ خرید کے یہ تمام سوتے سوکھ جائیں گے تو پوری معیشت پر اس کا بہت تباہ کن اثر پڑے گا۔ قیمتیں اتنی گر جائیں گی کہ کوئی کام نفع بخش نہیں رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ محض صلح کے قریب ہونے کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی نفسیاتی کیفیت بدل جائے گی۔ رجائیت کی جگہ ان میں قنوطیت پیدا ہو جائے گی۔ اور قیمتوں میں عاقبت اندیشانہ زوال شروع ہو جائے گا۔

اس کی مخالفت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے لوگ جو اب راشن بندی اور کنٹرول کی وجہ سے مال نہیں خرید سکتے ہیں اور جن کے پاس جنگ کے زمانے میں روپیہ خوب اکٹھا ہو گیا ہے وہ خوب خرچ کریں گے۔ لوگ مکانوں اور اپنے ساز و سامان کی مرمت اور تجدید بھی کرائیں گے وغیرہ وغیرہ لیکن ان وجوہ سے مال کی جو طلب پیدا ہوگی اس کی مقدار مجموعی طور پر جنگ کے مصارف کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔

دوسری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ غیر ملکوں میں چونکہ قیمتیں اضافہ کی طرف مائل ہوں گی اس لئے ہندوستان کو بھی ان کی دیکھا دیکھی اپنی قیمتیں بڑھائے رکھنا ہوں گی لیکن غیر ملکوں میں دو طرح کے ملک ہیں۔ ایک تو یورپ کے مہذب ملک ہیں جہاں جنگ کے دنوں میں حکومت کی طرف سے قیمتوں پر کڑی نگرانی رکھی گئی ہے اور انہیں بہت کم بڑھنے دیا گیا ہے اور جن کی رعایا نے حب الوطنی کے جذبے کے تحت بہت سی قوت خرید جنگ کے بعد خرچ کرنے کے لئے پس انداز کی ہے۔ جب جنگ کے بعد اس قوت خرید سے کام لیا جائے گا تو ان ملکوں میں قیمتیں جنگ کے مقابلے میں مزید بڑھیں گی اور جب ان کے

باشندے باہر کے ملکوں سے مال منگائیں گے تو وہاں بھی قیمت کے بڑھانے کا موجب ہوں گے۔ لیکن ہندوستان میں باہر کے ان لوگوں کی قوت خرید کا اثر جنگ سے موجودہ حد کے مقابلے میں بہت کم پڑے گا اس لئے ہندوستان کی قیمتوں کو تو باہر کے ان لوگوں کی زیدطلب کے باوجود موجودہ سطح سے نیچے اُترنا ہی پڑے گا۔ رہ گیا ایشیا کے پس ماندہ ملکوں کا معاملہ جن کی قیمتیں جنگ کے زمانے میں ہندوستان سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہیں سو ان کی قیمتوں میں تو لازماً کمی ہوگی اور شاید بہت تیزی کے ساتھ ہوگی۔

اس کے علاوہ اگر اس کوشش کو بھی سامنے رکھا جائے جو جنگ کے بعد غیر ممالک اپنے مال کو ہندوستان میں فروخت کرنے کے لئے کریں گے تو اس کی وجہ سے بھی ہندوستانی صناعوں کو اپنی قیمتیں مجبوراً کم کرنا پڑیں گی۔

ہندوستان کے وزیر مالیات نے بھی اس سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے اپنی افتتاحی تقریر میں اس طرف اشارہ کیا تھا۔ لیکن انھوں نے قیمتوں کی اس کمی کو کچھ زیادہ اندیشہ ناک قرار نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ آیا جنگ کے بعد زمانے میں قیمتوں کو ان کی موجودہ سطح پر قائم رکھنا ضروری ہوگا انھوں نے کہا تھا میں اسے (یعنی قیمتوں کے قائم رکھنے کو) ایک غلط خیال سمجھتا ہوں جنگ کے بعد جب قوم کی دولت آفرینی کی قوت جنگ کے سامان تیار کرنے کی جگہ امن کے سامان تیار کرنے پر لگائی جائے تو چیزوں کی بہت زیادہ رسد فراہم ہو سکے گی۔ اور اس زیادہ رسد کا میری رائے میں یہ نتیجہ ہوگا کہ ان چیزوں کی قیمت کم ہو جائے گی۔ لیکن اگر جنگ کے بعد اس معاشی مصروفیت کو جسے جنگ کے زمانے میں شروع کیا گیا تھا۔ جاری رکھا جائے گا تو اس کی مجموعی پیداوار کے ذریعے مجموعی قومی آمدنی کو نہ صرف برقرار رکھا جا سکے گا بلکہ قیمتوں کے نزول کے باوجود بڑھایا جا سکے گا۔ جنگ کے بعد کے سالوں میں چاہا سطح پر [illegible] کی قیمتوں کو قائم رکھنا نہیں چھوڑا جاسکتا بلکہ مجموعی قومی آمدنی کو [illegible]

رکھنا چاہیے۔

وزیر مالیات کے اس بیان کا اور کچھ مطلب ہو یا نہ ہو لیکن ایک مطلب بالکل صاف ہے کہ جنگ کے بعد کو قیمتیں گریں گی اور ان کو موجودہ سطح پر قائم رکھنے کے لئے حکومت ہند کوئی خاص کوشش نہیں کرے گی

غرض اس وقت سب سے زبردست خطرہ ہندوستان میں یہ ہے کہ سرکاری مصارف کہیں یکبارگی نہ کم ہو جائیں کیونکہ اگر ایسا ہوا تو قیمتیں کاروبار اور روزگار یکبارگی بیٹھ جائیں گے۔

کیا اس خطرے کا کوئی تدارک ممکن ہے؟ کیا اس کے مضر اثرات کو کسی طرح کم کیا جاسکتا ہے؟

اس کے تدارک کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی یہ کہ موجودہ مصارف کو قائم رکھا جائے۔ اگر سرکار اپنی مجبوریوں یا مصلحتوں کی وجہ سے انھیں قائم نہیں رکھ سکتی تو نجی افراد اور کمپنیوں کو موقع دیا جائے کہ جس رفتار سے سرکاری مصارف کم ہوں اسی رفتار سے نجی مصارف اور شغل اصل کو بڑھائیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے بعد کے سالوں میں، سرکاری مصارف اور شغل اصل کا تناسب نجی مصارف اور شغل اصل کے مقابلے میں کم ہی رہے گا۔ چاہے حکومت اپنے معاشی مشاغل کو بڑھانے کا کتنا اور کیسا ہی ارادہ کیوں نہ رکھتی ہو۔ لیکن مدافعت کے بے شمار مصارف حکومت امن کے زمانے میں بہرحال جاری نہ رکھ سکے گی۔ رہیں امن کے زمانے کی اجتماعی خدمات مثلاً تعلیم حفظان صحت وغیرہ سو ان کے مصارف کو پورا کرنے کا وعدہ حکومت جب ہی کرے گی جب کہ اس کو یقین ہو کہ محصول میں اضافہ ہو چکا ہوگا۔ یہ اضافہ اسی وقت ہوگا جب نجی شغل اصل کو بڑھانے کے لئے ہر امکانی کوشش کی جائے گی۔ اس لئے شغل اصل اور روزگار کو بڑھانے کے لئے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ جنگ کے خاتمے کے فوراً بعد حکومت ....

محاصل اور دیگر محاصل اور اجرائی سرمایہ کا انتظام اس طریقے پر کرے کہ جس سے شغل اصل میں کمی کی جگہ اضافہ ہو سکے۔

اس کام میں جتنی جلدی کی جائے گی اتنا ہی زیادہ فائدہ ہوگا۔ کیونکہ اگر سرکاری مصارف کے زوال کے مقابلے میں نجی مصارف اور شغل اصل کی ترقی میں دیر لگی تو تفریط زر شروع ہو جائے گی اور اس کا مجموعی اثر نجی شغل اصل پر آئندہ کے لئے اچھا نہیں پڑ سکتا۔

اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ نجی سرمایہ داروں کو ہر قسم کا اطمینان اور بھروسہ دلایا جائے تاکہ وہ تاخیر و تذبذب کے بغیر اس خلاء کو پر کر سکیں جو حکومت کے مصارف کی کمی سے پیدا ہوگا۔ خارجی حالات کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ مشینوں اور دوسرے ضروری سامان کی درآمد میں رکاوٹیں پیدا ہوں اور عبوری دور کے نازک ترین زمانے میں نجی شغل اصل کو کام کا موقع نہ مل سکے۔ ایسا اگر ہوا تو پھر حکومت ہی کو کساد بازاری کا تدارک کرنے کے لئے سرکاری تعمیرات کا کام شروع کرنا ہوگا تاکہ مزدوروں کی بڑی تعداد کو روزگار سے لگایا جا سکے چاہے ان کاموں کے شروع کرنے سے لوگوں کی اہلیت ادائی محصول میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوتا ہو۔ سرکاری تعمیرات کی اس طرح کی اسکیموں کو نیز تخفیف شدہ سپاہیوں کو جذب کرنے کی اسکیموں کو ابھی سے تیار رکھنا چاہیے۔ ورنہ ملک کے اندر بہت زیادہ فتنہ و فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ سپاہیوں کی تخفیف کی رفتار کو دوسرے پیشوں کو جذب کرنے کی صلاحیت کے مطابق سست رکھنا ہوگا لیکن جنگ کی صنعت کو امن کے سامان تیار کرنے کے لئے جس قدر جلد تبدیل کیا جائے اتنا ہی مناسب ہوگا۔

غرض جنگ کے بعد کے عبوری دور کا سب سے اہم فریضہ یہ ہوگا کہ مجموعی شغل اصل کو جہاں تک ہو سکے موجودہ حالت پر برقرار رکھا جائے۔ اس کام میں حکومت اور نجی سرمایہ داروں کا کیا حصہ ہو اس کے بارے میں تو اختلاف رائے ہو سکتا ہے لیکن اگر روزگار کو قائم رکھنا ہے تو شغل اصل کا بصورت مجموعی موجودہ حالت پر قائم رہنا نہایت ضروری ہے۔

حالاتِ حاضرہ

غیر ممالک

جبکہ روسی اور اتحادی فوجیں جرمنی کی حدود کے باہر یا سرحد کے قریب ہی تھیں، بات سمجھ میں آسکتی تھی کہ جرمنی صلح کی بہتر شرطوں کی اُمید میں لڑائی کو جاری رکھے۔ اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا کہ آخری محاذ کہاں پر ہوگا اور روسی ایک طرف اور اتحادی دوسری طرف جرمنی کے اندر پہنچ گئے تب بھی جرمن حکومت کے لئے یہ طے کرنا مشکل ہو سکتا تھا کہ اپنی شکست کو کس موقع پر تسلیم کرے۔ لیکن اب اتحادی مغربی محاذ کو بالکل توڑ کر ڈیڑھ دو سو میل جرمنی کے اندر گھس گئے ہیں اور روہر کا صنعتی علاقہ گھیر لیا گیا ہے اور جرمنوں کو اس کی کوئی امید نہ رہ گئی ہوگی کہ مقامی جوابی حملوں کے سوا اتحادیوں کو روکنے کی کوئی تدبیر کی جا سکے گی۔ پھر جرمن ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیتے؟ جرمنی کے شہروں کو تباہ کرنے اور زندگی کے سارے نظام کو ڈھا دینے میں ان کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے؟ اور انجام میں بھی جرمنی کو وہ فتح جس کا نازی لیڈر اب تک اپنی قوم کو یقین دلا رہے ہیں کیسے نصیب ہو سکتی ہے اگر وہی لوگ جو زندگی کی از سرِ نو تعمیر کر سکتے ہیں محض ایک ضد پوری کرنے کے لئے قربان کر دیئے گئے؟

سیاست کے کام غصہ اور ضد سے بگڑتے ہیں، بنتے نہیں۔ آج کل ہی نہیں، ہمیشہ سے ہوشیار آدمیوں کا یہ طریقہ رہا ہے دشمن سے بھی میٹھی بات کی جائے، صرف اس نیت سے نہیں کہ وہ دھوکے میں رہے، بلکہ اس مصلحت سے کہ اگر ضرورت ہو تو دشمنی کی جگہ دوستی کر لی جائے اور اس کا احساس پیدا نہ ہو کہ رویئے میں کوئی تبدیلی کی گئی ہے۔ جرمن سیاست نے پہلے کبھی اس پرانے اصول کا لحاظ نہیں کیا، شاید اس لئے کہ غصہ دکھانے

میں زیادہ فائدہ تھا۔ لیکن اب بھی جب غصہ اور ضد سے نقصان ہی پہنچ سکتا ہے، جرمن حکام نے اپنی ادا نہیں بدلی ہے۔ صلح کی تجویزیں جنگ کے دوران میں برابر پیش کی جا رہی ہیں لیکن ہر دفعہ اس محفوظ ذہنی کے ساتھ کہ برطانیہ اور متحدہ ریاستیں اپنے رویے پر نادم ہوں گی آخرکار وہ یہ محسوس اور ظاہر کریں گی کہ جرمنی سے جنگ کرکے انھوں نے اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب تک روس اور اتحادیوں میں ایسا کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے جس کا جنگ پر اثر پڑتا۔ مگر جرمن اب بھی اسے ماننے پر تیار نہیں کہ یہ اتحاد حقیقی ہے اور اس صورت میں بھی قائم رہے گا جب جرمنی میں حملہ کرنے کی طاقت نہ رہے گی اور ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہو جائے گا کہ وہ لڑائی کو طول دے سکتا ہے۔ یالٹا کانفرنس کی کوئی ایسی بحث اور کوئی ایسا فیصلہ نہیں ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اتحادیوں میں اختلاف ہے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کا روس کے مطالبوں کو مان لینا اس کی دلیل ہے کہ فی الحال وہ ایک دوسرے کو راضی رکھنے کے لئے سبھی کچھ کرنے کو تیار ہیں، اس لئے کہ وہ جرمنی کو شکست دینا اور تمام مقاصد اور مصلحتوں پر مقدم سمجھتے ہیں۔

جرمن سیاست داں اتحادیوں کے سیاسی محاذ میں کمزور مقاموں کو اس طرح تلاش کر رہے ہیں جیسے فوجی ہراول دشمن کے محاذ کو ٹٹولتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ جرمن اپنی حالت سے واقف نہیں ہیں۔ وہ صاف صاف کہتے ہیں کہ اس جنگ میں ہم ہار گئے ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے مذہب اور مقاصد کو چھوڑ دیں گے یا کامیابی کا یقین جو ہمارے دل میں ہے وہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اس دعوے کی پشت پر یہ حقیقتیں ہیں۔ لڑائی جتنے عرصے تک جاری رہے گی جرمن قوم کی مصیبتیں بڑھتی جائیں گی۔ اتحادیوں نے صلح کی شرطیں بیان کر دی ہوتیں تو جرمنی کی آبادی اپنی حکومت کو لڑائی جاری رکھنے کا ذمہ دار ٹھیرا سکتی۔ مگر موجودہ صورتوں میں نازیوں کو کہنے کا موقع ہے کہ [illegible] [illegible] نے کی خاطر قربانیاں کر رہے ہیں۔ اتحادی جرمنی کو تقسیم [illegible]

جو بعد وہ ظاہر کر چکے ہیں اور اس سے نازیوں کی بے رحم منطق کو اور تقویت پہنچی ہے کہ نازیوں کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ فوجی شکست اور جرمنی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی لڑتے رہیں گے بے بنیاد نہیں ہے۔ جرمن ہائی کمانڈ جنگ کے امکانات سے واقف ہوگا۔ اس نے اب سے ڈیڑھ دو سال پہلے ہی اس کا اندازہ کر لیا ہوگا کہ جرمنی اتحادیوں اور روسیوں کا کب تک مقابلہ کر سکتا ہے۔ ۱۹۴۳ء کے وسط میں صلح نہ ہونے کے معنے یہ تھے کہ باضابطہ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی بے ضابطہ جنگ کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اس کا ایک پہلو قزاقانہ جنگ ہوگی۔ جس کے لئے منتخب نازیوں کو مشق کرائی جا چکی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کارروائی جس کا ہمیں علم ہوا ہے یہ ہے کہ آخن کی میونسپلٹی کا صدر قتل کر دیا گیا۔ ان لوگوں کو سزائیں دینا جو شکست کو تسلیم کر لیں اور دشمن سے اتحاد عمل کریں۔ قزاقانہ جنگ کا ایک محاذ ہوتا ہے۔ دوسرا محاذ اس وقت قائم ہوگا جب اتحادی ملک کے اتنے حصے پر قبضہ کر لیں گے کہ توزفاقانہ جنگ کرنے والے جتھوں کو نقل و حرکت کرنے کے لئے جگہ مل جائے گی۔ اتحادی فوجوں کی موجودہ رفتار قائم رہی تو ان سپاہیوں کو جو اس کام کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں اس کا موقع ملے گا کہ وہ باضابطہ فوج سے الگ ہو کر عام آبادی میں گھل مل جائیں اور اتحادی فوجیں اپنے ساز و سامان کے ساتھ آگے نکل جائیں گی تو یہ جتھے اپنا کام شروع کر دیں گے۔ آخن کی میونسپلٹی کے صدر کو جن لوگوں نے قتل کیا وہ فوجی وردی پہنے تھے اور ایک قومی عدالت کے فیصلے کی تعمیل کر رہے تھے۔ اب ایسی اور وارداتیں ہوں گی، اور کہیں اتحادی مجرموں کو پکڑ لیں گے تو کہیں وہ بچ کر نکل بھی جائیں گے۔ بہرحال اتحادیوں کے لئے امن قائم رکھنے کا ایسا انتظام کرنا تو بہت ہی مشکل ہوگا کہ آخن کی سی وارداتیں نہ ہو سکیں اور جرمنی میں افراد جان پر کھیل کر ہی ان کے ساتھ تعاون کر سکیں گے۔ قزاقانہ جنگ کرنے کے علاوہ نازی پارٹی نے ایک مورچہ بھی بنایا ہے جہاں وہ جرمنی کے فتح [illegible] لڑائی رہے گی۔ ان میں سے ایک نادرے ہوگا۔ یہاں جرمنی کے سائنسدان

ابدوخیرہ جمع کر دیئے گئے ہیں۔ دوسرا اور مرکزی مورچہ مغربی آسٹریلیا اور جنوبی جرمنی میں ہوگا اس کی بیرونی فصیل جنوبی جرمنی، مغربی چکوسلوواکیا، آسٹریلیا اور شمالی اٹلی کی قدرتی رکاوٹیں ہوں گی ممکن ہے کہ اس مورچے کے متعلق جو خبریں آئی ہیں وہ بالکل غلط ہوں، لیکن نازیوں کا یہ ارادہ کرنا کہ وہ اپنے عقائد کے لئے اس وقت بھی لڑتے رہیں گے جب جرمنی ان کے قبضے سے نکل جائے کچھ بعید از قیاس نہیں۔ اگر ہم نازی مورچے کی جو خبریں ملی ہیں ان کو صحیح مان لیں تو اور کئی باتیں بھی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ جرمن ہائی کمانڈ شمالی مغربی ہنگری پر جوابی حملے کر رہا تھا۔ اس وقت جب روسی فوجیں دانزگ اور کونزبرگ کو گھیر رہی تھیں اور برلن کی طرف ان کی پیش قدمی جاری تھی۔ شمالی مغربی ہنگری میں ٹینک اور جنگ کا بھاری سامان مشرقی یا مغربی محاذ سے نہ بھیجا گیا ہوگا۔ یہ وہاں موجود ہوگا اور اس خاص ارادے سے وہاں رکھا گیا ہوگا کہ روسی اس سمت میں بڑھ کر نازیوں کے مرکزی مورچے کو خطرے میں نہ ڈالنے پائیں۔ غالباً روسیوں کو مشرق میں اتنی جلدی اور اتنی زیادہ کامیابی نہ ہوتی اگر جرمنوں نے اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کیا ہوتا۔ مغربی محاذ پر بھی جرمن بظاہر جم کر نہیں لڑے، اور اتحادیوں کے لئے رہائن بھی کوئی بڑی رکاوٹ ثابت نہیں ہوا۔ اگر جرمنوں میں اتنا بل بوتا بھی نہیں ہے کہ وہ رہائن کا سہارا لے کر دشمن کو روک سکیں تو ان کا لڑائی کو جاری رکھنا محض حماقت ہے۔ اگر ان کی کمزوری کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے جنگ کا بیشتر سامان اپنے مجوزہ مورچے کی حفاظت کے لئے بھیج کر وہاں پہنچا دیا ہو تو معاملے کی صورت اور ہو جاتی ہے۔ اتحادی بمباری سڑکوں اور کارخانوں کو اتنا نقصان پہنچا چکی ہو کہ جرمن نیا سامان تیار کر سکنے کی امید نہ رکھتے ہوں گے، انھیں اسی سامان سے کام نکالنا ہوگا جو بنا بنایا موجود تھا، اور انھوں نے اسے جنگ کے محاذوں پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے مرکزی مورچے میں محفوظ کر دیا ہوگا سڑکوں اور ریلوں کی بربادی کے سبب سے جرمن وسطی اور شمالی جرمنی سے

بڑھتے رہیں گے، اور کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر اتحادی برلن تک اسی رفتار سے بڑھتے رہیں۔ لیکن جنوبی جرمنی میں مقابلہ زیادہ سخت ہوگا۔ روسی ہائی کمانڈ جرمنوں کے ارادوں سے زیادہ صحیح واقفیت رکھتا ہے۔ آسٹریا اور چکوسلواکیا پر زیادہ توجہ کرتا ہے، اور غالباً مشرقی محاذ پر برلن کے محاصرہ میں شریک ہونا کافی سمجھے گا۔

سیاست میں طوفان نہ آئیں تو تند ہوائیں تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ یالٹا کانفرنس کے بعد جنرل دے گول کی مزاجی کیفیت نے ایک ہنگامہ برپا کیا، جنرل دے گول راضی کئے گئے تو پولینڈ نے شکایتیں شروع کیں۔ ابھی حال میں اس مسئلے نے سب کو بے چین کر دیا تھا کہ برطانیہ متحدہ ریاستوں اور روس نے سین فرینسسکو کانفرنس کی کاؤنسل میں اپنے لئے تین اور باقی تمام ریاستوں کے لئے ایک ایک ووٹ دینے کا حق تجویز کیا ہے۔ اس پر ہر طرف سے اعتراض ہوا تو متحدہ ریاستوں نے اعلان کیا کہ انھیں تین ووٹ دینے کا حق نہیں، اور اب غالباً برطانیہ اور روس کی طرف سے بھی ایسے ہی اعلانات ہوں گے۔ لیکن طریق کار سے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں ہے۔ برطانوی نوآبادیاں اور ہندوستان سب کو الگ الگ رائے دینے کا حق ہوگا، جس کے معنی یہ ہیں کہ برطانیہ کو اسی نسبت سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں گے۔ پھر کیا تعجب کی بات ہے کہ روس نے اپنے وفاق کے دو صوبے اراکین کے لئے نمائندگی کا حق طلب کیا ہے۔ بڑی اور طاقتور ریاستیں ایک طرف اپنے اثر کو اس طرح بڑھانے کی تدبیریں کر رہی ہیں اور دوسری طرف چھوٹی ریاستوں کو یہ شبہہ ہو رہا ہے کہ متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور روس کے درمیان یالٹا میں خفیہ معاہدے ہوئے ہیں، اور انھوں نے آپس میں یہ بھی طے کیا ہے کہ کانفرنس میں بعض ریاستوں کی انفرادی طور پر نمائندگی ہوگی، بعض کی اجتماعی طور پر۔

شاید سب سے پریشان کن یہ خبر ہے کہ روس کو سین فرینسسکو کانفرنس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ اب تک صرف اس کا یہ ثبوت ملا ہے کہ روس اپنے وزیر خارجہ مولوٹوف

کو کانفرنس میں نہیں بھیج رہا ہے ، بلکہ متحدہ ریاستوں کے روسی سفیر کو کانفرنس میں شرکت کرنے کی ہدایت دے دی ہے گویا روس کا نمائندہ اپنی حکومت کو کانفرنس کی حالت اور بحثوں سے باخبر رکھنے کے لئے موجود رہے گا ۔ روس کی پالیسی بیان کرے گا نہ سمجھوتہ کرنے کا اختیار رکھتا ہوگا ، اور اگر کانفرنس کو کسی معاملے میں روسی حکومت کی رائے معلوم کرنا ہوگی تو وہ خود کوئی جواب نہ دے گا بلکہ حکومت سے دریافت کرے گا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے ۔ ڈمبارٹن اوکس میں جو کانفرنس ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی اس میں بھی روس کے نمائندے اسی حیثیت سے شریک ہوئے تھے ، اور اس سے کانفرنس کا کام مشکل ہوگیا ۔ اور اس کے فیصلوں کی بین الاقوامی اہمیت بہت کم ہوگئی ۔ روسی حکومت نے اپنی رائے نہ بدلی اور اپنے نمائندے کو اپنی پالیسی بیان کرنے اور فیصلوں میں شریک ہونے کا پورا اختیار نہ دیا تو سین فرانسسکو کانفرنس اتنی نتیجہ خیز نہ ہو سکے گی جتنی کہ ایسی کانفرنس ہونا چاہیے ۔ اور بین الاقوامی سیاست میں استقلال پیدا نہ ہو سکے گا ۔ روس اور اتحادیوں کے درمیان اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ پولینڈ کی نمائندگی کون کرے متحدہ ریاستیں اور برطانیہ دونوں اب تک لندن کی پولستانی حکومت کو حق دار تسلیم کرتے ہیں ۔ روس نے لبلن کی قومی کمیٹی کو پولینڈ کی اصل حکومت مان لیا ہے ۔ یالٹا کانفرنس میں طے ہوا کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس کی موجودہ شکل میں مستقل نہ مانا جائے ، بلکہ مسٹر مولوتوف اور برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کے روسی سفیر باہم مشورے کے بعد دونوں کمیٹیوں کے اراکین میں سے مختلف خیالات اور پارٹیوں کی نمائندگی کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک نئی کمیٹی منتخب کریں جو پولینڈ کی عارضی حکومت کہلائے ۔ یہ عارضی حکومت جلد سے جلد نئے انتخابات کا انتظام کرکے قوم کو اس کا موقع دے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت قائم کرے ۔ مسٹر مولوتوف اور برطانوی اور امریکی سفیر ورنے مشورے ہوئے ہیں پر تو اب تک کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے ۔ اور اب روسی حکومت نے [illegible]

کو بین فریب مسکو میں لبلن کمیٹی کو نئی حکومت کی حیثیت سے پولینڈ کے نمائندے بھیجنے کا حق دیا جائے۔ برطانیہ اور متحدہ ریاستوں کو اس پر اعتراض ہے، کیونکہ جب تک یالٹا کانفرنس کے فیصلے کے مطابق پولینڈ کی نئی حکومت مرتب نہ ہو وہ لندن کی پولستانی حکومت کو حق دار ماننے پر مجبور ہیں۔

جرمنی کے خلاف جنگ کرنے کی جو تجویزیں روسی اور اتحادی ہائی کمانڈ نے منظور کی ہیں ان پر عمل ہو رہا ہوگا۔ لیکن سیاست کے میدان میں روس بظاہر اتنا ہی آزاد ہے جتنا کہ وہ یالٹا کانفرنس سے پہلے تھا۔ یونان کے سوا جنوب مشرقی یورپ کے معاملات میں اتحادیوں کو اتنا ہی کم دخل ہے جتنا کہ کانفرنس سے پہلے۔ روس نے بلغاریہ پر قبضہ کیا تو قریب تین سو فوجی افسر جو بلغاریہ کو آزاد کرنے کی کارروائی کی تکمیل کے لئے وہاں گئے تھے ملک کے باہر پہنچا دیے گئے۔ انھیں اور شاید برطانوی حکومت کو بھی اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔ متحدہ ریاستوں کے تھوڑے سے شہری جن کا سیاست اور جنگ سے کوئی تعلق نہیں اب تک وہاں ہیں، لیکن ان پر مختلف قسم کی پابندیاں لگا دی گئی ہیں جن کا کوئی سبب بتایا نہیں گیا ہے۔ اتحادی سفارت خانوں کے لوگ بھی اس بات سے بہت پریشان ہوتے ہیں کہ روسی ان کے سوالوں کے جواب نہیں دیتے۔ یا دیتے ہیں تو ایسا کہ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ روسیوں کی یہ خاموشی یا نپی تلی مگر مبہم گفتگو ایک نئی سیاسی ادا ہے جس سے دوست دشمن سب حیران ہیں، اور معلوم ہوتا ہے اس خاموشی کی تہہ میں ایسے راز ہیں جو کبھی بھی اور کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکیں گے۔ روسی اس خیال کو اور تقویت پہنچا رہے ہیں۔ خصوصاً اس طرح کہ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے بھی رہتے ہیں جو ان کی باتوں کو سننے والے کے لئے بالکل توقع کے خلاف ہوتا ہے۔ حال [illegible] روس نے ۱۹۲۵ء کے مدافعانہ معاہدے کو جو ترکی سے ہوا تھا منسوخ قرار [illegible] یہ بتائی ہے کہ یہ بہت پرانا ہو گیا ہے اور نئے حالات کے لحاظ سے [illegible] کرنا ایسی کارروائی ہے جس سے اندیشہ ہوتا ہے کہ معاہدہ

کرنے والوں کے تعلقات بگڑ گئے ہیں۔ مگر ترکوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ روس کی دوستی کی قدر نہیں کرتے۔ روس کے ارادوں کے متعلق صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے اور ایسی قیاس آرائی عموماً سیاست کی فضا کو مکدر کردیتی ہے۔ غالباً روس کو خیال ہے، عرب اتحاد کی تحریک جس میں رفتہ رفتہ اصلیت پیدا ہورہی ہے ان کے خلاف مشرق قریب میں ایک محاذ قائم کرنے کی تدبیر ہے، اور اگر ایسا ہے تو انھیں ترکی کو اپنے ساتھ ملا لینا چاہیے، یا کم از کم معلوم کرلینا چاہیے کہ ترکی سیاست کا میلان کس طرف ہے۔ پرانے سیاسی آداب کے مطابق ایسا علم مختلف وزیروں اور پارٹی لیڈروں اور اخباروں کے ذریعے حاصل کیا جاتا، اب سیاست زیادہ تشدد پسند ہوگئی ہے، اور اپنے پرانے اعصاب کو آزماتی رہتی ہے۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب — عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۲ لاکھ ۴۴ ہزار	۲۲۴۴۰۰
ادا شدہ سرمایہ	۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار	۱۲۵۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، ارسل و رسائل، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں:-

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمد آباد، کانپور

جامعہ

زیرِ ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۱۴ - نمبر ۴ | بابتہ ماہ اپریل سنہ ۲۵ء | سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس، دہلی

• اقبال اور وطنیت

اسلامی دنیا میں اقبال کے سیاسی، معاشری اور اجتماعی افکار کو جو اہمیت حاصل ہے اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اقبال بیسویں صدی کے اسلامی مفکر ہیں جو جدید فلسفے اور سائنس کی روشنی میں اسلامی افکار و سیاسیات کی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تفسیر و تشریح فرما رہے ہیں اقبال مرحوم کے خطبات "اسلامی الہیات کی تعمیر نو" کی اشاعت کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقات میں خالص اسلام اور اس کی تعلیمات و روایات سے متعلق اس مفکر اعظم کے خیالات کو جو مزید اہمیت حاصل ہو گئی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ان کے افکار کو زیادہ سے زیادہ تشریح کے ساتھ پیش کیا جائے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان پر تبصرہ بھی کیا جائے۔

اقبال کے تمدنی اور ثقافتی تصورات میں وطنیت اور مسئلہ وحدت اسلامیہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اسی لئے میں اس فرصت میں بحث و تبصرہ کے لئے اسی کو منتخب کر رہا ہوں۔ موجودہ حالات میں کم سے کم ہندوستان میں مسئلہ وطنیت و قومیت بہت زیادہ فکر و بحث کا محتاج ہے۔ اور ممکن ہے کہ خاص اس مسئلے کی وضاحت اقبال کے دوسرے سیاسی افکار و تصورات کی توضیح و تشریح میں بھی کوئی مدد دے سکے۔

اس مسئلے کے متعلقات پر بحث کرنے سے پہلے میں ایک اصولی چیز کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ اصولی سے میری مراد یہ ہے کہ اگرچہ اس چیز کا اس مسئلے کے مختلف زاویوں اور گوشوں سے کوئی خصوصی تعلق نہیں اور اس حیثیت سے اُسے اس مسئلے کے متعلقات میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اقبال کے عام فلسفیانہ تصورات و افکار کے سلسلے میں وہ ایک بنیادی حیثیت کی حامل ہے اور ضرورت ہے کہ جب کبھی اقبال کے کسی مخصوص فکر یا نظریے سے بحث کی جائے تو اس اصولی چیز کو بھی پیش نظر رکھا جائے

تاکہ اقبال کی حقیقی غرض و غایت سمجھنے میں بے قدردی کوئی امکان باقی نہ رہے۔

اقبال مرحوم، جیسا کہ ظاہر ہے، دراصل اسلامی فلسفے کے جدید شارح ہیں جو مخصوص حالات میں اس کے فلسفیانہ تصورات کی شرح فرما رہے ہیں۔ کسی فلسفیانہ نظام کی شرح و تفسیر کے لئے بھی کچھ مقررہ اصول اور ضابطے ہیں جن کی پابندی بہرحال ہر شارح کے لئے ضروری ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک اہم اصل وہ ہے جسے خود علامہ مرحوم نے اپنے خطبات کی تمہید میں ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :۔

"یہ بہرحال پیش نظر رہے کہ فلسفیانہ غور و فکر کے سلسلے میں قطعیت Finality کوئی چیز نہیں۔ جس قدر علم ترقی کرے گا اور فکر کے لئے نئی راہیں اور روشیں کھلیں گی اسی قدر دوسرے خیالات اور شاید ان خیالات سے زیادہ صحیح اور معقول خیالات جو ان خطبات میں پیش کئے گئے ہیں امکان پذیر ہو سکیں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انسانی فکر و تصور پر بیداری کے ساتھ نظر رکھیں اور اس سے متعلق ایک آزادانہ تنقیدی روش اختیار کریں۔"

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن حالات میں اقبال مرحوم، اپنے خطبات میں اسلامی فلسفے کی گویا ارتقائی تفسیر فرما رہے ہیں، وہ حالات تبدیل ہو سکتے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ قدرتی طور پر ان تفسیرات میں بھی شاید بہتر اور مناسب تغیرات راہ پا سکتے ہیں۔ اس لئے اہل بحث و نظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اقبال مرحوم کی پیش کردہ تفسیرات کو آخری اور قطعی تصور نہ فرمائیں اور خود اقبال کے افکار کی تشریح میں بھی حالات، ماحول اور گرد و پیش کو نظر انداز نہ ہونے دیں۔

کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی عہد میں وطنیت کے مبلغ تھے اور اس کے بعد قیام یورپ سے مراجعت فرمانے پر انھوں نے وطنیت کو خیرباد کہا اور اس کے بجائے وحدت اسلامیہ کی تبلیغ فرمائی۔ اس خیال کی تائید میں علامہ کی ابتدائی مشق سخن کی نظمیں

شیخ تصویر درد، ترانۂ ہندی، نیا شوالہ اور ہندوستانی بچوں کا گیت پیش کی جا سکتی
تمام نظموں کا نچوڑ ہے۔

ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستاں ہمارا

بعد کی نظموں اور مثنویوں میں نہ صرف یہ کہ وطنیت کی مذمت کی گئی ہے بلکہ اُسے تہذ
نوی کا ایک بت اور مذہب کا کفن بتایا گیا ہے اور مسلم سے درخواست کی گئی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے | اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھا دے | اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

بظاہر اقبال کی تعلیمات میں یہ ایک تضاد ہے اور جس طرح اقبال کے پرستار اس کو
کر رہے ہیں اس سے توضیحات منافی نظر آتا ہے اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں
کہ اقبال کی ابتدائی نظموں کو جن میں وطنیت کا رنگ اڑ گیا ہے منسوخ قرار دیا جائے
یہ کہہ دیا جائے کہ شاعر اسلام کے یہ خیالات اس عہد کے ہیں جب ان کا فکر پوری طرح پختہ
ہونے پایا تھا۔ یہ شاعر کے (خدانخواستہ) خام خیالات ہیں جن پر اسلامی نظام
معیشت و سیاست کی بنیادیں کھڑی نہیں کی جا سکتیں۔

جو اصحاب قرآن شریف کی بعض آیات کو جو بظاہر انہیں متناقض نظر آتی ہیں
بے باکانہ منسوخ قرار دیدیتے ہیں۔ ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اقبال کی ان نظموں کو
بھی قابل نسخ قرار دیں۔ بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر بھی رہے ہیں اور یہ
فرما رہے ہیں کہ وہ شاعر کے بالکل ابتدائی اور ناپختہ خیالات ہیں۔ جب شاعر کے
مطالعے میں وسعت اور تجربات میں ہمہ گیری آئی تو طبعی طور پر ان کے خیالات بھی
تبدیل ہو گئے۔ وہ اول ہندوستانی قومی شاعر تھے۔ لیکن بعد میں وہ خالص اسلامی
شاعر ہو گئے۔

در اصل یہ کہنا اقبال کی بہت بڑی توہین ہے کہ پورے عہد کے سفر نے اقبال کے فلسفے

بعد وسعت دے کر انھیں ملی شاعری سے اسلامی شاعر بنا دیا۔ یہ یقینی ہے کہ اقبال کی تعلیمات میں کوئی تناقض نہیں۔ ان کے خیالات میں کوئی ایسی ناہمواری ہی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ ان کے نظریے اصلے بدلتے رہے ہیں۔ جب وطنیت کے اقبال گن گا رہے ہیں کبھی انھوں نے اس وطنیت کی مذمت نہیں کی اور نہ درحقیقت وحدت اسلامیہ اور وطنیت میں کوئی تباین ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکے کہ چونکہ اقبال وحدت اسلامی کے مبلغ ہیں اس لئے وہ وطنیت یا قومیت سے بیزار ہیں۔

وطنیت کے معنی ہیں وطنی اشتراک ، وطنی اتحاد اور وطنی رشتہ ۔ بنی نوع انسان میں سب سے زیادہ وسیع اشتراک انسانیت میں ہے۔ انسان کے تمام افراد بہرحال انسان ہیں اور وہ سب ایک وصف انسانیت میں شریک ہونے کے باعث انسان کہلاتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور صفات بھی ہیں جو افراد انسان میں اتحاد و یکسانی کی موجب ہیں۔ یہ سب صفات سب ایک حیثیت کی نہیں۔ انسانیت کے بعد وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے ان میں درجات کا تفاوت ہے۔ مثلاً نسل، زبان، مذہب اور وطن۔ ان میں سب سے زیادہ وسیع تر مایہ الاشتراک مذہب یا دین ہے اس لئے کہ مذہب نام ہے ان معتقدات و روایات کا جو زندگی کے لئے کسی مکمل نظام عمل کی تشکیل کر سکیں اور ظاہر ہے کہ اس میں بڑی سے بڑی توسیع ہو سکتی ہے یعنی اس مکمل نظام عمل کی حدود میں مختلف نسل اور زبان کی قومیں داخل ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد زبان اور نسل کا درجہ ہے۔ میں چونکہ وحدت لسان کو وحدت نسل کا لازمی نتیجہ نہیں سمجھتا اس لئے زبان کی حدود کو نسلی دائرے سے زیادہ وسیع قرار دے رہا ہوں۔ سب سے آخر میں وطن ہے جو دائرۂ اتحاد میں سب سے زیادہ تنگ اور سب سے زیادہ محدود و مختصر ہے یہی دائرہ وطنیت ہے جو ایک جغرافیائی حدود میں بسنے والے افراد انسان کو وحدت کے ایک ہی رشتے میں منسلک کر سکتا ہے۔ وطنیت سے تنگ تر دائرے بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً قبیلہ، خاندان،

شہریت وغیرہ۔ لیکن موجودہ انسانی معیشت پر نظر رکھتے ہوئے ان دوائر کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے اس بحث و نظر سے ان کو خارج کر دیا گیا۔

گذشتہ دو صدی سے یورپ میں وطنیت کو اجتماعی زندگی کی اساس قرار دے دیا گیا اور یہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات کے ماتحت ہوا ہے۔ کسی رشتہ کا استحکام صرف اس کی افادیت اور نافعیت پر اور یہ افادیت موقوف ہے انسان کے عام سیاسی، معاشی اور اجتماعی منافع پر۔ اس لئے سب سے بڑا محرک عمل وہی ہو سکتا ہے جو ان منافع کی صحیح اور بہترین تنظیم کر سکے گذشتہ تاریخی تجربات نے بتلایا ہے کہ جتنے بھی مابہ الاشتراک بھی ہیں ان سب میں وطن ہی اس قابل ہے کہ وہ کسی قوم کی بہترین اور شائستہ ترین تنظیم انجام دے سکے اور شاید یہی ایک صورت سیاسی تنظیم کی ممکن بھی ہے۔ دراصل بنی نوع انسان کے اشتراک اور باہمی تعاون کا مسئلہ انسان کی اجتماعی حیات سے وابستہ ہے۔ اگر انسان طبعی طور پر متمدن نہ ہوتا یا افراد انسان ایک دوسرے سے الگ اور جدا رہ کر بھی ترقی کے منازل طے کر سکتے تو اشتراک یا تعاون اور وحدت یا یکسانی کا سرے سے سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہوا جب نوع انسان کے افراد ایک مقام پر رہتے بستے پائے گئے۔ ان کے سیاسی و معاشی مفاد کی یکسانی نے ان میں قومی وحدت کے جذبے کو نشوونما پانے کا موقع دیا۔ چنانچہ تاریخ معیشت میں سب سے پہلے خاندان کی وحدت نے جنم لیا۔ اس کے بعد اس وحدت نے اس طرح وسعت اختیار کی جس طرح پانی میں کوئی چیز پھینکنے کے بعد جو دائرہ سا بنتا ہے وہ برابر وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ خاندانی وحدت سے قبیلے کی وحدت پیدا ہوئی اور قبیلے کی وحدت سے وطنی وحدت نے جنم لیا۔ اور آخر میں وطنی وحدت نے قومی یا نسلی وحدت کا روپ اختیار کیا۔

وطنی وحدت کو جو دراصل جاذبۂ وطنیت کی علت ہے، مصنوعی قرار دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ خالص فطری اور تاریخی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وطنیت ایک تجریدی احساس Abstractive sense ہے۔ لیکن مذہب بھی اس اعتبار سے تجریدی ہے۔

بلکہ وطن کے مقابلے میں اس کی "تجریدیت" زیادہ شدید اور تاریخی طور پر بعد کی چیز ہے۔ عام افرادِ انسان کے لئے ہر وہ رشتہ زیادہ ... یا اور قابلِ احترام ہے جو ان کی روزانہ زندگی میں زیادہ موثر ہے۔ مذہبی وحدت خالص روحانی اور اخلاقی وحدت ہے اور اس کا شعور تاریخی ارتقا کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ انسان کے برتر تمدن کی یادگار ہے بلکہ اس کو انسان کی روزانہ زندگی اور اس کی ابتدائی ملازمی ضرورت سے اگر کوئی تعلق ہے تو نہایت بعید۔ شاید اسی وجہ سے وہ انسانِ اول کی زندگی میں کوئی بڑا محرکِ عمل ثابت نہ ہو سکا۔ نسلی یا قومی وحدت کا احساس جذبۂ وطنیت سے متاخر ہے اور یہ اس لئے کہ جب تک کوئی قوم ایک ہی جغرافیائی حدود میں محصور ہے۔ اس وقت تک نسل اور وطن ایک ہی دائرے پر منطبق ہیں اور ان میں کوئی فصل نہیں جب قوم کے افراد وطن کی حدود سے قدم باہر رکھتے ہیں اور کسی دوسری جگہ جا بستے ہیں تو نسلی دائرہ گویا وطنی دائرے سے منفصل ہو جاتا ہے اور پھر یا تو پہلے رشتے بالکل ٹوٹ جاتے ہیں اور نئے سرے سے نئے رشتے جوڑے جاتے ہیں اور یہ دراصل وطنیت کی توسیع ہوتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب نئی بستی میں جہاں قوم کے افراد جا بستے ہیں کوئی دوسری قوم آباد نہیں اور اگر ہے تو اقلیت میں ہے۔ اس وقت یہ دونوں بستیاں مل جل کر ایک نئے قومی وطن کی تشکیل کرتی ہیں۔ یا پہلے رشتے اپنی جگہ قائم رہتے ہیں اور مقامِ ہجرت میں بھی نئے رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہجرت کرنے والے افراد کسی ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جو پہلے مقام سے اس قدر دور ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے ان میں کوئی رشتہ یا تعلق ہی نہیں۔ یا دارِ ہجرت میں وہ ایک غیر اہم اقلیت میں ہیں۔ اس صورت میں بھی وہ اس مقام کی اکثریت میں رل مل جاتے ہیں اور ایک نئے وطن اور جدید قوم کی بنیادیں استوار کرتے ہیں۔

مثلاً: ایرانی اور ہندی قومیں یوں تو ایک ہی نسل یعنی آرین قوم کی مختلف شاخیں ہیں اور لسانی شہادتوں کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی قدیم زمانے میں ایک ہی مقام پر آباد

تھیں اور ایک ہی زبان عام بول چال میں استعمال کرتی تھیں۔ لیکن جب یہ قومیں بکھر کر اعتاً وطن کر کے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلیں تو ان کی نسلی وحدت مٹ گئی۔ اور گرد و پیش حالات نے ان کی شکل و صورت، اوضاع و اطوار، زبان اور معتقدات کو ایک سے سانچے ڈھال کر اس حد تک بدل دیا کہ اب بدشواری خال خال لسانی علامات اور کسی قدر طبعی آثار کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ قومیں کسی ما قبل تاریخ عہد میں ایک ہی مقام پر آباد تھیں اور ان میں قسم کا اتحاد و اتفاق تھا۔

قدیم زمانے میں وطن اور قوم کا مفہوم، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، ایک ہی تھا۔ اس کی وجہ بھی بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی یہ کہ ایک قوم ایک ہی مقام کی حدود میں محصور تھی۔ قوم اور وطن کے تصور کا باہمی اختلاف مربوط ہے افراد قوم کی ہجرت اور ترک وطن سے۔ جب کبھی کسی نسل یا قوم کے کچھ افراد کٹ کر الگ ہوئے اور ان کا سیاسی اور معاشی مفاد ان کی اصل یا سرچشمے کے عام منافع سے جدا ہوا تو یہ افراد ایک جداگانہ حیثیت کے مالک ہو گئے اور مجبور ہوئے اس امر پر کہ وہ اپنی سیاسی تنظیم اپنی قوم سے الگ اپنے مخصوص حالات کے مطابق کریں یا اس تنظیم میں اپنے مقام سکونت کے طبعی و جغرافیائی اثرات اور پہلے سے وہاں آباد رہنے والی اقوام کا بھی خاص خیال رکھیں۔ ابتدا میں ان طبقات کا مخصوص ماحول اور ان کے اپنے سیاسی و معاشی مفاد کے علاوہ کوئی اور چیز ان طبقات کو ان کے اصل سرچشمے سے ممتاز یا مختلف نہ بناتی تھی۔ لیکن زمانے کا امتداد ان میں برابر امتیازی خصوصیات پیدا کرتا رہتا تھا۔ جس سے وہ اپنی اصل سے بدستور دور ہوتی چلی جاتی تھیں۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ وطنیت کو انسان کی اجتماعی حیات میں بہت بڑا دخل ہے اور یہ کہ وہ خالص فطرت کی پیداوار ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ گذشتہ دو تین صدی سے یورپ میں اس فطری اصول اجتماع کو شاید اس کی افادیت یا عمومیت کی بنا پر بہت سراہا جا رہا ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مصنوعی چیز ہے اور سرزمین یورپ کی پیداوار ہے

یاس کی زندگی کل دو ڈھائی سو سال ہے جو اقوام کی زندگی میں ایک لمحے سے زیادہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علامہ اقبال یورپ کی جارحانہ وطنیت سے بیزار ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو یقیناً ان کی بیزاری اس صحیح اور فطری جذبہ وطنیت سے نہیں جس کی تحلیق ارتقائی تاریخ کے نقطۂ نظر سے سطور بالا میں کی جا چکی ہے۔ اقبال کی جارحانہ وطنیت سے بیزاری غالباً وطنیت کی بنیاد پر نہیں ورنہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

کی تاویل ہو سکے گی؟ ماحصل جارحانہ وطنیت سے بیزاری اس کی جارحیت کی وجہ سے ہے اور جارحیت کے معنی ہیں تخریب و افساد۔ یعنی اپنے وطن کی تعمیر کو دوسروں کی تخریب سے مربوط سمجھنا۔ وطن کے نام پر بھولے بھالے افراد قوم کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ دوسرے ارکان کی آزادی پر ڈاکے ڈالیں اور انھیں غلام بنائیں۔ دراصل وطنی تنظیم ایک محدود اور مخصوص تنظیم ہے۔ اس میں اگر کوئی فائدہ ہے تو یہ کہ اس کے ذریعے انسانی اجتماعی ہیئات کے کسی قدر دشوار مسائل کو ذرا آسانی کے ساتھ حل کیا جا سکتا ہے۔ انسان کا مفاد دو طرح کا ہے۔ شخصی اور اجتماعی۔ یہ دو طرح کے مفاد قدرتی طور پر برابر نبرد آزما رہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ انسان کی آئندہ ترقی اور کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے ان دو مختلف مفادات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور ان کی شکست و ریخت سے ایک خاص امتلائی کیفیت حاصل کی جائے۔ اس صورت میں اجتماعی منافع کے دائروں کو جس قدر تنگ کیا جائے گا اسی قدر اختلاف اور تصادم کے امکانات کم ہوں گے اور عام افراد معاشرہ کو بھی زیادہ سے زیادہ اتحاد کے رشتوں میں منسلک کیا جا سکے گا۔ اسی خیال سے یورپ میں جب دوسرے وحدانی نظام کانی اٹھائے جا چکے اور ان میں کوئی کامیابی نظر نہ آئی تو مجبور ہو کر وطنی تنظیم کو اختیار کیا گیا۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اور وطن کے نام سے یورپ کے مختلف ممالک نے گذشتہ دو صدی

میں کافی ترقی بھی کی۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ ترقی کے لئے مسابقانہ جذبے کو ہوا د
کر خوب بھڑکایا گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس جذبے نے بھڑک کر رقابت کی شکل اختیا
یورپ آگ اور خون کے کھیل میں دلچسپی لینے لگا۔

یورپ کی موجودہ وطنی تنظیم میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وطن سے بالاتر
کوئی اور رشتہ نہیں جو ان مختلف اوطان یا ممالک کو ملا کر ایک بڑی وحدت بنا۔
حیات و کائنات بے شمار وحدات کا ایک نامحدود نظام ہے جس میں قانون تدر
کام کر رہا ہے۔ سب سے زیادہ وسیع وحدت خود وجود یا ہستی ہے جو جوہر او
دو وحدتوں کی جامع ہے جو ہر ایک بہت بڑی وحدت ہے جس میں اجسام ا
ارواح کی بے شمار وحدتیں بندھی ہوئی ہیں۔ جسم ذرات کی ایک ناپید اکنار دنیا
اندر لئے ہوئے ہے۔ ذرہ کا تجزیہ کیجئے۔ آپ کو نامعلوم برقپارے یا کوانٹم حرکت
کرتے نظر آئیں گے۔ یہ ایک مثال ہے، یہ بات سمجھانے کے لئے کہ اوطان کی تنظیم
بلند تر جذبے کے ماتحت ہونا چاہئے تھی تاکہ اس کے زیر اثر بین الاقوامی یا بین الاو
مسائل کی گتھیاں بھی سلجھائی جا سکیں۔ یورپ میں چونکہ کوئی ایسا رشتہ نہ تھا اس
ان اوطان میں تصادم ہوا اور وہاں میدان کارزار گرم ہو گیا۔ اقبال مرحوم اسی
جذبۂ رقابت، اسی جاذبۂ مسابقت اور اسی جارحانہ وطنیت کو جو بالاتر رشتۂ اتحا
سے محروم ہے، ایک نو تراشیدہ بت قرار دے کر اُسے توڑ دینے کی تبلیغ فرماتے ہیں۔
لیکن اس سلسلے میں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ اگر وطنیت سے اس کی جارحیت
کی بنا پر بیزاری کا اظہار کیا جا سکتا ہے تو یہ جارحیت کسی ایسی تنظیم میں بھی پائی جا سکتی
ہے جس کی بنیادیں مذہب پر قائم ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے عام
مفاد کی خاطر غیر مسلموں پر بھی جور و جفا روا رکھا جا سکتا ہے۔ اسلام کے نام پر غیر مسلموں کا
خون بھی بہایا جا سکتا ہے اور بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا سکتا ہے جب

لے دنیا میں غیر مسلم آبادی ہیں۔ اسلام کے نام پر تقسیم کے معنی یہ ہیں کہ زمین کے چپوں کو مسلم و غیر مسلم حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ اور اب جو کچھ وطن کے نام سے ہو رہا ہے اُسے اسلام، یہودیت، نصرانیت، اشتراکیت، اشتمالیت وغیرہ ناموں سے خوب کھل کر کیا جائے۔ بظاہر ان دو صورتوں میں کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ اسلام ظلم و سفاکی کا مخالف ہے۔ اس لئے ممکن نہیں کہ اسلام کے نام سے کوئی ناروا اقدام کیا جا سکے۔ ایک مسلم کے نقطۂ نگاہ سے یہ درست ہے اور شاید مسئلہ کی وضاحت کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں کہ خواہ مخواہ مسلم تاریخ (اسلامی نہیں) کی خوں ریزیوں کا اس سلسلے میں ذکر کیا جائے۔ اور فقہائے اسلام کے مشہور اصول "الاسلام او السیف" (اسلام قبول کرو ورنہ قتل کئے جاؤ گے) کے عملی تفسیریں بھی پیش کی جائیں۔ وطن پرستوں کے نقطۂ نگاہ سے وطن بھی خونریزی اور ظلم و تعدی کو روا نہیں رکھتا اور شاید یہ صحیح بھی ہو کہ یورپ کے باشندے اپنے وطن کا نام روشن کرنے کے لئے، اپنے قومی وقار کے استحکام کے لئے۔ اور اپنے وطن کو اُچھالنے کی غرض سے جو انسانیت سوز اقدامات کرتے رہتے ہیں وہ انصاف اور جمہوریت کے نام سے کرتے ہیں۔ وہ ایک انسان کے دل میں بندوق کی گولی پیوست کرتے وقت بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم انسان کی عزت و ناموس کے بقا اور اعلاء کلمۂ حق کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ درست ہے اور ہزار بار درست ہے کہ قرآن کا فرمان ہے لَا تَعْتَدُوْا (زیادتی نہ کرو) لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ اس فرمان پر عمل بھی کیا جائے گا۔ اسلام زندہ باد اور مسلم قوم آباد کے فلک شگاف نعروں میں کسی حق پرست کی کمزور آواز لَا تَعْتَدُوْا بھی سنی جائے گی:

ڈاکٹر اقبال کی اسلامی وحدت وطنیت سے بالاتر ضرور ہے۔ لیکن اسی طرح جیسے دس نو سے زائد اور اس سے برتر ہے۔ وحدت اسلامی کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تمام وطنی امتیازات مٹا دئے جائیں اور اس پر اسلامی وحدت کی بنیاد کھڑی کر دی

جائیں اور یہ ممکن بھی نہیں۔ اسلام نام ہے زندگی کے ہمہ گیر حق پرستانہ اص
اور بہر حال اسلامی ممالک یہ شان دار اصول حیات اختیار کرنے پر مجبور ہیں
ان اصول کی تنقید کے لئے جن افراد کی ضرورت ہے وہ کسی ایک مقام کے با
ہی ہو سکتے ہیں۔ جن کی کچھ اپنی مخصوص ضروریات اور حالات بھی ہیں۔ یہ پورا
ملا جلا کر وطنیت کے نام سے موسوم ہے۔ مختلف اوطان یا ڈھانچوں کی تنظیم
بھی کچھ بالاتر اصول و قواعد کی ضرورت ہے وہ یہی اسلامی اصول ہیں جو ان دو
کے باہمی تعلقات اور ارتباطات کی توثیق میں زیادہ سے زیادہ مددپہنچ
ہیں۔

وحدت اسلامی ایک بین الاقوامی نظام کا نام ہے جو ہیت سے اسلامی او
کی وحدات پر مشتمل ہے۔ اس لئے وطنیت اور وحدت اسلامی میں کوئی تقابل
منافات نہیں ہو سکتی۔ ایک دھائی یعنی دس نام ہے جداگانہ دس اکائیوں کا
تک دس اکائیاں ایک جگہ جمع نہ ہوں دھائی کا وجود ناممکن ہے۔ اسی طرح ج
تک متعدد اوطان کی وحدات نہ ہوں ایک اسلامی وحدت کا وجود کہاں ہو سکت
اگر ایک دھائی اور دس اکائیوں میں کوئی اختلاف یا تقابل نہیں تو وطنیت اور
اسلامی وحدت میں بھی منافات قطعی ناممکن ہے۔

وحدت اسلامی کی تشکیل صرف اسلامی وطنی وحدات ہی سے ہو سکتی ہے
اور ڈاکٹر اقبال نے اس سلسلے میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سید عبدالرحمٰن الکواکبی
اور مولانا جمال الدین افغانی کی تعلیمات اور پرخلوص مساعی کی گویا بازآفرینی ہے
مولانا افغانی کی سیاسی سرگرمیاں عالم اسلامی میں کافی مشہور ہیں۔ وہ وحدت اسلامی
(پان اسلامزم) کے سب سے بڑے مبلغ تھے۔ اور اس راہ میں ان کی بے مثال
قربانیاں قابل صد ستائش ہیں۔ وہ اسلامی ممالک کو ایک ہی رشتۂ اتحاد میں

منسلک کرنے کے لئے برابر ساعی رہے۔ لیکن ان کا منشا ہرگز یہ نہ تھا کہ عراق، عرب شام فلسطین، مصر، افغانستان، ایران اور ٹرکی اپنی قومی وحدات مٹا کر ایک وحدت بن جائیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ ان ممالک میں اسلام کے نام سے ایک مستحکم رشتہ اخوت قائم ہوجائے۔ وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے بھی منفرد موتی کے دانوں کی طرح ایک ہی مسلک میں منسلک ہوں۔

اقبال جو مولانا جمال الدین کے پرستاروں میں سے ہیں دول اسلامیہ کے اتحاد و اتفاق کے خواہاں ہیں اور چونکہ یہ خطرہ ہے کہ ایرانی کی ایرانیت، افغان کی افغانیت اور ترک کی ترکیت اس اتحاد کی راہ میں مزاحم ہو اس لئے اس بلند و بالا تر مقصد کے پیش نظر وہ اس جذبے کو سبک اور حقیر قرار دے رہے ہیں۔ جہاں مسلم کے ساتھ غیر مسلم بھی آباد ہیں یا جہاں غیر مسلم ریاستیں بھی ہیں قدرتی طور پر وہاں وحدت اسلامی کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک مقام پر بسنے والے مسلم و غیر مسلم کا اتحاد صرف وطنی خطوط پر ہی ہوسکتا ہے اور چونکہ وطنیت اپنی جگہ یعنی جب اس کا وحدت اسلامی سے تصادم نہ ہو، ایک اور مسعود جذبہ ہے اس لئے وہ معیوب نہیں اور نہ اس سے بیزاری کوئی معقول چیز ہے۔

مارچ ۱۹۳۸ء میں یعنی وفات سے ایک ماہ پہلے اقبال مرحوم نے وطنیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا تھا۔ قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرہ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علی ہذا القیاس چینی عربی، جاپانی، ایرانی وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت کی اسلام سے متصادم نہیں۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنی جنم بھومی سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کو تیار رہتا ہے۔ (روح اقبال صفحہ ۲۲۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام اور وطن میں کوئی تصادم نہیں۔ ایک مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنی جنم بھومی کے لئے قربانی دینے کو تیار ہو سکتا ہے اور اس کی بہبود کی جدوجہد بھی کر سکتا ہے۔

وحدت اسلامی کی جو تشریح سطور بالا میں پیش کی گئی ہے وہ ثبوت ہے اس امر کا کہ اقبال مختلف اسلامی اوطان کی ایک بالاتر تنظیم کرنا چاہتے تھے جس کے صاف اور واضح معنی یہ ہیں کہ وہ وطنیت کے مخالف نہ تھے۔ یہ غلط ہے کہ وہ ایک واحد اسلامی ریاست قیام چاہتے تھے۔ یہ در اصل ناممکن ہے۔ جو اصحاب وطنیت کے مخالف ہیں یا اقبال کو وطنیت کا مخالف بتاتے ہیں۔ ان کے نزدیک وحدت اسلامی کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ دنیا میں ایک واحد اسلامی ریاست ہو۔ ڈاکٹر قاضی عبدالحمید نے لکھا ہے۔ (اردو اقبال نمبر صفحہ ۱۹۹)۔

" اقبال کہا کرتے تھے کہ اسلام میں خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک بھی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم نہ ہو سکی اور نہ اس کی کوئی امید دکھائی دیتی ہے۔ البتہ اتحاد اسلامی کا تخیل اس معنی میں ضرور عملی جامہ پہن سکتا ہے کہ تمام اقوام آزاد ہوں اور اسلامی مقاصد کے لئے باہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ یہ حکومتیں ایک قسم کی اسلامی قومی حکومتیں ہوں گی"

جن الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے انہیں غور سے پڑھئے اور فیصلہ فرمائیے کہ اقبال قوم یا وطنیت سے بیزار ہیں۔ آگے ارشاد ہوتا ہے۔

" مگر ان قومی حکومتوں کی بنیاد اخلاق اور محبت پر استوار ہونا چاہئے۔ یہ قومیت یورپ کی طرح جارحانہ نہ ہونا چاہئے۔ جس کا لازمی نتیجہ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کی لعنت ہے "۔

یعنی جو قومیت " اخلاق اور محبت " سے عاری ہے وہ یورپی قومیت ہے اور اقبال

ـسے ہمیں دور رکھنا چاہتے ہیں ۔

مسلم اور غیر مسلم کا اتحاد۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے وطن ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اتحاد و اقبال کی تحریکات کے مطابق اسلام اور اس کی تعلیمات کے منافی نہیں۔ لیکن اگر کی ایسی صورت پیش آئے کہ کسی مشترک قومی وطن کے مفاد کا تصادم کسی اسلامی قومی ریاست ، مفاد سے ہو جائے تو مشترک قومی ریاست کے مسلم باشندے کیا راہ اختیار کریں؟ اس جواب کسی قدر دشوار ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی صورتیں پیش آتی رہی ہیں اور مسلم فقہا اسلامی اصول کے مطابق اس پر عمل بھی پیش کرتے رہے ہیں ۔

مسعودی عرب کا مشہور مورخ اور سیاح ہے۔ اس نے چوتھی صدی ہجرت کے اوائل میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان ں اس وقت کثیر تعداد میں مسلمان آباد تھے جو اہل ہند کے ساتھ رل مل گئے تھے۔ انہوں ے یہاں شادیاں بھی کر لی تھیں اور مستقل طور پر یہیں رس بس گئے تھے۔ بحر خزر (کیسپین) کے ے آس پاس بسنے والی قوموں کے متعلق مسعودی کا بیان ہے کہ یہ مسلمان ہیں اور لُرشیہ ہلاتے ہیں۔ یہ خوارزم (خیوہ) سے ہجرت کر کے یہاں آ بسے ہیں۔ یہ بہترین سپاہی یں اور خزر کے بادشاہ کو ان کی بہادری پر بڑا اعتماد ہے۔ یہ لوگ اس شرط پر یہاں باد ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں گے اور مسجدیں بھی تعمیر کر سکیں گے۔ وزیر انہی میں سے چنا جائے گا۔ اور اگر خزر کے بادشاہ کو کسی اسلامی سلطنت سے جنگ پیش آئے تو مسلمانوں کو ان ے خلاف جنگ میں نہ بھیجا جائے گا۔ وہ دوسری قوم سے لڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ ان کے یہاں سات حکام عدالت ہیں۔ دو مسلمان، دو خزری، دو عیسائی ور ایک روسی۔ اگر کوئی مشکل قضیہ پیش آتا ہے تو اسے مسلم حکام عدالت کے روبرو پیش کیا جاتا ہے اور شریعت کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ ان کی مسجدوں میں درس قرآن کے مدارس بھی ہیں۔ (مروج الذہب جلد دوم صفحہ ۱۰)

یہ قدیم قومیت کی ایک ابتدائی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام
اخوت وطنی اتحاد سے کس قدر بلند اور بالاتر ہے۔ یعنی اگر وطنی و ملی حقوق
ہو تو بہر حال ملی حقوق مرجح ہونا چاہئیں۔ لیکن اسلامی ریاست کے ساتھ ہوکر
ملک کے خلاف جنگ بھی نہ کرنا چاہیئے۔ مشہور فقیہہ علامہ سرخسی فرماتے ہیں
اسلامی حکومت اور اس حکومت میں جہاں مسلمان آباد ہیں جنگ چھڑ جائے تو مسلمان
اپنے زمانہ قیام میں ہر طرح کے محاربانہ اعمال اور غداری سے مجتنب رہنا چاہئے
(مبسوط جلد دہم صفحہ ۹۸)

بعض اصحاب کی یہ روش نامحمود ہے کہ وہ علامہ اقبال کے چند
اشعار سے وطنیت کے متعلق اُن کے تصور کی تعیین فرماتے ہیں۔ اور ان کی
تحریرات کو یک سر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اقبال مرحوم کے واضح
اور مذہبی تصورات کو کسی قدر دھندلا بنا دیتے ہیں۔ خود شعر و شاعری کی بابت
کے یہ الفاظ ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہئیں۔

"شاعرانہ القا یا الہام سے جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے وہ اعلیٰ
انفرادی حیثیت کا ہے۔ وہ مجازی، مبہم اور غیر متعلق یعنی نامشخص
ہوتا ہے" (خطبات صفحہ ۱)

شوکت سبزواری

ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

زرعی اصلاح و ترقی کا کام کون کرے؟

زرعی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں عام طور پر اسے کافی سمجھا جاتا ہے کہ نئی پالیسی کا رُخ متعین کر دیا جائے اور مجوزہ اصلاحوں کا شمار کرا دیا جائے۔ لیکن اس کام کا آغاز اس کی نگرانی اور اس کی تکمیل کون کرے یعنی مناسب انتظامی مشین کے قائم کرنے کے سوال کا جواب غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اصلاح کے تمام بڑے کاموں کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ سرکاری افسروں اور ان کے عملے کی موجودہ ذہنیت کو بدلا جائے۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ دیہات میں ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو ان قابل لوگوں سے کام لے سکیں جو مقامی طور پر موجود ہیں اور خود گاؤں کے لوگوں میں اپنی مدد آپ اور اپنی اصلاح آپ کے جذبے کو بیدار کر سکیں۔ اس ضمن میں آیئے سب سے پہلے موجودہ عمال حکومت کی خامیوں اور خرابیوں کا ایک جائزہ لیں۔

نظام حکومت میں اصلاح یہ ظاہر ہے نظام حکومت میں مملکت کے مقاصد برابر جھلکتے رہتے ہیں۔ کسی مملکت کو زندہ اور فعال صورت میں دیکھنا ہو تو اس کے نظام حکومت کا مشاہدہ کر دیجئے۔ اس لئے نظام حکومت کی اصلاح کے مسئلے کو مملکت کے مشاغل اور فرائض کی روشنی ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو نظام حکومت محض امن و امان کو قائم رکھنے کے لئے بنایا گیا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ مملکت کے وسیع تر مقاصد کو پورا کر سکے گا، غلط ہوگا۔ موجودہ مملکت کی نوعیت کا عکس لازمی طور پر دفتری حکومت ہی کی صورت میں نظر آ سکتا تھا۔ سرکاری حاکم، چاہے وہ کتنے ہی اہل اور کارگذار کیوں نہ ہوں، اپنے کام کی قدر دانی، رعایا اور عوام سے کرانا نہیں چاہتے بلکہ حکام بالا سے کرانا چاہتے ہیں اور یہ بات اعلیٰ سے اعلیٰ افسر سے کر ادنیٰ سے ادنیٰ عہدہ دار حکومت تک

سب پر صادق آتی ہے۔ کسی ملک کے اندر اعلیٰ ترین عاملہ کا دستوری حیثیت
غیر ذمے دار ہونا سارے نظام حکومت پر غیر ذمے داری کا ایک چھاپ لگا
لیکن جب اعلیٰ ترین عاملہ کی نوعیت بدل جاتی ہے تو اس کے ساتھ ہی آہستہ آ
لیکن غیر محسوس طریقے پر ان تمام افسروں کا رویہ بھی بدل جاتا ہے جو مملکت کی پالیسی
عملی جامہ پہناتے ہیں اور عام پبلک سے روزانہ دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ غالباً
کے ملازموں میں جو اعلیٰ احساسِ فرض، ایمانداری اور مکمل خود گذاری پائی جاتی
اور ہندوستان کے افسروں میں عام طور پر جو رعونت اور حاکمانہ نشینی پائی جا
ہے اس کی تہہ میں یہی بنیادی فرق کارفرما نظر آتا ہے۔

سرکاری افسروں کی ذہنیت میں تبدیلی

اس لئے سب سے مقدم ضرورت یہ ہے کہ حکومت کی ذہنیت میں
تبدیلی پیدا کی جائے۔ جو دفتری حکومت اس وقت کام کر رہی
ہے وہ کسانوں کی ضرورت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس کے ہر کام میں گھس گھس اور
دفتری خانہ پری پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز میں اصلاح کے جو
قوانین نہایت نیک نیتی سے منظور کئے جاتے ہیں ان کا خاطر خواہ اثر اس بہتری کے ساتھ ظاہر
نہیں ہوتا جس کی کہ امید کی گئی تھی۔ آج کوئی شخص سرکاری افسروں کے بارے میں یہ نہیں
کہہ سکتا کہ عوام کبھی بھی ان سے ہمدردی، امداد یا رہنمائی کے متوقع رہتے ہیں۔ سرکاری
افسر اور غیر سرکاری لوگ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دو مختلف جنسوں سے تعلق رکھتے
ہیں۔ یہ دو ایسی جماعتیں نظر نہیں آتیں جو مختلف راستوں سے ایک ہی قسم کا کام کر رہی
ہوں بلکہ یہ مخالفوں کے دو گروہ معلوم ہوتے ہیں اگر سرکار یہ چاہتی ہے کہ جماعتی خدمت
کے ادارے کی حیثیت سے کوئی زندہ اثر کام شروع کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ
وہ بہت نیچے تک اپنے عہدہ داروں میں خدمت کی ذہنیت پیدا کرے۔ ان میں لوگوں
ضرورتوں، ان کی مشکلوں اور ان کے جذبات کو بہتری کے ساتھ سمجھنے کی صلاحیت ہونا

چاہئے۔ ان کے رویئے میں اس وقت جو دھاندلی کا انداز پایا جاتا ہے وہ ختم ہونا چاہئے انھیں اپنے آپ کو عوام کے حقوق کا محافظ سمجھنا چاہئے۔ ان کا مخدوم نہیں بلکہ خادم سمجھنا چاہئے۔ ذہنیت کے اندر یہ تبدیلی مرکز کی طرف سے مناسب رہنمائی کے ذریعے ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔ سرکاری ملازموں کی بھرتی اور ترقی کا اگر مناسب نظام اختیار کیا جائے گا اور اس کے معیاروں میں پالیسی کے نئے نصب العینوں کے پیش نظر بنیادی تبدیلیاں پیدا کی جائیں گی تو اس چیز کو ضرور حاصل کیا جا سکے گا۔

سرکاری گھس پھس اور دفتری خانہ پری

اس بات کا ثبوت کہ موجودہ نظام حکومت کسانوں کی ضرورتوں کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ تقاوی کے قرضوں کے تجربے سے ملتا ہے مصیبت کے زمانے میں گاؤں والے بطور حق کے تقاوی کا قرض حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ اپنے اس حق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو انھیں ایک نہایت پیچیدہ اور طویل طریقۂ کار کی پیروی کرنا پڑتی ہے جس کے مکمل ہونے میں بڑی دیر لگتی ہے اور کئی دفعہ تحصیل کے صدر مقام کے چکر لگانا پڑتے ہیں۔ اس کے بعد بھی اس کسان کو خوش نصیب سمجھا جاتا ہے جسے کسی نہ کسی شخص کو کچھ نہ کچھ دئے بغیر تقاوی مل جاتی ہے تقاوی کے وصول کرنے کے طریقوں میں بھی کوئی لچک اور ہمدردی نہیں پائی جاتی۔ یہ بات کو سب کمیٹیوں اور کمیشنوں نے تسلیم کیا ہے کہ کسان اس وقت بھی جب کہ اسے حکومت سے قرض لینے کا حق اور موقع حاصل ہوتا ہے، گاؤں کے ساہوکار سے قرض لینا زیادہ پسند کرتا ہے کیونکہ وہاں سے قرض اسے آسانی سے مل سکتا ہے اور اس کے کام کے طریقوں کو وہ سمجھ سکتا ہے۔ انھی وجوہ کی بنا پر اعلیٰ طبقے کے وہ کسان بھی جن میں کچھ خودداری کا احساس ہوتا ہے سرکاری قرضوں کو نہیں لیتے اور ان کی جگہ نہایت گراں شرح سود پر ساہوکار سے قرض لینا جاری رکھتے ہیں۔

ہر وہ شخص جب حکومت سے کبھی بھی کوئی واسطہ پڑا ہے سرکاری تاخیر کی مثالیں

اپنے ذاتی تجربے سے پیش کر سکتا ہے۔ کاغذی گھوڑوں کو ایک دفتر سے دوسرے میں ذرا ذرا سی بات پر اور قانون کی لفظی گرفت کی بنا پر دوڑاتے رہنا وہاں روز ہے۔ دفتر کے لوگ ان تدبیروں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں جن سے ان کا خو پتہ ان کے اعلیٰ افسروں کو ان کے ماہانہ گوشواروں سے ہرگز نہیں چل سکتا " انصاف تاخیر کے معنی یہ ہیں گویا انصاف سے محروم کر دیا گیا " یہ قول عدالت کے کام کے جس قدر صحیح ہے اتنا ہی سرکار کے دوسرے کاموں کے لئے بھی صحیح ہے۔ سول انتظا حکومت کا اگر تازہ ترین اور اندوہناک ترین مظاہرہ دیکھنا ہو تو بنگال کے حالیہ قحط کا ملاحظہ کیجئے جہاں کی صورت حال پر قابو صرف اسی وقت پایا گیا جب غلہ کی نقل و حمل اور تقسیم کا کام فوج کے حوالے کیا گیا۔

رشوت ستانی | اس کے بعد رشوت ستانی کا مسئلہ ہے۔ بے شمار مواقع ایسے ہوتے ہیں جب گاؤں والے سرکاری عہدہ داروں سے کوئی نہ کوئی کام کرانا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کا واسطہ زیادہ تر محکمہ مال عدالت اور پولیس کے عہدہ داروں ہی سے پڑتا ہے گاؤں والوں کو بعض سہولتوں، رعایتوں اور معافیوں کی ضرورت ہوتی ہے انھیں مال گذاری ادا کرنا ہوتی ہے انھیں دیوانی اور فوجداری کے مقدموں میں گواہی دینا ہوتی ہے۔ انھیں کسی دستاویز کی رجسٹری کرانا ہوتی ہے۔ اس قسم کے تمام موقعوں پر انھیں دفتری حکومت کے کسی نہ کسی عہدہ دار کی دلجوئی کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ انھیں دیر بے آرامی غیر ضروری خرچ بلکہ تشویش اور اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ سرکاری دفتروں کے صحیح طریقہ کار سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بعض وقت وہ قانون کی گرفت سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے صرف ایک راستہ کھلا ہوتا ہے یعنی کسی نہ کسی کی مٹھی گرم کرنا اور غیر قانونی مطالبوں کو پورا کرنا۔

اس بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ رشوت ستانی ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے نہ یہ کہ

ں بھی موجود ہے وہاں قصور سارا سرکاری عہدہ داروں کا ہے۔ لیکن یہ برائی بلاشبہ موجود اور حکومت بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہے۔ جب عوامی وزارتیں برسرِ حکومت تھیں انھوں نے رشوت ستانی کے خلاف مہم شروع کی تھی۔ اس بات کے کہنے سے ہمارا مطلب ت اس قدر ہے کہ اگر واقعی اصلاح کرنا ہے تو سرکاری ملازموں کی ذہنیت کا دیل کرنا سب سے مقدم ہے۔

اس بات کو بھی سب لوگ جانتے ہیں کہ گاؤں والوں کو بیگار دینا پڑتی ہے جس کا کبھی ں معاوضہ مل جاتا ہے اور کبھی نہیں ملتا جب کبھی ملتا ہے تو وہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی گاڑی یا خود اسے عین اس وقت خدمت کے لئے طلب کیا جا سکتا ہے جب اس کی کھیتی کا کام جاری ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی افسر گاؤں میں ڈیرا ڈالتا ہے تو گاؤں کے لوگوں کو اس کے عملے کے کھانے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ چاہے بعد میں انھیں اس کے دام ہی کیوں نہ مل جائیں تفتیش جرم کی صورت میں پولیس کے لوگ گاؤں میں آتے ہیں اور کئی دن تک وہاں قیام کرتے ہیں اور ان کا خرچ گاؤں والوں کو اٹھانا پڑتا ہے۔

نگرانی اور معائنہ سرکار نے معائنہ کرنے والوں کو بھی دفتروں کی کارگزاری کا پتہ چلانے کے لئے مقرر کیا ہے۔ وہ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ آیا مقدمات کا فیصلہ جلد کیا جاتا ہے یا نہیں گوشوارے تیار کراتے ہیں اور ان افسروں کو اکثر یہ ہدایتیں دی جاتی ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مقدموں کا فیصلہ موقع واردات پر کر دیا کریں اور دادرسی کے کام کو تیزی سے پورا کر لیا کریں۔ دفاتر کے انتظام کے لئے اور اصلاح و ترقی کے کاموں کے لئے افسروں اور ان کے ماتحت عملے کی تربیت کا بھی انتظام موجود ہے لیکن ابھی تک ان انتظامات کے خاطر خواہ نتیجے نہیں نکلے ہیں۔ پولیس کو مشکل ہی سے خزانہ کیا جا سکتا ہے اور دوسرے سرکاری ملازموں کی تعلیم بھی ابھی بہت کم ہے۔

اعلیٰ افسروں کا اثر بھی جن سے معمولاً اصلاح حال کی توقع قائم کی جا سکتی ہے کم ہوتا

جا رہا ہے۔ موٹروں کے رواج نے گاؤں کے دورے میں اختصار اور جلد بازی
ہے اور اس کی وجہ سے عوام کے ساتھ ان کے میل کے مواقع کم ہو گئے ہیں اب جو
زیادہ تر ادنیٰ عہدہ داروں ہی سے رہتا ہے۔ اعلیٰ افسروں کے پاس اگر کبھی شکایتیں
ہیں تو ان کا میلان اپنے ماتحتوں کی طرفداری کی جانب ہوتا ہے۔ کیونکہ دفتری حکومت
ایک واحد نظام رکھتی ہے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر کسانوں کے دل سے سرکاری عہدہ داروں اور افسروں
جاتا رہا ہے اور وہ انہیں عموماً طور پر بد اعتمادی اور خوف کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اسی دوری
غلط فہمی کی وجہ سے حکومت کی بہت سی نہایت اچھی اسکیمیں ناکام ثابت ہو چکی ہیں اور
امداد باہمی کی انجمنوں کی ناکامی کی بھی ہے۔ جو شخص بھی موجودہ صورت حال پر غور کرے
وہ محسوس کرے گا کہ اب اس طرف سے تغافل کرنا نہایت غیر مناسب ہے۔ اصلاح کی
چیزوں کی کامیابی کے لئے حکومت کے نمائندوں اور گاؤں والوں میں دوستانہ روابط
کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

<u>مقدم یا نمبردار</u> مقدم یا نمبردار کی موجودہ حیثیت اس بات کو اور بھی اچھی طرح ظاہر کرتی
ہے۔ پرانے زمانے میں یہ شخص گاؤں کا ایک قدرتی رہنما ہوا کرتا تھا اور لوگ ہر معاملہ میں
اس سے ہدایت اور مشورہ کے متوقع رہتے تھے۔ وہ ان کے رنج و راحت میں برابر
شریک رہتا تھا۔ وہ گاؤں کی جماعت کا ایک فرد ہوتا تھا اور "ہر کہ خدمت کرد او مخدوم
شد" کی ایک زندہ مثال ہوتا تھا لیکن اب وہ ایک "افسر" یعنی سرکاری ملازم بن گیا ہے
اور اس کو اپنی جگہ پر قائم رہنے کے لئے اعلیٰ عہدہ داروں کی سرپرستی کا سہارا لینا پڑتا ہے
اس کے فرائض بہت سخت ہیں۔ اسے پیدائش اور اموات کا اندراج کرنا ہوتا ہے۔ اسے
جرائم، مداخلت بے جا اور وبا اور بیماری کے بارے میں اطلاع کرنا ہوتی ہے۔
اسے پٹواری کی اور مالگذاری کے افسروں اور پولیس کے لوگوں کی ان کے فرائض کی بجا آوری

لے میں امداد کرنا ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کسی کام کو پورا کرنے سے وہ قاصر رہتا ہے تو زا کا مستوجب ہوتا ہے۔ افسروں کے دورے کے وقت اُسے خرچ اُٹھانا پڑتا ہے ہی وہ اس ہنر کو سیکھ جاتا ہے جس کے ذریعے اپنے آقاؤں کو خوش رکھا جا سکتا ہے اور رت کے وقت رعیت کی چمڑی اُدھیڑی جا سکتی ہے اور اس قسم کی ضرورتیں ہزاروں کی د میں نمودار ہوتی رہتی ہیں۔ اس نظام کو "اوپر سرکار، نیچے بے گار" کے نام سے موسوم کیا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اگر کسی بات پر نمبردار، پٹواری اور پولیس کے دیوان بھی جائیں تو پھر غریب دیہاتی کا اس دنیا میں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ ہندوستان کے گاؤں یک پُرامن بہشت فرض کرنا محض افسانہ پرستی ہے۔ جب لوگوں کے پاس بہت سا لی وقت ہوتا ہے تو انہیں جھگڑا کرنے میں مزا ملنے لگتا ہے اور سرکاری افسر جھگڑا کرنے والوں ساتھ دیتے ہیں۔ جھوٹے دعوے، جھوٹی گواہیاں اور مقدمہ بازی کا طویل سلسلہ گاؤں زوال اور نفاق کی تصویر کو مکمل کرتے رہتے ہیں۔

جن لوگوں نے ہندوستان کے گاؤں کو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے ان کو یہ بیان بالغہ آمیز نظر آئے گا۔ لیکن جو شخص رات دن گاؤں کے لوگوں کے درمیان اُٹھا بیٹھا ہو ور جس نے اُن کے مسئلوں کو ہمدردی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہو اسے اس بیان میں دیہی علاقہ جتماعی زندگی کی صحیح جھلکیاں نظر آئیں گی۔ لیکن یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا حکومت کی طرف سے ی تعمیر کے جو کام ہو رہے ہیں انھوں نے اس حالت میں کوئی بہتری نہیں پیدا کی ہے؟ تماشا یہی ہے کہ اس سوال کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا، سرکاری رپورٹیں اس کا جواب اثبات میں یتی بھی ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ سرکاری نگرانی میں انجمنیں بنائی جاتی ہیں۔ نمائشیں منعقد ہوتی ہیں۔ ہل اور دوسرے آلات رعایتی قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں۔ بڑے حکام خوش کرنے کے لئے جیٹھ کے دن پورے گاؤں کی صفائی کر دی جاتی ہے۔ لیکن ان سب اموں کو گاؤں کے "نئے رہنماؤں" کا طبقہ انجام دیتا ہے۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے ساہوکاری

یا زائد لگان وصول کرکے کچھ روپیہ اکٹھا کر لیا ہے اور جن کے پاس گاؤں کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے فرصت ہوتی ہے۔ اس قسم کے تماشے کرکے وہ اپنا اثر بڑھا لیتے ہیں۔ لیکن جیسے ہی اعلیٰ حکام پیٹھ موڑتے ہیں ہر چیز اپنی پرانی بے ڈھنگی رفتار پر آجاتی ہے۔ یہ نئے رہنما "اصلی کاشتکار" نہیں ہوتے۔ انھیں حقیقتاً کھیتی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی اولاد سرکاری ملازمتوں یا علمی پیشوں کا دروازہ کھٹکھٹانی ہے کھیتی کو یہ حقیر سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ شہروں میں جا بستے ہیں اور "پرباسی" زمیندار بن جاتے ہیں۔ جب کامیاب ہوتے ہیں تو دوبارہ اپنا روپیہ زمینداری کی خریداری میں لگاتے ہیں اور یہ کے اس چکر کو دائمی بنا دیتے ہیں۔ جب حالات یہ ہوں تو کسی دیرپا ترقی کی امید قائم نہیں کی جا سکتی۔

اصلاح کی صورت اس لئے اصلاح کی اولین شرط یہ ہے کہ پہلے ان کارکنوں کی اصلاح کی جائے جو کسانوں سے براہ راست واسطہ رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کا اعتماد اور اشتراک حاصل کر سکیں۔ ایک معمولی کسان اپنا فائدہ خوب جانتا ہے وہ چالاک اور حوصلہ مند تو نہیں ہوتا۔ لیکن مخلص محنتی اور ایماندار ضرور ہوتا ہے اور صحیح رہنمائی کو قبول کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ رشوت ستانی اور دوست پروری ایسی برائیاں ہیں جو مشرقی ملکوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لئے ان سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ان کو تو گوارا ہی کرنا ہوگا۔ لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ مغرب کے بہت سے ملکوں میں بھی اجتماعی زندگی کے ارتقا کی ایک خاص منزل میں سخت قسم کی بدانتظامی اور بددیانتی عام طور پر پائی جاتی تھی۔ یورپ کے جاگیردارانہ نظام سے اس قسم کی کافی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کا صحیح علاج جمہوری حکومت ہے۔ جب کسی قوم کی عزت نفس بیدار ہو جاتی ہے تو وہ فرسودہ خیالوں اور تعصب امیزیوں کو ترک کر دیتی ہے اور ترقی پسندی کی کوشش کرنے لگتی ہے

یہ زمانہ تھا جب مہذب دنیا کے لوگ جاپان اور روس پر ہنسا کرتے تھے کہ ان کے یہاں لوٹ اور اندرونی سازشوں کی بڑی گرم بازاری ہے اور ان کی جمہوری اہلیتوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن ان ملکوں کی ترقی نے ثابت کر دیا ہے کہ تعلیم اور جمہوریت کے ذریعے کیسا انقلاب کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں ناخواندگی۔ معاشری نظام کی غیر تغیر پذیری اور لوگوں کے اس جمود کی وجہ سے جو صدیوں کے ظلم و افلاس کا نتیجہ ہے۔ اصلاح کا کام بہت مشکل ہو گیا ہے غلامی اور غلامی برابر ہماری قومی زندگی کی جڑوں پر کلہاڑا چلا رہی ہے۔ لیکن ان کے باوجود ہندوستان کے دل کی حالت ابھی تک ٹھیک ہے۔ عوامی تحریکات کے اثر کو ہندوستان ضرور قبول کرے گا۔ اگر حکومت کے کارکنوں کی ذہنیت تبدیل ہو جائے اگر سرکاری افسروں اور عوام کے مقاصد میں یک جہتی پیدا ہو جائے تو دیہی علاقے کی کایا پلٹی جا سکتی ہے۔ علاج صرف یہ ہے کہ سرکاری کارکنوں میں خدمت کرو اور مخدوم شدہ کا جذبہ پیدا کیا جائے نمبردار، پٹواری، اور تحصیل دار کو انتظام حکومت کے فن کا ضرور ماہر بنایا جائے لیکن انھیں اپنے آپ کو عوام کا خادم سمجھنے کی بھی تربیت دی جائے تاکہ وہ انھیں آہستہ آہستہ بہتر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کر سکیں۔ ان کا کام خادم کی حیثیت سے اپنے آقاؤں کی تعلیم ہونا چاہئے۔

معاشی بہتری کے لئے جو تحریکیں چلائی جائیں گی وہ خود صحت مند قوتوں کو ابھاریں گی۔ لیکن اگر حکومت کی انتظامی مشین میں اوپر لکھی ہوئی اصلاحیں کر دی جائیں گی تو گاؤں والوں کو ضروری رہنمائی مل سکے گی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ خود گاؤں والوں کے اندر اپنے اداروں کے ذریعے اپنی مدد آپ کرنے کے جذبے کو ترقی دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں ہر گاؤں میں ایک پنچایت۔ ایک امداد باہمی کی انجمن اور ایک اسکول کا انتظام کرنا [illegible] اور دوسرے طریقوں پر ان کے اندر اجتماعی زندگی کو ترقی دینا ہوگی۔

سرمنی لال بی نانا وتی

صنعتی انقلاب اور اس کے بعد کی معاشی تر

انگلستان میں اٹھارھویں صدی کے آخری نصف میں نام نہاد "صنعتی
ہوا۔ اس وقت سے آج تک معاشی کاروبار کا رجحان مغربی اور مغرب پرست
طور پر بلندی کی طرف رہا ہے۔ ایک طرف آبادیوں میں بڑے اضافے ہوئے ہ
اور ویلز کی آبادی جو ۱۸۰۱ء میں ۹۰ لاکھ تھی ۱۸۵۱ء میں ایک کروڑ ۹۰ ل
چار کروڑ ہو گئی ہے۔ دوسری طرف پیدائش دولت میں اس سے بھی زیادہ اضا
اگرچہ اس کو صحیح صحیح ناپا نہیں جا سکتا کیونکہ نئی نئی چیزیں برابر دریافت کی جاتی رہی
مجموعی پیداوار میں مصنوعات اور خدمات کا تناسب بڑھتا رہا ہے اور زراعتی پیدا
کا گھٹتا رہا ہے۔ جو بہترین تخمینے موجود ہیں۔ ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انگلس
ویلز میں پیداوار کس سو سال پہلے کے مقابلے میں آج دو یا تین گنا زیادہ ہو گئی
اس کی وجہ سے زندگی کے عام معیار میں خاصی بلندی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو بھی
ناپا نہیں جا سکتا۔ لیکن سو سال کے بیانات کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ا
کے بہت سے مزدوروں کے خاندان اور خاص کر کھیتوں پر کام کرنے والے مزدور
زندگی بسر کرتے تھے جس کا شمار آج کل افلاس اور فاقہ زدگی میں کیا جائے گا۔ اس میں
شبہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانے کے مزدور کو غذا، مکان، لباس نیز سفر، تعلیم ا
تفریح کی سہولتیں اپنے دادا بلکہ اپنے باپ سے بھی کہیں زیادہ حاصل ہیں۔ کام
ہفتہ کی لمبائی جس کا ناپنا ممکن ہے بلاشبہ کم ہو گئی ہے۔ فیکٹری اور تعمیرات کے
مزدوروں کو انیسویں صدی کی دو تہائی مدت گزرنے تک ہفتہ میں ۶۰ گھنٹے سے زیا
کام کرنا پڑتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں اکثر مزدوروں کو ۵۴ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ آج وہ صرف

ں سے کم کام کرتے ہیں۔ شرح اموات کی کمی کو بھی ناپا جا سکتا ہے۔ انگلستان
شرح اموات سنہ [illegible]ء تک ۲۱ فی ہزار تھی۔ آج یہ ۱۲ سے کم ہے۔ پچھلے
رح اموات کی زیادتی کا سبب کچھ تو طبی واقفیت کی کمی تھی لیکن اس سے زیادہ
ہ لوگوں کو کافی غذا کھانے کو نہیں ملتی تھی۔ انگلستان اور ویلز کے بارے میں
اور اعداد درج کئے ہیں لیکن اس سے ملتے جلتے اعداد، آبادی، پیداوار
زندگی کے اضافے کے بارے میں مغرب کے اکثر ملکوں کے لئے پیش کئے
یں۔

م زیادہ تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ معاشی کاروبار کی اس غیر معمولی توسیع
ے چند عام باتیں درج کئے دیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس توسیع کا سلسلہ
ہوا ہے بلکہ برابر جاری ہے۔ مغربی یورپ میں آبادی کی توسیع تو ضرور رک گئی ہے
سری چیزوں میں اضافے کی طرف میلان اب تک برابر جاری ہے۔ اس کی تصدیق
اقعات اور اعداد پیش کئے جا سکتے ہیں۔ گذشتہ بیس تیس سال میں بہت سی ایسی بڑی
وجود میں آئیں جو اس قسم کی چیزوں کو بناتی یا استعمال کرتی ہیں جیسے کہ ربڑ، پیٹرول،
، بجلی کے آلات، سینما کے فلم جن سے لوگ پہلے یا تو واقف نہیں تھے یا جن کی نسبتی
نی زیادہ نہیں تھی۔ کوئلے کی پیداوار دنیا میں سنہ [illegible]ء میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ
۔ سنہ [illegible]ء میں چار کروڑ ۵۰ لاکھ، سنہ ۱۸۹۰ء میں ۵۰ کروڑ۔ اور سنہ ۱۹۱۳ء
ب ارب ۲۰ کروڑ ٹن ہو گئی تھی۔ اس وقت سے دوسری چیزوں کے مقابلے میں
ہ پیداوار میں نسبتاً کم اضافہ ہوا ہے۔ اس کی جگہ دوسری چیزیں مثلاً معدنی
یل ایک حد تک استعمال کی جانے لگی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سنہ ۱۹۳۶ء میں دنیا
ئلے کی پیداوار ایک ارب ۳۰ کروڑ ٹن تھی۔ اس کے مقابلے میں خام پیٹرول کی
ار سنہ [illegible]ء میں ۲ کروڑ ٹن، سنہ ۱۹۱۳ء میں ۵ کروڑ ٹن اور سنہ ۱۹۳۶ء میں ۲۳ کروڑ ٹن

تھی۔ لوہے کی پیداوار ۱۷۴۰ء میں ۲ لاکھ ٹن تھی۔ ۱۸۴۰ء میں ایک کروڑ ہوئی ۱۸۸۰ء میں ۳ کروڑ اور ۱۹۲۶ء میں ۹ کروڑ ٹن ہو گئی۔ ایک لحاظ سے صنعتی انقلاب کا دارومدار کوئلہ اور لوہے ہی پر تھا۔ لوہے کی ضرورت ابتدا میں مشینیں بنانے کے لئے اور بعد میں انجن اور ریل کی گاڑیاں بنانے کے لئے ہوئی اور کوئلے کی ضرورت مشینوں اور انجنوں کے لئے قوت محرکہ فراہم کرنے کے لئے ہوئی۔ اس لئے اگر صنعتی ترقی کو ناپنے کے لئے کوئلہ اور لوہے (اور موجودہ زمانے میں فولاد اور پٹرول) کی پیداوار کو استعمال کیا جائے تو ان کے اعداد کے دیکھنے سے یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ترقی کی رفتار بھی برابر تیز ہوتی جا رہی ہے۔

ان مشینوں کا رواج جو بھاپ کی قوت سے چلتی تھیں آہستہ آہستہ ہی ہوا۔ واٹ نے ۱۷۸۱ء میں اسٹیم کے انجن کو ایجاد کیا تھا اور گردش میں لانے والی حرکت کو جس کے ذریعے ہر قسم کی مشینوں کے چلانے کا امکان پیدا ہوا۔ ۱۷۸۵ء میں ایجاد کیا گیا۔ لیکن ۱۸۰۰ء میں ساری سلطنت متحدہ برطانیہ میں صرف ۲۸۹ بھاپ کے انجن کام کرتے تھے۔ ۱۸۳۳ء میں قوت محرکہ سے چلنے والے کرگھوں کی تعداد ایک لاکھ ۲۳ ہزار تھی۔ (آج ان کی تعداد دس لاکھ ہے) اور ان میں سے سات ہزار کو چھوڑ کر باقی سب روئی کی صنعت میں لگے ہوئے تھے۔ روئی کی صنعت کے علاوہ دوسری صنعتوں میں ۱۸۳۰ء بلکہ ۱۸۵۰ء تک انگلستان میں فیکٹریوں کا نظام عام طور پر رائج نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ملکوں میں یہ نظام اور بھی بعد میں رائج ہوا۔

اس کی ایک حد تک یہ وجہ تھی کہ مزدوروں میں نقل پذیری کم پائی جاتی تھی۔ بعض ملکوں میں مزدور انیسویں صدی کے خاصے طویل زمانے تک بیگار کے نظام کے ماتحت زمین کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ انگلستان میں انہیں نقل و حرکت کی آزادی تھی لیکن بہت سے شمال کی جانب (کیونکہ آبادی کا بیشتر حصہ جنوب میں تھا

نقل سکونت کر کے اور فیکٹریوں میں داخل ہونے کے لئے تیار ہوتے تھے۔ شروع کے سالوں میں فیکٹری کے مزدوروں میں زیادہ تر آئرلینڈ کے لوگ تھے۔ لیکن اصل وجہ فیکٹری نظام کی ترقی کے سست ہونے کی یہ تھی کہ ابھی معاشی کاروبار کی مختلف شاخوں میں ترقی ہونا باقی تھی۔ کئی عشرے گزر گئے۔ جب کہیں قوت محرکہ سے چلنے والے کرگھے سوت کی پیداوار کے اضافے کا ساتھ دے سکے جو کاتنے اور دھننے کے طریقوں کی اصلاح و ترقی سے ممکن ہو گئی تھی اور اس سے بھی زیادہ مدت کپڑے کی تیاری کے بعد کی منزلوں کو بہتر بنانے کے لئے صرف کرنا پڑی۔ ابتدائی اسٹیم انجنوں اور مشینوں کو ہاتھ سے بنایا جاتا تھا۔ اس لئے ان میں بہت سی خرابیاں رہتی تھیں اور وہ اکثر ٹوٹتی رہتی تھیں ۱۸۲۳ء میں کہیں جا کر مشین بنانے والے اوزاروں کی اہم ایجادیں ہوئیں اور انھوں نے مشین بنانے کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا جس کی وجہ سے صحیح اور قابل اعتماد مشینوں کو بڑی تعداد میں بنایا جا سکا۔ مزدوروں کو مشینیں بنانے ان کی مرمت کرنے اور انھیں استعمال کرنے کی تربیت دینی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مشینوں کی ترقی ایک حد تک کوئلے کی کان کنی اور فولاد سازی کی صنعت کی ترقی پر بھی منحصر تھی۔ غرض اس پیچیدہ نظام پیدائش کے ماتحت کسی ایک شعبے میں ایجادوں سے اسی وقت فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا. جب ساتھ ہی ساتھ دوسرے شعبوں میں بھی ترقیاں ہوں اور یہ بات آج بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی جب تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک شعبہ کی ترقیوں سے دوسرے شعبے کی ترقیوں کو تحریک ہوتی ہے اور انھیں ان سے امداد ملتی ہے اور یہ اپنی جگہ پھر اور نئی ترقیوں اور اصلاحوں کا موجب ہوتی ہیں۔ چنانچہ ترقی یافتہ کاتنے کی مشینوں نے لوگوں کو قوت محرکہ سے چلنے والے کرگھے ایجاد کرنے کی طرف مائل کیا۔ اسی طرح کوئلے کی کانوں سے پانی نکالنے کے لئے جب بھاپ کے انجنوں کو استعمال کیا گیا تو کوئلہ سستا ہوا اور کوئلے کے سستے ہونے کی وجہ سے بھاپ کے انجنوں کی لاگت کم ہو گئی اور ان کی مانگ

بڑھ گئی۔

مختلف شعبوں کی ترقی میں جو باہمی انحصار پایا جاتا ہے اس کی نہایت اہم مثال نقل وحمل کی ترقی میں نظر آتی ہے۔ شہروں کے درمیان تقسیم کار کو اس وقت تک زیادہ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ منڈی کا رقبہ نقل وحمل کی لاگت کے زیادہ ہونے کی وجہ سے محدود رہتا ہے۔ وہ شہر جو بعض چیزوں کو خود پیدا نہیں کر سکتے، ان کی کم مقداروں ہی کو دوسرے شہروں سے منگا سکیں گے کیونکہ نقل وحمل کے مصارف کی وجہ سے ان کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو جائے گا۔ اکثر شہر جو اشیاء پیدا کر سکیں گے پیدا کرنا جاری رکھیں گے۔ کیونکہ جن شہروں کو نسبتی فوائد اور کم تر مصارف اس وجہ سے ہوتے ہوں گے کہ ان کی آب وہوا یا زمین بعض پیداواروں کے لئے خاص طور پر موزوں ہے یا جن کے یہاں کوئلہ یا خام لوہا یا دوسری معدنیات موجود ہیں یا جن کے یہاں ایک خاص صنعت مرکوز ہو چکی ہے ——— ان کے ان فوائد کی تلافی خاصے فاصلوں پر منتقل کرنے کے مصارف کی زیادتی سے ہو جائے گی۔ اٹھارھویں صدی میں نقل وحمل کے مصارف بہت زیادہ تھے اور صرف بیش قیمت چیزوں ہی کو بڑے فاصلے پر خصوصاً خشکی کے راستے سے منتقل کرنے میں فائدہ تھا۔ لیکن میکاڈم اور دوسرے لوگوں نے سڑکوں کو ترقی دی، نہریں بنائی گئیں۔ دریاؤں میں جہازرانی کا امکان پیدا کیا گیا اور سب سے بڑی تبدیلی ریلوں کی تعمیر کے ذریعے ہوئی۔ ۱۸۲۵ء میں پہلی بھاپ کی ریل (اسٹاکٹن اور ڈارلنگٹن ریلوے) بنائی گئی جس پر بھاپ سے چلنے والی گاڑی چلائی گئی۔ لیکن جب تک انیسویں صدی نصف کے قریب نہیں گذر چکی اس وقت تک انگلستان میں ریلوں کا جال نہیں بچھ سکا۔ اور دوسرے ترقی پسند ملکوں میں یہ ترقی اور بھی بعد میں ہوئی۔

ریلوں نے پورے براعظموں کو باہم منسلک کر دیا۔ اب لوگ ساحلوں اور دریا کے کناروں پر آباد ہونے کی جگہ وسط ملک میں آباد ہو سکتے تھے۔ وہ دور دراز منڈیوں

میں فروخت کر[illegible] کے لئے فصلیں وسط ملک میں بوئی جا سکتی تھیں۔ [illegible]ء میں معاشیات کے ماہر میک کلاؤچ نے لکھا تھا کہ انگلستان میں زندہ مویشی اور نمک لگا ہوا گوشت سوائے ہیمبرگ کے کسی دوسرے مقام سے درآمد نہیں کیا جا سکتا اور وہاں سے بھی درآمد کی توقع زیادہ نہیں کی جا سکتی۔ اُس نے کہا تھا کہ جنوبی امریکہ سے ایک چھٹانک گوشت بھی نہیں آ سکے گا۔ [illegible]ء میں کیرڈ نے کہا تھا کہ انگلستان کے کسان کو عملاً غلّہ پر دس شلنگ فی کوارٹر کی ضمانت ملی ہوئی ہے کیونکہ ڈانزگ سے لندن تک غلّہ کو منتقل کرنے میں تقریباً دس شلنگ کے برابر لاگت آتی تھی۔ لیکن نقل و حمل کی تیز رفتار ترقی نے ان سب باتوں کو بدل ڈالا۔ امریکہ اور دوسرے سمندر پار ملکوں میں ریلوں کی تعمیر کی وجہ سے اور جہاز سازی کے فن تعمیر میں اصلاحات کی بنا پر [illegible]ء کے بعد غلّہ اور گوشت کا بڑی مقدار میں سمندر پار سے درآمد کرنا ممکن ہو گیا۔ نقل و حمل کے مصارف کی اسی مسلسل کمی نے انگلستان کے اور دوسرے ملکوں کے صناعوں کے لئے دنیا کی منڈی میں اپنا مال فروخت کرنے کا امکان پیدا کر دیا۔

ریلوں کی ترقی کو بڑی امداد ان مسلسل اصلاحوں سے ملی جو لوہے اور بعد میں فولاد کے پیدا کرنے میں کی جاتی رہیں۔ ریلوں اور ان کی گاڑیوں کے لئے لوہے اور فولاد کی بڑی مقداروں میں ضرورت ہوئی۔ اس زائد مانگ کی وجہ سے بڑے پیمانے کی کفایتیں حاصل کی جا سکیں۔ جس کی وجہ سے ریلوں اور ان کی گاڑیوں کی قیمت اور کم ہو گئی۔ سستے نقل و حمل نے لوہے اور فولاد کو اس طرح بھی بڑھایا کہ ان کی وجہ سے مصنوعات کو ترقی دینے کا موقع ملا اور اُن کی ترقی نے ہر قسم کی مشینوں اور سامانوں کی مانگ پیدا کی۔ دوسری طرف اس کی وجہ سے لوہے اور فولاد کے کارخانوں کو کوئلہ اور خام لوہا، اور بعد میں بیکار لوہا پہلے کے مقابلے میں زیادہ دور سے اور زیادہ سستی قیمت پر مل سکا۔ غرض کہ طرح لوہے اور فولاد کی صنعت نے ریلوں اور جہاز رانی کی ترقی میں مدد دی۔ اور خود انھوں نے [illegible] لوہے اور فولاد کی صنعت کی ترقی میں۔

ف۔ بنہم

لیگی سیاست کے نئے میلانات

مسلم لیگ کی سیاست اس وقت نہایت نازک مرحلے سے گزر رہی ہے۔ پنجاب کی لیگی وزارت ایک عرصہ ہوا ٹوٹ چکی ہے۔ سرحدی وزارت بھی حال میں ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ کانگریسی وزارت نے لی ہے۔ بنگال میں دفعہ ۹۳ کا نفاذ ہو گیا ہے یعنی آئین کو معطل کر کے سب اختیارات گورنر نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں۔ سندھ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت نے بہت سے پلٹے کھائے ہیں اور مختلف قسم کی مصالحتیں اس کو کرنا پڑی ہیں۔ آسام کی لیگی وزارت اور وہاں کے لیگی عوام میں کشمکش جاری ہے۔ لیگ کی وزارتوں پر لوگ رشوت ستانی کی تہمتیں لگا رہے ہیں۔ ان کے خلوص اور وفاداری پر حرف زنی کر رہے ہیں۔ یو۔پی میں لیگ کے اندر سخت اختلافات رہ چکے ہیں۔ انہیں اب ایک حد تک سلجھا لیا گیا ہے۔ مسٹر جناح بیمار ہیں۔ ان کی علالت کی وجہ سے لیگ کا سالانہ اجلاس ملتوی کرنا پڑا ہے۔ وائسرائے انگلستان گئے ہوئے ہیں اور کانگریسی رہنما جیلوں سے رہا ہو رہے ہیں۔ ہر طرف چرچا ہے کہ حکومت کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سپرو کی مصالحتی کمیٹی نے جو تجویزیں شائع کی ہیں ان میں دور دور کہیں پاکستان کا گزر نہیں ہے مہاتما گاندھی جس حد تک آگے بڑھ گئے تھے اس کے مقابلے میں یہ تجویزیں بہت رجعت پسند معلوم ہوتی ہیں کیا مسٹر جناح سے گاندھی جی کی ملاقات کو پاکستان کے مطالبے کا انتہائی نقطۂ عروج سمجھا جائے؟ کیا اس کے بعد اب زوال ہی زوال ہے؟ یہ سوال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے لگے ہیں۔ غرض حالات کچھ ایسے جمع ہو گئے ہیں جن میں لیگ کا مستقبل واقعی تشویش ناک نظر آتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لیگ کے لئے آزمائش کا وقت خلاف توقع بہت جلد آ گیا ہے اور اس کے پہلے مرحلے میں مسلم لیگ نے اپنی طاقت کا کچھ اچھا

ہی ہوا ہے۔

لیگ کے مخالف علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ لیگ جی حضوریوں اور جاہ پرستوں کی جماعت ہے اس میں نوابوں اور خطاب یافتہ لوگوں کا غلبہ ہے۔ اس کے سب کام سرکار کے اشارے پر ہوتے ہیں۔ جب کانگریس کو زک دینے کے لئے سرکار کو لیگ کو طاقتور رکھنے کی ضرورت تھی اس وقت تک لیگ میں خوب زندگی اور جوش و خروش تھا لیکن جب سرکار کو اس کی ضرورت نہیں رہی لیگ بھی ٹیں ٹیں فش ہو گئی۔ پاکستان کا مطالبہ اور لیگ ———— یہ صرف کانگریس کو منہ چڑھانے کی ترکیبیں تھیں ورنہ چند سرپھرے لوگوں کو چھوڑ کر، لیگ کے باقی تمام معزز رہنماؤں کو اس خرافات سے کیا مطلب۔ یہ سرکار پرست لوگ ٹھہرے۔ سرکار کا جدھر رُخ ہو وہی ان کا پاکستان ہے۔ پاکستان کے مطالبے کے لئے دل گردے کی ضرورت ہے یہاں تو ریڑھ کی ہڈی ہی سرے سے غائب ہے۔ سر سے پیر تک پلپلا گوشت اور بادی کا موٹاپا ہے۔ ان میں تو لچک ہی لچک ہے۔ یہ تو ایسی قلا بازیاں کھا سکتے ہیں کہ بڑے بڑے نٹ ان کے کارنامے دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائیں۔ یہ بے چارے سرکار کی ٹیڑھی نظر کی کیا تاب لائیں گے ان کا عشق پھولوں کی سیج پر ہوتا ہے۔ ان کا اظہار سخن شناس قدر دانوں کی محفلوں یا ڈنر کی میزوں پر غیر ملکی زبان کی خطابت و صحافت کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مجنوں کی صحرا نوردی کا فرہاد کی تیشہ زنی۔ سلاسل و آہن اور زنجیر یا وغیرہ کو یہ آئین عشق اور آداب محبت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کا رقیب اگر اوچھے ہتھیاروں اور غیر پارلیمنٹری طریقوں پر اتر آئے تو "استعفا میرا با حسرت و یاس" کہہ کر کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔

پھبتی کے شائق کہہ سکتے ہیں ؎

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

پاکستان کا مطالبہ جوان مردوں کو دعوت دیتا ہے جو اس کے حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے تیار ہوں۔ بوڑھے گوشہ گیر قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اپنی عمر بھر کی کمائی یا باپ دادا کی میراث کو سینے سے چپٹائے ہوئے ہیں یا جو سیاست بھی روپیہ کمانے کا ایک حیلہ سمجھتے ہیں۔ وہ کیا اس میدان میں کودنے کا حوصلہ کریں ابھی کیا ہے وائسرائے کو انگلستان سے لوٹ کر آنے دو جب وہ کانگریس سے مصالحت کے فیصلے کا باقاعدہ اعلان کریں گے تو لیگ کی مقامی شاخوں میں جہاں رجعت پرست لوگوں کا غلبہ ہے پاکستان کے مطالبے کی جڑیں اس طرح کھوکھلی کی جائیں کہ مخلص رہنماؤں کو لیڈری کا پورا مزہ مل جائے گا۔

کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لیگ میں ایک دوسرا عنصر بھی آہستہ آہستہ نشو ونما پا رہا ہے جو لیگ کے پرانے رہنماؤں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں، اوسط حیثیت کے تاجروں، چھوٹی حیثیت کے زمینداروں اور دستکاروں اور غریب مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ دولت مندوں کا نہیں بلکہ بیدار اور باشعور عوام کا گروہ ہے۔ اس کے لئے سیاست، تفریحی مشغلہ یا بڑھاپے کا سہارا نہیں بلکہ عزت و آبرو کے ساتھ جینے اور مرنے کا سوال ہے۔ پاکستان اس کا دوسرا نام ہے۔ اس کی زبان و ادب ہے، اس کی تاریخ و تمدن ہے، اس کا اوڑھنا اور بچھونا ہے اور اس کا کھانا اور پینا ہے۔ اس کی بے چین تمنائیں اظہار کی خواہش مند ہیں۔ اس کے بلند حوصلے میدان کی وسعت کے متلاشی ہیں۔ اس کی پوشیدہ طاقتیں عمل کی منتظر ہیں۔ اس کو سرزمین وطن کی ضرورت ہے۔ اس کو اقتدار حکومت کی ضرورت ہے۔ اس کو آزادی اور خود مختاری چاہئے۔ وہ اپنے من کی دنیا کو بنانا اور بسانا چاہتا ہے۔ وہ ہم آہنگی، یک دلی اور یک رنگی کو ڈھونڈتا ہے جسے روز روز کے جھگڑے

اور شعبوں سے نفرت ہے۔ وہ خود خوش رہنا چاہتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش دیکھنا چاہتا ہے: "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو" اس کا اصول ہے۔ تم اپنے گھر میں آزاد ہم اپنے گھر میں آزاد ——— یہ اس کا مطالبہ ہے اور اپنے اس مطالبے میں وہ حق و انصاف کو اپنے ساتھ سمجھتا ہے۔

یہ عنصر موجود ہے۔ اس کو ترقی ہو رہی ہے۔ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا لیکن اس کی طاقت کتنی ہے۔ اس کا مستقبل کیا ہے۔ اس کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں اس کے بارے میں ابھی کوئی بات یقین اور وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے پرانے رہنماؤں سے کئی جگہ ٹکر لی ہے۔ پنجاب، یو۔پی۔ بمبئی اور سندھ میں لیگ کے رہنماؤں کے اندر جو اختلافات رونما ہوئے ہمارے کمیونسٹ رفقاء انھیں اسی عنصر کے ابھرنے کی کوشش پر محمول کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شوکت حیات خاں، غضنفر اللہ، قاضی عبدالحمید ہے، ایم، سید۔ اس نئے عنصر کی رہنمائی کرتے ہیں۔ لاہور کے انگریزی اخبار "ٹائمز" نے سرحد کی لیگی وزارت کی ناکامی کو مسلم لیگ کے نصب العین کی عدم مقبولیت پر محمول نہیں کیا بلکہ اسے سرحد کے لیگی رہنماؤں کی ذاتی ناکامیابی پر محمول کیا ہے۔ بنگال میں عبدالہاشم صاحب سکریٹری بنگال پروونشل مسلم لیگ کو اس نئے میلان کا رہنما قرار دیا جاتا ہے۔ ان بیانوں میں کس حد تک صداقت ہے اس کا کوئی قطعی ثبوت ابھی تک نہیں مل سکا ہے۔ پرانے رہنماؤں سے نئے رہنماؤں نے جو ٹکریں لی ہیں ان میں کسی جگہ بھی انھیں اتنی کامیابی نہیں مل سکی کہ وہ انھیں ان کی جگہ سے ہٹا سکتے اور اپنی مرضی کے مطابق کارروائی کرسکتے۔ ان کی تنظیم کی مضبوطی کی بھی کوئی شہادت ابھی تک فراہم نہیں ہوئی ہے۔ لاہور شہر میں لیگ کا اجلاس منعقد کرانا بہت معمولی کام تھا۔ لیکن اس کام میں بھی کامیابی اور ناکامی کا ثبوت مسٹر جناح کے بیمار ہوجانے کی وجہ سے نہیں مل سکا ہے۔ آئندہ کے اسمبلیوں کے انتخابات سے شاید کچھ

کا کچھ پتہ چل سکے۔ لیکن صحیح آزمائش تو اس وقت ہوگی جب کسی مخالف حکمران طاقت سے ٹکر لینے کے باوجود یہ اپنی تنظیم اور مقبولیت کو قائم رکھ سکیں گے سو اس کا وقت معلوم نہیں کب آئے۔ ان کی اضافہ پذیر اہمیت کا ایک ثبوت البتہ ملتا ہے اور وہ یہ کہ لیگ کے چوٹی کے رہنماؤں نے اس عنصر کے خیالات کی ترجمانی اپنی تقریروں اور تحریروں میں شروع کردی ہے لیکن اس ثبوت کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں ہے کیونکہ زمانے کا رجحان ہی کچھ اس طرف ہے۔ حتیٰ کہ ایک کھرب کا منصوبہ بنانے والے سرمایہ دار بھی اپنے آپ کو اس رجحان کے اثرات سے آزاد نہیں رکھ سکے ہیں۔ اس لئے ان تمام باتوں کے پیش نظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس عنصر کو اپنی اہمیت اور اپنے اثر و اقتدار اور اپنے پیروؤں کی تعداد اور وفاداری کا ثبوت دینا ابھی باقی ہے۔

لیکن جہاں تک ان کے عزائم کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم ضرور گفتگو کرسکتے ہیں۔ کیونکہ پنجاب کی لیگ نے نومبر ۱۹۴۴ء میں اور بنگال کی لیگ نے اپریل ۱۹۴۴ء میں اپنے اپنے منشور شائع کئے ہیں۔ جن سے ان کے ارادوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

پنجاب کی مسلم لیگ کا ابتدا میں یونینسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد تھا اور دونوں مل کر صوبے کی حکومت کا کام سنبھالے ہوئے تھیں۔ پنجاب کے بہت سے مسلمان رہنما لیگ اور یونینسٹ پارٹی دونوں کے رکن تھے اور دونوں کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے تھے۔ لیکن بعد میں ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ان کے لئے دونوں کے ساتھ وفاداری کو نبھانا مشکل ہوگیا۔ یہ اتحاد ٹوٹا۔ کچھ مسلمان رہنما خالص یونینسٹ ہوگئے کچھ خالص لیگی۔ اکثریت یونینسٹ کی تھی اس لئے ان کی وزارت قائم رہی اور مسلم لیگ کو اسمبلی میں مخالف پارٹی کی حیثیت سے اپنی تنظیم کرنا پڑی۔ چنانچہ ان کے منشور میں یونینسٹ پارٹی کی مخالفت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ بنگال کی مسلم لیگ پارٹی کو چونکہ اس قسم کی کسی اندرونی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لئے ان کے منشور میں کسی دوسری

سیاسی پارٹی پر جو ٹیں نہیں ہیں پنجاب کے منشور میں جزئیات اور تفصیلات بھی شامل ہیں لیکن بنگال کے منشور میں محض اصول بیان کر دئیے گئے ہیں۔ پنجاب کا منشور طویل ہے اس میں کہیں کہیں ایک ہی بات کو کئی دفعہ دوہرایا گیا ہے اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بنگال کا منشور نسبتاً مختصر ہے۔ منطقی ترتیب کے ساتھ اس میں نصب العین کو درج کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور تفصیلات اور جزئیات سے اجتناب کیا گیا ہے۔ پنجاب کا منشور نقش اول ہے اس لئے اس کے خیالات اور بیانات میں انضباط اور تنظیم کی کمی ہے۔ بنگال کا منشور نقش ثانی ہے اس لئے زیادہ منضبط اور محدود ہے۔ لیکن دونوں میں سب سے زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ پنجاب کا منشور ایسے صوبے کے لئے تیار کیا گیا ہے جو سب سے آخر میں برطانیہ کی حکومت میں شامل ہوا جہاں جنگ جو نسلیں آباد ہیں۔ جہاں کی حکومت میں بہت زیادہ مطلق العنانی پائی جاتی ہے۔ جو فوجی بھرتی کا صوبہ ہے جہاں کے لوگ فوجی ہونے کی وجہ سے فوجی اطاعت اور وفاداری کے عادی ہیں اور جہاں اس اطاعت اور وفاداری کی معقول قیمت سرکار کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ جہاں کے لوگ سرکار کے ساتھ صرف نمک حلالی کرنا جانتے ہیں۔ کیونکہ اس کا معاوضہ نقد کی صورت میں ملتا ہے اور باقی سب چیزوں کو مہمل اور خرافات سمجھتے ہیں۔ جہاں معاشی اور سیاسی میدان میں ہندو، مسلمان اور سکھ اس طرح مقابلہ کر رہے ہیں کہ کبھی سرکار ایک کو شہ دے کر آگے بڑھاتی ہے تو کبھی دوسرے کو۔ کبھی ایک کا زور کم کرتی ہے تو کبھی دوسرے کا اور طاقت کے اس توازن کو قائم رکھتے ہوئے اپنی مطلق العنان حکومت کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے۔ ایسے صوبے کے لئے جو منشور تیار کیا جائے گا اسے لازماً اس دوسرے صوبے سے مختلف ہونا چاہئے جہاں آزادی کی مختلف قسم کی تحریکیں آئینی تحریکوں سے لے کر دہشت انگیزی کی تحریک تک، ایک عرصے سے چل رہی ہیں

جہاں سرکار کا رعب اور ہیبت لوگوں کے دل سے نکل چکا ہے۔ جہاں کے لوگ عین اس وقت جب وہ ظاہری طور پر حکومت کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہیں اپنے دل کے اندر دوسری وفاداریوں کو چھپائے رہتے ہیں۔

بہرحال دونوں منشوروں کے یہ اختلافات کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتے بنیادی طور پر دونوں کے میلانات میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے جن کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ برطانوی شہنشاہیت کی مخالفت اور اس کے اثر سے کلی آزادی۔

۲۔ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور ان کی تحریک آزادی کے ساتھ ہمدردی و شراکت یعنی آزاد ہندوستان میں آزاد پاکستان کا نصب العین۔

۳۔ جمہوریت پسندی (یعنی شہری آزادی، عوام کو جواب دہی، عوام کے اقتدار اعلیٰ اور عوام کے مفاد میں حکومت)

۴۔ صنعتیت یعنی جدید طرز کی بڑے پیمانے کی صنعتوں کو ترقی۔

۵۔ محنت کش عوام کے حقوق کا تحفظ۔

۶۔ مردوں، عورتوں، نابالغوں اور بالغوں سب کے لئے عام ابتدائی تعلیم اور فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم۔

۷۔ مفاد عامہ کے کاموں کی توسیع و ترقی۔

۸۔ معاشی وسائل کی ہمہ گیر ترقی خصوصاً زراعت اور چھوٹے پیمانے کی صنعت وغیرہ کی ترقی۔

۹۔ سرکاری مالیات کی اصلاح تاکہ عوام پر محاصل کا بوجھ پورے سے کم کیا جاسکے اور عوام کے فائدہ کے لئے زیادہ روپیہ خرچ کیا جاسکے۔

۱۰۔ موجودہ انتظامات حکومت کی اصلاح تاکہ اس کے عہدہ دار عوام کی

فلاح و بہتری کو بنیادی اول و آخر فریضہ سمجھنے لگیں۔

اس فہرست کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پروگرام میں مسلمانوں کے مخصوص مذہبی حقوق پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہے جتنا کہ ان کے شہری اور معاشی حقوق پر اور اس میں بھی توجہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ شمال مغربی اور شمال مشرقی پاکستان کی جتنی بھی آبادی ہے اس کے لئے بلا تفریق مذہب و نسل مشترکہ طور پر بہتر حالات پیدا کرنے کو نصب العین میں شامل کیا گیا ہے۔ ان علاقوں کی رہنمائی کو البتہ مسلمانوں کی کثرت تعداد کے پیش نظر مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رکھا گیا ہے اور ان کی تعلیمی اور معاشی پستی کا خیال کرتے ہوئے ان کے لئے کچھ تحفظات کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ بیت المال اور شریعت کا بھی ذکر آیا ہے لیکن وہ تبرکاً ہے ورنہ حقیقت میں دنیوی معاملات کو مذہب کی دخل اندازی سے الگ ہی رکھا گیا ہے۔

غرض ان منشوروں میں ترقی پسند غیر مسلم اور غیر لیگی عناصر اور محنت کش عوام کو مائل اور جذب کرنے کی خاصی صلاحیت موجود ہے۔ اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ان کو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں عام طور پر مقبول بنانے کے لئے جس رہنمایانہ اہلیت اور اثر و نفوذ کی ضرورت ہے۔ وہ لیگ کے موجودہ رہنماؤں میں ہے یا نہیں۔ کانگریس کی کامیابی کا راز اس کے رہنماؤں کی قابلیت، ایثار، مستقل مزاجی، بیدار مغزی اور کثرت تعداد میں ہے۔ لیگ کو بھی اگر اسی پایہ کے رہنما خاصی کثیر تعداد میں مل سکے تو لیگ بھی بلا تردد پاکستانی علاقوں میں اپنے پروگرام کو ویسا ہی مقبول بنا سکے گی جیسا کہ کانگریس ہندوستانی علاقوں میں اپنے پروگرام کو بنا چکی ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے محض تمنا کرنا ہرگز کافی نہیں ہے بلکہ بہت جاں گسل اور صبر آزما محنت و ریاضت کی ضرورت ہے۔ کیا لیگ کو ایسے آدمی مل سکیں گے؟

ہمارا خون

یہ تباہی اور ہلاکت کا جنوں
یہ شکست و فتح کا مہلک فسوں
یہ مسلح فوجیوں کا طمطراق
یہ بلکتی ماؤں کا سوزِ فراق
آسماں سے موت کی یہ بارشیں
رات دن یہ قتل ہی کی سازشیں
یہ حصولِ برتری کے مشورے
اور یہ غارت گری کے مشورے
یہ اچھوتی وضع کے آلاتِ جنگ
یہ تحیر آفریں آلاتِ جنگ
کھیل ہے سارا ہمارے خون کا
ایک فوارہ ہمارے خون کا!

اور وہ دورِ اماں، وہ عہدِ امن
وہ تعیش کا سماں، وہ عہدِ امن
امن کی وہ برکتیں یادش بخیر
وہ سکوں، وہ راحتیں یادش بخیر
وہ ادب، وہ علم وہ تنقیدِ فن
وہ ثقافت، وہ سیاست وہ وطن

درسگاہوں میں علم و فن کا شور
پھر مسائل میں تجارب کا وہ زور
گفتگو وہ آرٹ پر، وہ ذکرِ شعر
وہ حسیں راتوں میں اکثر فکرِ شعر
شام کی وہ پُر تکلف صحبتیں
وہ طرب خانوں کی رنگیں عشرتیں
برق پاروں کا وہ سیلِ بے کراں
شب کو بھی وہ روزِ روشن کا سماں
دل فریبی وہ تماشا گاہوں کی
دیدہ زیبی وہ تماشا گاہوں کی
گیت میں وہ لمبی تانوں کی بہار
رقص میں وہ ننگی رانوں کی پکار
مے کدوں میں وہ ہجومِ مرد و زن
وہ جمالِ ساقیانِ سیم تن
الغرض وہ عیش کی دنیا، وہ امن
جنگ سے پہلے جو قائم تھا، وہ امن

رنگ تھا کس چیز کا اس امن میں؟
کیا ہمارا خون نہ تھا اس امن میں؟

اختر انصاری

حالات حاضرہ

کسی محفل سے لوگ اٹھنے لگیں تو اس کی رونق جاتی رہتی ہے۔ چاہے محفل سپاہیوں یا سیاست دانوں کی کیوں نہ ہو۔ پریذیڈنٹ روزولٹ سیاست دانوں کی محفل کے صدر تھے ان کے جانے سے محفل کا کچھ رنگ ہی بگڑ گیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سیاست کے جو مقاصد سب سے زیادہ نمایاں ہیں ان کی تشکیل کس حد تک پریذیڈنٹ روزولٹ نے کی ہے اور کس حد تک دوسروں نے۔ لیکن ویسٹ منسٹر چارٹر انہیں کے خیالات کا عکس ہے اور جنگ کا اخلاقی پہلو بہت کمزور رہتا اگر ان کے خلوص نے اس میں ایک شان نہ پیدا کر دی ہوتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کی صاف دلی اور بے تکلفی، مروت اور صداقت نے جمہوری ملکوں کی بہت سی مشکلیں آسان کر دیں اور بہت سے لوگوں کو جن کی طبیعتیں مختلف یا مزاج تیز تھے ایسے اتحاد عمل پر آمادہ کر لیا کہ جس میں ذاتی مصلحت کے علاوہ انسانیت کے مستقبل سے گہرا تعلق ظاہر ہوتا ہے۔ اب جو پریذیڈنٹ روزولٹ کی طرح سب کو ملانے اور سب کی شیخی ٹھوکنے والا کوئی نہیں رہ گیا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ اتفاق اور اتحاد پر بھی مخالفت کا گمان پیدا ہوتا رہے، اور اتحادیوں کی سیاست میں یک جہتی کے باوجود اختلافات بڑھتے رہیں۔ اتحادیوں کی قوت اب اتنی ہے اور جرمنی اور جاپان کو اب انھوں نے اس طرح پچھاڑ لیا ہے کہ جنگ میں جلد اور پوری کامیابی ہونا یقینی ہو گیا ہے۔ لیکن دشمنوں کو شکست دینا بہرحال صرف ایک تمہید ہے۔ اس بین اقوامی نظام کی جو جنگ کے بعد قائم ہوگا اور جس پر امن اور آسودگی کا مدار ہوگا۔ یہ نظام قائم نہ ہو سکا یا کافی مضبوط نہ ہوا تو جبر مقاصد جنگ کی شکست کے علاوہ جنگ سے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔

اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اتحادیوں کے مقاصد بدل جائیں گے۔ پریذیڈنٹ روزولٹ

[illegible] پریزیڈنٹ ٹرومین نے یقین دلایا ہے کہ متحدہ ریاستوں کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی
اور ہر طرح سے پریزیڈنٹ روزویلٹ کی پیروی کریں گے۔ سان فرانسسکو میں جو بین اقوامی
کانفرنس ہونے والی ہے وہ بھی ہوگی مگر ابھی یہ نہیں معلوم کہ پریزیڈنٹ ٹرومین میں
دراصل گرمی دور کرنے اور مخالفوں کو جن بنیادی باتوں پر اتفاق ہوا انھیں واضح کرنے
کی وہ خاص قابلیت ہے یا نہیں جس نے پریزیڈنٹ روزویلٹ کو ممتاز اور ہر دل عزیز بنایا
تھا۔ ممکن ہے کانفرنس میں اختلافات بہت زیادہ نمایاں ہو جائیں۔ ہر فریق اپنی رائے کو
مبالغے کے ساتھ بیان کرے۔ اور کوئی ایسا موقع شناس مدبر موجود نہ ہو جو وقت پر سب
کو سمجھا سکے کہ اختلافات کے مقابلے میں ان مسائل کی اہمیت بہت زیادہ ہے جن پر وہ
متفق ہیں۔ کانفرنس میں برطانوی سلطنت کے تمام اراکین شریک ہوں گے۔ روس نے
مطالبہ کیا ہے کہ روسی وفاق کے دو اراکین کو بھی جداگانہ نمائندگی دی جائے۔ اور اس
مطالبے کو منظور کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ روس نے اس کا بھی مطالبہ
کیا ہے کہ لبلن کی قومی کمیٹی یعنی پولستان کی اس حکومت کو جو روس کی سرپرستی میں
قائم ہوئی ہے کانفرنس میں شرکت کا حق دیا جائے۔ مگر اتحادیوں نے ابھی اس حکومت کو حق دار
تسلیم نہیں کیا ہے۔ روسی حکومت کے اس اعلان سے کہ کانفرنس میں اس کے وزیر خارجہ
مسٹر مولوتوف شریک نہ ہوں گے لوگوں کے دلوں میں بہت سے اندیشے پیدا ہو گئے ہیں۔
روس کے دونوں مطالبے منظور نہ کئے گئے تو ممکن ہے وہ کانفرنس میں صرف تماشائی
بن کر جائے۔ بحث میں حصہ لے اور بحث کے نتیجے سے بے تعلق رہے۔ اتحادیوں سے
مل کر جو انتظام کیا جائے گا اس کے علاوہ روس نے اپنی حفاظت کے لئے الگ تدبیریں
بھی کی ہیں۔ چیکوسلواکیہ، فن لینڈ، پولینڈ اور ابھی حال میں یوگوسلاویہ سے اس کے
جنگی معاہدے ہو چکے ہیں۔ ایسے ہی معاہدے وہ رومانیہ اور بلغاریہ سے بھی کرے گا۔ اور
ممکن ہے ترکی بھی اس معاہدے کی جگہ جسے روس نے کوئی ایک مہینہ ہوا منسوخ قرار دیا

تھا ایک نیا اور روس کے لئے بہتر معاہدہ کرنے پر مجبور ہو۔ کانفرنس میں ان حد فریقی معاہدے پر بہت زیادہ اعتراض کیا گیا۔ یا دوسری ریاستوں نے ایسے معاہدے کرنے کا حق محفوظ رکھا تو کانفرنس بین اقوامی امن کے لئے کچھ بہت مفید ثابت نہ ہوگی۔

جنگ کا نقشہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا ہے۔ اتحادی اور روسی فوجیں وسط جرمنی میں بہت جلد مل جائیں گی اور پھر صرف مدافعت کے چند مورچوں کو ختم کرنے کا خیال رہ جائے گا۔ ان میں سے ایک برلن ہوگا۔ دو چار شمالی جرمنی میں ہوں گے سب سے اہم ڈنمارک اور ناروے اور جنوبی جرمنی اور مغربی آسٹریا کے مورچے ہوں گے۔ ناروے میں جرمنوں نے اپنی ساری بحری قوت یک جا کر لی ہے اور فوجی قوت کا بیشتر حصہ جنوبی جرمنی اور مغربی آسٹریا کے مورچے میں جمع کیا گیا ہوگا۔ اس مورچے کے وجود پر پہلے شک کیا جا سکتا تھا، اب یہ دیکھتے ہوئے کہ جرمن وسط جرمنی میں اتحادی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر رہے ہیں مگر جنوب مغربی جرمنی میں بہت جم کر لڑ رہے ہیں اس کا یقین ہو گیا ہے کہ وہ آخری مقابلہ یہیں پر کریں گے۔ ناروے بھی آبدوزوں کے لئے بہت موزوں ہے۔ اور آبدوزوں سے اتحادیوں کو جو خطرہ تھا وہ کچھ بہت کم نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ لڑائی کو کب ختم کیا جائے یا ختم سمجھا جائے۔ نازی پارٹی ہتھیار نہیں ڈالے گی، اس نے اپنے آدمیوں کو حکومت سے الگ کر لیا ہے، اور اس طرح اتحادی جن علاقوں پر قبضہ کر چکے ہیں یا آئندہ کریں گے ان کو دشمن کے حوالے کرنے کا الزام نازی پارٹی پر نہ آئے گا، اور وہ ان لوگوں کو جو اتحادیوں کی فرماں برداری کریں گے غدار کہہ کر قتل کرنے کی تدبیریں کرتی رہے گی۔ اتحادی یہ دیکھ کر کہ جرمنی کے بیشتر حصہ پر ان کا قبضہ ہو گیا ہے یا یہ کہہ کر کہ اب کوئی بڑی اور باضابطہ فوج میدان میں نہیں ہے اس کا اعلان کر دیں کہ لڑائی ختم ہو گئی ہے تب بھی نازی لڑائی کو جاری رکھیں گے، اور اتحادیوں نے اپنے اعلان پر اعتبار کیا اور فوج اور جنگ کے سامان کے

بڑے جتھے کو جرمنی سے ہٹایا یا تو نازیوں کو فنا کرنے کا بہت اچھا موقع مل جائے گا۔
جنرل آئزن ہاور نے پریزیڈنٹ روزویلٹ کو ایک خط میں اس مسئلے کی طرف توجہ دلائی تھی اور یہ کہا تھا کہ غالباً جنگ کو باضابطہ طریقے پر ختم کرنے کی نوبت نہ آئے گی اور کسی مناسب موقع پر اس کا اعلان کرنا ہوگا کہ وہ ختم ہو گئی ہے۔ لوگ اب جنگ سے اس قدر عاجز آ گئے ہیں کہ وہ چاہتے ہیں کہ لڑائی ختم ہونے کا اعلان جلد سے جلد کر دیا جائے لیکن دوسری طرف اس کا اندیشہ بھی ہے کہ یہ اعلان قبل از وقت کر دیا گیا تو جنگ کے انتظامات میں بڑی دشواری پیدا ہو جائے گی اور اس کا ختم ہونا محض فرضی ہوگا۔ اس وجہ سے بعض محتاط لوگ بہتر سمجھتے ہیں کہ اعلان ملتوی کیا جائے گا جب تک کہ اس کا پورا یقین نہ ہو جائے کہ واقعی جرمنوں میں لڑنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ ابھی تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فیصلہ کیا ہوگا۔

(۲۴ اپریل ۱۹۴۵ء)

جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن
کی
چند مطبوعات

جغرافیہ اندلس	[illegible]	مقدمات مابعد الطبیعیات	[illegible]	اشیائے تعمیر	[illegible]
مفتاح المنطق	[illegible]	طرق اور تفکرات	[illegible]	اندلس کی تاریخی جغرافیہ	[illegible]
نصاب ذیلی ریاضی	[illegible]	اخلاق نقوماجس	[illegible]	تاریخ ہند (اول، دوم، سوم)	[illegible]
قدیم قانون	[illegible]	تنبیہ ولاشراف	[illegible]	مرقات	[illegible]
قانون ثالث	[illegible]	قسطنطین اعظم	[illegible]	افادیت	[illegible]
تاریخ یونان قدیم (چہارم)	[illegible]	تاریخ فلسفہ اسلام	[illegible]	اصول دھرم شاستر	[illegible]
ڈوپلے اور کلایو	[illegible]	نظریہ سلطنت	[illegible]	تاریخ سیاست	[illegible]
جلیوس تمینز	[illegible]	اسلامی فن تعمیر	[illegible]	بخاری	[illegible]
بدھ مت ہند	[illegible]	تاریخ انگلستان	[illegible]	مفتاح الفلسفہ	[illegible]
ویدک ہند	[illegible]	اساس نفسیات	[illegible]	نظریہ مبادلات خارجہ	[illegible]
مادھوجی سندھیا	[illegible]	طبیعیات عملی	[illegible]	خصوصی قانون رعایا	[illegible]

فیدرس لائیسس اور بروطاغورس افلاطون	[illegible]	کارہائے منقبات دستیات	[illegible]
شخصی قانون بین الاقوام	[illegible]	کتاب الخراج وصنعت الکتابت	[illegible]
سیاسی تاریخ ہند (جلد اول)	[illegible]	اصول معاشیات (جلد اول)	[illegible]
" " " (" دوم)	[illegible]	" " " دوم	[illegible]
خلاصہ طبقات الارض ہند	[illegible]	امپیریل گزیٹر آف انڈیا	[illegible]
مدلز آف انڈیا (لارڈ کلایو)	[illegible]	جمہوریہ روماں (جلد پنجم)	[illegible]

مکتبۂ جامعہ

دہلی، بمبئی، لاہور، لکھنؤ

جامعہ

زیر ادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم۔اے

سالانہ چندہ صہ فی پرچہ	بابتہ ماہ مئی سنہ ۴۵ء	جلد ۴۰ نمبر ۵

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے آکسن ۔ محبوب المطابع پریس ۔ دہلی

رسالہ جامعہ اور جامعہ کی جوبلی

اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عمر ۲۵ سال کی ہو جائے گی۔ اس لئے مجلس جامعہ ملیہ نے طے کیا ہے کہ مارچ ۱۹۴۶ء کی آخری تاریخوں میں جامعہ کی سلور جوبلی منائی جائے، اور اس جشن کے موقع پر جامعہ کے ہر فرد اور شعبے اور جامعہ کے ہر ہمدرد اور بہی خواہ سے یہ درخواست کی جائے کہ وہ جامعہ کی وساطت سے قوم کی خدمت میں کسی نہ کسی شکل میں، اپنی استعداد اور اہلیت کے مطابق، کوئی نہ کوئی تحفہ پیش کرے۔

رسالہ جامعہ کے ادارے کی یہ خواہش ہے کہ رسالہ جامعہ بھی اس موقع پر کوئی تحفہ پیش کرے۔ ظاہر ہے

"برگِ سبز است تحفۂ درویش"

کے مصداق پر، رسالہ جامعہ کا تحفہ مضامین ہی کی صورت میں پیش کیا جا سکے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان مضامین کی نوعیت کیا ہو اور انھیں کس طرح اور کس موقع پر شائع کیا جائے۔

جامعہ کی چونکہ ابتدا سے یہ دلی تمنا رہی ہے کہ وہ ملک و ملت کے لئے ایک اصلاح و ترقی کی تحریک بن سکے۔ اس لئے رسالہ جامعہ کے لئے یہ بات موزوں معلوم ہوتی ہے کہ وہ قومی اصلاح و ترقی کی مختلف تحریکوں ہی کو اپنے مضامین کا موضوع بنائے۔ لیکن ان کا کوئی محدود مفہوم اپنے ذہن میں نہ رکھے، بلکہ سیاست و معیشت، تمدن و تاریخ، فلسفہ و مذہب، اخلاق و معاشرت، شعر و ادب، علم و فن کی جملہ ان تحریکات کو جن کا بلا واسطہ یا بالواسطہ، قریبی یا بعید کوئی تعلق قومی اصلاح و ترقی سے نکل سکتا ہو ان سب کا احاطہ کرے۔ دوسری قوموں اور ملتوں کی کامیابیوں سے شوق و ہمت کو ابھارے اور ان کی ناکامیوں سے عبرت و انتباہ حاصل کرے۔ قومی زندگی کے مختلف شعبوں کی

اصلاح و ترقی کے لئے لائق عمل منصوبے تجویز کرے۔ اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مناسب تدبیریں اور مشورے پیش کرے

یہ کام اتنا وسیع ہے کہ رسالہ جامعہ کے کسی ایک شمارہ میں اسکی انجام تک پہنچ پائے۔ ہر چند رسالہ جامعہ کا ایک جوبلی نمبر نکالنے کا ارادہ ہے اور اس کی ضخامت کو بھی اتنا بڑھانے کا قصد ہے جتنا کاغذ کی موجودہ قحط سالی کے زمانے میں آسانی کے ساتھ ممکن ہو اور اس رسالے کو ہم اسی کام کے لئے مخصوص بھی کرنا چاہتے ہیں لیکن رسالہ جامعہ کے سامنے جو مقصد ہے اس کی تکمیل کے لئے اس کا محض ایک شمارہ کافی نظر نہیں آتا اس لئے طے کیا گیا ہے کہ بجائے اپریل ۱۹۸۰ء سے ۱۰ مارچ ۱۹۸۱ء تک یعنی انعقاد جوبلی سے ایک سال قبل کے دوران میں جتنے رسالے مرتب کئے جائیں ان میں اس قسم کے مضامین کی نشر و اشاعت کو خاص طور پر خیال رکھا جائے۔ چنانچہ اس مہینے سے اس سلسلے کے کچھ مضامین کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

لیکن رسالہ جامعہ اپنی اس خواہش میں کامیاب تب ہی ہو سکے گا جب اس کے قلمی معاونین اور قدر دانوں کا حلقہ خاص طور پر اور ملک کے ارباب فکر و نظر اور اہل قلم حضرات عام طور پر اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سارے کام اب تک جمہور قوم کے تعاون اور سرپرستی سے انجام تک پہنچتے رہے ہیں۔ انھی کی حوصلہ افزائی کی امید پر رسالہ جامعہ نے بھی اس مشکل کام کو اپنے ذمے لیا ہے اور جس طرح ہمیں اپنے دوسرے کاموں میں کبھی مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کام میں بھی ہمیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

جامعہ کی تحریک

خدا کا شکر و احسان ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کرے گی۔ صدی کا چوتھائی حصہ، عددی اعتبار سے ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہے اور فنا و بقا کی اس مسلسل جنگ میں جو ہر لمحہ جاری ہے اگر کوئی چیز اپنے وجود کو اتنی طویل مدت تک برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ بات بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر خوشی کا اظہار کیا جائے۔ اگر حالات خاص طور پر ناساعد رہے ہوں اور زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ہر قدم پر نہایت سخت جد و جہد کرنا پڑی ہو اور عزم و ہمت، استقلال و استقامت کا ثبوت دینا پڑا ہو تو یہ بات اور بھی زیادہ خوشی کا موجب ہو سکتی ہے۔ پھر اگر وہ چیز جو باقی رہی ہو ایک ایسا قومی ادارہ ہو جس کے ساتھ ملک کے قابل ترین اور مخلص ترین بزرگوں اور رہنماؤں کی تمنائیں اور مرادیں وابستہ رہی ہوں، جو مشترکہ جد و جہد، مشترکہ عزم و ہمت، مشترکہ استقلال و استقامت، مشترکہ ایثار و محبت کا خلاصہ و نتیجہ ہو تو اس کا قیام یقیناً ملکی اور قومی فتح و کامرانی کا نشان سمجھا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۰ء میں قوم کے کچھ سربرآوردہ رہنماؤں نے اس چیز کا ساتھ دینے کے لئے جسے وہ حق و انصاف سمجھتے تھے، اُن قوتوں سے ٹکر لی جنہیں وہ نیک نیتی اور ایمانداری کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کے کاموں میں شریک سمجھتے تھے۔ انہوں نے قوم کے نونہالوں سے اپیل کی کہ وہ اس جہادِ حق میں ان کا ساتھ دیں۔ ان کے مقصد میں خلوص تھا، اُن کی آواز میں اثر تھا۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے اس آواز پر لبیک کہی، اُن کی تحریک نہایت زور شور سے چلی۔ کچھ عرصے کے لئے روپیہ، عزت، شہرت، سب چیزوں نے ان کا ساتھ دیا۔ وہ جدھر جاتے تھے فاتحوں کی طرح ان کے جلوس نکالے جاتے تھے، لوگ پروانو

کی طرح ان پر نثار ہونے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس وقت جیل جانے، سختی اٹھانے، ظلم سہنے میں مزہ تھا۔ انتہاپسندی میں ایک نشہ تھا۔ امید کی شعاعوں سے دل منور تھے۔ کامیابی کی منزل سامنے نظر آتی تھی۔ لیکن یہ حالت زیادہ دن قائم نہیں رہی۔ واقعات نے پلٹا کھایا عوام میں تحریک کی مقبولیت کم ہونا شروع ہوئی۔ خانگی جھگڑے اور فسادات شروع ہوئے جو لوگ معبود بنے ہوئے تھے وہ مردود ہو گئے۔ چندے وصول ہونا بند ہوئے۔ نہ صرف بدنامی کا سلسلہ شروع ہوا۔ آبرو سنبھالنا مشکل ہوئی۔ ایک بڑی تعداد نے جو کامیابی کے زمانے میں آگے آگئی تھی۔ آزمائش کے زمانے میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا اور کھسکنا شروع کیا۔ بزرگ رہنما ذاتی الجھنوں اور پریشانیوں میں پھنس گئے یا ناوقت فوت ہو گئے۔ ذمے داری کا سارا بوجھ چھوٹوں کے کمزور اور ناتجربہ کار کاندھوں پر آن پڑا سخت نازک وقت تھا۔ انتہائی آزمائش کا موقع تھا۔ نہایت اہم اور نتیجہ خیز فیصلے کرنا تھے۔ انھیں ہر چیز کے بارے میں نئے سرے سے سوچنا اور اپنے پورے طرز عمل کا سختی سے محاسبہ کرنا پڑا۔ انھیں فرع و اصل، عرض و جوہر، جسم و روح میں امتیاز کرنا پڑا۔ انھوں نے اصل، جوہر اور روح کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ لیکن فرع، عرض اور جسم میں ضرورت اور مصلحت کے مطابق قطع و برید کو جائز سمجھا۔ بہرحال بنیادی معاملات میں اٹل رہے۔ سختیاں جھیلیں۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ اپنے کم اہل ساتھیوں کو عزت، شہرت اور دولت کے بلندترین مرتبوں پر پہنچتے دیکھا۔ لیکن اپنے بزرگوں سے جو قول و قرار کیا تھا اور جو آخری فیصلہ کر چکے تھے۔ اس سے ادھر ادھر نہیں ہٹے۔ وہ قوم کی آبرو کے امین تھے۔ وہ قوم کی آن کے نگہبان تھے۔ انھیں ایک محاذ پر کھڑے رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ حکم دینے والے ختم ہو گئے تھے لیکن ان کی وصیت باقی تھی۔ وہ اپنے فرض کی ادائی سے منہ نہیں موڑ سکتے تھے وہ اپنا مورچہ نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ آندھیاں اٹھیں، طوفان آئے، بجلیاں کوندیں زلزلوں نے زمین کو زیروزبر کیا۔ ان کی جمعیت کم ہوتی رہی۔ ان کا گھر ویران ہوتا رہا۔

اپنی مادرِ علمی سے وہ بہت دور پھینک دیے گئے۔ اُن کا آشیانہ تنکوں کا ایک ڈھیر ہو گیا۔ لیکن اُنھوں نے ایک ایک تنکا پھر اکٹھا کیا۔ دعوتِ ترکِ موالات کے لیے دلِ صد پارہ کو پھر جمع کیا نوجوانوں نے جب ان کی طرف سے بے رُخی اختیار کی تو اُنھوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کا دل لبھایا اور اُنھیں اپنے ساتھ ملایا۔ کالج میں طلبہ کم رہ گئے۔ اُنھوں نے اس کی تلافی ابتدائی مدرسہ قائم کرکے کی۔ تصنیف و تالیف اور اشاعت و فروختِ کتب کا سلسلہ شروع کیا۔ تعلیم بالغان کی ابتدا کی۔ لیکن قوم اُن کے پیچھے پڑے رہے۔ ایک نعرہ کی طرف ذوق کی کمی دیکھی، دوسرا نعرہ شروع کیا۔ لیکن اپنے فرض سے نہیں ہٹے اپنا کہنا برابر جاری رکھا اور قوم کو اپنے حال کی طرف متوجہ رکھا۔ آخر آزمائش کا زمانہ بھی ختم ہوا۔ قوم نے غفلت برتنا ترک کی۔ دوست تو دوست دشمنوں نے خلوص و استقامت کا اعتراف کیا۔ ان لوگوں کو جنھوں نے خانہ بدوشوں کی طرح خیموں میں زندگی شروع کی تھی۔ زمینیں اور عالی شان عمارتیں ملیں اور الطافِ اکرام کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ غرض جامعہ ملیہ اسلامیہ، زندگی کے اس اٹل قانون کا ایک واضح اور بین ثبوت ہے کہ خلوص و استقامت کبھی رائگاں نہیں جاتے۔

لیکن صدی کا چوتھائی حصہ ایک بڑی طویل مدت ہوتی ہے۔ خصوصاً تیز رفتاری کے موجودہ دور میں جبکہ برسوں کی منزلیں گھنٹوں میں طے کی جانے لگی ہیں اور مقام و وقت کے فاصلے بہت زیادہ مختصر ہو گئے ہیں ۲۵ سال کی مدت کو ہرگز کم نہیں کہا جا سکتا۔ اس مدت میں دنیا کی دوسری قوموں اور دوسرے رہنماؤں نے جو زبردست کام انجام دئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں جب ہم اپنے حقیر کاموں پر نظر ڈالتے ہیں تو شرم سے گردن جھک جاتی ہے باہر کی دنیا میں صرف روس کے رہنماؤں اور اُن کے جانباز ساتھیوں کے کاموں کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ہمت و حوصلہ کے مالکوں نے ریگستانوں کو گلزار، ویرانوں کو شہر اور ایک پس ماندہ ملک کو صفِ اول کے صنعتی ملکوں میں تبدیل کر دیا۔ خود ہمارے ملک میں بھی ہمارے برادرانِ وطن کے بہت سے

اوارے ہیں جن کے کام ہمارے مقابلے میں بہت زیادہ قابل تعریف رہے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مطمئن اور قانع ہوجانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ہمیں آیندہ کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو شروع کرنا ہے۔ قوم نے جو اعتبار ہم پر کیا ہے اور جس توجہ اور عنایت کا ہمیں مستحق سمجھا ہے اس کا جواب ہمیں اس طرح دینا ہے کہ اپنی خامیوں کو جو ہم میں ابھی تک بہت زیادہ باقی ہیں دور کرنے کی انتہائی کوشش کریں۔ جامعہ کو جہاں اپنی زندگی کے ۲۵ سال پورے کرنے کی خوشی ہے۔ وہاں اپنے کاموں کی کمی کا بھی زبردست احساس ہے۔ اس نے مارچ ۱۹۴۶ء میں جوبلی منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن یہ فیصلہ محض خوشی کے جشن منعقد کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ پرانے کام کا جائزہ لینے اور نئے کام کا منصوبہ بنانے کے لئے ہے۔ شیخ الجامعہ صاحب نے اس سلسلے میں جو بیان شائع فرمائی ہے اس کے مندرجہ ذیل الفاظ خصوصیت کے ساتھ توجہ کے مستحق ہیں۔

"جامعہ کے قدیم طلبا، ہمدردان جامعہ اور وہ سب حضرات جو تعلیمی اور قومی کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں جمع ہوکر جامعہ کے موجودہ اداروں اور شعبوں کا معائنہ کریں، ان کی اصلاح و ترقی کی تدبیریں بتائیں۔ اور ان کی ان تجویزوں پر جو جامعہ کے کام کی توسیع کے لئے پیش کی جا رہی ہیں غور فرمائیں۔ کچھ کام جو ہو رہے ہیں انھیں مکمل کیا جائے، اور کچھ جو کرنے ہیں انھیں شروع کیا جائے۔"

اے خوشا وہ قوم مستقبل ہو جس کا شاندار
کل سے بہتر آج ہو اور آج سے بہتر ہو کل

مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کا جائزہ

میں نے [illegible] اور [illegible] میں مسلمانانِ ہند کی معاشی حالت کا جائزہ لینے کے لئے ادارہ معاشی تحقیقات علی گڑھ، سہارنپور اور دہلی میں شروع کی تھی جہاں مجھے کچھ سہولتیں حاصل تھیں۔ اس سلسلے میں میں نے کئی سوال نامے جاری کئے تھے جن کے جواب واقف کار حضرات سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان میں سے ایک سوال نامہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جو برادریوں کی حالت سے متعلق ہے اس سوال نامے کے جوابات بہت سی برادریوں کے بارے میں حاصل کئے گئے تھے "مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر سوال نامے کے بعد اس جواب کو درج کر رہا ہوں جو دہلی کی لاہوری برادری کے بارے میں میرے رفیق کار مختار احمد صاحب جامعی نے نہایت محنت تحقیق اور دیانت و قابلیت کے ساتھ تیار کیا ہے مختار احمد صاحب کا اس برادری سے ذاتی تعلق ہے اور وہ اپنی برادری کی اصلاح و ترقی کا ایک درد اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

مسلم برادریوں کے بارے میں عام سوال نامہ

(الف)

۱۔ آپ کی برادری کی مختصر تاریخ۔ کس طرح ابتدا ہوئی۔ مختلف تاریخی ادوار میں کیا حالت رہی۔ خصوصاً ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے کن کن شہروں میں اس برادری کے لوگ بسنے چلنے ہیں؟

۲۔ آپ کے شہر کے کن کن محلوں اور علاقوں میں آپ کی برادری کے لوگ آباد ہیں کون سے محلے پورے ان کے ہیں۔ کن میں اکثریت ہے۔ کن میں اقلیت میں ہیں۔ برادری کی

کوئی پنچایت یا انجمن وغیرہ ہے؟

۳۔ برادری میں شادی بیاہ صرف آپس کے لوگوں میں ہوتا ہے یا برادری سے باہر بھی کرلیا جاتا ہے؟

۴۔ محلوں اور گھروں کی صفائی کا کیسا انتظام ہے؟

۵۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کی تندرستی کی کیا حالت ہے؟

۶۔ مردوں اور عورتوں کی تعلیمی حالت کیسی ہے ابتدائی، ثانوی، اعلیٰ، فنی سب طرح کی تعلیم۔

۷۔ کسی قسم کی بری عادتیں تو عام طور پر نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً شراب نوشی، عیاشی جوا وغیرہ۔

۸۔ کون کون سے کاروبار اور پیشوں سے برادری کے لوگ زیادہ تر روزی حاصل کرتے ہیں اور ان کاموں میں برادری کے لوگوں کے حصہ کی اہمیت کتنی ہے اور کیا تناسب ہے؟

۹۔ برادری کے لوگ کتنے مختلف درجوں کے سرکاری ملازم ہیں۔ آئی سی، ایس۔ پی سی، ایس۔ فوجی افسر۔ پولیس افسر۔ دوسری امپیریل اور پراونشل اور لوکل سروسز سیکریٹریٹ۔ سوپیریر اور انفیریر سروس۔ جج۔ منصف۔ تحصیلدار وغیرہ کتنے وکیل ہیں۔ کتنے ڈاکٹر۔ انجینیر۔ پروفیسر۔ اہل علم۔ اہل تصنیف۔ اہل صحافت۔ کتنے میونسپلٹی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ صوبہ اور مرکزی کونسل کے ممبر ہیں۔ کتنے سیاسی لیڈر ہیں۔ کس سیاسی پارٹی سے زیادہ تعلق ہے۔ کتنے اور کس قسم کے سرکاری خطاب یافتہ ہیں؟

۱۰۔ پیدائش سے موت تک کی تمام تقریبوں پر برادری کے مختلف حیثیت کے لوگوں کا اوسطاً کیا خرچ رہتا ہے؟

۱۱۔ برادری کے مختلف حیثیت کے لوگوں کا خرچ اوسطاً مندرجہ ذیل چیزوں پر کیا رہتا ہے؛ کھانا، کپڑا، کرایہ مکان، سنگار کے سامان، زیور، مکان کے سازسامان،

بچوں کی تعلیم، سواری، تفریح، خیرخیرات، چندہ، دعوت، ضیافت، مہمانداری حج، زیارت، نذرونیاز، عید بقرعید، ملازم، پہرے دار، خدمت گار وغیرہ، شکار سینما، ناچ رنگ، خرید کتب ورسائل، تعمیر مسجد، مسافرخانہ، مدرسہ، کتب خانہ فقیر و پیر پرستی، علماء پرستی، فن پروری، علم دوستی وغیرہ۔

(ب)

۱۲۔ برادری میں کتنے کروڑپتی ہیں؟ یعنی جن کی کل جائداد کی مالیت ایک کرور روپیہ سے زیادہ ہو۔ ان کے نام مع پتہ اور کاروباری زندگی کی تاریخ، ان کی جائداد اور آمدنی کے بارے میں حسب ذیل تفصیلات:۔

(i) صحرائی جائداد کتنی اور کس قسم کی ہے؟ اس کی مالیت بصورتِ سرمایہ کیا ہے اور اس سے سالانہ خالص آمدنی کتنی حاصل ہوتی ہے؟

(ii) سکنائی جائداد کتنی اور کس قسم کی ہو۔ اس کی مالیت بصورت سرمایہ کیا ہے اور اس سے سالانہ خالص آمدنی کتنی حاصل ہوتی ہے؟

(iii) فیکٹری یا کارخانے کتنے اور کس کس قسم کے ہیں۔ ان کی زمین، عمارت، مشین اور سامان میں اور روزمرہ کے کام چلانے کے لئے کتنا سرمایہ لگا ہوا ہو اور اس سے سالانہ خالص منافع کتنا ہے؟

(iv) تجارتی کوٹھیاں اور دکانیں کتنی اور کس قسم کی ہیں۔ ان کے سامان میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہو اور ان سے کتنا سالانہ خالص منافع ہے؟

(v) کتنا روپیہ لوگوں یا فرموں کو قرض دے رکھا ہے یا ان سے واجب الوصول ہے یا بنکوں میں جمع کر رکھا ہو اور اس سے کتنا سود ملتا ہو؟

(vi) کمپنیوں کے حصوں اور تمسکات میں، سرکاری تمسکات وغیرہ میں کتنا روپیہ لگا ہوا ہو۔ اس سے سالانہ آمدنی؟

(vi) کن کن قسم کے ٹھیکے لے رکھے ہیں۔ ان میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اور سالانہ آمدنی کتنی ہوتی ہے؟

(viii) سرمایہ اور کن کن دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے اور ان سے کتنی آمدنی ہوتی ہے؟

(ix) مینجنگ ایجنٹ، ڈائرکٹر کمپنی یا منیجر یا سرکاری یا نجی ملازم یا دلال ہونے کی حیثیت سے کتنی تنخواہ، فیس یا کمیشن سالانہ مل جاتا ہے؟

(x) کوئی دوسرا مسلسل یا غیر مسلسل ذریعہ آمدنی ہے یا نہیں ہے؟

(xi) کتنا قرضہ دوسرے لوگوں، بنکوں، فرموں، وغیرہ کا واجب الادا ہے اور اس کا سالانہ سود کتنا ہوتا ہے؟

(xii) سونا، چاندی، گنی اشرفی، ہیرے، جواہرات اور ان کی مالیت

(xiii) موٹر اور دوسری سواریاں، اور ان کی مالیت

(xiv) قیمتی پوشاکیں اور ان کی مالیت

(xv) مکان کا ساز و سامان یعنی سونے، چاندی، تانبے، پیتل، چینی، شیشے، تام چینی اور مٹی کے چھوٹے بڑے برتن۔ دری، فرش، گدے، گاؤ تکیے، جانمازیں، قالین غالیچے۔ پردے، جھاڑ، فانوس، بجلی کے سامان، میز، کرسی، صوفے، غسل خانے اور سنگار کے سامان گھڑیاں، گھنٹے، تصویریں، صناعی کے جملہ نوادرات۔ قلمی اور نادر کتابیں۔ آلاتِ موسیقی، ہتھیار، بندوق وغیرہ اور ان سب کی مالیت

۱۳- برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۵۰ لاکھ اور ایک کروڑ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۴- برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۲۰ لاکھ اور ۵۰ لاکھ کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر (۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۵۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک لاکھ اور ۱۰ لاکھ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر(۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۶۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۵۰ ہزار اور ا لاکھ کے درمیان ہے۔ ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر(۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۷۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ۱۰ ہزار سے ۵۰ ہزار کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر(۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

۱۸۔ برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک ہزار اور ۱۰ ہزار کے درمیان ہے ان کے بارے میں جملہ وہ تفصیلات جو سوال نمبر(۱۲) ایک تا پندرہ میں درج کی گئی ہیں۔

(۱۹) برادری میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کی حیثیت ایک ہزار سے کم ہے ان کے گزر اوقات کے ذرائع کی تفصیل۔

(ج)

۲۰۔ برادری کے مختلف طبقوں میں سرمایہ دولت اور آمدنی میں ترقی ہو رہی ہے یا تنزل ہو رہا ہے۔ یا حالت بدستور ہے اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ کون سے نئے کام ہاتھ میں آرہے ہیں۔ کون سے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ کیا نئے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ کن لوگوں سے مقابلہ ہے وغیرہ۔

۲۱۔ کاروبار کے چلانے کے لئے اگر روپے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسے کون پورا کرتا ہے۔ بنک، ساہوکار یا برادری کے خوش حال لوگ۔

۲۲۔ (۱) تھوک کام اور آڑت کا کام عام طور پر برادری کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے یا غیر لوگوں کے۔ تھوک تاجروں یا آڑتیوں کی روپے کے لئے وقتی ضرورت کو کون پورا کرتا ہے۔ مثلاً ایک تھوک تاجر نے جہاز سے مال خریدا۔ مال کا بیجک بنک کی معرفت آیا۔ تو کیا بنک تھوک فروش کو روپیہ قرض دے کر اس کے دام ادا کرتا اور مال کو اپنے گودام

میں منگوا کر رکھ لیتا ہے اور جب تھوک فروش سہولت کے ساتھ دام ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے، مال اس کے حوالے کر دیتا ہے یا تھوک فروش کو فوراً سب روپیہ خود ہی فراہم اور ادا کرنا ہوتا ہے۔ عام طور پر کیا شرح سود ادا کرنا پڑتی ہے ؟

(۲) برادری کے جو لوگ خوردہ فروشی کا کام کرتے ہیں ان کو فوراً پورے دام تھوک آڑتیہ کو ادا کرنا ہوتے ہیں یا وہ انھیں موقع دیتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ اُسے دام ادا کر دیں، شرح سود کیا ہوتی ہے ؟

(۳) برادری کے جو لوگ صنعتوں کو بڑے یا متوسط یا چھوٹے پیمانے پر چلاتے ہیں یا چلانا چاہتے ہیں۔ انھیں سرمایے کی فراہمی میں تو دقت نہیں ہوتی اور عام شرح سود کیا رہتی ہے ؟

دلّی کی لاہوری برادری

تعارف:۔

دلّی میں ہنرمندوں کی ایک جماعت ہے جو ایک چھوٹی سی برادری کی شکل میں ہے اور اس کا نام "لاہوری برادری" ہے۔ اسی برادری کے لوگ سینکڑوں برس سے صنعت و حرفت کی بہت سی شاخوں میں باکمال کاری گر رہے ہیں اور جیساکہ آگے کے بیان سے معلوم ہوگا۔ ہندوستان میں مغلوں کے پرشوکت زمانے کی فنی ترقیوں اور شاندار صنعتی کارناموں میں اس برادری کے لوگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ حالات کی تبدیلی نے اس برادری کی صنعتی شہرت کا اب خاتمہ کردیا ہے لیکن جڑاؤ زیور بنانے کی مشہور نفیس صنعت اب بھی اس برادری میں موجود ہے [illegible] اس کے زیادہ تر لوگ اسی کام کو اختیار کئے ہوئے ہیں جڑاؤ زیور بنانے کے کام کو سادہ کاری کہتے ہیں۔ سادہ کاری جیسی بڑی اور اہم صنعت کے تعلق کی وجہ سے بعض لوگ اسے سادہ کار برادری کہتے ہیں۔ لیکن اس برادری کا صحیح نام لاہوری برادری ہے۔ چنانچہ ہم اُسے اسی نام سے پکاریں گے۔

لاہوری کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں لاہوری کے لفظ سے اتنا تو ثابت ہے کہ دلی میں یہ لوگ لاہور سے آئے، لیکن ہماری پہنچ کسی ایسی تاریخ یا قدیم تذکرے تک نہیں ہوسکی جس میں ان لوگوں کی اصل اور خاندان کے بارے میں کوئی صراحت کی گئی ہو۔ خود لاہوری بزرگوں سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ اُن کے مختلف بیانوں کو ملانے کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عراق سے مغلوں کے ابتدائی زمانے میں ہندوستان آئے۔ اس بیان کی تصدیق اسلامی تاریخ سے ہوتی ہے۔ خلافت عباسیہ کے عہد میں مسلمانوں کی علمی اور صنعتی ترقی اعلیٰ درجے پر تھی۔ خلافت کی سرپرستی سے اسلامی دنیا

کے اچھے عالم اور ہنرمند بغداد میں جمع تھے۔

لاہوریوں کا قدیم مرکز بغداد

عباسیہ کے زوال کے بعد بغداد کی علمی اور فنی مرکزیت ختم ہوگئی۔ سب اہل کمال منتشر ہوگئے۔ چنانچہ مغلوں کے عہد میں ہندوستان کی تمدنی ترقی کی شہرت سے کچھ اہل کمال ہندوستان آئے انھوں نے ملتان اور لاہور میں، کہ یہ شہر اس زمانے میں تمدن کے بڑے مرکزوں میں تھے۔ قیام کیا۔ لاہوری برادری کے بزرگوں نے اس خیال کی تائید کی ہے کہ صناعوں کی وہ جماعت جو عراق سے ہندوستان آئی۔ کسی ایک برادری کی شکل میں نہیں تھی۔

لاہوری کوئی ایک برادری نہ رکھتے تھے ہندوستان میں آنے کا زمانہ

مختلف خاندانوں اور قبیلوں کے لوگ تھے سترھویں صدی کے شروع میں جب لاہور جہانگیر کا پایۂ تخت بنا تو یہ لوگ ایک مرکز پر آگئے اور ان میں میل جول بڑھ گیا۔ یہ سب کے سب کسی ایک پیشے کے نہیں تھے۔ لیکن صنعت سب میں ایک مشترک چیز تھی، یعنی ان میں مصور، مرصع کار، مُہرکن، لوہار، نجّار، معمار، مہندس سب پیشوں کے آدمی تھے اس لئے ایک صنعت پیشہ برادری کا بن جانا قدرتی بات تھی۔

لاہوری برادری کا بننا

اس طرح عراق کے صنّاعوں کا یہ قافلہ جس میں عرب، شام عراق، مصر، ایران، سبھی قومیت کے آدمی رہے ہوں گے، لاہور پہنچ کر ایک برادری بن گیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت اس کا نام لاہوری برادری نہ تھا۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت تک یہ ہنرمند پیشہ برادری لاہور میں ہندوستان کی تمدنی ترقی کا عنصر بنی رہی۔

لاہوری برادری دہلی کو

۱۶۴۸ء میں جب شاہ جہان نے دہلی کو دار الخلافہ بنایا تو صناعوں کی یہ چھوٹی سی نئی آبادی لاہور سے دہلی منتقل ہوگئی۔ چراغ کہیں ہو، پروانے ساتھ رہتے ہیں۔

لاہوری برادری کی وجہ تسمیہ

کافی عرصے تک یہ برادری لاہور میں رہ چکی تھی اور اسے حق تھا کہ دلی پہنچ کر وہ اپنے آپ کو لاہوری کہتی، لیکن ہمارا خیال ہے کہ پہلے پہل دلی کے قدیم باشندوں نے نووارد جماعت کو لاہوری کہہ کر پکارا ہوگا اور جیسے تیموری، ترک ہندوستان والوں کے دیئے ہوئے خطاب مغل پر راضی ہوگئے، یہ لوگ بھی لاہوری نام پر راضی ہوگئے۔ یہاں تک کہ برادری کا نام بھی لاہوری رکھ لیا۔ یہ نام پھر اس برادری کا طرۂ امتیاز اور اظہار فخر کا ایک وسیلہ بن گیا۔ آج بھی برادری کے لوگ اپنے سوا دلی کی اور برادریوں کی کسی رسم، کسی وضع، کسی بات پر نام دھرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں "ہندوستانیوں کی ہے"۔ پنجاب کے لوگ اب بھی دہلی اور یوپی والوں کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ معلوم نہیں لاہوری برادری کی زبان پر لفظ ہندوستانی کا یہ استعمال لاہور میں کچھ برس قیام کا اثر ہے یا یہ لوگ عراق سے آکر اپنے آپ کو ولایتی اور دوسروں کو ہندوستانی کہتے تھے؟

دہلی میں لاہوریوں کی ابتدائی بستی

لاہوری برادری دلّی میں آکر معاشرتی ضرورتوں کے اعتبار سے شہر کے مختلف حصوں میں بس گئی۔ دارالخلافہ بن جانے کی وجہ سے شہر میں عمارتوں کی نئی طرح ڈالی جارہی تھی، جامع مسجد، قلعہ اور مختلف سرکاری عمارتیں زیر تعمیر تھیں۔ ان تعمیرات کے نگراں لاہوری برادری کے استادانِ فن تھے۔ اس لئے ماہرینِ تعمیرات جدید حصۂ شہر میں تھے۔ جوہری، سادہ کار، مصور، شہر کے مرکز میں رہتے تھے۔ خانم کا بازار جو جامع مسجد کے قریب تھا اور موتی بازار لاہوریوں کے خاص صنعتی مرکز تھے۔ لاہوریوں کی ابتدائی بستی فتح پوری کے قریب تھی۔ آج بھی یہاں گلی میں جو باغ دیوار سے ورے ہے میونسپل کمیٹی کا بورڈ لگا ہے: "لاہوریوں کی گلی"۔ لیکن وہاں اب کوئی لاہوری نہیں رہتا۔

مغلوں کی شاندار عمارتوں کے معمار لاہوری تھے

دنیا کی سب سے حسین عمارت تاج، دلّی کے

لال قلعے اور نادر روزگار جامع مسجد کے مہندس اور معمار اعلیٰ استاد احمد لاہوری[1] اور استاد حامد لاہوری تھے۔ احمد اور حامد کے بارے میں مشہور ہے کہ دونوں بھائی تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ استاد حامد کا نام لاہوری برادری میں جامع مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں بار بار بیان کی تاریخ میں ان کا ذکر مجمل ملتا ہے۔ علمیت اور خاندان کی تفصیل نہیں ملتی۔ ان کے نام کی ایک گلی جامع مسجد کے شمالی رخ رہٹ کے کنوئیں کی گلی سے آگے کوچہ استاد حامد کے نام سے اب تک ہے۔ اس گلی میں سب گھر لاہوری برادری کہتے ہیں۔

لاہوریوں کے قدیم مہندس اور معمار خاندان؛ استاد حامد

استاد احمد کا حال تفصیل سے ملتا ہے۔ چنانچہ ان کا نام احمد بن یوسف ابن حسین ابن عبد اللطیف ہے۔ یہ ریاضیات کے بڑے عالم، مہندس اور ماہر تعمیرات تھے۔ صرف ان کے نام کے ساتھ تذکروں میں معمار شاہجہانی لکھا ہوا ملتا ہے۔ جو اس بات کی علامت ہے کہ انہیں سرکاری تعلق کی خصوصیت حاصل تھی۔ ان کے تین بیٹے تھے جو علم و ہنر میں باپ کی طرح نامور تھے۔

عطاء اللہ رشیدی

(۱) عطاء اللہ رشیدی فن تعمیر کے ماہر اور ریاضی کے عالم تھے دو کتابیں اُن سے یادگار ہیں: الجبرا اور خلاصۃ الحساب۔

لطف اللہ مہندس

(۲) لطف اللہ۔ یہ بھی مہندس تھے۔ شاعر تھے اور پیشے کی مناسبت سے مہندس تخلص کرتے تھے۔ ایک دیوان شعر ان کی تصانیف سے ہے۔ دیوان سے بہت سی کارآمد تاریخی معلومات ملتی ہے۔

---

[1] دلی میں خصوصاً لاہوری برادری میں اُستاد احمد اور استاد حامد کہتے ہیں یعنی استاد کی دال نہیں بولتے اور حامد کے میم پر زبر دیتے ہیں استاد میں سے د کا حذف فارسی قاعدے سے جائز ہے لیکن حامد میں میم پر زبر دلی والوں کی تراشش ہے۔ صحیح تلفظ کے مطابق حامِد کہئے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ دلی والے نہیں ہیں۔

مولانا نوراللہ | یہ خطاط تھے ۔ جامع مسجد کی محرابوں کے اوپر خط ریحان میں کتابت کی عبارت انہی کے بے مثال پاکیزہ خط کا نمونہ ہے ۔ مولانا نوراللہ کا مزار پریڈ گراؤنڈ دہلی میں لال قلعہ کے قریب ہے ۔ اور ان کے پائیں ان کے گرامی قدر صاحب زادے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مزار ہے ۔ شاہ کلیم اللہؒ تصوف و طریقت میں جو پایہ رکھتے ہیں وہی رتبہ انہیں علم میں حاصل ہے ۔ بہت سی اعلیٰ درجے کی علمی تصانیف ان کی یادگار ہیں ۔ شاہ کلیم اللہؒ ثابت کرتے ہیں کہ لاہوری برادری نے جو نام ہنرمندی اور صناعی میں حاصل کیا ہے وہی درجہ اس کے بزرگوں نے علم ظاہر و باطن میں حاصل کیا ہے ۔

لاہوری برادری کے اس طلائی سلسلے کی دو کڑیاں اور ہیں ۔ یہ استاد حامد کے پوتے اور لطف اللہ کے پوتے ہیں ۔

۱۔ امام الدین ریاضی | یہ مہندس اور ریاضی داں تھے ۔ علم ریاضی پر کئی کتابیں ان سے یادگار ہیں ۔

۲۔ خیراللہ مہندس | خیراللہ ، ماہر فلکیات اور مہندس تھے ۔ راجہ جے پال سنگھ والی جے پور نے ان کی مہندسی میں ایک رصدگاہ تعمیر کرائی اور اس کا نام زیج محمد شاہی رکھا ۔ یہ رصدگاہ شکستہ حالت میں نئی دہلی میں اب بھی موجود ہے اور جنتر منتر کے نام سے مشہور ہے ۔

لاہوری کی صنعتیں

ہیرا تراشی ، منبت کاری ، مرصع کاری ، مصوری ، مُہرکنی ، خطاطی ، نقاشی یہ فن تعمیر کی متعلقہ صنعتیں یا تمدن کے بلند ترفنون ہیں ۔ شخصی حکومت کے زمانے میں شاہی سرپرستی سے یہ صنعتیں پھلتی پھولتی ہیں ، لازماً ان کے ماہرین کے لئے سازگار فضا قلعے اور امراء کے محل ہوتے ہیں ۔ ان صنعتوں کے ماہرین سب لاہوری برادری کے افراد تھے ۔ نقاشی خطاطی ، مصوری ، منبت کاری کے کچھ دھندلے نقوش دلّی کے لال قلعے میں اب بھی مل

ہیں۔ فولاد سازی کے سلسلے میں دلی کے لاہوری کاریگروں نے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی تھی ان کی شمشیر سازی کے نمونے اب بھی عجائب خانوں کی زینت ہیں۔ جواہر اور زیورات کے کام میں لاہوریوں کی نادرہ کاری اور نفاستِ ذوق کی گواہی اُمرا کے محلات شاید اب تک دے سکیں گے۔ مصوری میں پچھلی صدی کی مٹی کھٹی دلی کے یگانۂ روزگار محمد فضل مصور کا ذکر اب تک لاہوری برادری والے کرتے ہیں کہ اُن کی قلم ایک اکھ روپے کی مشہور تھی۔ اسی زمانے کے بدرالدین مُہرکن کے چرچے اب تک شہروں میں ہیں جو ہیرا تراشی اور مہرکنی میں نظیر نہیں رکھتے تھے۔ دلی میں اُن کے لاہوری شاگرد مُہرکنوں کا سلسلہ اب تک چلا جا تا ہے اور استاد کے نام کو عزت دیتا ہے۔

<u>موجودہ لاہوریوں کا حال</u> یہ معلوم کرنے کے لئے کوئی کی وہ برادری جو اتنا شاندار تاریخی پس منظر رکھتی ہے، اب کس حال میں ہے۔ ہم اس کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

تعداد

لاہوریوں کی آخری مردم شماری برادری کے انتظام کے ماتحت ۱۹۵۱ء میں کی گئی تھی۔ اس کی اطلاع کے مطابق لاہوریوں کی کل تعداد بیس ہزار ہے۔ اس میں سے ۵۰۰ افراد کاروبار کے سلسلے میں باہر کے شہروں میں ہیں اور ۱۷۵۰۰ افراد دہلی میں ہیں۔

بیرونجات کے ان شہروں میں لاہوری برادری کے لوگ ہیں۔

ریاستیں:- الور۔ اودے پور۔ بھوپال۔ جے پور۔ حیدر آباد دکن۔ رامپور۔

پنجاب:- امرتسر۔ انبالہ۔ جالندھر، شملہ، لاہور۔

یو۔پی:- الہ آباد۔ علی گڑھ۔ فیروزآباد۔ لکھنؤ۔

دیگر:- بمبئی۔ مرشد آباد۔ کلکتہ۔ رنگون۔

<u>دلی سے باہر گئے ہوئے لاہوریوں کا حال</u> لاہوریوں کے بعض گھرانے مذکورہ بالا شہروں

مستقل طور پر بس گئے ہیں، اُنھوں نے وہیں رشتہ داریاں کرلی ہیں۔ کچھ گھرانے ایسے ہیں جو پابندی کے ساتھ ہر سال دہلی آتے ہیں اور رشتہ داری کا زیادہ تر تعلق دہلی میں رکھتے ہیں۔ ریاستوں میں صرف الور اور رامپور کا تعلق سرکاری ہے الور کا تعلق زیادہ قدیم ہے۔ مشہور لاہوری شمشیر ساز خاندان الور سرکار سے متعلق ہے۔ الور والے لاہوری سب سے زیادہ باوضع ہیں۔ وہ لاہوری شرع کے سخت پابند ہیں۔ ہمیشہ مرکز سے متعلق رہتے ہیں اور بیاہ شادی کا تعلق دہلی میں برادری کے سوا کہیں نہیں کرتے۔

دہلی میں لاہوری محلے | دہلی میں لاہوریوں کے کم و بیش .. ۳۵ گھر ہیں۔ جو عموماً ان محلوں اور علاقوں میں ہیں:-

بارہ دری شیر افگن (دہلی دروازہ) باڑہ ہندو راو۔ تماشوں والی گلی۔ پہاڑی املی، پہاڑ گنج تراہا بیرم خاں۔ چوڑی والان۔ حویلی اعظم خاں۔ رہٹ کا کنواں۔ کٹرہ شیخ چاند۔ کشمیری دروازہ۔ کوچہ استاحامد۔ کوچہ پنڈت۔ کوچہ رائے مان۔ کوچہ میر عاشق کوچہ نٹواں۔ گلی امام۔ گلی برنا۔ گلی میر جلا۔ مسجد تہور خاں۔ ملیا محل ———— جن علاقوں میں لاہوریوں کے ایک دو گھر ہیں ان کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ وہی محلے اور علاقے لکھے گئے ہیں جن میں لاہوریوں کے گھر کثرت سے ہیں۔ ان میں بھی کوچہ استاحامد۔ کوچہ رائے مان کوچہ نٹواں۔ شیش محل۔ صدر بازار اور پہاڑ گنج کے کئی بڑے محلے لاہوریوں کے خاص مرکز ہیں۔ لاہوریوں کے صنعتی کارخانے انھی محلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ زیورات کے کچھ خاص اور نامی کاریگروں کے ٹھکانے چاندنی چوک اور دریبہ کلاں اور موتی بازار کے گردو پیش ہیں۔ کیونکہ زیورات کی تجارت کا مرکز شہر کا یہی حصہ ہے۔

لاہوریوں کی تمدنی حالت

رسمیں | مولوی سید احمد کی تالیف رسوم دہلی میں جو شادی غمی کی بے شمار ہندوانہ رسمیں دہلی کے مسلمانوں میں جاری دکھائی گئی ہیں ان میں سے تھوڑی بہت لاہوریوں میں برتی باقی ہیں

مثلاً بری ۔ دہیز (جہیز) کھانا ۔ پینڈیاں ۔ چوکی ۔ منگنی ۔ اور تہواروں پر بہت خرچیلا لین دین ۔ چھٹی ۔ ختنہ ۔ گھوڑی ۔ بسم اللہ روزہ ... جیسی رسمیں کبھی کبھی برتی جاتی ہیں ۔ غمی میں پھول ۔ جمعرات ۔ چالیسواں ۔ برسی کی رسمیں بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہیں ۔

لباس | لباس میں انگرکھا ، دو پلی ٹوپی ، تنگ مہری یا ایک برکا پاجامہ کبھی کا ختم ہوا ۔ کبھی پرانی وضعداری کا پابند لاہوری یوں نظر آجاتا ہے جیسے پت جھڑ کے بعد درخت پر کوئی سوکھا زرد پتہ بچ رہے ۔ کچھ برسوں پہلے سیدھا پاجامہ ، نازک ترش کا کرتہ ، صدری اور ترکی ٹوپی لاہوریوں کا نشان تھی ۔ ترکی ٹوپی کچھ باقی ہے ورنہ نوجوان اب ہمہ رنگ فیشن برتتے ہیں ۔ ہر چیز پر ایک تیز رو تمدن کی اضطراری حالت طاری ہے سچ یہ ہے آج کی دنیا میں جہاں حالات بجلی کی تیزی سے بدلتے ہیں ۔ تمدن میں استقلال یا ٹھہراؤ کی تلاش مایوس کن ہے ۔ پھر بھی لاہوریوں کے اوسط طبقے کے گھروں میں سادگی اور خوش سلیقگی دیکھنے میں آتی ہے ۔

تفریحات | لاہوری تفریحات کے بہت دلدادہ ہیں ۔ آئے دن سیر و شکار کی تقریبیں دیکھیے ۔ ناچ رنگ کی محفلیں جم رہی ہیں ، پتنگ بازی ، پیراکی گلی ڈنڈا ، چوسر ، شطرنج کبڈی کے میچ ہو رہے ہیں ۔ شب برات کے سلسلے میں یا میسوں کے میلے پر آتش بازی میں کمال فن کے مظاہرے ۔ عرس ، قوالیاں ، بسنت ، پھول والوں کی سیر ، سترھویں ان سب میلوں میں لاہوری نوجوان پیش پیش ہیں ۔

صناعوں کا ایک خاص تہوار | ان سب کے علاوہ آخری بدھ کی تقریب خاص ہے جو دلی کے مزدوروں اور صناعوں کا جشن بہار معلوم ہوتا ہے لطف یہ کہ یہ کوئی تہوار قومی یا مذہبی نہیں ، دلی کے سب کاری گر اور صنعتی طبقے اس دن چھٹی کرتے ہیں ۔ پھولوں اور مٹھائیوں کے تحفے کاریگروں کو ملتے ہیں ۔ اس طرح یہ خالص 'مزدوروں کا تہوار' بن جاتا ہے ، آخری بدھ کی رنگینی اس سے ظاہر ہے کہ یہ رسم مزدوروں سے گزر کر امرا اور قلعے تک جا پہنچی

تھی ـــــ غالب کا وہ قطعہ ملاحظہ ہو جس کا پہلا شعر ہے

ہے چہار شنبہ آخر ماہ صفر، چلو ـــــ رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے، مشک بو کی ناند!

برسات میں باغوں کی سیریں، گرمی میں فالیز کی سیر۔ غرض زندہ دلی کے ہر مظاہرے کی روح رواں ... ہوری رہے ... کبھی جب وقت سازگار تھا یہ ادائیں بری نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ وقت بدل گیا لیکن لاہوری اپنی تفریحات میں نہ بدلے۔ انھوں نے اس سے قومی نقصان اُٹھایا، لیکن وقت کا زبردست دھارا ... ہر خشک و تر کو بہا لے جاتا ہے انھیں اور مہلت نہ دے سکتا تھا، انجام کار خوش دلی اور زائد بے فکری اقتصادی بدحالی اور افسردگی سے بدل گئی۔

زبان! زبان کے معاملے میں لاہوریوں کے کئی طبقے ہیں۔ ادنیٰ طبقہ جو پیتل اور چاندی کے بہت معمولی کارخانوں میں لگا ہوا ہے۔ اکثر وہ زبان بولتا ہے جسے دلی کی کرخنداری بولی کہتے ہیں۔ لیکن یہ لحاظ رکھا جائے کہ جب سے جہل و افلاس بڑھتا گیا اور لاہوریوں نے اپنے صنعت گھروں میں دلی کے بہت ادنیٰ طبقے کو شاگردی میں داخل کیا تو نہ صرف زبان متاثر ہوئی بلکہ اخلاق بھی بگڑ گئے۔ کارخانوں کی زبان بلکہ پورا ماحول کہیں کہیں ایسا ہے جیسا رندوں اور اوباشوں کے تکیوں کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ دار تعلیم کی کمی ہے۔ پھر بھی لاہوری برادری کا کاریگر دلی کی دوسری برادریوں کے کاریگر کے مقابلے میں سنبھلی ہوئی زبان استعمال کرتا ہے، یعنی صرف چند لفظوں کی بگڑی ہوئی یا پرانی صورت استعمال کرتا ہے۔ مثلاً جلدی کو زلدی، سرہانے کو سریانے، اُس کے بجائے وس یا وِن۔ کہاں کے لئے کیاں (بہ کسر کاف و اعلان ی) ہے کے ہے گا، کسی، آگے۔ پیچھے کو کسو، آگو، پیچھو بولتا ہے۔ لاہوریوں کا اوسط اعلیٰ طبقہ ٹکسالی اور شستہ زبان بولتا ہے۔ عورتوں کی زبان بھی اسی طرح مختلف ہے۔ کسی گھر میں قدیم اور متروک الفاظ کی کثرت سے دلی دکنی کے زمانے کا سماں بندھ

جاتا ہے، سبزی منڈی کے لاہوری گھروں کے عورتیں ارائیوں کی ہم سائیگی کے اثر سے "عورتیں آئی تھیں" کو "عورتاں آئیاں سیاں" بولتی ہیں —— لیکن بعض گھروں میں الفاظ کی شستگی اور سلاست اور لہجے کی پاکیزگی سے غالب کے خطوط کی بے ساختہ تحریر یاد آجاتی ہے۔

لاہوری برادری۔ لاہوری قوم

یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ لاہوری لوگ ایک آدھ موقع کے سوا اپنے لئے کبھی برادری کا لفظ استعمال نہیں کرتے بلکہ قوم کہتے ہیں یعنی لاہوریوں کی قوم یا قوم لاہوریاں اس لئے راقم سطور بھی اب کہیں کہیں اسے قوم کے نام سے پکارے گا۔

قدیم پنچایتی نظام لاہوری قوم میں شروع سے پنچایتی نظام چلا آیا ہے۔ لاہوریوں کے کسی بھی جھگڑے کے لئے پنچ فیصلہ ناطق فیصلہ ہوتا تھا۔ قوم کا چودھری جو حکم دیتا اس سے سرتابی کی مجال نہ تھی۔ دو گھروں میں شادی کا رشتہ تجویز ہوتا تو چودھری سے اس کی منظوری لینی ضروری تھی۔ دونوں گھروں کی حالت دیکھ کر زیور، کپڑے، مہر، جہیز اور دعوت ولیمہ کی مقدار وہ خود مقرر کرتا تھا جس میں شرعی احکام کی پوری رعایت رکھی جاتی تھی۔ سب سے بڑا چودھری قوم میں ایک ہوتا تھا جو قوم کی بڑی پنچایت کا حاکم ہوتا اور چھوٹے چودھری کے فیصلوں کی اپیل اس کے ہاں کی جا سکتی تھی۔ یہ چھوٹے چودھری معمولی جھگڑوں کا فیصلہ خود لوگوں کے گھر پہنچ کر چکا دیا کرتے۔ یوں محلے میں اُن کی حیثیت ہر گھر کے سرپرست کی ہوتی تھی۔

پنچایتی نظام کا ٹوٹ جانا یہ پنچایتی نظام اب صرف روایتاً باقی ہے اور قوم میں اب بھی چودھری موجود ہیں۔ لیکن اُن کے پاس قانون نہیں ہے نہ اُن کے فیصلوں میں نفاذ کی طاقت ہے نہ وہ کسی لاہوری پر قومی یا اخلاقی قانون توڑنے پر قوم کی طرف سے جواب طلب کر سکتے ہیں۔ پہلے غیر قوم میں رشتہ کرنے کی بڑی مناہی تھی۔ لیکن اب نہ صرف دوسری قوم کی

بیٹی لاسکتے ہیں۔ بلکہ لاہوری بیٹی دوسری قوم کو دی جاسکتی ہے، گو ایسا کرنے پر قوم کے لوگ اپنے بن لکھے قانون کی خلاف ورزی کا احساس کرتے ہیں اور اُسے معیوب خیال کرتے ہیں اب کوئی لاہوری اپنی بیوی سے بدسلوکی کرے یا بلا وجہ اُسے نہ بسائے تو چودھری میں یہ طاقت نہیں ہے کہ قوم کی طرف سے وہ اُسے کوئی اخلاقی سزا دے سکے پنچائتی نظام کا یوں بکھر جانا لاہوری قوم کی شدید زبوں حالی اور انتشار کو ظاہر کرتا ہے

تعلیم لاہوریوں کے علم و فن کا کمال، شخصی بادشاہت کی قدردانی سے جتنا محروم ہوتا گیا اتنا ہی ان کا علمی ذوق کم ہوتا گیا۔ آخر میں وہ اسی تعلیمی نظام کے پابند ہو گئے جو دہلی میں رائج تھا۔ وہ پابندی سے بچوں کو قرآن حفظ یا کم از کم ناظرہ پڑھاتے اور فارسی کے دو ایک ابتدائی رسالے پڑھا کر تعلیم ختم کرا دیتے۔ لکھنا اُن کی پڑھائی کا دوسرا حصہ نہیں تھا۔ یہی انداز لڑکیوں کی تعلیم کا تھا جس کی ذمہ دار ماں یا گھر کی کوئی اور بڑی ہوتی تھی۔ لیکن آج کل یہ نظام تعلیم بھی باقی نہیں ہے۔ لاہوریوں کے بعض طبقوں میں صرف قرآن ناظرہ پڑھانے کی پابندی مذہبی اہمیت کے پیش نظر جاری رہی ہے۔ کہیں قرآن کے ساتھ اسکولی تعلیم کا رواج بھی ہوتا جاتا ہے۔ لیکن افلاس کی وجہ سے اور اکثر اس لئے کہ اسکول کی تعلیم کے نتائج سرپرست کو صنعتی پیشے کے لئے نہ صرف غیر مفید بلکہ مضر نظر آتے ہیں، وہ بچوں کو اسکول کی پوری تعلیم بھی نہیں دلواتا۔ لیکن چونکہ پیشے میں آگے چل کر تعلیم کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے اس لئے برادری کا ایک حصہ کام چلانے کے لئے تھوڑا سا لکھنا پڑھنا سیکھ لیتا ہے۔ ذیل کے تخمینی اعداد و شمار سے لاہوری برادری کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہو سکے گا:

دوسری جماعت کا معیار	پانچویں جماعت کا معیار	میٹرک یا مساوی معیار	کالج کے درجے
۴۰ فی صدی	۲۰ فی صدی	۱ فی صدی	۱ر فی صدی
صرف قرآن	بالکل بے پڑھے لکھے		
۲۰ فی صدی	۱۸ فی صدی		

لاہوری برادری کی عورتیں عورتوں کو اس تخمینے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ ستر فی صدی لڑکیاں مکتب میں یا گھریلو طور پر پورا یا کم قرآن پڑھ لیتی ہیں۔ دس فی صدی لڑکیاں قرآن کے ساتھ معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتی ہیں۔ پانچ فی صدی لڑکیاں اسکول جاتی ہیں اور عموماً پانچویں درجے تک پڑھتی ہیں۔ ۲۵ فی صدی لڑکیاں کسی قسم کی تعلیم حاصل نہیں کرتیں۔ جہاں تک تربیت سلیقے اور ہنرمندی کا تعلق ہے لاہوری برادری کی عورتیں مستثنیٰ درجہ رکھتی ہیں۔ ان میں اکثر سینے پرونے کاڑھنے اور گھریلو ہنرمندیوں میں اتنی ہی اچھی ہیں جتنی صنعتی کاموں میں اُن کے مرد۔ پکانے، ریندھنے میں دلی کی دوسری برادریوں میں لاہوری عورتوں کا لوہا مانا جاتا ہے۔ راقم سطور کی معلومات کے مطابق لاہوری برادری کی عورتیں کھانا پکانے کے ہنر میں شاید سارے ہندوستان کی عورتوں سے آگے ہیں اور ہماری یہ رائے مسلسل ذاتی ذاتی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ کھانے پینے کے معاملے میں لاہوریوں کا مبالغہ پسند ذوق ان کے اقتصادی زوال کا بہت بڑا سبب ہے۔

اقتصادی حالت

لاہوری خوش حال نہیں ہیں لاہوری برادری کو خوش حال نہیں کہا جا سکتا۔ اس برادری کا دولت مند ہونا تو مشکل ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر اس کا تعلق مزدور طبقے سے ہے صنعت اس کے ہاتھ میں ہے لیکن اس صنعت کا تجارتی فائدہ، جو دولت مندی کے لئے لازمی ہے اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ تاہم صنعتیں، جن میں زیور سازی کی صنعت سب سے نمایاں ہے۔ مالی اعتبار سے اُسے مطمئن ضرور کر سکتی ہیں۔ لیکن یہ برادری مطمئن بھی نہیں ہے، اسباب کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ یہاں ہم کچھ سرسری اعداد و شمار پیش کرتے ہیں جن سے مجموعی طور پر برادری کی مالیات کا اندازہ ہو سکتا ہے اور تین خانگی بیزانیے (فیملی بجٹ) دیتے ہیں جن سے انفرادی حالت سامنے آسکے گی۔

عام مالی حالت

(۱) لاہوری برادری میں کسی کی مالی حیثیت دس لاکھ سے زیادہ کی نہیں ہے۔

(۲) ا لاکھ اور ۱۰ لاکھ کے درمیان ۲۰ افراد

(۳) ۵۰ ہزار اور ۱ لاکھ کے درمیان ۴۰ ،،

(۴) ۱۰ ہزار اور ۵۰ ہزار کے درمیان ۵۰۰ ،،

(۵) ۱ ہزار اور ۱۰ ہزار کے درمیان ۵۰۰۰ ،،

مختلف مدات میں برادری کے لگے ہوئے مجموعی سرمایہ کا تناسب

کم از کم دس ہزار کی حیثیت کے آدمی کو دولت مند مان کر مختلف مدات میں برادری کی مجموعی دولت کے صرف کا تناسب حسب ذیل ہے۔

صحرائی جائداد	۵ فی صد روپیہ لگا ہوا ہے
شہری جائداد (مکان، دوکان)	۵۵ ،، ،، ،، ،،
کارخانے (برادری کے مختلف پیشے)	۱۰ ،، ،، ،، ،،
ملوں کے حصے اور سرکاری قرضے	... ...
سودی کاروبار	... ...
زیور، نقد، قیمتی کپڑے اور دیگر اشیاء	۲۰ فی صد روپیہ لگا ہوا ہے
مکان کا سامان۔ فرنیچر، برتن	۱۰ ،، ،، ،، ،،
موٹر، سواری	... ...

(باقی)

مختار احمد صاحب جامعی

حکومتِ ہند کی طرف سے صنعتی پالیسی کا اعلان

جنگ کے بعد حکومت ہند کی صنعتی پالیسی کیا ہوگی۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے وہ لوگ بہت منتظر تھے جو جنگ کے بعد نئی صنعتوں کو جاری کرنے اور پرانی صنعتوں کو وسعت دینے یا قائم رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حکومت سے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ وہ واضح الفاظ میں اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کردے۔ چنانچہ حکومت ہند نے ۲۲ اپریل کو ایک اعلان شائع کیا ہے۔ جس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے حکومتِ ہند نے اپنی صنعتی پالیسی کے بارے میں اعلان شائع کرنے کے وجوہ کو بیان کیا ہے۔ یہ دو ہیں۔ اول یہ کہ حکومت کی عام پالیسی کا صنعتی ترقی پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ منصوبہ بندی ترقی کرکے اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ مربوط اور ہم آہنگ ترقی کے لئے کچھ صنعتوں کا مرکزی نگرانی کے ماتحت لایا جانا نہایت ضروری ہوگیا ہے۔

جن صنعتوں کو مرکزی نگرانی کے ماتحت لانا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔ لوہا اور فولاد۔ انجن سازی۔ موٹر۔ ٹریکٹر اور ٹرک۔ ہوائی جہاز، جہاز سازی اور جہاز رانی سے متعلق انجن سازی بجلی کی مشین، وزنی مشینیں، مثلاً کپڑے، شکر، کاغذ، کان کنی، سمنٹ اور کیمیاوی اشیاء تیار کرنے والی مشینیں، مشین بنانے کے اوزار، وزنی اور ہلکی کیمیاوی اشیا، کیمیاوی رنگ کھاد اور دوائیں، کیمیاوی برقی صنعت۔ روئی اور اون کے کپڑے، سمنٹ، قوت محرکہ کے طور پر استعمال ہونے والے الکوحل، شکر۔ موٹر کے لئے اور ہوا بازی کے لئے ایندھن ربڑ سازی، غیر آہنی دھاتوں کی صنعت۔ بجلی کی قوت۔ کوئلہ، ریڈیو کی مشین سازی۔

۲۔ موجودہ دستور ہند میں اگرچہ صنعتی ترقی کا کام صوبوں کی حکومت کو سپرد کیا گیا

ہے لیکن حکومت ہند کو مفاد عامہ اور مصلحت ملکی کے پیش نظر اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اس قسم کے قانون بنائے جن کے ذریعے بعض خاص صنعتوں کی ترقی کا کام اس کے ہاتھ میں آجائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک قانون، مرکزی مجلس قانون ساز میں جلد ہی منظور کرایا جائے گا لیکن یہ قانون زیادہ دن کے لئے نہیں ہوگا بلکہ جب تک موجودہ دستور باقی رہے گا اس وقت تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہے گا۔

۵۔ سرکار کے نزدیک صنعتی ترقی کے حسب ذیل تین بنیادی مقصد ہوں گے:۔

(۱) ملک کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے کر ملک کی دولت کو بڑھانا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مادی اور انسانی وسائل خاصی بڑی مقدار میں موجود ہیں جن سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ اس لئے حکومت کی پالیسی یہ ہوگی کہ ان سے پورا پورا اور موثر ترین فائدہ اٹھایا جائے۔

(۲) ملک کو مدافعت کے لئے زیادہ بہتر طریقے پر تیار کرنا۔ گذشتہ دو جنگوں کے تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ مدافعت کے لئے جو اشیاء اہمیت رکھتی ہیں ان کی فراہمی کے لئے دوسرے ملکوں پر انحصار کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔

(۳) روزگار اور معروفیت کا ایک بلند تر اور زیادہ مستحکم معیار حاصل کرنا۔ موجودہ زمانے میں صنعتی پیشے سے لوگوں کو مقابلۃً بہت کم روزگار ملتا ہے لیکن جب ملک کے صنعتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ امکانی ترقی دی جائے گی تو صنعتی پیشوں نیز اس کے ضمنی اور امدادی پیشوں اور نمی خدمتوں کے ذریعے ملک میں بہت سے لوگ روزگار سے لگ جائیں گے

حکومت کی اس پالیسی سے یہ بات ایک بدیہی حقیقت کے طور پر اخذ کی جاسکتی ہے کہ صنعتی ترقی کی وجہ سے جو زائد دولت پیدا ہوگی اس کی تقسیم کا کام بھی منصفانہ بنیاد پر کیا جائے گا۔

حکومت کا خیال ہے کہ جنگ کے بعد جو حالات پیدا ہوں گے ان میں حکومت ہند کی موجودہ پالیسی سے مابعد جنگ کی ترقیات کا کام نہیں لیا جاسکے گا۔ اگرچہ ۱۹۱۳ء کے مقابلے میں ہندوستان کی حالت زیادہ مستحکم ہوئی لیکن پھر بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان کی حیثیت ادنے تر ہوگی۔ دوسرے ملکوں میں مشین کی بہت زبردست ترقی ہوگئی ہے۔ اور موجودہ جنگ کی نوعیت کی وجہ سے ماہر صنعتی مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اگر ہندوستان کو بھی بہت تیزی کے ساتھ ترقی کرنا ہے تو یہ لازمی ہے کہ ہندوستان بھی زور شور کے ساتھ اور مسلسل کوشش کرے اور اس کام میں سرکاری اور نجی صنعتیں دونوں حصہ لیں۔

اس لئے حکومت نے آیندہ کے لئے صنعتوں کو زیادہ سے زیادہ امکانی ترقی اور ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کرنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اور ان صنعتوں کی ترقی کو خصوصیت کے ساتھ اہم سمجھتی ہے جن پر موجودہ صنعتی زندگی کی بنیاد قائم ہے۔ مثلاً لوہے اور فولاد کی صنعت، وزنی مشینیں بنانے والی صنعت، مشین سازی کے اوزار بنانے والی صنعت، وزنی کیمیاوی صنعت وغیرہ۔

اگرچہ ان صنعتوں کی ترقی کو بہت زیادہ ترجیح دی جائے گی لیکن پھر بھی توازن کو قائم رکھا جائے گا اور استعمال کی چیزوں کو بھی ترقی کے پروگرام میں ان کی مناسب جگہ دی جائے گی۔

ظاہر ہے اس مقصد میں کامیابی اسی وقت ہوگی جب نجی صنعت کا پورا اشتراک عمل حاصل ہوگا۔ اس لئے اس اشتراک کے حاصل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

(۱) صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے محاصل درآمد و برآمد کی ایسی پالیسی مقرر کرنے پر بھی غور کیا جارہا ہے جو مابعد جنگ کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہو، جو صنعتیں جنگ کے زمانے میں قائم ہوئی ہیں یا جنھیں اس زمانے میں ترقی دی گئی ہے ان کی حالت بھی توجہ

ی محتاج ہے۔ ان میں سے کچھ کو سنہ ۱۹۴۸ء کے اعلان کے ذریعے اطمینان دلایا جاچکا ہے کہ جنگ کے بعد ان کی حفاظت کی جائے گی۔ لیکن ان کے علاوہ دوسری صنعتوں نے بھی اس غیر معمولی زمانے میں قومی معیشت کو سہارا دینے میں بہت حصہ لیا ہے۔

عبوری زمانے میں ایسی صنعتوں کی امداد یا حفاظت جنھیں تندرست بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے فوری اہمیت اختیار کرے گی۔ حکومت بلا توقف ان صنعتوں کی امداد یا حفاظت کے بارے میں تحقیقات کرنے کا انتظام کرنے والی ہے۔ یہ چھوٹی مدت کی کارروائی ہوگی۔ اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک محصول درآمد و برآمد کے سلسلے میں زیادہ لانبی مدت کی پالیسی نہیں بن جائے گی۔

(۶) حکومتِ ہند نے صنعتوں کے انتظام و انصرام کے بارے میں حسب ذیل فیصلے کئے ہیں:۔

(الف) فوجی سامان تیار کرنے والے کارخانے، مفادِ عامہ کی صنعتیں اور ریلیں اس وقت بھی حکومتِ ہند کی ملکیت اور انتظام میں ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ جہاں تک ہوسکے گا بڑی مقدار میں بجلی کی فراہمی کی صنعت کو بھی حکومت ہی کے ہاتھ میں رکھا جائے گا۔

(ب) ان کے علاوہ بنیادی صنعتیں جنھیں قومی اہمیت حاصل ہے جیسے جہاز، موٹر اور ٹریکٹر، کیمیاوی اشیاء، لوہا اور فولاد، انجن، مشین بنانے کے اوزار، بجلی کی مشینیں وغیرہ تیار کرنے والی صنعتیں۔ انھیں بھی قومی ملکیت میں لیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ان کے لئے نجی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہ ہوتا ہو اور ان کی ترقی کو ملکی مفاد میں ضروری سمجھا جائے۔

(ج) حکومت ایسی صنعتوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے جن میں نفع کے مقا میں محصول کا عنصر زیادہ غالب نظر آتا ہے اور حکومت کو ان صنعتوں کو ہاتھ میں

لینا آسان اور ضروری نظر آتا ہے۔ پچھلے زمانے میں اس کی مثال میں نمک کی صنعت کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

(د) باقی تمام صنعتوں کو نجی ہاتھوں میں رہنے دیا جائے گا۔ لیکن ان پر حکومت کی طرف سے بھی نگرانی قائم رہے گی۔ جس کے مدارج مختلف ہوں گے جو صنعتیں ایسی ہوں گی جو معمولی استعمال کی چیزیں تیار کرتی ہوں گی اور جن میں آزاد مقابلہ جاری ہوگا ان پر تو صرف اتنی نگرانی رکھی جائے گی جتنی کہ مزدوروں کے ساتھ انصاف کا سلوک کرانے کے لئے ضروری سمجھی جائے گی۔ لیکن جو صنعتیں ایسی ہوں گی جن کی نوعیت "اجارہ" کی سی ہوگی یا جن کے قبضہ و تصرف میں ایسے صنعتی وسائل ہوں گے جن کی رسد قلیل ہے تو ان پر زیادہ کڑی نگرانی رکھی جائے گی۔ رہا معاملہ کوئلہ کا تو اس کے بارے میں علیحدہ طور پر غور اور فیصلہ کیا جائے گا۔

(۶) اوپر کی فہرست میں جن صنعتوں کو حکومت کے ہاتھ میں رکھنا جائز قرار دیا گیا ہے ان کے بارے میں اس سوال کا تصفیہ کہ آیا موجودہ کارخانوں پر جن کی ملکیت اس وقت نجی افراد کے ہاتھ میں ہے حکومت کو قبضہ کرلینا چاہیے یا نہیں۔ ہر انفرادی صنعت کے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا۔

(و) قومی لحاظ سے اہمیت رکھنے والی کچھ ایسی صنعتیں بھی ہیں۔ مثلاً جہاز سازی کی صنعت اور ریل کے انجن اور بائلر بنانے کی صنعت جنھیں سرکار اور نجی سرمایہ دار دونوں کے ہاتھ میں رکھا جاسکتا ہے۔

(ز) جو صنعتیں سرکار کے ہاتھ میں ہوں گی اُن کا انتظام عام طور پر تو حکومت خود کرے گی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محدود مدت کے لئے حکومت ان کا انتظام کسی نجی ایجنسی یا پبلک کمپنی کے حوالے کر دے۔ اس میں مصلحت یہ ہوگی کہ ان کمپنیوں کے ذریعے حکومت انتظامی تجربہ حاصل کرے۔

۹۔ صنعتوں کی امداد دینے کے لئے حکومتِ ہند نے حسب ذیل تجویزیں پیش کی ہیں:۔

(الف) ملک میں صنعتی ترقی کی بنیاد رکھنے کے لئے حکومتِ ہند اپنی ذمے داری کو اس طرح پورا کرے گی کہ

(۱) معدنی وسائل کے ایک بہت اچھے جائزہ کا بندوبست کرے گی

(۲) سائنس کی ترقی، صنعتی تحقیقات اور اعلیٰ فنی تعلیم کا انتظام کرے گی۔

(ب) جو صنعتیں ملک کی ترقی کے لئے اہم ہوں گی اور جن کے لئے نجی سرمایہ کافی مقدار میں فراہم نہیں ہوتا ہوگا ان کو سرکار یا تو سرمایہ قرض دے گی یا اُن کے سرمایے میں حصہ دار ہو جائے گی۔

(ج) ظاہر ہے جن صنعتوں کو اس قسم کی امداد ملے گی ان پر حکومت کی نگرانی بھی زیادہ ہوگی جس کی صورت مثلاً یہ ہو سکتی ہے کہ ان کی مجلس انتظامیہ میں سرکاری نمائندگی کا مطالبہ کیا جائے گا۔

(د) خاص صورتوں میں صنعتی اقدام کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے سرمایے پر کمتر منافع کی بھی ضمانت کی جا سکتی ہے یا مقررہ سالوں کے لئے اس کے خساروں کی تلافی کی ذمے داری لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس امداد کے لئے لازمی شرطیں یہ ہوں گی کہ انتظام میں حکومت کا بھی دخل ہو اور سرمایے کے معاوضے کی ایک انتہائی حد مقرر کر دی جائے۔

(ہ) سرکار کی امداد کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ منظم صنعتوں کی انجمنوں کی طرف سے تحقیقاتِ علمی کے جو ادارے قائم کئے جائیں اور یونیورسٹیوں کی طرف سے منظور شدہ اسکیموں کے لئے تحقیقاتِ علمی کا جو کام کیا جائے انہیں سرکار کی طرف سے کافی مالی امداد دی جائے۔ یہ امداد اس خرچ کے علاوہ ہوگی جو سرکار براہ راست اپنے تحقیقاتی اداروں مثلاً سائنس اور صنعتی تحقیقات کی کونسل کی معرفت کر رہی ہوگی۔

(ف) اس بلا واسطہ مالی امداد کے علاوہ سرکار اس بات کی معقول ضمانت کرلینے کے بعد کہ مال کی نوعیت اور قیمتیں ٹھیک ہیں۔ موجودہ زمانے کی طرح آیندہ بھی ہندوستان کی صنعت کی حوصلہ افزائی دوسروں کے مقابلے میں اس کا مال خریدکرتی رہے گی۔

(ز) محصول کے نظام پر بھی وقتاً فوقتاً اس نقطۂ نگاہ سے غور کیا جاتا رہے گا کہ جہاں وہ ایک طرف عدل ومساوات کے اصول اور قومی میزانیہ کی مصلحتوں کو پورا کرتا ہے وہاں دوسری طرف اس کا اثر صنعت کی ترقی پر تو خراب نہیں پڑ رہا ہے۔

(ح) جن اشیاء دولت آفریں کی صنعتوں کو ضرورت ہوگی اُن کی فراہمی میں بھی امداد دی جائے گی اور اس کام کے لئے سلطنت متحدہ برطانیہ اور امریکہ میں دفاتر قائم کئے جائیں گے۔

(ط) جن صنعتوں کے لئے ماہروں کا مشورہ خاص طور پر لازمی ہوگا، اُن کے لئے سرکار ماہروں کی خدمات فراہم کرنے میں بھی امداد دے گی۔

۷۔ خاص خاص علاقوں میں صنعت کو مجتمع کر دینے کی وجہ سے جو ناپسندیدہ معاشی معاشرتی اور فوجی مصلحت کے خلاف نتائج پیدا ہوتے ہیں ان کے رفع کرنے کو بھی تجویز میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی ذمے داری اکثر صورتوں میں صنعت کی اس ترقی پر ڈالی جاتی ہے جسے محض اتفاقی اور من مانے طریقے پر ایک خاص شہر کے ساتھ مخصوص کردیا جاتا ہے۔

۸۔ اس کے علاوہ صنعت کے منافع میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک اور زراعت کے ساتھ اس کا رابطہ قائم کرنے کے لئے بھی حکومت صنعت کی ترقی کو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلانا چاہتی ہے۔

۹۔ سرمایہ داروں کی فوری نفع طلبی کی ذہنیت کی وجہ سے موجودہ بے منصوبہ انتظام میں صنعتی ترقی میں جو عدم توازن پیدا ہوتا رہتا ہے اُسے دور کرنے کے لئے بھی حکومت

ہر صنعت کی ترقی کے انتہائی حدود پہلے سے مقرر کر دے گی اور پھر ان کی تقسیم علاقہ وار طریقے پر کر دے گی۔

۱۰۔ سرکار اس کا قانون بنا دے گی کہ ہر نئی فیکٹری کو قائم کرنے اور پرانی فیکٹری کو وسیع کرنے کے لئے لائسنس حاصل کیا جائے کیونکہ اس کے بغیر منصوبہ کے مطابق صنعتی ترقی کو جاری نہیں رکھا جا سکے گا۔

۱۱۔ اس مقصد کے پیش نظر کہ حکومت کی تجاویز کو عوام کی حمایت حاصل ہو اور دیسی ریاستوں کو اس بات کی شکایت نہ ہو کہ اپنی ریاستوں میں صنعتوں کو ترقی دینے کی جو جائز خواہش ان کے اندر موجود ہے اسے ناواجب طریقے پر پامال کیا جا رہا ہے۔ ایک ایسے بالادست بورڈ کو مقرر کرنے کی تجویز زیر غور ہے جو مرکزی حکومت کو ان صنعتوں کے بارے میں جنہیں مرکزی نگرانی کے ماتحت لانے کا ارادہ ہے برابر مشورہ دیتا رہے۔ اس کے فرائض اور دیگر معاملات کا بعد میں تصفیہ کیا جائے گا۔

۱۲۔ اس کے علاوہ دوسری نگرانیاں بھی مندرجہ ذیل مقاصد کو حل کرنے کے لئے تجویز کی گئی ہیں:

(الف) صنعت، زراعت اور اجتماعی خدمات میں جو سرمایہ لگایا جائے اس میں توازن [illegible]

(ب) صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کو اجرت انصاف کے مطابق ملے اور ان کی رہائش کے لئے مہذب انتظامات کئے جائیں۔

(ج) نجی سرمایہ داروں کے بہت زیادہ منافعوں کا سدباب کیا جائے۔

(د) صنعتی مال کی نوعیت کو ملکی اور غیر ملکی منڈیوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے [illegible] رکھنے کی ضمانت کی جائے۔

(ہ) چند افراد یا کسی خاص فرقے کے ہاتھ میں سرمایہ کا غیر صحت مند اجتماع نہ ہ[illegible]

مندرجہ بالا مقاصد میں سے پہلے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سرمایہ کے ا[illegible]

نگرانی رکھی جائے گی ۔ دوسرے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مزدوروں کے واسطے مناسب قوانین بنائے جائیں گے ۔ تیسرے مقصد کے لئے ایسے کاروبار کے منافع کو جس میں آزاد مقابلہ جاری ہوگا ۔ غیر مناسب طریقے پر کم کر کے لوگوں کی حوصلہ شکنی نہیں کی جائے گی ۔ لیکن جہاں آزاد مقابلہ نہ ہوگا اور اس بنا پر غیر معمولی منافع حاصل کئے جاتے ہوں گے وہاں البتہ ضرورت کے مطابق کارروائی اختیار کی جائے گی ۔ چوتھے مقصد کے لئے مال کی معیار بندی کر دی جائے گی اور اس معیار بندی کو نافذ کرنے کے لئے خاص انتظامات کئے جائیں گے ۔ پانچویں مقصد کے لئے مناسب کارروائیاں کی جائیں گی مثلاً سرمایہ کے اجراء پر کنٹرول اور صنعت کی علاقہ وار تقسیم کے لئے لائسنس دینے والا محکمہ ۔

حکومت ہند کو یہ بھروسہ ہے کہ صوبوں اور دیسی ریاستوں کے مشورہ سے ایسا انتظام کیا جا سکے گا کہ دوستانہ اشتراک عمل کے ساتھ ایک متفقہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہوگا ۔ غرض یہ حکومت ہند کی صنعتی پالیسی کا خلاصہ ہے ۔

جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ

رسالہ جامعہ کا کوئی مخصوص سیاسی مسلک نہیں ہے۔ اس لئے اس میں ہر مسلک کے خیالات شائع کئے جاسکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ سنجیدگی اور معقولیت کے معیار پر پورے اُتریں۔ (مدیر)

مسلمانوں میں جو جماعتیں اس وقت کل ہند پیمانہ پر سیاسی کام کر رہی ہیں ان میں ممتاز حسب ذیل ہیں۔

مسلم لیگ، جمعیۃ العلما، مجلس احرار، خاکسار، آل انڈیا مومن کانفرنس، آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور کل ہند مسلم مجلس (جس میں آزاد مسلم کانفرنس بھی ضم ہو گئی ہے۔

ان جماعتوں میں کل ہند مسلم مجلس ابھی نئی قائم ہوئی ہے اور اپنی تنظیم کا کام بڑے پیمانے پر شروع نہیں کر سکی ہے۔ اس کے وجود کا علم صرف ان بیانات سے ہوتا ہے جو اس کے محترم صدر کبھی کبھی شائع فرماتے رہتے ہیں۔ یہی حال تقریباً آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور آل انڈیا مومن کانفرنس کا بھی سمجھنا چاہیے۔ لیکن بقیہ چار سیاسی جماعتیں فعال اور منظم سیاسی وجود رکھتی ہیں۔

ہندوستان میں جہاں غیر ملکی حکمرانوں کا تسلط و اقتدار ابھی تک مضبوطی کے ساتھ قائم ہے کسی سیاسی پارٹی کے فعّال ہونے کی یہ پہچان ہے کہ وہ حکومت کی اٹل چٹان سے اپنا سر ٹکراتی رہے۔ ان چار جماعتوں میں سے خاکسار جماعت نے ابھی تک صرف ایک بڑی ٹکر لی ہے۔ لیکن احرار اور جمعیۃ العلما کے وجود کو مسلسل ٹکر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے البتہ مسلم لیگ نے حکومت سے ابھی تک کوئی قابلِ ذکر جنگ نہیں کی ہے۔ اگرچہ اپنی میدان میں یہ حکومت سے برابر دست و گریبان رہتی ہے۔

خاکسار جماعت کا زور حکومت کی آخری ٹکر کے بعد بہت گھٹ گیا ہے۔ مجلس احرار کے اندر صرف گنے چنے اونچے درجے کے پڑھے لکھے رہنما ہیں۔ باقی لوگوں کا تعلق زیادہ تر ناخواندہ عوام کی جماعت سے ہے اور اگرچہ اس کا اثر ان مقامات کے عوام میں جہاں اس کی باقاعدہ شاخیں ہیں بہت خاصا ہے۔ لیکن بصورت مجموعی اس کی تنہا آواز کوئی سیاسی اہمیت نہیں رکھتی۔ گو مقامی معاملوں اور مسئلوں میں یہ کبھی کبھی بہت زور دکھاتی رہتی ہے۔

اس لئے لے دے کر مسلمانوں میں دو بڑی سیاسی جماعتیں رہ جاتی ہیں:- مسلم لیگ اور جمعیۃ العلماء۔ آیئے انھی دونوں جماعتوں کی نسبتی اہمیت اور خصوصیات کا تجزیہ کریں۔

یہ دونوں جماعتیں ہماری معاشرتی زندگی کی دو اہم اور بنیادی طور پر مختلف تحریکوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مسلم لیگ سیاسی میدان میں "علی گڑھ" کی ترجمان ہے اور جمعیۃ العلماء دیوبندی تحریک کی۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال اور برطانوی حکومت کے عروج کے وقت مسلمانانِ ہند کو ایک نہایت شدید انقلابی دور سے گزرنا پڑا۔ اس انقلاب میں حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور امارت و قیادت کی بلند ارفع جگہوں سے مسلمان بے دخل کئے گئے۔ نہ صرف معاشی حیثیت سے وہ بے بس اور حقیر ہو گئے بلکہ معاشرتی، مذہبی اور تمدنی حیثیت سے بھی اُن کا وجود خطرہ میں پڑگیا۔ ان کی زبان اُن کا ادب، ان کی تاریخ، اُن کا مذہب ان کے رسم و رواج اور معاشرت و تمدن سب کو مغربی حکومت، خیالات اور تہذیب نے مٹانا شروع کر دیا۔ نوجوانوں کو اپنے آباو اجداد کا ترکہ ذلیل اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ نظر آنے لگا۔ انھیں اپنی ہر چیز بُری اور غیروں کی ہر چیز اچھی نظر آنے لگی۔ وہ اپنی محکومی اور بے بسی کا ذمے دار اپنی قدامت پسندی کو قرار دینے لگے اور ان میں سے بہت سے روایتی طریقوں کو چھوڑ کر حکمران طاقت کے نمونہ کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہو گئے۔

یہ حالات تھے جب ایک ہی سرچشمہ فیض سے سیراب کئے ہوئے دو دریاؤں نے نجات کے دو مختلف راستے دکھلائے۔ سرسیدؔ نے نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا راستہ دکھایا اور مغربی علوم و فنون کو سیکھنے اور اُن سے فائدہ اُٹھانے کا سبق دیا اور مولانا محمد قاسم صاحب نے پُرانے علوم کے تحفظ اور ان کی پا بجائی پر زور دیا۔ سرسید نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کیا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب نے دارالعلوم دیوبند۔ ایک کو نیچریت اور جدت پسندی کا گہوارہ سمجھا جانے لگا اور دوسرے کو سنّت و طریقت کا مخزن۔

سرسیدؔ اور مولانا محمد قاسم صاحب دونوں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے تھے اور ان کے جانشینوں اور مریدوں نے جو اصلاح و جہاد کی تحریکیں چلائی تھیں ان کے اثرات کو دونوں نے قبول کیا تھا۔ لیکن استعداد و صلاحیت، فہم و تمیز اور حالات و مواقع کے اختلاف نے دونوں کی طبیعتوں پر ان چیزوں کا بالکل متضاد اثر ڈالا تھا۔ سرسید جدید علم کلام وضع کرنے کی طرف مائل ہوئے اور انھوں نے اپنی وہ تفسیر مرتب کی جس نے انھیں نیچری اور دہریہ کا لقب دلوایا اور مولانا محمد قاسم صاحب نے قدیم طریق سنت اور اتباع آثار سلف کی تجدید شروع کی جس نے انھیں محافظ دین کے خطاب سے سرفراز کیا۔

سرسیدؔ کا مقصد انگریزوں اور مسلمانوں۔ اسلام اور عیسائیت میں مصالحت پیدا کرانا تھا۔ وہ مسلمانوں کی اصلاح و ترقی چاہتے تھے، لیکن انگریزی روش اور طرزِ خیال کو قبول کرکے۔ وہ اسلام اور عیسائیت، مسلم محکومی اور برطانوی شہنشاہی کو ناقابل مصالحت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ دونوں کے اشتراک عمل کے قائل تھے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے تھے۔ وہ انگریزوں کے وجود کو نہ صرف اٹل بلکہ مسلمانوں کے لئے مفید سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ ان کے مٹانے اور ختم کرنے کی کوششوں

کو نری خام خیالی سمجھتے تھے۔

لیکن مولانا محمد قاسم صاحب عیسائیت اور انگریزوں کے ساتھ مصالحت کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے وہ اپنے جسم پر انگریزوں کی حکومت کو بجبر و اکراہ گوارا کر سکتے تھے لیکن اپنے دل پر ان کی حکومت کو قبول کرنے کے لئے کسی شرط پر تیار نہیں تھے۔ وہ اپنے دین اور اسلامی تمدن کو اپنی اصلی حالت پر زندہ اور قائم دیکھنا چاہتے تھے۔

دونوں نے اپنی تمناؤں کو پورا کرنے کا ذریعہ تعلیمی کوششوں کو قرار دیا۔ سرسید نے علی گڑھ میں مدرسہ بنایا، مولانا محمد قاسم صاحب نے دیو بند میں۔

سرسید چونکہ انگریزوں سے مصالحت کے قائل تھے اس لئے ان سے میل جول کے مواقع بڑھاتے تھے۔ دفتر میں، کونسل چیمبر میں، عدالت میں، ہسپتال میں کلب میں ڈنر کی میز پر، بنک اور دوکان میں، کلاس کے کمرہ میں غرض ہر موقع پر سرسید ان کے رفقاء اور اُن کی زیرنگرانی تعلیم حاصل کرنے والے طلباء انگریزوں سے گفتگو اور ملاقات کرتے تھے۔ ان کی بات سمجھنے اور اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور حاکم و محکوم کے درمیان جو بُعد ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ انگریزی زبان، ادب اور علوم سیکھتے تھے تاکہ وہ حاکم انگریز سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکیں اور اس کا اعتماد حاصل کر سکیں۔

لیکن دیوبند کے اساتذہ اور طلباء اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ کی طرح گورنر اور وائسرائے کی سرپرستی اور حکومت کی مالی امداد کے خواہش مند نہیں تھے۔ عقیدت مند عوام کی مالی پیش کش، نذر، زکوٰۃ، صدقات کو اپنے لئے کافی سمجھتے تھے۔ وہ انگریز سے مصالحت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انھیں صرف اپنی چیز بچانے کی فکر تھی۔ انھیں اگر کبھی اتفاق سے انگریز سے ملنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو جھجک کراہیت کے ساتھ ملتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں بُعد اور بیگانگی

قائم رہی

علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبار کو انگریزی سرکار نے اپنی ملازمت میں لیا۔ اپنی عدالتوں میں وکیل، اپنے شفاخانوں میں ڈاکٹر، اپنے مدرسوں میں معلّم بنایا۔ سرکاری ٹھیکے دیئے۔ برطانوی تجارت خانوں نے انھیں اپنی ایجنسیاں دیں، صحافت اور دوسرے علمی پیشوں میں خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کئے جس کی وجہ سے ان کی وفاداری اور ربط و تعلق انگریزوں کے ساتھ بڑھتا رہا اور بڑی حد تک دونوں کے مفاد میں اشتراک پیدا ہوگیا۔ لیکن دیوبند کے طلبار ان تمام مواقع سے محروم رہے ان کا کام عوام کے سامنے وعظ و ارشاد اور ان کی امامت در مذہبی تعلیم رہا اور اسی میں وہ لگے رہے۔ اس لئے انگریز حاکم سے ان کی دوری قائم یا بڑھتی رہی۔

علی گڑھ تحریک کے حلقۂ اثر میں وہ تمام مسلمان آگئے جو سرکار سے فائدے کے متوقع رہتے تھے اور دیوبندی تحریک میں وہ مسلمان شامل ہوئے جو بڑی حد تک سرکار سے آزاد رہ کر اپنا گذر کرتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے پیروؤں کو دنیوی مفاد کا رشتہ باہم منسلک کئے ہوئے تھا۔ دیوبندی تحریک کے حامیوں کو آخرت کے مفاد کا رشتہ۔

ہندوستان میں جب سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور یہاں کے لوگوں نے سیاسی حقوق و اختیارات کے خواب دیکھنے شروع کئے یعنی ۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تو علی گڑھ تحریک کے پیروؤں کو جو مسلم انگریزی اشتراک مفاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے، یہ بات خطرناک نظر آئی۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کی تائید اور ہندوؤں کی مخالفت میں ۱۸۸۸ء میں محبان وطن کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ شروع میں یہ انگریز پرست ہندو مسلمانوں کی متحدہ جماعت تھی لیکن ۱۸۹۳ء میں اس نے خالص مسلمانوں کی جماعت کی شکل اختیار کرلی اور تقسیم

کے ہنگامہ پرور زمانے میں اس جماعت نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا نام اختیار کر لیا

لیکن سیاسی بیداری کی لہریں ان مسلمان حلقوں میں بھی پہنچیں جو علی گڑھ تحریک کے اثر سے باہر تھے۔ ان میں سے کچھ برادران وطن کی تحریکوں میں محض ہندوستانی کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کو یہ شرکت مطمئن نہیں کر سکی۔ وہ ایک آزاد اسلامی سیاسی تحریک کے منتظر رہے۔ اس قسم کی تحریک غیر منظم طور پر ہندوستان میں عرصے سے موجود تھی۔ اس کا سلسلہ سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک جہاد سے ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کا غدر بھی اسی تحریک کا ایک ماحصل تھا۔ جمال الدین افغانی اور سلطان حمید کی اتحاد اسلامی کی تحریک کو بھی اسی ذیل میں لایا جا سکتا ہے۔ دیوبند میں اس تحریک کو وہاں کے اولین طالب علم حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نے اپنایا اور اس وقت سے دیوبند کی تحریک نے ایک سیاسی پہلو بھی اختیار کر لیا۔

اسی دوران میں تقسیم بنگال کی منسوخی، تحریک اتحاد اسلامی کی ترقی اور مسلمانوں میں سیاسی شعور اور بیداری کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی پڑھے ہوئے طبقے میں بھی ترکی کی واحد آزاد اسلامی سلطنت کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی اور انگریزوں اور مسلمانوں کے مفاد کے مختلف ہونے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مفاد کے مشترک ہونے کا احساس ترقی پانے لگا۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مسٹر جناح کی قیادت میں کانگریس لیگ پیکٹ ہوا اور انگریزوں کے سامنے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ہوم رول کا ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا۔ ۱۹۱۷ء میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے ہندوستان کو ذمہ دار حکومت عطا کرنے کا وعدہ کیا اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ جنگ کے بعد خلافت اور مقامات مقدسہ کا حکومت برطانیہ پورا احترام کرے گی۔ لیکن جنگ کے بعد حکومت نے نہ صرف یہ کہ اپنا وعدہ پورا نہیں کیا بلکہ پنجاب میں نہایت ہولناک مظالم کو روا رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اس موقع پر دیوبند کی تحریک کے سیاسی پہلو نے جمعیۃ العلماء ہند

کی صورت میں اپنی رہنمائی کو منظم کیا اور اپنے گرد ان تمام علماء کو جمع کرنا شروع کر دیا جو مذہبی بنیاد پر انگریزوں کی حکومت کے مخالف اور آزادیٔ ہند کی تحریک کے حامی تھے۔

لیکن عامۃ المسلمین جس جھنڈے کے گرد اکٹھے ہوئے وہ خلافت کا جھنڈا تھا اور اس نے علی گڑھ اور دیوبند دونوں کو یکجا کر دیا۔ لیکن اس یکجائی میں دیوبند نے علی گڑھ کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھایا بلکہ علی گڑھ نے دیوبند کی قیادت کو قبول کیا علی گڑھ کے نیچریوں اور یورپ زدہ لوگوں نے مغربی لباس، انگریزی زبان اور مغربی معاشرت کو ترک کر کے دیوبندی شکل و صورت بنائی اور خود کو مشرقی جگہ مولانا کہلوانا شروع کر دیا غرض آکسفورڈ اور کیمبرج، برلن اور پیرس، کولمبیا اور فلاڈلفیا کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے یورپ کے تمدن پر لعنت بھیجی اور علماء ہند کی پیروی کو شرف و سعادت سمجھا۔ اس نے ان کی طاقت کو حیرت انگیز طریقے پر بڑھا دیا۔ پہلے وہ حکومت کے محتاج و دست نگر تھے۔ اب وہ آزادی اور اختیار کے مالک ہو گئے۔ وہ براہ راست طاقت کے خزانہ یعنی عوام تک پہنچ گئے اور اس خزانے کو انھوں نے مذہبی اپیل کی کنجی سے کھول کر اپنے مقاصد کے پورا کرنے کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ عوام نے انھیں محکومیت کی پستی سے نکال کر حکمرانی کے اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچا دیا۔ لیکن یہ کامیابی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ سید احمد بریلوی اور غدر کے جہاد بالسیف کی طرح یہ عدم تشدد پر مبنی جہاد بھی محض جذبات اور تخیلات پر قائم تھا۔ اور ٹھوس حقائق کی طرف سے اس میں طفلانہ لاعلمی اور بیگانگی پائی جاتی تھی۔ اس کے رہنما برطانوی سلطنت کے برقی لیمپ کو محض پھونکوں کی کثرت سے بجھا دینے کی تمنا کر رہے تھے۔ لیمپ تو خیر کیا بجھتا، پھونکوں کی یک رخی بھی زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکی اور اس کی وجہ سے جو زبردست جھاگ اور بلبلے اٹھے تھے وہ بھی کچھ عرصے کے بعد بیٹھ گئے۔

خلافت کی تحریک اب ختم ہو گئی۔ علی گڑھ اور دیوبند کا ازدواجی رشتہ ٹوٹ گیا

البتہ اس رشتہ کی ایک یادگار جامعہ ملیہ اسلامیہ ابھی تک موجود ہے۔ اور اپنے اندر زندگی اور ترقی کے بے شمار سوتوں کو چھپائے ہوئے ہے۔

بہرحال تحریک خلافت جب ختم ہوئی تو مسلم لیگ جو اس کے عروج کے زمانے میں کمزور اور جان بلب ہوگئی تھی دوبارہ طاقتور ہونا شروع ہوئی۔ وہ ہماری معاشرتی زندگی کی ایک واقعی ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ وہ ایک پالیسی پر امن اور آئینی تحریک کی علمبردار تھی۔ جو انگریزوں کے ساتھ مصالحت کرکے ہندوؤں کے مقابلے میں ہمارے انگریزی پڑھے لکھے اور دولت مند طبقے کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اور حکومت کے کاروبار میں مسلمانوں کی خاطر خواہ نمائندگی کا مطالبہ کرتی تھی۔ اس میں شک نہیں اس نے اپنا نصب العین حصول آزادی قرار دے لیا تھا، لیکن وہ ایک انقلابی جماعت نہیں تھی۔ انقلابیوں کی طرح اس کی نظر محض مستقبل پر نہیں تھی یعنی جب انقلاب مکمل ہو جائے گا بلکہ وہ فوری فوائد کے حصول کو مساوی اہمیت دیتی تھی۔ وہ لوگوں کو ملازمتیں، اعلیٰ عہدے، تجارتی فوائد اور دیگر سہولتیں فی الوقت بہم پہنچاتی اور ان کی شکایتوں اور تکلیفوں سے حکمرانوں کو روشناس کراتی تھی۔ اس کی یہ خدمتیں کسی غیر یقینی مستقبل یا آئندہ نسلوں کے لئے نہیں بلکہ موجودہ زمانہ اور اپنے معینہ حلقے کے لئے تھیں۔ مسلم لیگ کے رہنما، مرکزی اور صوبہ جاتی مجالس قانون ساز۔ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے جلسوں، عصرانوں، لنچوں اور ڈنروں کے موقع پر سرکاری حکام سے ملتے جلتے تھے۔ اور انھیں اپنے حلقے کے مطالبوں کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ اپنے ووٹ، اپنے پلیٹ فارم اور پریس کا دباؤ ڈال کر اپنی بات منواتے تھے۔ اس لئے ان کا وجود فیض بخش تھا اور ان کی مقبولیت ان کے حلقے میں لازمی تھی۔ سرکار بھی انھیں خطرناک نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ کبھی انھیں مایوس اور کبھی ممنون کرکے وہ انھیں اپنا طرفدار بنا سکتی تھی۔ ان سے مول تول، گفتگوئے مصالحت کرنے کا موقع تھا۔ غرض ان وجوہ کی بنا پر مسلم لیگ کو ایک آئینی سیاسی جماعت کی

حیثیت سے دوبارہ ترقی ہوئی

لیکن انگریزی لکھے پڑھے اور دولت مند طبقے کے علاوہ مسلمانوں میں ایک کثیر التعداد ایسا طبقہ بھی موجود تھا جس کو اپنے درد کا کوئی مداوا ۔ اپنی تکلیف پریشانی کا کوئی علاج لیگ میں نہ ملتا تھا۔ یہ اپنے دبے ہوئے غم وغصہ ، اپنی ٹھکرائی ہوئی تمناؤں اپنی پوشیدہ آرزوؤں کو ظاہر کرنا چاہتے تھے ، ان کو بھی ایک پلیٹ فارم ، پریس اور اپنے خیالات کے وکیلوں اور نمائندوں کی ضرورت تھی۔ کانگریس یا ملک کی دوسری غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کی وکالت ان کے جذبات کی تسکین کے لئے کافی نہیں تھی۔ یہ چھوٹے تاجروں ، چھوٹے زمینداروں ، کاریگروں اور صناعوں اور مزدوروں کی جماعت تھی ۔ ان کی نمائندگی کا کام جمعیتہ العلما (اور مجلس احرار نے جسے جمعیتہ العلما ہی کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے) نے انجام دیا۔ لیکن اسے سرکاری افسروں سے بعد اور بیگانگی تھی ۔ اس کے علاوہ اس کا حلقہ اتنا وسیع تھا کہ حکام کی انفرادی رعائتیں اس کی شکایتیں رفع کرنے سے قاصر تھیں۔ اس لئے اُسے ایک انقلابی جماعت ہی بننا پڑا۔ اُس نے اپنا نصب العین آزادی کامل قرار دیا اور جملہ فوائد کو اس کے حصول پر منحصر رکھا۔ آزادی کامل کا نصب العین ایک مبہم ، غیر یقینی اور آئندہ کا مقصد تھا۔ لیکن اس کو اختیار کرنے کی وجہ سے جمعیتہ العلما کو اپنے حلقے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ اس کی مذہبی اپیلیں جن میں بڑی سے بڑی ریاضت اور قربانی کے لئے دعوت دی جاتی تھی عموماً آخرت اور دوسری دنیا کے منافع کے لئے ہوا کرتی تھیں جہاں پر لبیک کہنے کے لئے لوگ تیار تھے تو ان کے مقابلے میں اسی دُنیا کے منافع کے لئے اپیل کرنا (اگرچہ وہ فوراً ممکن الحصول نہیں تھے) کہیں زیادہ آسان کام تھا۔

بہرحال جمعیتہ العلما ــــــ اور اس بات میں خاکسار اور احرار بھی اس کے ساتھ شریک کئے جاسکتے ہیں ــــــ خالص سیاسی جماعت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ

مذہبی عقیدت، وابستگی اور وفاداری شامل ہیں۔ اس کی اپیل عموماً مذہبی اپیل ہوتی ہے اس کے رہنماؤں کی عزت مذہبی رہنماؤں کی حیثیت سے کی جاتی ہے۔ یہ مذہب کی تہذیبی قوت سے اپنی بات منواتی ہے۔ یہ خدا اور رسول، قرآن و حدیث، فقہ و شریعت کو درمیان میں لاتی ہو۔ چودہ سو سال کی روایتی مذہبی تنظیم کی پناہ اور حفظ و امان میں اور اسی کی امداد اور تقویت کے ساتھ وہ اپنے سیاسی کام کرتی ہے۔ جمعیتہ العلماء کی بذات خود کوئی اچھی تنظیم نہیں ہے اس کی شاخیں کوئی مستقل دفتر اور مقامی مرکز نہیں رکھتیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کا ایک مخصوص پلیٹ فارم ہے، ایک وسیع حلقۂ اثر ہے اور یہ ہندوستان کے طول وعرض میں اپنی دعوت پر بڑی سے بڑی قربانیوں کے لئے مسلمان مردوں اور عورتوں کو آمادہ کر سکتی ہے۔

لیکن سیاسی بصیرت، آئینی واقفیت، موقع شناس معاملت اور جدید زمانے کے حالات، مطالبات اور طریقہ ہائے کار سے آگاہی اور دنیوی زندگی کے فوری فوائد کے حصول پر توجہ کو مرکوز کرنے کے معاملے میں جمعیتہ العلماء بہت پیچھے ہے۔ سیاسی اعتبار سے نہ یہ ایک اچھی انقلابی پارٹی بن سکتی ہے نہ آئینی اور پارلیمنٹری پارٹی۔ ان معاملوں میں یہ علی گڑھ سے استمداد لینے اور مسلم لیگ سے اشتراک عمل کرنے کے لئے بالکل مجبور ہے۔

خوش قسمتی سے اس استمداد اور اشتراک عمل کے مواقع پہلے کی بہ نسبت اب بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ علی گڑھ کے حلقہ اور مسلم لیگ دونوں میں ایک ترقی پسند عنصر موجود ہے۔ رسالہ جامعہ کے پچھلے شمارہ میں "لیگی سیاست کے نئے میلانات" کے عنوان سے جو مضمون میں نے لکھا تھا اس میں لیگ کے اندر اس عنصر کی ترقی اور نشوونما کو دکھلایا گیا تھا۔ جمعیتہ العلماء کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا مشورہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود شناسی کے ساتھ اپنے حدود کا احساس کرے۔ ان معاملوں میں جن میں علی گڑھ کی استمداد ضروری

ہے وہ اس کا اشتراک عمل حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی پوری قوت سے مسلم لیگ کے ترقی پسند عنصر کو کامیاب بنانے میں امداد دے۔ لیگ کے پاکستانی نصب العین سے جمعیتہ العلماء کو ہرگز نہ بھڑکنا چاہیئے۔ یہ نصب العین ہمارے ملک کی بنیادی حقیقتوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہنے والا ہے۔ خود کانگریس کے بیدار مغز اور ترقی پسند عناصر نے اس بات کا اعتراف کرلیا ہے۔ لیکن اگر جمعیتہ العلماء کی امداد کے باوجود لیگ کے ترقی پسند عنصر کو لیگ کے اندر پنپنے کا کوئی موقع نہیں ملتا تو اُسے پھر مجبوراً لیگ سے باہر آنا پڑے گا۔ اس وقت اس کے لئے مناسب ہوگا کہ جمعیتہ العلماء کے اشتراک عمل سے ایک نئی مسلم لیگ بنائے جس کے لئے ایک موزوں نام پہلے سے رکھا جاچکا ہے یعنی کل ہند مسلم مجلس۔

حالاتِ حاضرہ

۳۰ اپریل کو ہامبرگ ریڈیو نے اعلان کیا کہ جرمنی لڑائی میں ہار گیا ہے۔ یہ شکست کا پہلا اعتراف تھا جو جرمن حکومت کی طرف سے کیا گیا۔ پہلی مئی کو ہٹلر کے انتقال کی خبر دی گئی، اور یہ کہا گیا کہ مرنے سے پہلے وہ امیر البحر ڈونٹز کو اپنا جانشین مقرر کر گئے ہیں۔ اس وقت تک اتحادیوں نے مغرب کی طرف سے بڑھتے بڑھتے دریائے البے کے کناروں تک قبضہ کر لیا تھا، اور جرمن فوجیں جگہ جگہ ہتھیار ڈال رہی تھیں۔ آخر اپریل میں ہملر نے کوشش کی تھی کہ صرف ایک فریق یعنی اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے کام چل جائے، مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ پھر بھی جرمن فوجوں نے ہتھیار اس طرح ڈالے کہ گویا ہملر کی درخواست منظور کر لی گئی ہے۔ روسیوں کے ساتھ لڑائی جس طریقے اور پیمانے پر بھی ممکن تھا چند روز تک جاری رہی اور ادھر شمالی اٹلی اور وسطی اور شمالی جرمنی کی جرمن فوجوں نے دو تین دن کے اندر ہتھیار ڈال دئے۔ اس طرح سے شکست کا اعتراف بھی پروگرام کے مطابق ہوا، اور اس پالیسی کی تکمیل کی گئی کہ جرمنی کا کم سے کم حصہ روسیوں کے قبضے میں آئے اور زیادہ سے زیادہ اتحادیوں کے۔ آخر میں ۷ مئی کو ڈونٹز نے ایک ساتھ اتحادیوں اور روسیوں سے لڑائی بند کرنے کی درخواست کی، اور برلن میں رات کو ٹھیک بارہ بجے جرمنی کی طرف سے فوج کے سپہ سالار فون کائتل، امیر البحر فون فریڈبرگ اور ہوائی بیڑے کے افسر اعلیٰ فون شٹمف نے اتحادیوں کے شرائط نامے پر دستخط کر دئے۔ یہ شرطیں صرف لڑائی بند کرنے کے متعلق ہیں۔ ان کے بعد روسی اور اتحادی جرمنی کے ساتھ جو برتاؤ مناسب سمجھیں کریں گے، گویا جرمنی کے لئے صلح کی شرطیں احکامات کی شکل میں ملا کریں گی جن کی تعمیل سے گریز کرنے کا موقع یا حق نہ ہوگا۔

روسی اور اتحادی اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے، مگر لڑائی بند ہوتے ہی دل میں وسوسے بھی پیدا ہونے لگے جرمنی کے وزیر خارجہ شویرین فون کروسک اور ڈونٹز نے اپنی آخری تقریروں میں نازی پارٹی کا ذکر نہیں کیا تھا، آخر وقت میں فیصلہ کرنے کا اختیار جرمن ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں آگیا، گویا وہی قوم اور ملک کو دشمنوں سے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا اور اسی نے جرمنی کو سلامت رکھنے کی آخری تدبیر کی۔ یہ قومی زندگی میں اس کے مرتبے اور استقلال کا ایک ثبوت ہے، اور اس طرح اتحادیوں کا یہ ارادہ کہ وہ جرمن ہائی کمانڈ، اس کے ماتحت اداروں اور ان روایات کا جن پر اس کے اقتدار کی بنیاد رکھی گئی ہے بالکل خاتمہ کر دیں گے جب تک پورا ہوتا نظر نہیں آتا۔ نازی پارٹی مر مٹی ہے، اس کی قدر کرنے والا اب کوئی نہ رہے گا، اور بہت ممکن ہے کہ ہر غلطی اور ہر مصیبت کا الزام اسی پر لگایا جائے۔ لیکن ہٹلر کی شخصیت، اُن کے حوصلے، ان کی مردانہ موت ایک داستان بنائی جائے گی۔ ہائی کمانڈ سے ان کی جو مخالفتیں ہوئیں ان پر پردہ ڈال دیا جائے گا اور یہ دکھایا جائے گا کہ لیڈر کی موت کے بعد جرمنی کا سہارا اور قومی عزت اور آبرو کا نگہبان وہی تھا۔

اتحادیوں اور روسیوں نے ضمناً ڈونٹز کو جرمنی کا حاکم تسلیم کر لیا ہے۔ ان کا ارادہ یہ ہے کہ جرمنی میں اپنی فوجی عملداری قائم کریں لیکن معلوم نہیں یہ عملداری براہ راست ہوگی یا کسی باضابطہ جرمن حکومت کے وسیلے سے کام لیا جائے گا۔ لڑائی بند ہونے کے بعد ڈونٹز کو فوراً عہدے سے برطرف نہیں کیا گیا۔ فلنزبرگ کا جرمن ریڈیو قوم کو اس طرح مخاطب کرتا رہا کہ گویا اطلاعات کا سرکاری ذریعہ وہی ہے، اور اس پر اخباروں کے نامہ نگاروں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ غالباً جرمنی کی حکومت کا مسئلہ طے نہ ہو سکے گا جب تک اتحادی یہ نہ دیکھ لیں کہ روسی کیا کرتے ہیں۔ آسٹریا میں روسیوں نے اپنی سرپرستی میں ایک عارضی حکومت قائم کر دی ہے، اگرچہ یالٹا میں یہ سمجھوتہ ہوا تھا کہ

میں آسٹریا کے مختلف حصوں میں روس، برطانیہ، فرانس اور متحدہ ریاستوں کی فوجی حکومت قائم ہونا قرار پایا تھا۔ چکوسلوواکیہ کی جلاوطن حکومت سے روسیوں نے شکست کے آخر میں معاہدہ کیا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ چکوسلوواکیہ کا محافظ روس ہوگا۔ ابھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روسی چکوسلوواکیہ کی سابق حکومت کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ اور یہ ناممکن نہیں ہے کہ معاہدہ بحال رہے مگر چکوسلوواکیہ کی حکومت نئے لوگوں کے ہاتھ میں جنے جن کا روس سے تعلق صرف مصلحت پر مبنی نہ ہوگا۔ جرمنی کا دارالسلطنت روسیوں کے قبضے میں ہے، اور کیا تعجب ہے کہ وہ کسی فوری ضرورت کا بہانہ کرکے جرمنی میں ایک عارضی حکومت قائم کردیں جو ان کی سرپرستی کو ان تمام فائدوں پر ترجیح دے جو اتحادیوں کی خوشنودی جرمن قوم کو پہنچا سکتی ہے۔ مارشل ستالن نے اپنی یکم مئی کی تقریر میں پھر کہا تھا کہ روس، جرمنی کی عام آبادی پر کسی قسم کی سختی نہ کرے گا اگر وہ احکامات کی تعمیل کرتی رہے، کہ روس کی لڑائی صرف نازیوں سے ہے، اور وہ صرف نازیوں اور ان کی تعلیم کو مٹانا چاہتا ہے۔ بعض شہروں میں جن پر روسیوں کا قبضہ ہے آبادی سے کہا گیا ہے کہ وہ شہر کے منتظم (یعنی میر یا برگ ماسٹر   کو خود منتخب کرے،
حالانکہ اتحادیوں نے ہر جگہ شہریوں کی رائے لئے بغیر کسی شخص کو بطور منتظم نامزد کردیا ہے۔ اتحادی سپہ سالاروں نے سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جرمنوں سے کسی قسم کا میل جول نہ رکھیں۔ روسی ایسی تصویریں چھاپ رہے ہیں جن میں روسی سپاہی جرمن بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یہ طرزِ عمل جن سیاسی چالوں کی تمہید ہے ان کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف روسی جرمنی میں ایک عارضی حکومت قائم کریں اور اتحادیوں کو اسے تسلیم کرنے کی دعوت دیں اور دوسری طرف اتحادی ڈونٹز یا کسی ایسی شخصیت کو جو آزاد جمہوری حکومت اور سرمایہ داری کے نظام کو قائم کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ روسیوں کی بنائی ہوئی عارضی حکومت کے مقابلے پر لائیں۔ جرمنی نے ہتھیار ڈونٹز کے کہنے پر ڈالے

اور جرمنی میں جو نئی حکومت قائم ہو اُسے ڈونٹز کی حکومت کا قانونی وارث اور صلح کی شرط
پر عمل کرنے کا ذمہ دار ہونا چاہیے۔ جرمنی کے بیشتر شہروں میں زندگی کے بنیادی انتظا
جیسے کہ غذا، پانی اور روشنی کی فراہمی اور آمد و رفت کے ذرائع بالکل برباد ہو گئے
انھیں بحال کرنا اور آبادی کی دوسری ضروریات پوری کرنا اتحادیوں کی مدد سے ہی ممکن ہے
لیکن یہ کام بڑی مشکل سے اور آہستہ آہستہ انجام پا سکیں گے، اور اتحادیوں کے حق میں
بہتر ہوگا کہ ان کے اور جرمن آبادی کے درمیان جرمنوں کا بنایا ہوا کوئی نظام حا
رہے۔ جرمنی اور یورپ کی تاریخ میں وہ تدبیریں فیصلہ کن ہوں گی جو اس وقت رو
اور اتحادی اختیار کریں گے۔ اور ان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے یہ بات سمجھ میں آ سک
کہ ان تدبیروں کے متعلق روسیوں اور اتحادیوں کے درمیان اختلاف ہو۔ روسی حکومت
یہ فتنے داری نہیں کہ وہ اپنے ہر فیصلے کی تصدیق قوم سے کرائے۔ اور وہ اپنی آزادی
پورا فائدہ اٹھائے گی۔ اتحادیوں میں وہ یک جہتی جو جنگ کے دوران میں تھی قائم نہ ر
گی۔ ان کے مشوروں میں دیر لگے گی اور مسٹر چرچل جیسے لیڈر، جو جنگ کے دوران
قومی سیاست پر بالکل حاوی تھے۔ ہر فیصلہ اپنی صواب دید کے مطابق نہ کر سکیں گے۔
تک روسی بعض معاملات میں مشورہ کرتے رہے ہیں تو بعض معاملات میں خود فیصلہ کر
انھوں نے اتحادیوں کو اسے تسلیم کرنے کی دعوت دی ہے، اور جن معاملات کا روس سے
تحفظ سے تعلق تھا ان میں انھوں نے بحث اور اظہار رائے کو بھی بے جا مداخلت قرار
چنانچہ بحر بالٹک کی ساحلی ریاستوں، یعنی لیتھوئینیا، لیتویہ اور استھونیا کے متعلق
پر انھوں نے کوئی گفتگو نہیں ہونے دی اور اتحادیوں کو اس بارے میں کوئی باضابطہ
اطلاع نہیں ہے کہ روسی رومانیہ، بلغاریہ اور ہنگری میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ مما
اتحادیوں کے لئے اس طرح بند ہیں جیسے کہ جنگ کے زمانے میں تھے، کیونکہ روسی ان
ملکوں کے ان لوگوں کو جو یہاں سے نکالے نہیں جا سکتے بڑی سخت نگرانی میں رکھتے

اور دور تنے نہیں دیتے۔ جنگ کے دوران میں اتحادیوں نے روسیوں کی اس حقیقت کا یا کہ وہ ان معاملات کے سوا جن سے خود ان کو مطلب ہے اور کسی مسئلے پر گفتگو تے اور مشوروں میں چاہے جو کچھ طے پائے، عمل میں صرف اپنی مصلحت کا لحاظ ہیں۔ جنگ ختم ہو گئی ہے تو اتحادیوں کا رویہ کچھ نہ کچھ بدلے گا لیکن وہ اس بات سے مجبور ہوں گے کہ روسیوں کو جو کچھ کرنا تھا انھوں نے کر لیا ہے۔ پولینڈ کا مسئلہ اس کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ روسیوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ کرزن لائن کو پولینڈ کی مشرقی سرحد بنا کر رہیں گے اور انھوں نے طے کر لیا تھا کہ پولینڈ کی عارضی حکومت انھی سیاست دانوں پر مشتمل ہوگی جن پر وہ اعتبار کر سکیں اور اب یالٹا کانفرنس کے فیصلے کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے ہیں۔ اب تک ایسا کبھی نہیں ہوا ہے کہ وہ بحث میں قائل ہو کر اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں، یا رویے کو بدلیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جرمنی میں وہ کیا کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں، کیونکہ تحفظ کی جو تدبیریں انھوں نے اب تک کی ہیں ان کی کامیابی اسی پر منحصر ہے۔

دراصل ان قوموں کو جن میں اپنی سیاست کو آزاد رکھنے کی طاقت ہو کسی خاص طریقے کا پابند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ غالباً طہران کانفرنس میں مارشل اسٹالن کو اس بات پر مصر تھا کہ یورپ مختلف حلقوں میں تقسیم کیا جائے اور روسی اور اتحادی اپنے اپنے حلقے میں امن قائم رکھنے کے ذمے دار ہوں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بیان کیا ہوگا کہ پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور رومانیہ کو روس کے حلقۂ اثر میں ہونا چاہیے۔ اس موقع پر پریزیڈنٹ روزویلٹ نے، جن کی بدولت یہ کانفرنس ہوئی تھی، یہ ظاہر کر دیا ہوگا یا سمجھا ہوگا کہ یورپ کی یہ تقسیم کسی اطمینان بخش بین اقوامی نظام میں کھپائی نہیں جا سکتی، کہ انھوں نے مارشل اسٹالن کی تائید بھی نہ کی ہوگی۔ یالٹا کانفرنس میں انھوں نے مارشل اسٹالن کو تھوڑا بہت راضی کر لیا، مگر اس کے باوجود روس کا رویہ نہیں بدلا، اور سین فرانسسکو

کانفرنس کا یہ فیصلہ کہ پولینڈ کے مسئلے کا حل کرنا مارشل سٹالن مسٹر چرچل اور پریزیڈنٹ ٹرومین پر چھوڑ دیا جائے گویا اس کا اعتراف ہے کہ ان معاملات میں جن کا روس، برطانیہ یا متحدہ ریاستوں کے مفاد سے قریبی تعلق ہے۔ بین الاقوامی مجلس اپنی رائے کو تسلیم کرانے کی بہت زیادہ کوشش نہ کرے گی۔

سین فرین سسکو کانفرنس اپنی قسم کی ہر کانفرنس کی طرح تقریروں سے شروع ہوئی جو اکثر نامہ نگاروں کی رائے میں بہت پھیکی تھیں۔ مسٹر مولوتوف نے صدارت کے معاملے میں متحدہ ریاستوں اور برطانیہ کی مخالفت کی اور کامیاب ہوئے۔ لیکن اُن کے اصرار کے باوجود کانفرنس اس پر راضی نہیں ہوئی کہ پولینڈ کی عارضی حکومت کو شرکت کی دعوت دی جائے اور ارجنٹینا کو نہ دی جائے۔ مسٹر مولوتوف نے جو ہنگامے برپا کئے۔ ان کے باوجود کانفرنس کا کام جاری رہا، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد اپنے فیصلے شائع کردے گی۔ ان کی بدولت وہ بین اقوامی نظام قائم ہو جائے گا جس کا خاکہ ڈمبارٹن اوکس کانفرنس میں بنایا گیا تھا۔ یہ بین اقوامی نظام ایک کاؤنسل، ایک اسمبلی اور ایک سکریٹریٹ پر مشتمل ہوگا۔ غالباً کاؤنسل کے اراکین گیارہ ہوں گے، اگرچہ ایک تجویز ہے کہ اس کے اراکین کی تعداد کچھ بڑھادی جائے۔ اراکین میں سے پانچ یعنی متحدہ ریاستیں، برطانیہ، فرانس، روس اور چین مستقل ہوں گے، باقی مخصوص مدت کے لئے منتخب ہوں گے۔ کاؤنسل بین اقوامی اسمبلی کی کارکن جماعت ہوگی، اور یہ بیشتر معاملات میں صرف اسمبلی کے فیصلوں کو نافذ کرے گی تو بعض معاملات میں جن کا دنیا کے امن اور مختلف قوموں کی سیاست کو ہم آہنگ رکھنے سے زیادہ تعلق ہوگا یہ خود فیصلہ کرے گی۔ ابھی یہ فیصلہ زیر بحث ہے کہ تجاویز کو منظور کرنے کے لئے کاؤنسل کے مستقل اراکین کی کل تعداد کا متفق ہونا لازمی مانا جائے یا صرف اکثریت کا۔ لیکن میلان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ جس ریاست کا کسی معاملے سے مخصوص تعلق

ہو اس کی مرضی کے خلاف کاؤنسل میں فیصلہ نہ کیا جائے۔ جنوبی امریکہ کی ریاستیں روس اور کمیونزم کے بہت خلاف ہیں۔ لیکن ان کی خواہش یہ معلوم ہوتی ہے کہ بین اقوامی نظام میں ان کے براعظم کو جداگانہ سیاسی حیثیت دی جائے اور ان کے آپس کے جھگڑے کاؤنسل میں اُن کی رضامندی کے بغیر پیش نہ ہوں۔ یہ خواہش پوری کی گئی تو گویا اس رویے کی تصدیق کر دی جائے گی جو روس نے اختیار کیا ہے۔

اُ۔ م

۱۶ مئی ۱۹۴۵ء

انشا کی تعلیم

وقار عظیم صاحب ایم۔ اے۔ بی ٹی

مضمون نویسی کی تعلیم پر یہ کتاب مکتبہ جامعہ نے اسی مہینے شائع کی ہے جو کم عمر بچوں سے لے کر اونچی جماعتوں کے طلبا تک یکساں مفید ہے۔ مضمون نویسی سکھانے والے اساتذہ اس کتاب سے خاص طور پر فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات قلم بند کرانے، مضمون اور کہانیاں لکھوانے کے طریقے خود اساتذہ کو بتائے ہیں۔ فہرست مضامین حسب ذیل ہے:

- ۱۔ تمہید
- ۲۔ ہماری ضرورت
- ۳۔ زبانی انشار
- ۴۔ تحریری انشار
- ۵۔ مطالعے سے ربط
- ۶۔ قواعد کی تعلیم اور انشار
- ۷۔ مدرس کی ذمے داری

قیمت۔ عہ

مکتبہ جامعہ
قرول باغ۔ دہلی

شاخیں
مکتبہ جامعہ۔ امین آباد، لکھنؤ
مکتبہ جامعہ۔ جامع مسجد، دہلی
مکتبہ جامعہ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی

جامعہ

زیرادارت:- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد۔۴ نمبر ۹	بابتہ ماہ جون سنہ ۴۵ء	سالانہ چندہ صہ؍ فی پرچہ ۸؍

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع پریس دہلی

غذا کی اصلاح و ترقی

ہندوستان کے جاہل اور نلاقف غریبوں کا تو ذکر ہی کیا ہے کہ اُن کی تو مالی مجبوریاں ہی اس بات کی اجازت نہیں دیتیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ یہاں کے پڑھے لکھے اور خوشحال بھی اپنی غذا کی اصلاح و بہتری کے لئے وہ کوشش نہیں کرتے جو ضروری ہے۔ صحت توانائی اور خوش مزاجی کا مدار بڑی حد تک غذا کے ٹھیک ہونے پر ہے۔ جس گروہ کی غذا صحت بخش اور غذائیت کے جملہ اصول کے لحاظ سے مکمل ہے اس کی کارکردگی کی اہلیت بھی اعلیٰ ترین ہوگی اور دوسرے گروہوں کے مقابلے میں اس کی کامیابی کے مواقع بھی نسبتاً زیادہ ہوں گے۔ ہندوستان کے بعض مورخوں نے اس ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی کامیابی کا ایک سبب اُن کی بہتر غذا کو قرار دیا ہے۔ اسی طرح بعض معاشئین نے مختلف گروہوں کی اہلیت کارکردگی کا موازنہ کرتے وقت، غذا کے فرق کو، کارکردگی کے فرق کا ایک اہم سبب قرار دیا ہے۔ اس لئے قوم کی اصلاح و ترقی کی تمام تحریکوں میں غذا کی اصلاح و ترقی کی بنیادی حیثیت حاصل ہونا چاہئے۔ خصوصاً ہماری تعلیم گاہوں میں جہاں تعلیم کے اور دوسرے بہت سے تجربے کئے جاتے ہیں اور تعلیم کے ترقی یافتہ طریقوں کو سوچ کر نکالا جاتا ہے وہاں اُن کے دارالاقاموں میں غذا کے بارے میں تجربوں کو بھی امتیازی حیثیت حاصل ہونی چاہئے اور صدر مدرسہ کو یہ کام یا تو خود اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہئے یا اپنے کسی دوسرے نہایت قابل اور معتمد رفیق کے سپرد کرنا چاہئے۔ اصلاح رسوم و معاشرت کی جہاں اور دوسری بہت سی تحریکیں ملک و قوم میں چلائی جاتی ہیں وہاں اصلاح غذا کی تحریک بھی نہایت زور شور کے ساتھ چلانی چاہئے۔

اس بیان کی تائید میں اعداد و شمار تو موجود نہیں ہیں، لیکن خاصے وسیع مشاہدہ

ے اس قسم کا ایک عام اثر ضرور قبول کیا جا سکتا ہے کہ شہر میں رہنے والے مسلمانوں کا معیار صحت اپنی ہمسایہ اقوام کے مقابلے میں تیزی کے ساتھ گرتا چلا جا رہا ہے۔ اب سے بیس پچیس برس پہلے جتنے جاندار، گٹھیلے اور ورزشی جوان مسلمانوں میں نظر آیا کرتے تھے اب نظر نہیں آتے اور اس زوال کی ذمہ دار بہت بڑی حد تک ان کی غذائی خرابی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاص کر شہر کی مسلمان عورتوں میں تپ دق اور دوسری ضعف کی بیماریوں میں جو ترقی ہو رہی ہے اس میں ناقص غذا کا بڑا دخل ہے۔ مسلمانوں سے قطع نظر ہندوستان کی عام آبادی کے بارے میں ماہر ڈاکٹروں نے بیش تحقیقات کر چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ تحقیقات کے نتائج ابھی درج کئے جائیں گے۔ لیکن اس مسئلے کے بہت سے دوسرے پہلو بھی تحقیقات طلب ہیں اور غذا کی اصلاحی تحریک چلانے والے لوگوں کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ علمی تلاش و تحقیق کے ذریعے ان تاریک پہلوؤں کو روشنی میں لائیں۔

غذا کی اصلاح و ترقی کے سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن چیزوں کو غذا میں شامل کیا جائے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کس مقدار، تناسب شکل اور اوقات میں ان مختلف اشیاء کو استعمال کیا جائے۔ تیسرا سوال ان کے پکانے سے متعلق ہے اور پکانے کے ساتھ ایک ضمنی سوال آمیزش اور اس کے طریقۂ استعمال کا بھی ہے۔ چوتھا پکانے اور کھانے کی جگہوں، برتنوں اور کھانا پکانے والوں کی صفائی اور ستھرائی سے متعلق ہے پانچواں کھانے کے برتنوں کی نوعیت اور تعداد سے۔ چھٹا کھانے کو سلیقہ اور خوش مذاقی کے ساتھ چننے اور تقسیم کرنے سے اور آخر میں سب سے اہم لاگت اور مصارف کا ہے یعنی کم خرچ اور بالانشین بننے کا ——— یہ سب باتیں توجہ اور ترقی کی مستحق ہیں اور قوم کو مہذب اور شائستہ بنانے کے لئے ان سب کی تہذیب اور درستگی ضروری ہے۔

غذا کی اصلاح و ترقی ہی سے متعلق لیکن اوپر درج کئے ہوئے تمام مسئلو

زیادہ بنیادی ایک اور مسئلہ ہے یعنی زمین و آبادی کے باہمی توازن کا مسئلہ یعنی یہ سوال کہ زمین کے اندر، آبادی کے لئے غذا کی مختلف چیزوں کو فراہم کرنے کی صلاحیت کتنی اس وقت موجود ہے اور اسے کتنا اور کس طرح اور بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس سوال کے جواب پر بقیہ اور تمام سوالوں کا جواب منحصر ہے۔ کیونکہ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ آبادی کی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے زیادہ تیز رفتار کے ساتھ زمین کے اندر وسائل غذا کو وسیع کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس وقت تک یہ توقع قائم کرنا کہ کسی ملک کی آبادی کے لئے بہتر اور مکمل غذا مہیا کی جا سکے گی، فضول ہے۔

اس مختصر مضمون میں ان تمام مسئلوں پر تفصیلی بحث کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں اور اپنے قارئین کے اشتراک عمل سے ممکن ہے ہم اس موضوع کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے خیال کو بھی پیش کر سکیں۔ لیکن آج کی صحبت میں ہم صرف چند بنیادی امور کو پیش کریں گے۔

کچھ عرصہ ہوا ہندوستان کے اعلیٰ ترین طبی افسر، سر جان میگا کی زیر نگرانی چھ سو ڈاکٹروں نے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نمونہ کے زراعتی دیہاتوں میں بسے ہوئے تھے، ایک مفصل تحقیقات اس بات کی کی تھی کہ ہندوستان میں غذا کی کمی کی صورت حال کیا ہے؟ ان کی اس تحقیقات کے نتائج کو ذیل کی جدول کی صورت میں درج کیا جاتا ہے۔

صوبہ	زیر بحث مجموعی تعداد	فرزندوں یا بچوں کی تعداد کا اوسط فی خاندان	ارکان کی تعداد کا اوسط فی خاندان	تناسب فی صد جن کو اچھی طرح خوراک مل رہی تھی۔	تناسب فی صد جن کو کم خوراک مل رہی تھی۔	تناسب فی صد جن کو بہت خراب خوراک مل رہی تھی	دودھ کے استعمال کا اوسط فی بالغ شخص اونس یومیہ۔	بچوں کی شرح اموات پہلے سال کے دوران فی ہزار نومولود	زچگی کی شرح اموات فی ہزار نومولود
آسام	۲۲ ہزار ۵۵۲	۶٫۹	۵٫۶	۵۳	۳۸	۹	۲٫۳	۲۵۰	۲۶٫۴
یوپی	۲۷ ہزار ۵۵	۱٫۶	۵٫۴	۴۰	۳۹	۲۱	۵٫۰	۳۰۳	۱۸٫۰
سی پی	۵۸ ہزار ۳۱۷	۱۶٫۵	۵٫۰	۳۲	۵۰	۱۸	۰٫۸	۲۹۶	۸٫۲
مدراس	۱ لاکھ ۸۸ ہزار ۳۴۸	۶٫۳	۵٫۰	۴۶	۳۶	۱۸	۱٫۷	۱۹۸	۱۳٫۲
بنگال	۳۹ ہزار ۹۲۱	۵٫۰	۵٫۵	۳۲	۴۷	۳۱	۲٫۰	۱۸۹	۲۹٫۲
برما	۳۵ ہزار ۷۴۲	۵٫۷	۵٫۸	۴۲	۴۰	۱۸	۳٫۰	۲۴۲	۲۶٫۶
پنجاب	۱ لاکھ ۸ ہزار ۸۱۳	۱۷٫۳	۶٫۲	۴۲	۳۸	۲۰	۱۰٫۰	۲۰۶	۱۸٫۷
بمبئی	۴۸ ہزار ۷۰۰	۱۳٫۸	۵٫۲	۴۵	۴۴	۱۱	۴٫۰	۲۱۴	۲۰٫۱
برطانوی ہندوستان	..	۸٫۴	۵٫۴	۳۹	۴۱	۲	۳٫۵	۲۳۲	۲۴٫۵

اس تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف ۳۹ فی صد آدمیوں کو کافی غذا مل رہی تھی۔ ۴۱ فی صد کو کم غذا مل رہی تھی اور ۲۰ فی صد ایسے تھے جن کو بہت خراب غذا مل رہی تھی۔ بنگال کا تناسب سب سے خراب تھا یعنی علی الترتیب ۲۲ فی صد، ۴۷ فی صد اور ۳۱ فی صد۔ اس رپورٹ کے خاص خاص نتائج کا خلاصہ یہ تھا کہ (۱) تقریباً ۳۰ فی صد دیہات میں آبادی غذا کی رسد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کی آبادی کو بہت کم خوراک مل پاتی ہے (۲) عمر طبعی کا اوسط اس اوسط کے مقابلے میں جو ممکن ہے نصف ہے۔ (۳) غذا کی قلت یا قحط کے زمانے ہر دسویں سال ہر پانچ دیہات میں کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اگرچہ ان میں کوئی غیر معمولی امساک باراں واقع نہیں ہوتا (۴) شرح اموات کے بہت زیادہ ہونے کے باوجود آبادی میں غذا اور دوسری اشیاء کی پیداوار کے مقابلے میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی صورت حال کے تشویش ناک ہونے کا ثبوت زائد آبادی کی دوسری مشہور و معروف بالواسطہ علامتوں سے بھی ملتا ہے۔ مثلاً لوگوں کا ڈیل ڈول کم ہونا۔ ان کی شرح اموات کا زیادہ ہونا۔ شیر خوارگی اور زچگی کی اموات کا زیادہ ہونا۔ افلاس کی وجہ سے پیدا ہونے والے امراض کا وسیع طور پر پھیلا ہوا ہونا، قحط سالی اور وباؤں کی وجہ سے بہت زیادہ جانوں کا تلف ہونا۔ ہندوستان میں متوقع عمر کا اوسط انگلستان کے مقابلے میں نصف ہے۔ شرح اموات دگنی سے زیادہ ہے۔ شیر خوارگی کی اموات تقریباً تین گنا ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے کئی ملکوں نے گذشتہ ۶۰ سال میں اپنی متوقع عمر کے اوسط کو بارہ سال بڑھا کر ۶۲ کر لیا ہے۔ بعض ملکوں میں اسے تقریباً دوگنا کر لیا گیا ہے لیکن ہندوستان میں اسی دوران میں ترقی صرف ایک سال کی ہوئی ہے، یعنی ۲۵ سے ۲۶ سال کی۔

ناقص تغذیہ تغذیہ اور صحت کے نقطۂ نگاہ سے جس قدر غذا کی مقدار اہمیت رکھتی ہے اتنی ہی اس کی نوعیت کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اس معاملے میں بھی ہندوستان کے حالات ناقابلِ اطمینان نظر آتے ہیں۔ کیونکہ جو محدود غذا مل سکتی ہے وہ اپنی غذائیت کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہے۔ زمین کی زرخیزی تدریجی طور پر ختم ہوتی جارہی ہے۔ نوے فیصد زمینیں ادنےٰ درجے کی ہیں اور رقبہ زیرِ جوت برابر مختصر اور منتشر ہوتا جا رہا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کم غذائیت رکھنے والے اناجوں مثلاً جوار، باجرہ مکّی کی کاشت زیادہ غذائیت رکھنے والے اناجوں مثلاً گیہوں اور چاول کے مقابلے میں بڑھائی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ۱۹۱۰ء کو بنیادی سال قرار دیا جائے تو جو کی پیداوار کا اشاریہ ۱۹۳۴ء کے لئے، ۱۵ ہوتا تھا، جوار کے لئے ۲۱۰۔ لیکن چاول کے لئے صرف ۱۰۳٫۵ اور گیہوں کا (۱۹۳۵ء میں ۹۷٫۸ تک گھٹنے کے بعد) ۱۰۴٫۲ تک بڑھ گیا تھا۔ اس صورت حال میں اور زیادہ خرابی اس لئے پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسی ترکاریوں، حیوانی غذاؤں اور دودھ کی پیداوار کا استعمال جن میں حیاتین اور پروٹین (لحمیہ اجزاء) ہوتے ہیں کم کیا جاتا ہے۔ پھلوں اور ترکاریوں کا رقبہ جس میں مصالحوں کا رقبہ بھی شامل ہے کل بوئے ہوئے رقبہ کا صرف ۳ فی صدی ہوتا ہے۔ اس ملک میں دودھ کا استعمال فی کس صرف ۷ آونس ہے۔ درآں حالیکہ برطانیہ میں یہ ۳۹٫۰، ڈنمارک میں ۴۰٫۰، نیوزی لینڈ میں ۵٫۷، فن لینڈ میں ۶۳٫۰ آونس ہوتا ہے۔ ذیل کے نقشے میں ڈاکٹر اکیرائیڈ نے ایک عام غیر متوازن غذا کو اور اس کے بالمقابل ایک متوازن غذا کو جسے اس کی جگہ استعمال کرانا چاہیے پیش کیا ہے:-

	آونس فی یوم	
	عام غیر متوازن غذا	مجوزہ متوازن غذا
اناج	۲۰	۱۵
دال	۱	۳
ترکاری :-		
سبز پتوں والی	۲	۴
بغیر پتوں والی	۲	۶
چکنائی اور تیل	۰٫۵	۲
پھل	۰ :	۲
دودھ	۲	۸

سرجان میگا اور ڈاکٹر ائیکرا ئیڈ کی تحقیقاتوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ ہمارے جثہ وجسامت کے معیار کا پست ہونا اور بیماری اور موت کا آسانی سے شکار بن جانا دراصل غذا کی کمی اور اس کی خرابی کا نتیجہ ہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ اور دوسری جنگ عظیم کی ابتدار کے درمیانی زمانے میں برطانیہ عظمیٰ میں حفاظتی غذ کا استعمال تقریباً ۰د فی صد بڑھ گیا تھا اور ۱۹۳۰ء میں جو لڑکے اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوکر نکل رہے تھے وہ اپنے والدین کے مقابلے میں جب ان کی عمر بھی اتنی تھی، دو یا تین انچ زیادہ لانبے تھے ہندوستان میں اس بات کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ یہاں بھی اس قسم کی ترقی ہوئی ہے۔ بلکہ عام مشاہدہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے بالکل برعکس رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً دودھ کا استعمال برطانیہ عظمیٰ میں ۱۹۳۰ء میں ۲۵۳، ملین گیلن تھا جو ۱۹۳۱ء میں ۲۰۵، ۹ ملین گیلن ہوگیا یعنی ۲۵

بڑھ گیا۔ لیکن دودھ کی فروخت کے بارے میں جو تازہ ترین رپورٹ شائع ہوئی ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ہندوستان میں دودھ کا استعمال فی کس ۱۲ فی صدی گھٹ کر ۸٫۵ آؤنس رہ گیا تھا۔

ہندوستان کی قومی صحت اور کارگذاری کا مسئلہ بنیادی طور پر معاشی مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر ایکرائیڈ کے بیان کے مطابق ان کی مجوزہ متوازن غذا کے مصارف جنگ سے قبل کی قیمتوں کے حساب سے پانچ سے چھ روپئے ماہانہ فی کس ہوتے تھے اس کے مقابلے میں دیہات کی موجودہ غیر متوازن غذا کے مصارف ڈھائی روپیہ ہوتے تھے اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام کی قوت خرید جب تک کم سے کم دوگنی نہ ہو اس وقت تک وہ بیش قیمت متوازن غذا کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہندوستان کے دیہات کے اوسط درجے کے خاندان میں دو بالغ اور تین بچے ہوتے ہیں تو متوازن غذا کا معیار حاصل کرنے کے لئے دو سو بیس روپے سالانہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ڈاکٹر راؤ نے ہندوستان کے لئے سالانہ آمدنی کا تخمینہ فی کارکن صرف ۱۰۰ روپے کیا ہے اور دیہات کے کارکن کے لے ان کا تخمینہ اور بھی کم یعنی ۳۵ روپیہ ہے غرض نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی کثیر تعداد کی آمدنی اتنی کم ہے کہ وہ متوازن اور کافی غذا کا انتظام کرنے کے لئے ناکافی ہے۔

اس لئے ہندوستان میں غذا کی مقدار کو بڑھانا، اور اس کی نوعیت کو بہتر کرنا دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ہماری کوشش صرف موجودہ رسد میں اضافہ کرنے تک محدود نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ اس کے اندر تنوع، غذائیت اور فارغ البالی بھی پیدا کرنا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ غذا پیدا کرنے کی ایک دلیرانہ اور ہمہ گیر پالیسی اختیار کی جائے اور اس میں خاص توجہ ان اناجوں، ترکاریوں اور حیوانی غذاؤں کی طرف کی جائے جن میں غذائیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً گیہوں

دودھ، انڈا، گوشت، مچھلی وغیرہ جو تندرستی اور کارگزاری کے بہتر بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ پیداوار کی اس مہم کے ساتھ عوام کو حسب ذیل امور کے بارے میں بھی تعلیم دینا ضروری ہوگی کہ مختلف غذاؤں میں کتنی غذائیت پائی جاتی ہے۔ کھانے پکانے کے بہترین طریقے کیا ہیں اور تندرستی اور صحت میں باہم کیا تعلق ہے

اس ذیل میں ہم اپنے قارئین کی توجہ ان پمفلٹوں کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو کونور کی تحقیقات تغذیہ کے معمل کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں

ان کے ہیلتھ بلیٹن نمبر ۲۳ کے صفحہ ۱۱ پر حسب ذیل عبارت درج کی گئی ہے۔

انسانوں خصوصاً بچوں کی بہترین نشو و نما کسی ایسی غذا سے نہیں ہو سکتی جو زیادہ تر اناجوں مثلاً چاول جوار باجرہ وغیرہ پر مشتمل ہو الا جس میں دوسری غذاؤں کا اضافہ ناکافی طریقے پر کیا جائے۔ اس قسم کی خامیوں کو دور کرنے کے لئے انھیں دودھ سبز ترکاری، انڈے اور پھل وغیرہ کی خاصی مقدار استعمال کرنا چاہئے۔ ان کو بعض وقت "حفاظتی" غذا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں لحمی اجزا اور معدنی نمکوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ جسم کو بیماری سے اس صورت میں محفوظ رکھتی ہیں۔ جب کھانے میں کم غذائیت رکھنے والے عناصر مثلاً مشین میں کوٹا ہوا چاول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کاڈ لیور آئیل کو جس میں حیاتین الف اور د بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ نہایت قیمتی "حفاظتی" غذا سمجھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کی غذائیں عام طور پر اس لئے ناقص ہوتی ہیں کہ ان میں حفاظتی غذا کی کافی مقدار شامل نہیں ہوتی۔ اس کا خراب اثر خصوصیت کے ساتھ شیرخوار بچوں نمو پذیر نوجوانوں۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتوں پر پڑتا ہے۔

ان لوگوں کے لئے جو کسی ادارے کی طرف سے بچوں کی نگہداشت پر مامور کئے گئے ہوں۔ نیز ان تمام لوگوں کے لئے جو عملی زندگی میں غذا کی فراہمی سے تعلق رکھتے ہوں

اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ ایک غیر متوازن اور ناقص غذا کا تندرستی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً کسی ایسی غذا کا جو زیادہ تر نشاستہ سے بنائے ہوئے اناج پر مشتمل ہو اور جس میں لحمی مادے، معدنی نمک اور حیاتین ناکافی مقدار میں ہوں۔ ہندوستان کے ایسے امراض کی جو تغذیہ کی خرابی کی وجہ سے عام طور پر پھیلے ہوئے ہیں، ایک طویل فہرست تیار کی گئی ہے۔ مثلاً بیری بیری حمل کے زمانے میں خون کی کمی۔ کیراٹومیلیشیا اوسٹومیلیشیا خرابی تغذیہ کی ایسی صورتیں جن میں لوگ کسی سخت بیماری میں مبتلا نہیں ہوتے تو بہت زیادہ عام ہیں جسم کی نشو و نما کو معمول کے مطابق رکھنے کے لئے متوازن غذا کا استعمال نہایت ضروری ہے۔ اگر بچے کو خراب غذا ملے گی تو وہ اپنی عمر کے مقابلے میں چھوٹا اور دبلا نظر آئے گا۔ اس کا وزن لمبائی کے مقابلے میں اوسط سے کم ہوگا۔ وہ آسانی سے بیمار پڑ جایا کرے گا۔ اسکول کے بچوں میں چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا تدارک غذا کو بہتر بنا کر کیا جا سکتا ہے۔ کم یا خراب غذا کھانے والے بچوں میں ایک جمود، زندہ دلی کی کمی، کام اور کھیل میں جوش کا فقدان عام طور پر نظر آئے گا۔ کھال کی حالت بھی تغذیہ کے نقص کو اچھی طرح ظاہر کرتی ہے۔ کھردری خشک کھال یا ایسی کھال جس پر پھوڑے پھنسیاں نکلتی رہتی ہوں۔ اس بات کی علامت ہے کہ غذا ناقص ہے۔ خاص طور پر حیاتین "الف" کی کمی ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ایک اچھے کھلائے پلائے جانور کے بالوں میں چمک، دمک اور نرمی اور چکنائی ہوتی ہے جو خراب غذا کھلائے ہوئے جانور میں نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک اچھے کھلائے پلائے آدمی کی کھال میں بھی چمک اور تندرستی کی دمک ہوتی ہے۔ روشن صاف آنکھیں بھی قابل اطمینان تغذیہ کی نشانی ہیں۔ زیرو پ تھلیا (یعنی ورم چشم یا خشک آشوب چشم) اس لئے ہوتی ہے کہ حیاتین الف غذا میں کم ہوتے ہیں۔ منہ اور زبان میں چھالے اور باچھوں میں زخم ان بچوں میں نظر آتے ہیں جنھیں خوراک اچھی نہیں ملتی۔ اچھے

کھلائے پلائے بچے کی زبان چکنی اور یکساں رنگ کی ہونی چاہئے۔ اور اس پر دانے ابھرتا اور لعاب دار جھلی سے خالی جگہیں نظر نہ آنا چاہئیں۔ اس قسم کے خلل جو عموماً مشین کے کٹے ہوئے چاول کھانے والوں میں ملتے ہیں حیاتین کی کمی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کو دودھ کی مقدار بڑھا کر تیزی سے اچھا کیا جا سکتا ہے۔ مسوڑھوں میں دبانے سے خون نکلنا یعنی ہلکی اسکروی (مسوڑوں کا پھولنا اور خارش) حیاتین "ج" کی کمی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ تازہ پھل اور ترکاریاں کھلائی جائیں۔

<u>غذائیت پر پکانے کا اثر</u> کھانے کی چیزوں پر گرم کرنے اور پکانے اور ہندوستان میں کھانا تیار کرنے کے جو طریقے عام طور پر رائج ہیں ان کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اس بارے میں کافی معلومات موجود نہیں ہیں۔ حیاتین ج معمولی گرمی سے ضائع ہوجاتی ہیں۔ اس لئے غذا میں کچھ بغیر پکائے ہوئے پھلوں کا شامل کرنا مناسب ہے جب کھانے کو بہت زیادہ پانی ڈال کر دیر تک پکایا جاتا ہے تو اس کے کچھ حیاتین اور نمک پانی میں مل جاتے ہیں۔ اور جب پانی کو علیحدہ کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ چاول کے دھونے اور پکانے میں بہت خاصا فاسفورس ضائع ہوجاتا ہے۔ رنگ کو قائم رکھنے یا جلد گلانے کے لئے جب پانی میں سوڈا ملا کر پکایا جاتا ہے تو اس سے حیاتین ضائع ہوجاتے ہیں۔ اس کے برعکس تیزابی چیزیں مثلاً املی کو جب پکانے کے پانی میں ملایا جاتا ہے تو اس سے حیاتین کا تحفظ ہوجاتا ہے۔ گھی کو جب کھلے کڑھائے میں دیر تک گرم کیا جاتا ہے تو حیاتین الف ضائع ہوجاتا ہے۔ کچے اناجوں میں فاسفورس بہت خاصا موجود ہوتا ہے لیکن پکانے سے بہت کافی ضائع ہوجاتا ہے۔

غذا کی اصلاح و ترقی کا موضوع ہماری اولین توجہ کا مستحق ہے اور اس کے لئے باقاعدہ تحریک چلانے کی ضرورت ہے تاکہ غذا کے نقائص اور خرابیوں کو دور کیا جاسکے۔

ننھے کے سوالات

آپ کے ننھے آئے۔ یوں سمجھئے کہ آپ پر اچھی خاصی فرائض کی بوچھاڑ نازل ہو گئی۔ ننھے کے لئے شرارت کی اور آپ کے لئے فرائض کی۔ کھلائی پلائی اور پھر اس کی پڑھائی۔ آپ بھی جی میں کہتے ہوں گے۔ اچھے فتنۂ خوابیدہ کو چھیڑ بیٹھے ہیں ننھے لگا تو اسے تسکین دینے کے لئے جو نہ کرنا تھا وہ بھی کرنا پڑا۔ ابا ابا کہتے تھے۔ جیسے سکھ میں رہتے تھے اب ابا جو کہلوایا۔ کتنا دکھ پایا۔

ان کاموں میں سے ایک تعلیم کا کام ہی تھا۔ پیجئے اس کا حل تو آپ نے چٹکیوں میں کر دیا۔ ننھے کے ابا بننے کا شوق جب پرانا ہو چلا۔ تو جی میں آیا کہ بچے پڑھنے ننھے کا ابا بننا چاہئے۔ لیجئے ننھے کے لئے ایک کتابوں کا بیگ خرید دیا گیا۔ بیگ بے چارہ ابھی مشکل سے گھر پہنچ پایا تھا کہ گھر بھر کے بچوں نے ہلہ بول دیا۔ بہت کھینچا تانی رہی۔ بہت کش مکش کے بعد ننھے بیگ کا ندھے پر لٹکا کے گئے ڈاک بانٹنے۔ مگر اندر ہاتھ ڈال کر جو دیکھتے ہیں۔ تو چٹھی کی بجائے قاعدہ نکلا۔ یہ ان کی تعلیمی زندگی کا پہلا حادثہ تھا۔ ایک ہاتھ میں بیگ، دوسرے میں تختی۔ اور جیب میں قلم تراش۔ پیجئے آپ نے ننھے سپاہی کو خوب مسلح کر دیا۔ اور فخر سے یوں محسوس کر رہے ہیں۔ گویا کہیں سرکاری خدمت پر 'محاذ' میں بھیج رہے ہیں۔ یہ حضرت آگے ننھے کیا کم تھے۔ جو آپ نے اتنے کچھ ہتھیاروں سے سجا دیا۔ اب ان کا فرض کیا ہے۔ یہی سکول فرنٹ۔ اور غنیم! جو سامنے آجائے۔

آپ تو یہ کچھ کر کے اپنے خیال میں ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے۔ منوں بوجھ آپ کے کندھے پر سے ٹل گیا ہے۔ مگر آپ نے کبھی اپنے جی سے

یہ بھی پوچھا کہ کیا سچ مچ مل گیا۔ یا ابھی تک دیماکلیس کی تلوار کی طرح ایک بال کے سہارے سر پہ لٹکا ہوا ہے۔ انسانی سیرت کی تعمیر کا کام اتنا ہی آسان ہوتا تو اللہ میاں اتنے پیغمبر رسول اور مصلح بھیجنے کی بجائے فرشتوں کو استاد اور ان کے گروکو انسپکٹر بنا کر نہ روانہ کر دیتے۔

سچ تو یہ ہے تعلیم کا کام اکیلے استاد کے بس کا نہیں ہے۔ یہ تو پوری سماج کا کام ہے۔ اس عمل میں آپ بھی شریک ہیں۔ استاد بھی ہے۔ اور ماں باپ بھی یہ کام کرنے کا ہے۔ کئی ایک کے کیا سبھی کے کرنے کا ہے!

آپ ننھے کو غور سے دیکھئے۔ اس کی صورت ہمہ تن سوال ہے۔ روٹی کپڑے کا سوال نہیں یہ زندگی اور اس کے مسائل کا سوال ہے سمجھے تو ہر سوالیہ جملے کے بعد نشانِ استفہام (Mark of interrogation)؟ ایک ننھے منّے کا منہ سا معلوم ہوتا ہے۔ جو ہم سے سوال کرنے کے بعد شرارت آمیز حیرانگی سے کھڑا ہو کے رہ گیا ہے اور آنکھوں سے کہہ رہا ہے۔ واہ صاحب اتنے بڑے ہوگئے اور یہ سوال بھی نہ آیا۔

آپ نے اکثر ننھے کو سوال کرتے دیکھا ہوگا۔ سوال کرتے کیا۔ سوالوں کی بوچھار کرتے دیکھا ہوگا۔ وہ تو سوالات کی مشین گن ہے۔ اس کے چھرّے کیوں؟ کیسے؟ کس لئے؟ ہیں۔ جو ان سوالات کی باڑھ کی تاب نہیں لا سکتا۔ ان کا صحیح توڑ نہیں جانتا۔ وہ انسانی محاذ کا اچھا اور کارآمد سپاہی نہیں۔ پھر اگر بے چارہ سوال نہ کرے تو کیا کرے وہ بھی اس دنیا کا نیا نیا مسافر ہے۔ اس کی راہوں سے انجان اس کے گلی کوچوں سے ناآشنا ہے۔ رہ رہ کر اپنے بڑوں سے پوچھتا ہے۔ جواب نہیں ملتا تو دل میں جز بز ہو کر رہ جاتا ہے۔ عجب بستی ہے۔ نئے راہیوں کو راستہ تک نہیں بتاتے۔ مدرسے میں تو اکثر ماسٹر صاحب ایسے پے درپے سوال کرنے

ہیں۔ کہنے کو کچھ پوچھنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔ گئی ایک دن سے ننھے کا رہ رہ کر سوال پوچھنے کو جی چاہتا تھا۔ ماسٹر صاحب سے تو ہمت نہ پڑی۔ امی سے ہی پوچھ بیٹھے۔ بولے امی جان! میں جانوں ہمارے ماسٹر صاحب کو کچھ آتا جاتا نہیں تبھی تو بار بار ہم ہی سے پوچھتے ہیں۔ ننھے کو اس کا شدید احساس تھا کہ وہ مدرسے میں بھی کچھ پوچھ نہیں سکتے اس پر امی نے پیار سے کہا۔ بیٹا! اپنے ابا میاں سے پوچھ لینا۔ اس پر ننھے نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جس میں کئی ایک پرانی یادیں شامل تھیں۔

ابا کی چاند کچھ ہلکی سی ہو چلی تھی اور ننھے کے سر پر تو گویا کوئی جہاں اُگ آیا تھا۔ ایک دن امی سے پوچھنے لگے۔ امی ابا کے سر پر بال اتنے چھدرے چھدرے کیوں ہیں اس پر اماں بولیں۔ بیٹا! سوچتے ہیں نا بہت۔ لکھنے پڑھنے والوں کے سر کے اکثر بال جھڑنے لگتے ہیں۔ ننھے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ بولے امی! پھر تمھارے بال اتنے گھنے کیوں ہیں! ہمیں یہ تو پتہ نہیں کہ اس کا جواب بیلنی سے ملا یا دست پناہ سے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ننھے کو یہ جواب مدتوں یاد رہا۔ اور انھوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ آئندہ کے لئے یہ ایک سوال ہی کافی ہے۔

ننھا بڑا حساس ہے۔ اس کی شدتِ احساس کا تو کبھی کبھی آپ کو بھی پتہ چل گیا ہوگا۔ اگر آپ نے ایک دفعہ اس کے سوال کا جواب بے رخی سے دیا۔ تو اس نے خدا جانے کتنی مرتبہ شعوری نہیں تو غیر شعوری طور پر اپنے ننھے بوٹ کی ایڑی کو زمین میں جما جما کر عہد کیا ہوگا کہ پھر نہ پوچھوں گا حشر تک نہ پوچھوں گا۔

آپ اکثر ننھے کے سوالوں سے جھنجلاتے ہوں گے۔ آپ کا ذہن ہے کہ دفتر کے فائلوں میں لگا ہے۔ یا دکان کے بہی کھاتے میں الجھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ جسم تو گھر میں لے آئے مگر اپنا دل میز کی دراز میں مقفل کر آئے۔ ایسی صورت میں ننھا آپ کے لئے ننھا نہیں۔ بلکہ ایک شے ہے جیسے آپ کے میز پر کا غذات دبانے والا

پیپر ویٹ یا چابیوں کا گچھا۔ جس سے آپ غیر شعوری طور پر کھیلتے رہتے ہیں۔ وہ
انسان نہیں بلکہ ایک شے ہے۔ گھر کی بہت سی چیزوں میں سے ایک چیز۔ دوسر
ذرا گھٹیا۔ یہ ان میں سے بڑھیا۔ گھر سے ایک چیز

بات یہ ہے کہ آپ نے دنیا میں کچھ اتنے کام اپنے سر اوڑھ لئے ہیں کہ ننھ
بے چارہ اُن کے ڈھیر میں گم سا ہوکر رہ گیا ہے۔ ممکن ہے اس کا آپ بُرا مانیں۔
حقیقت ہے یہی۔ اس کوڑے کباڑ کے ڈھیر میں کہیں تو آپ کی سیاسی دلچسپیوں
ترانے ہیں۔ حالانکہ نہ آپ لیڈر ہیں۔ نہ اللہ کے فضل سے لیڈر بننے کا ارادہ ر
ہیں۔ ایک طرف دوستوں، عزیزوں، رشتہ داروں کے ذاتی معاملات کے بلند
ہیں۔ اس میں کہیں خاندانی جھگڑوں کے پرانے گودڑ ہیں۔ اور ان سب سے ا
کاروباری ساجھیوں اور دفتری ساتھیوں کے الجھیڑے اور ان کے نیچے آپ کی زند
کا سرمایہ۔ وہ گوہر گراں مایہ یعنی ننھا گم ہو کے رہ گیا ہے۔ جہاں آپ اتنا کچھ وقت
سب کے لئے نکالتے ہیں۔ کچھ ننھے کے لئے بھی نکال لیتے۔ ابھی تو وہ تھوڑا سا دے
دے کر بہت کچھ ممنون ہوگا اور بعد میں سارا وقت دے کر بھی آپ اُسے ممنون نہ کر
گے۔

ننھے کے سوالات! اکثر آپ کہتے ہوں گے۔ ننھا کیا۔ اور اس کے ننھے
سوالات کیا۔ لیکن سوالات کرنے والا جتنا ننھا منا ہوتا ہے۔ اس کے جوابات ا
ہی زیادہ مشکل اور بنیادی حقیقتوں سے اتنے ہی گہرے طور پر وابستہ ہوتے
ان ننھے منے سوالوں کے جواب اکثر فلسفی اور مفکر بھی نہیں دے پاتے۔
ابا آسمان گول کیوں ہے! تارے کیوں چمکتے ہیں۔ امی! میرے پر کیوں
اُگے۔ ان میں آپ کے لئے دعوت فکر ہے۔ اور آہنگ عمل بھی۔
اور پھر سوالات تو نکی اور خیر کا سا انداز رکھتے ہیں۔ جو پوچھتا ہے۔ وہ تو

جاتا ہے لیکن جو جواب دیتا ہے۔ اس میں بھی ایک خوش گوار تبدیلی آجاتی ہے۔ زندگی کے جس مسئلہ کی جانب سائل کی توجہ مبذول کی جاتی ہے، اس کی جانب اس کا پورا نقطۂ نظر اگر بدل نہیں جاتا تو کم از کم ایک مرتبہ شدید جھٹکا لگا جاتا ہے۔ ذہنی زندگی کے خشک سوتوں میں ہلکا سا انقلاب آجاتا ہے۔ بچوں کے لئے تو استاد، استاد سبھی برابر ہوتے ہیں۔ کیا پروفیسر اور کیا پہلے درجے کے ماسٹر صاحب۔ دونوں علم اور روشنی کے مخزن اور ابلتے ہوئے چشمے۔ مگر ایک یونیورسٹی پروفیسر کے بچے کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ کہ ان کے ماسٹر صاحب کے چہرے پر یہ بے رونقی ان کے لباس میں چیتھڑوں اور پیوندوں کا یہ گستاخانہ ہجوم کیوں ہے۔ انھیں یہ تو خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ استاد کی دنیا میں بھی حسب نسب کا اتنا کچھ تفاوت ہو سکتا ہے۔

ایک دن رہ نہ سکے۔ اپنے ابا سے پوچھ ہی بیٹھے۔ خدا معلوم ان کے ابا نے اس مشکل بے حد مشکل سوال کے جواب کو کیسے نبھایا ہوگا۔ اور پندرہ سو روپے ماہوار کو پندرہ روپلی ماہوار سے کیسے بھڑایا ہوگا۔ خدا نہ کرے۔ آپ کا ننھا آپ سے کوئی ایسا سوال پوچھ بیٹھے۔ اتنا ضرور ہے کہ اگر پوچھے۔ تو یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ اس میں سب کچھ بولنے والا آپ کا ننھا ہی ہے۔ ممکن ہے آپ بھی اس سودے میں گھاٹے میں نہ رہیں۔

ممکن ہے آپ بے حد عدیم الفرصت ہوں۔ یا معلومات کی دنیا سے زیادہ عقیدت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن ننھے کے سوالوں کا جواب نہ تو اکثر کچھ ایسا مشکل ہوتا ہے۔ نہ دیر طلب۔ ایک ہمدرد جواب دینے والے کے لئے اور ماں باپ سے زیادہ ہمدرد کون ہو سکتا ہے۔ جواب دینا اور بھی آسان ہوتا ہے۔ ان کی زبان ہی نہیں۔ ان کی نگاہیں، ان کے دل۔ ان کی پوری شخصیت جواب کی ترجمان ہوتی ہے۔

جواب دینے میں یہ ضروری ہے۔ کہ کیا کچھ بتایا جائے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری یہ کہ کیا کچھ نہ بتایا جائے یعنی اس حد فاصل کا تعین جہاں تک راہبر اپنے انجان مسافر کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر جہاں سے کھڑا ہو کے دور سے اس پُراسرار بستی کے چمکتے ہوئے گنبد دکھا دے۔ جس کا راز تھا اس سوال کے ذریعے فاش کرنا چاہتا ہے بعض غلط قسم کے راہبر کدال اور کلہاڑا لئے ننھے مسافر کے ساتھ ساتھ ہو لیتے ہیں اور جب تک اس پراسرار بستی کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دیتے اپنا ہاتھ نہیں روکتے ایسے جواب دینے والوں کی نہ تو ننھے کو ضرورت ہے اور نہ تعلیمی عمل کو اور پھر اس طرح تو ایک سوال کے جواب میں ہی دل و دماغ جواب دے جائیں گے۔ فرصت کے اوقات دم توڑ جائیں گے اور ہاتھ پاؤں دونوں شل ہو جائیں گے۔

تھا یہ نہیں چاہتا۔ کہ آپ زندگی کے اسرار کو اس کے لئے جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکیں یہ اس کی ذہانت اور شخصیت کی اہانت ہے۔ وہ تو پہلے ان اسرار کی کچھ سن گن چاہتا ہے۔ راستے کے نشیب و فراز کا اندازہ لینا چاہتا ہے۔ پھر چند ایک اوزار اور ہتھیار چاہتا ہے۔ خواہ وہ اس مضمون کی کتابیں ہوں۔ یا تجربی سامان اور آلات اس کے بعد وہ آپ کا دخل (اور آپ کا دخل یقیناً اس کے بعد دخل در معقولات ہوگا) نہیں چاہتا۔ اس میں آپ کا بھی کچھ بھلا ہے۔ آپ اسے تھوڑے وقت میں ایک نہیں کئی ایک نئی دنیاؤں کا اتا پتہ بتا سکتے ہیں اور آپ کا کولمبس ایک امریکہ نہیں کئی ایک امریکاؤں کے معلوم کرنے کا فخر حاصل کر سکتا ہے۔

مولانا حالیؔ کے سیاسی افکار

"شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں" اور ماحول انسانی ارتقاء کی گود میں انجانی طور پر پروان چڑھتا اور زمانے کی تبدیلیوں اور سیاسی تقاضوں کے دامن میں پرورش پاتا ہے! کیونکہ وہ قوموں اور ملکوں کی ترقی اور زوال کا آئینہ دار ہوتا ہے اور ہم اسی آئینے سے اس ادبی جوہر کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں جو ادب کی تبدیلی، ترقی اور نئے تقاضوں کی اصل بنیاد ہے۔ اردو ادب اپنی پیدائش اور نشو ونما کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور وہ ہے جو سامنت شاہی ایوانوں کی چہار دیواریوں میں مقید ہو کر صرف چند افراد کے جذبات کا آئینہ دار رہا۔ لیکن اس کے دوسرے دور کا آغاز غالب اور اس کے بعد سے نذیر، حالیؔ، شبلی اور آزاد وغیرہ کی نئی ادبی تحریکوں سے ہوتا ہے اور اردو ادب کے اس دوسرے دور کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اسی پس منظر کے ماحول میں حالیؔ کے سیاسی افکار پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ہیں! حالیؔ ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے جب کہ دولت مغلیہ آخری تاجدار کے عالم میں ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس وقت انگریزی سوداگر مسکراتے ہوئے سرزمینِ ہند پر اپنی حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کرتے جا رہے تھے۔ حالیؔ (۲۱) ویں برس میں قدم رکھنے ہی پائے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ایک غیر منظم بغاوت ہوئی جسے غدر کے غلط نام سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے ہزاروں خاندان نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے اور خاندانِ مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ اس بادِ صرصر کے جھونکے سے گل ہو گیا اور لکھنؤ کے نواب "مٹیا برج" میں بند کر دیے گئے۔ آن کی آن میں ہندی سیاست پلٹ گئی اور حکمران قوم پر اس قدر تباہی نازل ہوئی کہ وہ سیاسی حیثیت سے بہت دور

معاشی اور ثقافتی حیثیت سے مفلس ہوگئی۔ ان سیاسی واقعات سے متاثر ہوکر حالی اپنا مشن کے کر آگے بڑھتے ہوئے قوم کی زبوں حالی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ کہنہ رسم ورواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امرا، جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے، تھے غافل اور بے پرواہیں علما، جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔"

نثر کے ساتھ ساتھ مولانا کی شاعری میں بھی ماحول کی کشمکش اور گردوپیش کی ڈوبتی ہوئی طاقتیں منعکس نظر آتی ہیں :۔

کل کون تھے آج کیا ہوگئے ہم !
ابھی جاگتے تھے ابھی سوگئے ہم !

بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے !
عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے !

نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت ! نہ اپنوں سے الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی، دماغوں میں نخوت ! خیالوں میں پستی، کمالوں سے نفرت

عداوت نہاں دوستی آشکارا !
غرض کی تواضع غرض کی مدارا !

ماحول شاعر کے لیے ایک ناگزیر تقاضا ہوتا ہے جو اُسے متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔
لیکن یہاں ایک نکتہ قابلِ غور ہے وہ یہ کہ "غالب کے بعد کے شعراء نے سیاسی حالات کا اثر خود تو قبول کیا لیکن اپنی ادبی زندگی کے آبگینے کو ایک زمانے تک ٹھیس نہ لگنے دی" اور یہی بات ابتدا میں حالی کے یہاں بھی پائی جاتی ہے لیکن جب سرسید اور ان کے دوسرے رفقاء نے جن میں سے ایک مولانا حالی بھی ہیں ایک نئے اصلاحی مشن کا آغاز کیا تو زندگی کی ان مختلف النوع تبدیلیوں کے ساتھ ادب کے موضوعات اور رجحانات بھی بدل گئے۔ اسی دور سے صنفِ غزل میں زوال اور نظم میں عروج وارتقاء کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کی سب سے نمایاں مثال حالی اور اسی اسکول کے دوسرے شعراء میں پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ گذشتہ عظمت کی یاد کے ساتھ ساتھ مستقبل کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں جیسا کہ حالی کہتے ہیں کہ:-

یہ تکلیف وراحت ہے سب اتفاقی !

چلو اب بھی ہے وقت چلنے کا باقی :

"مسدس حالی" کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ طویل نظم جس میں قوم کو پیام دیا گیا ہے سرسید کے ایما سے لکھی گئی تھی۔ ہوسکتا ہے یہ بات ایک حد تک بالکل درست ہو لیکن بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سرسید نے جبر کرکے مولانا سے یہ نظم لکھوائی تھی۔ ہم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ شاعر اور ادیب اپنے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں اس لئے وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے اور جب وہ اپنے ماحول سے متاثر ہوتے ہیں تو یقیناً وہ اس کی عکاسی کرتے ہوئے مستقبل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ہمارے اس خیال کی تائید خود مولانا حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں کی ہے :-

"بغیر اقتضائے طبعی اور ولولہ باطنی کے جو شعر کہا جائے گا یا جو نظم

سرانجام کی جائے گی۔ اس میں زور پیدا کرنا نہایت دشوار ہے"

اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

"سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا، بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے"

مسدس حالی کا آغاز عرب کی زبوں حالی سے شروع ہوتا ہے چنانچہ مولانا دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ "میں نے اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند لکھ کر اول عرب کی ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی" مگر اس زبوں حالی کا تذکرہ اپنے ہی انداز میں کرتے ہیں جس کی وجہ سے اس مسدس میں طرز بیان کے لحاظ سے تنوع نہیں پایا جاتا ہے جو "مرثیہ انیس" میں موجود ہے :-

بند ایک ہوتا گرداں شرارا!
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا!

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی! قبیلوں کی کردی تھی جس نے صفائی!
تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی! صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ!
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ!

حالی اپنے زمانے کا اصلاح پسند ادیب تھا وہ زندگی کے ہر زاویے سے اصلاح ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ اس لئے مسدس میں یکسر تبدیلی کا نعرہ کہیں نہیں پایا جاتا ہے۔ البتہ وہ ماضی کے ٹھہراؤ کو زمانے کی چال چلن کے ساتھ ملا دینا چاہتے تھے

بہت قافلے دیکھے جا رہے ہیں! بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت جل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں! بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں

مگر اک تمھی ہو کہ سوتے ہو غافل!
مبادا کہ غفلت میں کھوئے ہو منزل!

آگے چل کر وہ مسدس میں قوم کا دکھڑا یوں بیان کرتے ہیں:۔

وہ ملت کے گردوں پہ جس کا قدم تھا! ہر کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا!
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا! وہ اُمت لقب جس کا خیرالامم تھا!
نشان اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں!
کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں!

نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم! نہ درباریوں میں سرافراز ہیں ہم!
نہ علموں پہ شایانِ اعزاز ہیں ہم! نہ صنعت و حرفت میں ممتاز ہیں ہم!
نہ رکھتے ہیں کچھ منزلت نوکری میں!
نہ حصہ ہمارا ہے سوداگری میں!

یہ ہیں دھنسان تازہ آفت زدوں کا! بہت کم زمانہ ہوا جن کو بگڑے۔
ابھی اک عالم ہے آگاہ جن سے! کہ ہیں کس کے بیٹے وہ اور کس کے پوتے!
جنھیں دیس پردیس سب جانتے ہیں
حسب اور نسب جن کا پہچانتے ہیں

اس نظم کو شروع سے آخر تک پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حالی نے یک سر اردو شاعری کے رجحانات کو بدل کر اس کو قومی زندگی کی عکاسی کا روپ دے دیا تھا انھوں نے شاعری کو ماضی اور حال کی نمایندگی کا جائز وارث قرار دیا لیکن مستقبل کی رہنمائی کا راستہ ٹھیک طور سے نہیں تبلایا اور یہی نقص آج بھی بہت سے ترقی پسند شاعروں میں پایا جاتا ہے۔ اس مسدس کے متعلق جس کو ایک سیاسی کتاب کا رتبہ دیا گیا ہے۔ خود مولانا فرماتے ہیں" کہ اس کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لئے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں اور دوستوں کو غیرت دلانے کے لئے کی گئی ہے" چنانچہ جب سرسید احمد خاں سے کسی نے سوال کیا کہ تم نے ہندوستان میں کون سی سیاسی خدمت انجام دی اور جب تمھارا خدا تم سے اپنی اس زندگی کا حساب

پوچھے گا تو کیا جواب دوگے، انھوں نے فوراً جواب دیا کہ :- "جب خدا پوچھے گا تو کیا لایا، میں کہوں گا حالیؔ سے 'مسدس' لکھوا لایا ہوں۔"

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد سے مولانا حالیؔ انگریزوں سے اتنے بددل ہوگئے تھے کہ جب ان کو ۱۹۰۴ء میں "شمس العلما" کا خطاب ملا تو انھوں نے اپنے لڑکے کو خط لکھتے ہوئے انگریزوں سے اپنی بیزاری کا یوں ذکر کیا تھا:۔

"اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے بہت سے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے رات دن دوائیاں کرتے ہیں مگر میرے لئے تو یہ ایک مصیبت ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہیں ملتا تھا اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لامحالہ وہاں جانا پڑے گا ——— بھلا میں کہاں اور یہ دردسری کہاں۔"

غدر کے بعد سے ہندو مسلمانوں میں جو سیاسی نفاق بڑھتا چلا جا رہا ہے مولانا اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انھوں نے اس نفاق کو ختم کرنے کے لئے کئی مضامین لکھے چنانچہ ۱۶ر جون ۱۹۰۴ء کو "ہندو مسلم اتحاد" کے عنوان سے اخبار "اتحاد" میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں :-

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمانوں میں یکجہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہوگئے ہیں کہ جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں لیکن ہمارے اس امر کے باور کرنے کی کافی وجوہات موجود ہیں کہ جس قدر ملک میں تعلیم کا

ترقی ہوتی جائے گی، جس قدر لوگ قومی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے اور جس قدر نا اتفاقی کے مضر نتائج لوگوں پر آشکارا ہوتے جائیں گے اسی قدر ان پر یہ راز ظاہر ہوتا جائے گا کہ بغیر اتفاق و یک جہتی دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے رہنا اور عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔"

یہ ہیں مولانا حالی کے سیاسی افکار، جن کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے اگر ہمیں حالی کی حقیقی عظمت کا اندازہ لگانا ہے تو ہمیں موجودہ ادب کا پورے طور پر جائزہ لینا ہوگا اسی وقت ہم اُن کی صحیح عظمت اور اُن کے افکار کا پتہ لگا سکیں گے کیونکہ خود اردو زبان اپنے وجود کے لئے سیاسی اثرات کی رہین منت ہے۔ لیکن اگر غالب نے ہمارے ادب کے دھارے کو نہ بدلا ہوتا تو مشکل تھا کہ ہم حالی سے مسدس' جیسی چیز حاصل کر سکتے اور اسی طرح سے اگر حالی ہماری قومی زندگی کے معنوی وجود کو پوری طرح سے ہم پر آشکارا نہیں کرتے تو اقبال جیسے شاعر کے پیدا ہونے میں کافی عرصہ لگتا۔

سری نواس لاہوٹی

ہمارا ظریفانہ ادب

اس وقت اردو ادب ایک دورِ تغیر اور عہدِ اضطراب سے گذر رہا ہے۔ کسی ملک یا قوم کی زبان اور ادب کے آغاز و ارتقار پر غور کیجیے تو یہی پتہ چلے گا کہ ادب ہمیشہ زندگی کے ساتھ کروٹ بدلتا رہا ہے۔ افراد کے رجحانات اور سوسائٹی کے خیالات ادب پر اپنے اثرات ہمیشہ مرتسم کرتے رہے ہیں۔ اور جیسے جیسے معاشرت کی جلا ہوتی ہے ادب میں بھی حسن و لطافت کا رنگ نکھرتا جاتا ہے۔

تاریخ ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ادب جس وقت تحقیق و تنقید کی روشنی میں آتا ہے تو نہ صرف گذشتہ ادبی اعمال کا حسن و قبح ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعے مستقبل کے راستے بھی نظر آتے ہیں۔ جب ادب میں تہذیب و شائستگی کے عناصر پورے طور پر داخل ہو چکتے ہیں تو مفکرین اسے مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھنا شروع کرتے ہیں۔

ادب کے متعلق کیٹس (Keats) جیسے رومانی مزاج شعرار کا نظریہ یہ ہے کہ ادب برائے ادب ہونا چاہیے، کیٹس رومانی شاعری کا قائل ہے۔ جمالیات اس کے نزدیک اہم ترین چیز ہے۔ وہ حسن کو حقیقت اور حقیقت کو حسن سمجھتا ہے۔ اس لئے ادب میں وہ کسی منفعت یا افادیت کا شائبہ بھی نہیں چاہتا۔ اس کے برخلاف دورِ جدید کے ادبی رجحانات مقتضا دیکھنے ادب پر تحقیقات کرنے والوں میں روسو، ارنلڈ، ٹالسٹائی اور مارکس وغیرہ نے آزادی کے ساتھ اپنی اپنی رائیں پیش کی ہیں۔ دورِ جدید کے ادبی رجحانات کا محور آرنلڈ کا یہ خیال ہے کہ ادب کو زندگی کی تنقید ہونا چاہیے وہ اپنے اس نظریے میں شدت یا انتہا پسندی کا مظاہرہ نہیں کرتا لیکن ٹالسٹائی اور بالخصوص مارکس ادب کو نہ صرف افادیت کے نقطۂ نظر سے جانچتے ہیں بلکہ اسے پروپیگنڈے کا آلہ بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں۔ ادب

برائے زندگی ایک فرسودہ امر ہے اور یہ تسلیم کیا جانا چاہئے کہ ادب اور حیات میں ہم آہنگی ہے۔ لیکن ہم آہنگی پیدا کرنے میں ادب کی اصلی روح یعنی حسن کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہئے اگر ایسا نہیں تو ادب، ادب نہیں رہتا۔ کچھ اور بن جاتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ادب کو صرف تخلیق حسن ہی کا تابع بنا دیا جائے۔ لیکن ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دو مختلف نظریوں میں جو تضاد ہے وہ دور ہو سکتا ہے۔ ادب اگر بنیادی اور اساسی خصوصیات کو برقرار رکھتے ہوئے مقتضائے زمانہ کی نمائندگی کرے تو ادبی معیار حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس عمل میں اپنی بنیادی خصوصیات کھو بیٹھے تو اُسے صرف پروپیگنڈا یعنی فیشن کہا جا سکتا ہے۔

ہم اس وقت ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اور یہ ہمارے اور ہمارے ادب کے لئے بڑا نازک مقام ہے۔ دور جدید میں یعنی اس وقت ادب کی باگ ڈور مختلف الخیال لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ان کے تین طبقے ہیں۔ ایک تو وہ جو ادب کو حسن کاری سمجھتے ہیں اور حیات انسانی سے زیادہ متقدمین کی پیروی سے اپنا ربط قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ صرف دل اور حسیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حقائق ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ دوسرے وہ جو ادب سے اس کی تمام حسن کا رانہ خصوصیات چھین کر اسے ہر اس خیال کا عکس بنا دینا چاہتے ہیں جو کسی نہ کسی خاص حادثے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ادب، جنگ کا پروپیگنڈا، خود مختاری، صوبہ داری حکومت، دینی تنظیم۔ مزدوروں کے مسائل۔ کسانوں کی مصروفیت۔ ساہوکاروں کے سود کا لین دین اور اجناس کی گرانی وغیرہ سے بحث کرنے کا نام ہے۔ اس ادب کو ترقی پسند ادب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو ادب کو نہ تو اس کے حسن و جمال سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور نہ ہی اُسے مٹی کی مورت بنا کر پوجنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک ادب ان خیالات اور رجحانات کے مجموعے کا نام ہے جو مقتضائے زمانہ کی

پیداوار ہوں۔ لیکن ان میں لطف اور حسن کا پہلو بھی موجود ہو ہم اس نظریہ امتزاج کو اپنی حد تک درست اور مناسب خیال کرتے ہیں۔

ادبی ظرافت کے معیار کو بھی اسی نقطۂ نظر سے جانچنا ہے کہ کیا وہ صرف ظرافت برائے ظرافت کا رنگ رکھتی ہے یا محض پروپیگنڈا ہے یا حسن اور افادیت کا امتزاج کیٹس کے نظریے کے مطابق ہمارا ظریفانہ ادب جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے تو ادب کی تعریف میں آجاتا ہے۔ لیکن جب ہم افادیت کی تلاش کرتے ہیں تو اس میں منزل رسیدگی کی شان نہیں پاتے۔ اردو ادب میں بالعموم نہ تو اس کے داخلی پہلو پر زور دیا جاتا ہے اور نہ حقیقی افادیت پر۔ اور اس کا بنیادی سبب ہندوستان کے عام حالات تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے خوب لکھا ہے "اگر شائستہ قوموں کی انشا پردازی سوال کرے کہ اردو کی انشا پردازی کیوں اس حالت میں مبتلا رہی تو حاضر جوابی فوراً بول اٹھے گی کہ قوم کی انشا پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے۔ اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی اور بادشاہوں اور امیروں کی قدردانی تھی ویسی ہی انشا پردازی رہی اور خاتمہ کلام اس فقرہ پر ہوگا کہ کوئی پرندہ اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اس کے بازو، فکر سنسکرت، بھاشا وغیرہ تھے، پھر اردو ہماری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پہ کیوں کر جا بیٹھتی۔" (آب حیات صفحہ ۶۴)

ہماری ادبی ظرافت جو زیادہ تر نظم کی صورت میں پیش ہوئی اسی نظریے کی پیداوار ہے۔ مولانا حالی نے ظرافت کی بدحالی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس امر کو واضح کیا ہے کہ بادشاہوں کی سرپرستی نے (جس میں محمد شاہ رنگیلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں) ہمارے مذاق پر کیسے اثرات مترتب کئے ہیں۔ بہرحال اردو کی یہ ظریفانہ شاعری معیاری نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اس کا افادی پہلو زندگی کے کسی عالم گیر مسئلے سے متعلق نہیں

بلکہ ذہنی تفریح، خوشامد، انعام و اکرام کی خواہش پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ جعفر علی زٹلی، سوداؔ انشاؔ اور مصحفیؔ نے کسی نہ کسی سطحی پہلو کو پیش نظر رکھا اور ادبی ظرافت کو تصنع اور صرف فن کی حیثیت دی۔ سوداؔ کے قصیدے شہر آشوب میں البتہ حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے مقصد کے اعتبار سے نظیرؔ اکبرآبادی کے کلام میں عمل و حرکت کا ایک جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ظریفانہ شاعری میں واقعیت نگاری کی پہلی کرن نظیرؔ کے کلام سے پھوٹتی ہے اور نظیرؔ کی ظرافت سے اردو شاعری میں پہلی مرتبہ فرائڈ (Freud) کے اس نظریے کی اشاعت کا پتہ چلا کہ ظرافت نفسی توانائیوں کی حفاظت اور کفایت کے ساتھ اُن کے اظہار کا نام ہے۔ ———— ———— ورنہ اس نظریے کو غلط ثابت کرنے کے لئے انسان کی ظریفانہ شاعری موجود ہے۔ جس پر اسپنسر کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ ظرافت زائد توانائی کی پیداوار ہے۔

نظیرؔ اکبرآبادی نے حقیقت نگاری کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد جن شاعروں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی اور کسی خاص مقصد کو اپنا نصب العین قرار دیا، اُن میں حالیؔ اکبر الہ آبادی اور شبلی نعمانی قابلِ ذکر ہیں۔ اس طریقے سے گویا ہماری ظریفانہ شاعری ارتقائی منازل طے کرنے لگی لیکن بیچ بیچ میں سلسلے ٹوٹتے رہے۔ حالیؔ، اکبر اور شبلی تینوں ہم عصر ہیں۔ اس لئے اُن کے کلام میں ایک ہی عہد کے مسائل پر تنقیدی نکات ملتے ہیں۔ حالیؔ اور شبلی کی حیثیت ظرافت نگار شاعر کے علاوہ اور بھی ہیں۔ لیکن اکبر اردو ادب میں ظرافت کے مقام پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں ———— اس لئے ان کی شاعری متنوع بھی ہے اور جامع بھی۔ ہم اکبر کے کلام کو بحیثیت مجموعی اردو ظریفانہ شاعری کا عروج تسلیم کرسکتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کے بعد اردو ظریفانہ شاعری میں کوئی خاص تغیر و تبدل نظر نہیں آتا۔ ریاض خیرآبادی نے بھی ظریفانہ شاعری کی۔ لیکن ان کا میدان شاعری جداگانہ

ہے۔ مقبول حسین ظریف نے البتہ اس رنگ کو نبھانے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس پس منظر اور استدلال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو ظریفانہ شاعری میں فنیت اور کمال کو زیادہ دخل ہے اور افادیت کا پہلو زندگی کے عالم گیر مسائل سے دور رہا۔

تاریخ ادب اردو کی عجب کیفیت یہ ہے کہ اس میں ادب نہ تو براہ راست زندگی سے متاثر ہوا اور نہ براہ راست ——— زندگی کو متاثر کر سکا۔ ہر بڑے آدمی کی قدر و منزلت اس کے عہد کے بعد ہوئی نظیر کی ظرافت نگاری اپنے عہد کے حالات پر کچھ اثر نہ ڈال سکی اس وقت کے معاشرے نے اس کی ظرافت پر کوئی توجہ نہ دی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ نظیر کی ظریفانہ شاعری کے چراغ کی روشنی ہماری آنکھوں پر اس وقت پڑی جب کہ حالات بدل گئے۔ اکبر الہ آبادی نظیر کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری ان کے بعد میں تحقیق و تنقید کی روشنی میں دیکھی جانے لگی۔ لیکن نظیر ہنوز پس پردہ رہے حال حال میں نظیر کے ظریفانہ کمالات پر کچھ توجہ دی گئی۔ لیکن قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اکبر کی تنقیدی شاعری نے ہماری قومی غفلتوں کو دور کرنے میں کوئی عملی حصہ لیا ہے یا نظیر کی تیز شوخ نگاہی نے ہمیں ماضی سے درس عبرت لینے پر مائل کیا۔ اس لئے نظم کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری ظریفانہ شاعری ملک و قوم کے لئے بہت کم مفید ثابت ہوئی۔

اردو ادب کی ظریفانہ نثر میں خارجی اور داخلی دونوں عناصر کا ہلکا سا امتزاج نظر آتا ہے۔ غالب کے خطوط اور سجاد حسین و سرشار کی ناولوں میں ہمیں حقیقی ظرافت اور شوخی کے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن جب اودھ پنچ کے اردو لکھنے والوں پر ہم غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے ہی اردو ظریفانہ نثر عوام کے رجحانات پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ نواب آزاد، مولانا محفوظ علی اور سلطان حیدر جوش اردو کے قدیم ظرافت نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ہمیں تنقیدی نکات نظر آنے لگے۔ اس سے یہ

نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نظم کی بہ نسبت ہماری نثری ظرافت میں ابتدا سے اعلیٰ اثرات کام کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اردو کی ظریفانہ نثر اب بھی تہی دامن اور منزل نارسیدہ ہے۔ ناول جو ادب میں اس لحاظ سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ سراسر حیات انسانی کے عکاس ہوتے ہیں اردو میں ناپید ہیں۔ بالخصوص ظریفانہ ناول تو اردو میں پائے ہی نہیں جاتے۔ دوسری چیز تمثیل ہے۔ اس کی ادبی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جب ہم مغربی ادب میں برنارڈ شا کے ڈراموں میں ظرافت کے اثرات پر غور کرتے ہیں اور اس کا مقابلہ اردو ادب سے کرتے ہیں تو اس کی تہی دامنی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ اردو میں ظریفانہ انداز کے اشعار اور مضامین بکثرت ہیں۔ جن کے متعلق بہ حیثیت مجموعی کہا جاسکتا ہے کہ ان میں اکثر و بیشتر تقلیدی ہیں۔ تصنع اور ابتذال کی پیداوار۔ تاہم فرحت اللہ بیگ۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے مضامین میں معیاری ادبی ظرافت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان میں مزاح اور ظرافت کی شان بھی ہے۔ اور اپنی منزل متعین کرنے کا ایک جذبہ بھی پنہاں ہے۔ افسانوں میں سے عظیم بیگ چغتائی کے افسانے مثالاً پیش کئے جاسکتے ہیں۔ جن میں مصنف کا جذبۂ احساس، قوت مشاہدہ اور معاشرے کی اصلاح و ترقی کی آرزوئیں کارفرما ہیں قاضی عبدالغفار اور نیاز فتح پوری کی تحریروں میں ایک نصب العین پایا جاتا ہے اور ان کی منزلیں متعین معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں کے انداز بیان میں نسبتاً طنز کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن طنز جہاں تک ظرافت کا آلۂ کار ہو سکتا ہے، مزاح اور ظرافت کی جھلکیاں ان میں نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریریں فرائڈ (سنہ [illegible]) کے بامقصد ظرافت کے نظریے کو پورا کرتی ہیں۔ "لیلیٰ کے خطوط" ہمارے معاشرے کی داخلی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ہمدردانہ طنز کی اس سے عمدہ مثال اردو ادب میں نہیں ملتی۔ اس لئے ہم اردو نثری ظرافت کو نظم پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ظرافت میں نفسیاتی اصول اور زندگی کے اس کے تعلقات کو پیش نظر رکھ کر حقیقی ادبی ظرافت کو پیش کیا گیا تو اردو ادب میں ظرافت

کا کچھ سرمایہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔

ہمارے ظریفانہ ادب نے سوسائٹی پر عمدہ تنقید بھی کی ہے لیکن افادیت کے نقطۂ نگاہ سے یہ تنقید ابھی تک اہل نظر کی توجہ کی محتاج ہے۔ سوسائٹی کے نقاد ادیبوں کی ظرافت نگاری نے ہمارے ماحول پر اب تک وہ راست اثر پیدا نہیں کیا جو ایڈیسن اسٹیل اور گولڈ اسمتھ کی ظرافت نے مغربی ادب پر کیا تھا اور اس کی بڑی وجہ میریڈتھ کا وہ خیال ہے جو کہ اس نے ظرافت نگار شاعروں اور ادیبوں کے ماحول کے متعلق ظاہر کیا ہے۔ میریڈتھ نے ادبی ظرافت کے لئے اس سوسائٹی کی ضرورت بتائی ہے جس کے افراد میں نہ صرف تہذیب اور شائستگی ہونا چاہئے بلکہ ان میں تلوّن مزاجی اور بیکاری جذبات سے دور رہنے کی بھی قوت موجود ہونا چاہئے۔ افسوس ہے کہ ہماری سوسائٹی میں یہ خصوصیات پوری طور پر پیدا نہیں ہوئیں۔

اس لئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہماری ادبی ظرافت باوجود اس کے کہ اس میں اب زندگی سے فرار گریز اور تصنع کی خامیاں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اب بھی بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی کے کان ہنوز ادبی ظرافت کے مضمون اور کیف سے آشنا نہیں ہوئے۔ ذاتیات سے بحث، جذبۂ شہرت پسندی، جلب منفعت کا شوق۔ مصنف بننے کی خواہش حقیقی ادب کی تخلیق میں ہنوز مخل ہیں ادھر ادب کے قدردانوں میں اعلیٰ تمدن و تہذیب اور شائستہ مذاق پیدا ہونا باقی ہے صحافت کی غرض مندیوں، تبصرہ نگاروں کے غیر محتاط ریویو سے ہمارے مصنفین کو کم درجے کی شہرت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وقتی طور پر ہمارے نوخیز علمی معاشرے کے افراد متاثر ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حتی الامکان ان حالات کو نقطۂ اعتدال اور ایک مرکز پر لایا جائے۔

یوسف ناظم ایم اے عثمانیہ

دہلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

فیملی بجٹ۔ (اعلیٰ۔ متوسط۔ ادنیٰ کا ایک ایک نمونہ)

فیملی بجٹ جنگ سے پہلے کی آمد و خرچ کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں۔ جنگ کی وجہ سے جتنا خرچ بڑھا ہے، آمدنی اس تناسب سے نہیں بڑھی ہے۔ اس سے صرف کی مدات متاثر ہوئی ہیں، یا قرض بڑھ گیا ہے۔ بہرحال قبل جنگ کا فیملی بجٹ یہ ہے۔

اعلیٰ (جس کنبے کی ماہوار آمدنی سات سو روپے ماہوار ہو اسے اعلیٰ شمار کیا گیا۔)

کنبے کے افراد:۔

شوہر، بیوی، چار لڑکے، تین لڑکیاں، ایک بہو۔ کل دس افراد۔ پیشہ سادہ کاری ہے۔ ضمنی طور پر دوسرے کاریگروں سے کچھ مال جمع کرکے معمولی کمیشن پر فروخت کرنے کا کام بھی ہے۔ ایک لڑکا جس کی عمر ۱۲ سال کی ہے ابھی پڑھ رہا ہے۔ باقی تین بڑے لڑکے باپ کے ساتھ کام میں شریک ہیں۔ ان تینوں لڑکوں میں چھوٹے نے ساتویں درجے تک منجھلے نے آٹھویں درجے تک بڑے نے میٹرک تک تعلیم پائی ہے۔ خاندان کے بڑے قدیم خیال اور وضع کے پابند ہیں۔ اولاد نئی تہذیب سے متاثر اور اسے اختیار کئے ہوئے ہے —————— یہ ایک مثالی گھر ہے۔ انفرادی ذوق اور حالات کے خفیف اختلاف کے ساتھ اتنی ہی آمدنی رکھنے والے کسی اور گھر میں خرچ کی مدات میں کہیں کہیں اختلاف ہوگا —————— کھانے کا معیار البتہ سب جگہ یکساں بلند ہے اور آمدنی کا بڑا حصہ اس میں صرف ہوتا ہے۔

تفصیل اخراجات ماہانہ

کھانا	250/	نذر نیاز	×
کپڑا	100/-	تہواروں کا خرچ	15/-
مرمت مکان	8/-	شادی غمی کی تقریبات	5/-
روشنی اور پانی	20/-	علاج معالجہ	30/-
تنخواہ ملازم	20/	شکار	7/-
سنگار	50/-	سینما	6/-
زیور	×	ریڈیو	5/-
مکان کا سامان	50/-	پان، سگرٹ	10/-
تعلیم	30/-	شراب اور نشے	×
سواری	20/-	کتب و رسائل	×
زکوٰۃ	×	اخبار	4/-
خیرات	30/-	تعمیر مسجد و مدرسہ	-/8/-
ٹیکس	زیر غور	کتب خانہ	×
دعوت، مہمان، دوست	10/-	پیر پرستی	5/-
حج، زیارت	×	علم دوستی	۲
			672/8/-

آمدنی کی تفصیل

کام کی اجرت	500/-	کرایہ جائداد	60/-
متفرق تجارتی منافع	100/-		660/-
			12/8/-
			672/8/-

کمی [illegible] میں سے یا زیورات یا جائداد کی فروخت یا قرض سے پوری ہوتی ہے

متوسط : شوہر، بیوی، بچے ۴ ، ۶ افراد

ماہوار آمدنی 200/-

تفصیل اخراجات ماہانہ

کھانا	90/-	ملازم	×
کپڑا	15/-	تقریبات شادی و غمی	3/-
کرایہ مکان	15/-	علاج ، دوا	4/-
زیور	×	شکار	×
مکان کا سامان	3/-	سنیما	7/-
تعلیم	15/-	ناچ رنگ	×
سواری	8/-	سگرٹ ، پان	7/-
خیرات	14/-	نشے	×
زکوٰۃ	×	کتب و رسائل	-/8/-
چندہ	3/-	تعمیر مسجد	-/8/-
ٹیکس	×	پیر پرستی	×
مہمان ، دوست نوازی	6/-	علم دوستی	×
حج ، زیارت	×		180/-
نذر و نیاز	×		20/-
تہوار	×		200/-

ادنیٰ - شوہر ، بیوی ، بچے کل ۵ افراد

آمدنی ساٹھ روپے ماہوار

تفصیل اخراجات

کھانا	45/-	روشنی، پانی، سامان خانہ	
کپڑا	5/-	حلال خور، شادی بیاہ، بیماری	4/-
کرایہ مکان	6/-		60/-

لاہوری برادری کی صناعانہ خصوصیات

شروع سے لاہوری برادری کے لوگ بہت سی قسم کی صنعتوں میں کام کرتے چلے آئے ہیں۔ لیکن پہلے ہمیں یہ بتا دینا چاہئے کہ یہ ایک ہنر پیشہ جماعت ہے۔ اور اس نے صنعت کی سادہ شکلوں کو عام ذریعۂ معاش کے طور پر کبھی اختیار نہیں کیا۔ ہم ابتدار سے اس میں صنعت کی صرف اُن پیچ در پیچ شکلوں کی مہارت پاتے ہیں۔ جو تمدنی ترقی کی پیداوار میں وہ ہمیشہ اس صنعت سے کتراتے رہے جس میں وہ "عرض ہنر" کے لئے وسیع میدان نہ پائیں۔ ہم غور سے دیکھیں تو عجیب و غریب طور پر اس برادری کا رجحان معدنی اشیا کی صنعتوں کی طرف پاتے ہیں۔ لیکن لاہوریوں نے جس معدنی صنعت کو لیا اُسے فن کی حیثیت دے دی۔ مثلاً لوہار کا پیشہ لاہوری آدمی نے صرف روٹی کمانے کے ایک ذریعے کے طور پر اختیار نہیں کیا۔ بلکہ صرف اس لئے کہ اس کا جی چاہتا ہے لوہے کے کام میں فنی نزاکت پیدا کی جائے۔ چنانچہ بھدی اور بے قطع چھریوں کو اس نے مصورانہ حسن سے بنایا، لوہے کی کیل کے معمولی سر کو اس نے کسی پھول کی شکل دے دی۔ کواڑ کے قبضے کو اس نے ڈرائنگ کی کسی مناسب تراش پر ڈھالا، یوں اس نے لوہے جیسی ضروری چیز کو تکلف کا رنگ دیا۔ ہر چیز جو اس نے بنائی اُسے ایک مصور کی، ایک شاعر کی نگاہ سے دیکھا، وہ ہر چیز میں موسیقی کا تناسب چاہتا ہے۔ لاہوری صنّاع کا یہی موسیقی طلب جذبہ ہے جسے ہم تاج اور جامع مسجد کی شکل میں محسوس کرتے ہیں۔

لاہوریوں کی صنعتیں لاہوریوں نے تعمیرات اور زیور سازی کے فن کی تکمیل کے لئے بہت سے ضمنی کام ہاتھ میں لئے اور ہر ایسے کام نے بعد میں مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ ضمنی کاموں میں لوہے کا کام جس میں ٹھپے سازی بھی شامل ہے۔ لکڑی کی خراد کا کام اور پیتل کا کام معمولی صنفیں ہیں۔ لاہوریوں نے ان میں اپنی امتیازی شان قائم رکھی۔ لاہوریوں میں نعل بند اور سلوتری بھی تھے۔ آج بھی ہیں۔ یہ کام انھوں نے درباری تعلق سے شروع کئے اور ان میں استادی کا درجہ حاصل کیا۔"

تعمیرات اور زیور سازی کے ضمن میں لاہوری مندرجہ ذیل صنعتوں میں ماہر تھے پچی کاری، منبت کاری۔ مینا کاری، مرصع کاری یعنی سادہ کاری، مصوری، نقاشی مُہر کنی۔ ان صنعتوں کی تشریح یہ ہے:۔

(۱) پچی کاری اصل میں پرچین کاری ہے۔ پرچین فارسی میں دیوار کی باڑھ کا ٹے کی قینچی کو کہتے ہیں مضبوطی کے لئے کسی چیز میں لوہے کی میخ ٹھونکنے کو بھی پرچین کہتے ہیں۔ تعمیرات کی اصطلاح میں پتھر سے پتھر کے بچے جوڑ لگانے اور پتھر کے خالی کئے ہوئے حصے میں تراشے ہوئے پتھر بٹھانے کے کام کو پرچین کاری کہتے ہیں جو بگڑ کر پچی کاری بن گیا ہے۔

(۲) مُنبت کاری پتھر میں پھول پتے اور حروف اُبھارنے کے کام کو کہتے ہیں۔

(۳) پتھر یا مٹی اور چونے کے پکے ہوئے ٹکڑوں یا برتنوں پر کیمیاوی رنگ چڑھا کر آگ میں پکا کر پختہ کرنے کو مینا کاری کہتے ہیں۔ اس طرح زیوروں پر مختلف رنگ کا مینا کیا جاتا ہے۔

(۴) سنگ مرمر یا دوسرے اچھے پتھروں میں نفیس اور نازک جالی کاٹنے کے کام کو سادہ کاری کہتے ہیں۔ یہی کام سونے چاندی کے معمولی زیوروں پر کیا جائے تو وہ سادہ کاری ساخت کا زیور کہلاتا ہے۔

(۵) مصوری اور نقاشی میں لاہوری لوگ یہ اصطلاحی فرق کرتے ہیں کہ مصوری تو آدمی یا مناظر کی تصویر کشی کو کہتے ہیں اور نقاش اس مصور کو کہتے ہیں جو لکڑی یا دھات کی چیزوں پر اور خاص طور سے ظروف میں پکے روغنی رنگوں سے صرف پھول پتوں کی ڈرائنگ کرے۔ نقاشی کا سب سے اہم اور قابل ذکر حصہ طلاکاری ہے۔ یعنی دیواروں یا دوسری چیزوں پر بنے ہوئے پھول پتوں پہ اصلی سونا چڑھانا۔ یہ صنعت لاہوریوں کی نادر صنعتوں میں ہے اور ہندوستان میں اس کے ماہر کمیاب ہیں۔

لاہوری برادری کی موجودہ صنعتیں | لاہوری برادری میں اب تعمیرات کا کام بالکل ختم ہو گیا ہے اس لئے پچی کاری کا کام کردہ براہ راست تعمیرات سے متعلق ہے۔ لاہوری لوگ اب نہیں کرتے۔ باقی وہ سب صنعتیں جن کا ذکر ابھی کیا گیا۔ جدید ترقیوں کے ساتھ لاہوریوں میں موجود ہیں۔ مرصع کاری یعنی سادہ کاری کی صنعت، اب یہ لوگ نفیس جڑاؤ زیور کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ میناکاری کی صنعت سے زیوروں پر مختلف رنگوں کے خوب صورت نقش و نگار بنانے کا کام لیتے ہیں۔ منبت کاری کی جگہ اب چپائی کاری اور پرداز کے کام نے لے لی ہے۔ چپائی کاری (انگریونگ) زیور یا ظروف میں ابھرے ہوئے نقوش کے کام کو کہتے ہیں۔ چپائی اور پرداز کے حسین نمونے بڑے کام میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بڑا کام۔ سادہ کاری کا وہ حصہ ہے جس میں چاندی سونے کے برتن، سنگار کی چیزیں، تخت چوکیاں، قلم، عصا اور شاہی ضرورت کی چیزیں بنتی ہیں۔

ان سب صنعتوں میں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ لاہوری برادری کے نامور کاری گروں کا مختصر تعارف ضمیمہ میں کرایا گیا ہے۔

لاہوری برادری کی سب سے نمایاں صنعت، سادہ کاری | لاہوری برادری کی سب سے نمایاں صنعت آج کل سادہ کاری ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگ اسے "سادہ کار برادری" کے نام سے پکارتے ہیں۔ ہم یہاں اس صنعت کا کچھ حال بیان کرتے ہیں:-

لفظ سادہ کاری کی تحقیق | زیور سوسنت کا مو ... دو قسمیں ہوتی ہیں (۱) سادہ (۲) جڑاؤ۔ لاہوری لوگ اس زیور کو جو سادہ ہو سناری زیور کہتے ہیں اور جس میں نگینے جڑے ہوں اور زیادہ نازک اور نفیس ہو اُسے سادہ کاری زیور کہتے ہیں۔ سناری ساخت کا کام دو ایک لاہوری کاریگر بھی کرتے ہیں لیکن زیور سازی کی یہ قسم ہندو کاریگروں سے مخصوص ہے سادہ کاری یعنی جڑاؤ زیور کا بنانا لاہور ... یونٹ حصہ ہے اور سادہ کاری ساخت کا زیور ہندوستان بھر میں پسند کیا جاتا ہے جڑاؤ زیور کے لئے سادہ کا لفظ ... بالکل الٹا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے اہل زبان یوں ہی بولتے ہیں۔ جڑاؤ زیور کی صنعت کے لئے مرصع کاری لفظ موجود ہے اور قدیم زمانے میں استعمال ہوتا تھا۔ لیکن لفظ سادہ کاری بھی کچھ کم پرانا نہیں ہے۔ چنانچہ شاہجہاں کے عہد کے سرکاری تذکرہ نویس ملا عبدالحمید لاہوری کی کتاب بادشاہ نامہ میں سادہ کار کا ذکر ہم دیکھتے ہیں۔ تاج محل کی تعمیر کے لئے صناعوں کی فراہمی کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے:-

"گروہا گروہ مردم از سنگ تراش و سادہ کار و پرچین کار و منبت کار از اطراف و اکناف ممالک محروسہ فراہم آمدہ بودند۔ ہر کدام در صنعت خویش ید طولیٰ داشت"

اردو کتابوں میں ہم نے یہ لفظ دیکھنا چاہا۔ ہماری تلاش کا نتیجہ ابھی صرف یہ ہے کہ سب سے پہلی کتاب جس میں لفظ سادہ کار ملتا ہے، جان شیکسپیر کی ہندوستانی انگلش ڈکشنری ہے جو ۱۸۱۷ء میں یا کچھ پہلے مرتب ہوئی ہے وہ لکھتے ہیں:- سادہ کار A kind of goldsmith [illegible]

سب سے پہلی اردو لغت جو کسی ہندوستانی نے مرتب کی ہے مولوی اوحد الدین بلگرامی کی نفائس اللغات ہے جو ۱۸۳۶ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں لفظ سادہ کار تو نہیں ملتا لیکن لفظ سادہ کے عجیب استعمال کی طرف اشارہ انھوں نے کیا ہے۔ "سادہ لغت فارسی است در اردوئے ہندی مستعمل خلاف منقش"

فیلن نے اپنی ڈکشنری ۱۸۷۹ء میں ذرا غلط بحث کیا ہے۔ انھوں نے سادہ کار کے معنی لکھا ہے [illegible] انھیں [illegible] کا شبہ لفظ سادہ سے ہوا ہے۔

صاحب فرہنگ آصفیہ (۱۸۹۲ء) سادہ کار کے ذکر میں لکھتے ہیں

۔۔ رہ اور سبک کام بنانے والا سنار جو نہایت سُدھ نفیس اور پرداز کا کام بنائے ——— فرہنگ کے اس بیان سے لفظ سدھ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ہندی میں سُدھ کے معنی سیدھے، صاف پاک اور متوازن کے ہیں۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ سادہ کاری کی اصل سُدھ کاری ہو۔ یہی قیاس یوسف بخاری صاحب نے اپنے مضمون دلّی کی سادہ کاری میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے سُدھ کاری کے علاوہ لفظ صد کاری بھی اس کی اصل سوچی ہے۔ کیونکہ سادہ کاری درحقیقت بجائے خود بہت سی صنعتوں کے مجموعے کا نام ہے ——— لیکن یہ سب قیاس صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ سادہ کاری کا لفظ ہم خود شاہ جہاں کے عہد میں پاتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لاہوری لوگوں نے اس صنعت کے لئے جسے وہ اپنے ساتھ عراق سے لائے تھے۔ کوئی ہندی الاصل لفظ اختیار کیا ہوگا۔ ان کے ہاں اس صنعت کے لئے ترصیع اور اس صنعت کے ماہر کے لئے مرصع کار لفظ موجود تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ سادہ کار عراق اور ایران کے صناعوں کی آویزش کی یادگار ہے جو عراق میں ہوئی یا ہندوستان پہنچ کر یا یہ لفظ ایرانی شاعری نے مرصع کار کی ہنرمندی کو داد کے طور پر دیا ہے۔ حسن اور شوخی ایک جگہ جمع ہو تو ایرانی ادیب اُسے "سادہ پرکار" کہتا ہے ——— لاہوری کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا جڑاؤ زیور شوخی، رنگینی اور حسن کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سادہ پرکاری سے زیادہ موزوں داد اس زیور کے لئے نہیں ہو سکتی اور زیور ساز ضرور سادہ پرکار کہلانے کا مستحق ہے۔ کثرت استعمال سے پُر ختم ہوگیا اور سادہ کار رہ گیا۔ یہ بحث رہ جاتی ہے کہ مرصع کار جو اصل اصطلاح ہے کب ترک کی گئی اور سادہ کار جو استعارہ ہے پیشے کے نام کے طور پر کیوں استعمال ہونے لگا۔ غالباً مرصع کاری اور سادہ کاری خود عہد شاہ جہانی میں اور اس کے بعد بھی مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے رہے۔ لیکن زبان کا رجحان ہمیشہ آسانی کی طرف رہتا ہے۔ اس لئے

بیع کاری بستے میں رہ گیا اور سادہ کاری جو اس سے نسبتاً آسان لفظ تھا زندہ رہا۔

سادہ کاری کی مختلف منزلیں اور تشریح

زیور بیسیوں قسم کے اور مختلف نام کے ہوتے ہیں۔ لیکن سادہ کار ہر زیور کو تیاری کے دوران میں مکمل ہونے پر بھی عام طور پر اپنی اصطلاح میں پرزہ کہتے ہیں۔ ہر پرزہ بازار میں جانے سے پہلے تک کئی بہت سی منزلوں سے گذرتا ہے۔ ہم بندے کی مثال لیتے ہیں۔

ڈول

نقش گر زیادہ مہذب لفظوں میں، ڈیزائنر نے پنسل سے اس کا نقشہ کاغذ پر بنایا۔ کاریگر نے یہ نمونہ خود پسند کر لیا ہو گا یا گاہک نے پسند کرایا تو ڈیزائنر نے وہ کاغذ تانبے کی چادر کے ٹکڑے پر چپکا کر لوہے کی باریک چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے نقوش کھود دئے۔ اس کھودنے کو ڈول چننا کہتے ہیں۔ یہ بنیادی چیز یعنی نمونہ تیار ہو گیا جس پر بندہ بنایا جائے گا۔ سادہ کار اپنی اصطلاح میں تانبے کے اس نمونے کو ڈول کہتے ہیں۔ ڈیزائنر اپنے کام کا خصوصی ماہر ہے۔ لیکن سادہ کار اگر چاہے تو ڈیزائنر کی مدد کی اسے ضرورت نہیں۔ وہ خود پنسل سے کسی نمونے کا نقشہ کاغذ پر بنا کر اسے تانبے کی اور زیادہ آسانی اس میں ہے کہ پیسے کی چادر کے ٹکڑے پر کھود دے۔ سادہ کار زیادہ مشاق ہو تو پنسل کا غذ کے نمونے کا سہارا لئے بغیر وہ کوئی نقشہ تانبے پر چاہے تو براہ راست اصل چیز یعنی سونے یا چاندی کی چادر پر چھیلے گا۔ ورنہ اس ڈول پر چاندی یا سونا گلا کر ڈھلائی کے مشہور طریقے کے مطابق پرزہ ڈھال لے گا۔

وسیع پیمانے پر تیاری

مندرجہ بالا ڈول کا طریقہ اسی وقت اچھا ہے جب صرف دو ایک پرزے بنانے ہوں۔ لیکن اگر کھیپ کی کھیپ مال تیار کرنا ہو تو ڈھلائی کا طریقہ طویل اور تکلیف دہ ہے۔ سادہ کار اب ڈیزائنر سے ڈول نہیں بلکہ صرف کاغذ پر نقش بنوا کر ٹھپے ساز کو دے گا کہ وہ اس پر فولاد کا ایک ٹھپہ بنا دے۔ اس ٹھپے پر چاندی یا سونے کی پتلی چادر کے ٹکڑے ٹھونک کر بکثرت بندوں کے لئے زمین تیار کر لی جائے گی ——— اور

بہت ترقی یافتہ کاریگر جو مال کو اور بھی سستا اور جلد اور زیادہ بنانا چاہتا ہے، ٹھپے کے بجائے کٹنگ ڈائی تیار کرے گا۔ اور دستی پنچنگ پریس میں ڈائی باندھ کر چاندی یا سونے کی چادر میں سے ہزاروں نینے کٹوائے گا ڈائی ساتھ ہی ساتھ حسب منشا جالی بھی کاٹ دیتی ہے اور نگینوں کے لئے سوراخ بھی کاٹ دیتی ہے —— پرزے کی تیاری کے ان مختلف طریقوں کو مثال میں یوں سمجھیے کہ ڈول والا طریقہ تو قلمی نسخہ ہے، ٹھپے والا طریقہ پتھر کے چھاپے کی کتاب ہے اور ڈائی کا طریق کار بلاک کی چھپی ہوئی کتاب ہے۔

مشینی ساخت کے زیور اور ہاتھ کے بنے ہوئے زیور کا فرق یہاں یہ نکتہ واضح کرنا ضروری ہے کہ ڈول والا پرزہ زیادہ دام پاتا ہے اور فن کے قدردان ٹھپے کی اور ڈائی کی چیز سے نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ چیز بازار میں ہر ایک کے پاس مل جاتی ہے۔ اور ہر کوئی اُسے خرید کر پہن سکتا ہے۔ اس لئے مشینی ساخت کا زیور باوجود یکسانیت نزاکت اور حسن کے بہت کم دام پاتا ہے۔ زیور کا استعمال آرائش سے بھی زیادہ تفاخر کے اظہار کی چیز ہے اور آسانی سے قابلِ حصول چیز میں شیخی اور نمود کا موقع کہاں؟ اس لئے سادہ کاری کے باکمال استاد ٹھپے بنانے کی تیاری کی طرف توجہ نہیں کرتے اور مشین کے استعمال کو فن کی توہین سمجھتے ہیں۔

بندھائی اور کھلائی ڈول پر جب پرزہ ڈھل چکتا ہے تو اس پر پھول پتوں اور دیگر نقوش کے بہت ہی دھندلے نشان ہوتے ہیں اور وہ سوراخ جن میں تیاری پر مختلف ناپ اور رنگ کے نگینے جڑے جانے والے ہیں کچھ یوں ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ پہلے ان سوراخوں کو جن میں نگینے جڑے جائیں گے وارپار نہیں، بلکہ پرزے کے دَل کی نصف موٹائی تک باریک برمے سے گہرا کر دیا جاتا ہے۔ اس کام کو سوراخ گہرانا کہتے ہیں۔ اب پرزے کی کئی مناسب جگہوں پر وارپار سوراخ کرلئے جاتے ہیں اور ان سوراخوں میں باریک آری کے نفر (Fret Saw) ڈال کر پھول بیل، پتے، جالیاں غرض جو نقوش

ہ وہ کھول اور کاٹ لئے جاتے ہیں۔ پہلے یہ کام باریک دانتی آری کے بجائے بہت سوہن سے کیا جاتا ہے۔ اس بے حد پتلے سوہن کو تیرگا کہتے ہیں۔ تیرگا اب صرف براخ چڑھانے اور گھڑائی کی اندرونی صفائی میں کام آتا ہے۔ غرض اس جالی کی کٹائی اور ل پتی کے کاٹنے کو کھلائی اور بندھائی کہتے ہیں اس کے بعد تیرگوں اور باریک سوہنوں ردسے پرزے کی سطح اور جالی اور کٹاؤ کے اندرونی حصوں کو صاف کر لیا جاتا ہے ے سوہن کاری کہتے ہیں۔

ا| اب یہ پرزہ جلاکار پالش والے کے پاس جاتا ہے۔ یہ پرزے کے سوراخوں ر جالیوں میں سوتی ڈورے ڈال کر گیرو اور دوسرے مسالوں کی مدد سے پرزے کی طح اور اندرونی کناروں کو مانجھ کر خوب صاف کر دیتا ہے اس سے پرزے پر آب آجاتی ہے۔

ع اور مینا| اب اگر پرزہ چاندی کا ہے اور سجاوٹ کی مصلحت کے لئے ملمع ضروری ہے تو پرزے کو ملمع ساز کے یہاں بھیج دیا جاتا ہے اور پرزہ اگر سونے کا ہے اور گاہک کی رمائش مینے کی ہے تو پرزے کے مناسب حصوں پر رنگ کی ہدایت کے ساتھ اسے میناکار کے ہاں بھیج دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جڑاؤ پرزوں پر مینا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ مینا نگینوں کے بغیر اکیلا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ نگینہ جڑے ہوئے پرزے میں اری گر کسی خالی جگہ مینا کو حسن افزائی کا ذریعہ سمجھے تو مینا کرا لیتا ہے —— ملمع کا بیٹری کا طریقہ جب تک رائج نہ تھا۔ سونے کے ورق چڑھانے کا طریقہ تھا اب بیٹری کے ذریعے ملمع ہوتا ہے۔ میناکاری میں پہلے دیسی رنگ اور دوسرے کیمیاوی اجزا سے کام لیتے تھے اب ولائتی تیار مینا مختلف رنگوں میں آتا ہے۔ یہ شیشے کی قسم کا پگھلنے والا مرکب سمجھئے۔ میناکار مینے کو کھرل میں پانی کی مدد سے بہت باریک پیس لیتا ہے اور لوہے کے قلم سے پرزے کی خالی جگہوں یا نقوش مقررہ میں محلول مینا بھر کر مینے کی خاص بھٹی میں رکھ کر مناسب وقت

تک پکاتا ہے۔ تاؤ میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ پرزہ نہ گل جائے۔

چھلائی | پرزہ ملمع کار یا مینا کار کے یہاں سے واپس آگیا۔ اب اُسے لکڑی کے دستے پر جسے ہنڈی کہتے ہیں لاکھ کی مدد سے جما لیتے ہیں اور لوہے کی ایک چھوٹی سی دھار دار قلم سے جسے بولی کہتے ہیں پرزے کے پھول کے کناروں، ڈنڈلوں، جالی کی کردلوں وغیرہ کو چھیلتے ہیں۔ جس طرح لکڑی کو رندے سے چھیلنے میں چمک آتی ہے۔ اسی طرح پیتل پر سونے یا چاندی کی چھیلن آتی ہے۔ اس طرح پرزے میں چمک دمک اور خوب صورتی بڑھ جاتی ہے۔ چھلائی کا کام نہایت اہم ہے۔ اس کام کے خصوصی ماہر ہوتے ہیں جو چھیلتے کہلاتے ہیں۔ کاری گر اگر چاہے تو اپنا پرزہ خود چھیلنے کی بجائے چھیلتے سے چھلوا سکتا ہے۔

جڑائی | چھلائی ہو چکی اور پرزہ ابھی تک لاکھ کی مدد سے ہنڈی پر مضبوط جما ہوا ہے اب نگینے جڑنے کا نمبر آتا ہے۔ معمولی یا چاندی کے پرزے پر کاریگر اکثر اپنی مرضی سے معمولی داموں کے نقلی نگینے یا موتی جڑ دیتا ہے۔ بڑھیا یا سونے کے پرزوں پر قیمتی پتھر جڑے جاتے ہیں جو گاہک یا دوکاندار دیتا ہے۔ پرزے کی مناسبت سے پتھر وغیرہ سائز اور رنگ انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ پتھر کا انتخاب ذوق اور حیثیت کے مطابق ہوتا ہے۔ پتھر دو ڈھائی روپے رتی سے کر ہزار روپے تک ہو سکتا ہے۔ پکھراج، نیلم، مانک، پنا، یاقوت، زمرد، لاجورد، اوپل، شجری، عقیق، یشب، مرجان، دھانی رنگ، ہیرا، اور بہت سی قسموں اور خاندان کے پتھر ہیں۔ جن کی قیمتیں، سائز و رنگ، ساخت، پانی یعنی اندرونی روشنی کی صفائی کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہیں۔ پتھر جڑ دیا جاتا ہے۔ چاندی کے سستے کام میں کہیں کہیں ولائتی سلیوشن سے نگینہ چپکا دیا جاتا ہے لیکن یہ طریقہ عیب میں داخل ہے اور کاری گر کو بدنام کر سکتا ہے۔ نگینے کی جڑائی بولی کی مدد سے ہوتی ہے۔ یعنی تیز دھار دار فولادی قلم سے سوراخ کے کنارے کو ذرا

کر ابھارتے ہیں اور نگینہ سوراخ میں بٹھا کر یہ ذرا سا اٹھا ہوا کنارہ نگینے کے نفاست پر چڑھا دیتے ہیں اور اس طرح نگینہ اپنی جگہ جم جاتا ہے۔ پرزہ اب تیار ہے۔ اُسے تبازی پر سے اُکھاڑ کر لاکھ الگ کر دی جاتی ہے اور اب تیک دار اُسے ریٹھے کے پانی میں برش سے رگڑ کر دھوتے اور کپڑے سے پونچھ کر خشک کر لیتے ہیں۔ اس آخری عمل کو اُجال اور نکھار کہتے ہیں ـــــ اس کے بعد پرزہ اس روپ میں ہوتا ہے جسے دیکھ کر کسی سے بے اختیار مگر بجا طور پر کہا ہوگا ۔ سادہ پُرکاری!

<u>چپائی اور پرداز</u> پرزہ قدرتی حسن سے مکمل ہو چکا ہے۔ لیکن پرزہ سازی دلچسپی میں ابھی ترقی کی گنجائش ہے یہ گنجائش چپائی اور پرداز سے پوری ہوتی ہے۔ پرزے کے لئے چپائی اور پرداز کاجل اور سُرخی کا سا مرتبہ رکھتی ہے۔ چپائی، خبث دور کرنے لئے مہندی نقش ہے۔ چاندی سونے کے زیوروں اور برتنوں پر ابھرے ہوئے نقش نگار بنانے کو چپائی کاری کہتے ہیں۔ چپائی صرف پرزے کے خالی حصوں پر نقش میں نہیں بلکہ مستقل عنصروں میں کام آتی ہے۔ وہ حصے جہاں کھلائی، جڑائی کا کام نہ ہو یا ناموزوں رہے وہاں چپائی کے اُبھرے ہوئے پھول پتے بہار دیتے ہیں۔ مثلاً انگوٹھی میں نگینے کے حصے کو چھوڑ کر دونوں طرف جو جگہ بچتی ہے۔ اس میں جالی کھولی جاتی ہے۔ لیکن چپائی کا کوئی ابھرا ہوا پھول اس جگہ بہت بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چپائی کی پہلے بالکل ضمنی تھی۔ لیکن ولایت میں یہ کام بہت زیادہ عمدہ ہوتا ہے۔ وہاں کے سے لاہوری برادری متاثر ہوئی اور اس شاخ میں اب زیادہ ترقی ہو گئی۔ یہ صنعت چونکہ ولائتی کام سے بہت ترقی پذیر ہوئی اس لئے چپائی کار اب اپنے آپ کو صناع کہلانا پسند کرتا ہے ـــــ پرداز بالکل حاشیے کی اور ضمنی چیز ہے۔ خوش نویس جیسے عبارت کے خلا کو کسی چھوٹی سی آرائش سے بھر دیتے ہیں یہی کام پرداز کا ہے۔ پرداز پرزے کے تیز باریک قلم سے آرائشی خطوط بنانے کو کہتے ہیں۔ زیور

پھول پتوں میں جہاں کھلائی جڑائی نہ ہو۔ پنیوں پر رگیں اور ڈنڈیوں پر نشان بنادیئے ہیں —— چتائی کار یا انگریوری پرداز کا کام بھی کر لیتے ہیں۔ پرزے پر چتائی یا پرداز کا کام جلاکاری کے درجے سے گذرنے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن وہاں چتائی اور پرداز کا کام نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لئے یہاں لکھ دیا گیا ہے

زیور کی تیاری کے جتنے درجوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر صناع ان تیاری کی کتنی منزلوں میں سب پر حاوی نہیں ہوتا۔ لیکن شروع سے آخر تک صرف اپنے ہاتھ سادہ کار ماہر ہوتا ہے
سے پرزہ تیار کرنے والے کاری گر بھی ہیں۔ عام طور پر کاری گر ڈول، ملمع، مینا، پالش چھلائی اور چتائی میں دوسرے کاری گروں سے مدد لیتا ہی جو اپنے کام کے خصوصی ماہر ہوتے ہیں۔ اس طرح وقت بچتا ہے اور پرزہ زیادہ اچھا تیار ہوتا ہے —— جو بات دلچسپ ہے کہ ماہر خصوصی یعنی وہ شخص جو ایک درجے کا مشاق ہو اور باقی درجوں میں معمولی ہو اپنے آپ کو سادہ کار کہتا ہے، جیسا کہ وہ ہے، لیکن ہم پیشہ لوگوں میں وہ اپنے خاص کام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مثلاً ملمع کار، مینا کار، جلا کار، انگریورچھلیا' —— لیکن وہ کاری گر جو کھلائی، جڑائی کا خاص ماہر ہو اور باقی حصوں میں معمولی ہو ہم پیشہ لوگوں میں بھی سادہ کار کہلاتا ہے ——

(باقی آئندہ)

مختار احمد جامعی

یہ احباب

یادش بخیر! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب کہ میرے صرف دو چار ہی دوست اور دو چار ہی ملنے والے تھے۔ لیکن خدا بھلا کرے اس ادبی ذوق اور علمی شوق کا کہ اس نے مجھے کہیں کا نہ رکھا اور میرے ملنے والوں اور جاننے والوں کی تعداد اتنی بڑھا دی کہ اگر آپ مبالغہ نہ سمجھیں تو میرا گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔

اگرچہ پہلے پہل جب میرا حلقۂ احباب اتنا وسیع نہ تھا تو مجھے شدت سے اپنی بےبسی کا احساس ستاتا اور اس خیال سے بڑا دکھ ہوتا کہ میں بہت معمولی اور گمنام آدمی ہوں۔ لیکن جیسے جیسے میرے ملنے والوں میں اضافہ ہوتا گیا اور یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تو میں اپنے آپ کو اپنے ہم جنسوں کے مقابلے نہایت سربلند اور خوش قسمت تصور کرنے لگا۔ کاش! اس وقت مجھے اپنی اس نادانی کے عواقب کا تھوڑا بھی علم ہو جاتا اور آج مجھے گوشہ نشین ہو جانے، جنگل کی طرف نکل جانے اور کبھی کبھی تو خودکشی کر لینے کے منصوبے نہ باندھنے پڑتے۔

ہرچند کہ حلقۂ احباب کا وسیع ہونا فائدے سے خالی نہیں۔ اور بظاہر اس میں محض خوبیاں ہی خوبیاں ہیں، مثلاً اگر آپ کے ملاقاتیوں میں کسی ٹاکیز کے قریب کی پولیس چوکی کا انسپکٹر نہ سہی، کانسٹیبل ہی ہے اور آپ بغیر لیمپ کے پونے دس بجے سائیکل پر دوسرا شو دیکھنے جا رہے ہیں تو یہ پولیس کانسٹبل آپ کا بڑا محسن ثابت ہوگا ورنہ بصورت دیگر آپ پکچر بھی نہیں دیکھ سکتے اور اگر آپ کے پاس اس وقت صرف دوسرے درجے کے ٹکٹ اور ایک پلیبرس کی ڈبیہ ہی کے دام ہوں تو آپ سائیکل پر گھر بھی نہیں لوٹ سکتے۔ یہی نہیں بلکہ دوسرے دن آپ کو دفتر میں غیر حاضر ہونے کے باوجود اپنی سائیکل حاصل کرنے کے

نہ معلوم کتنا جرمانہ بھی ادا کرنا پڑے۔

اسی طرح اگر آپ کے اپنے حلقے کے پولیس انسپکٹر یا اپنے محلے کی سمت کے پولیس کانسٹبل سے صاحب سلامت ہے تو پھر آپ اپنے محلے کے شیر ہیں۔ مطلق العنان بادشاہ ہیں۔ جو چاہے کیجئے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ رات بھر ریڈیو کی گھڑ گھڑ اور رت جگے کی گڑبڑ سے ہمسایوں کی نیند چین حرام کر دیجئے۔ کیا مجال جو کوئی آپ کا کچھ بگاڑ سکے۔

اور اگر اسی طرح آپ کی جان پہچان بلدیہ کے ناظم صاحب سے نہ سہی کسی چپراسی صاحب ہی سے ہے تو اطمینان رکھئے آپ کو عمر بھر اپنی سائیکل کا نمبر خریدنا نہ پڑے گا۔

یا پھر آپ شاعر ہیں اور کسی مؤقر رسالے کے ایڈیٹر سے آپ کا یارانہ ہے تو پھر آپ بہت جلد اقطاعِ ملک میں شاعرِ مشرق اور شاعرِ اعظم کے عسیر الحصول القاب سے نہیں نہ سہی۔ لیکن حضرت اور مولانا، شاعرِ حیات اور شاعرِ فطرت، شاعرِ انقلاب اور شاعرِ ہند کے میڈن جاپان قسم کے القاب سے تو مشہور ہو جائیں گے اور آپ کا شمار بھی پانچویں سواروں میں ہونے لگے گا۔

یا پھر آپ کی دو ایک طوائفوں سے آشنائی ہے (بُرا نہ مانئے میری نیت نیک ہی ہے) تو گویا پھر آپ اپنے زمانے کے داغ ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ ہر اچھی اور بُری محفل میں آپ کا کلام گایا جائے گا اور آپ خود گلی کوچوں میں ہوٹل کے لونڈوں اور تانگے والوں کو اپنا کلام گاتے سنیں گے۔

یا پھر آپ ادیب ہیں اور کسی ریڈیو اسٹیشن کے کنٹرولر، ڈپٹی کنٹرولر یا شعبۂ ادب کے سپرنٹنڈنٹ سے آپ کے خوش گوار تعلقات ہیں تو پھر کیا پوچھنا۔ آپ کی چاندی ہی چاندی ہے۔ آپ انشاء اللہ ڈرامے، فیچرس، مضامین، مباحثے، مکالمے اور جانے کیا کیا لکھتے لکھتے تھک جائیں گے اور سننے والے بھی آپ کو بار بار سنتے سنتے لیکن گھبرائیے مت پروگرام بلیٹن کا ہر نیم ماہی اشاعت میں آپکا نام ضرور ہوگا۔

بہرحال اب میں کہاں تک مثالیں دوں، آپ خود ڈاکٹر، وکیل، تھیٹر کے منیجر، کتب فروش، ٹیکسی والے، تماشے والے اور محلے کے غنڈے تک کے آگے "اثر" نکالیے۔ میرا ذمہ اگر آپ کا اثر اکارت جائے۔

تو بس اسی نظریے کے تحت میں نے ہر مذہب و ملت، ہر پیشے اور ہر قماش کے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا کی، جس کے نتیجے کے طور پر تھوڑے ہی عرصے میں قسم قسم کی داڑھیاں، وضع وضع کی مونچھیں۔ داڑھی، مونچھوں سے بے نیاز چہرے ترکی ٹوپیاں، انگریزی ٹوپیاں، گاندھی کیپ، جناح کیپ، دوپلیاں، طرّے، عمامے، پگڑیاں اور نہ جانے کیا کیا میرے گلے کا ہار ہو گئے۔

بات اگر آداب عرض، سلام علیکم، نمسکار، گڈ مارننگ اور مختلف قسم کی ہاتھ کی حرکتوں تک محدود رہے تو اس میں یقیناً کوئی قباحت نہیں۔ مثلاً آپ شام کے وقت شہر کی ٹھنڈی سڑک پر سیر کر رہے ہیں۔ کوئی آپ کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کہتا ہے۔ کسی کو آپ مسکراتے ہوئے آداب عرض ہے کہتے ہیں۔ کوئی آپ کو دیکھ کر دور ہی سے حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہے۔ کسی کو آپ صرف ہوا میں ہاتھ لہرا کر نازی سلام کرتے ہیں۔ غرض کسی کو آپ بڑی بے پروائی سے سلام کرتے اور کسی کا آپ بڑی رعونت اور ٹھسّے سے سلام لیتے ہوئے سڑک پر سے گزر رہے ہیں تو سڑک پر چلنے والوں میں مردوں پر بالعموم اور عورتوں پر بالخصوص بڑا مرعوب کن اثر پڑ سکتا ہے۔

لیکن بات اس سے آگے بڑھی کہ گئی۔ یعنی یہ آپ کے ملنے والے مجھ پھر کو رک کر اگر آپ کی خیریت بھی پوچھ لیا کریں تو سمجھ لیجیے کہ آپ کی خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک میرے تجربات کا تعلق ہے۔ یہ مان نہ مان میں تیرا مہمان کی قسم کے ملنے والے اکثر اس وقت جبکہ آپ کسی بیمار عزیز کی دوا لانے ہسپتال بھاگ رہے ہوں۔ ناشتہ جلدی تیار نہ ہونے کے باعث دیر سے تیز تیز دفتر جا رہے ہوں۔ دن بھر تنازع للبقا میں لگے

رہ کر شام کو تھکے ہارے گھر لوٹ رہے ہوں۔ یا کسی گہری سوچ میں غرق گردن جھکا کے سڑک پر چل رہے ہوں۔ آپ سے ٹکراتے ہیں۔ آپ لاکھ کنی کترانا چاہیں لیکن وہ سندباد جہازی کے مرد تسمہ پا کی طرح اس وقت تک آپ کی گردن پر سوار رہتے ہیں جب تک کہ کوئی غیبی امداد آپ کو ان کے پنجے سے نجات دلا دے۔

محولہ بالا بیان کی تصدیق میں آئیے آپ سے بھی اپنے چند ملنے والوں کا تعارف کرا دوں کیا حرج ہے۔ آئیے ملئے آپ میرے ایک دوست کے دوست ہیں۔ خیر سے شاعر ہیں۔ اور تمام اصناف سخن پر حاوی غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مستزاد، مرثیہ، ترکیب بند، ترجیع بند، واسوخت، ریختی اور آج کل کے رواج کے مطابق معرا اور آزاد نظم بھی لکھتے ہیں۔ آپ کی ہر غزل کم از کم پچیس تیس شعر کی ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ نظم وغیرہ کتنے اشعار پر مشتمل ہوتی ہوگی۔ ایک "ادبی اکھاڑے" یعنی مشاعرے میں مجھ سے میرے دوست کے دوست نے آپ کو ملایا تھا۔ بس اس دن سے جب آپ کبھی اور جہاں کہیں مجھے مل جاتے ہیں۔ آداب بجا لاتا ہوں قبلہ کے بعد میری مزاج پرسی کر لیتے ہیں۔ پھر اس کے فوراً ہی بعد بغیر کسی تمہید کے بے تکلف فرماتے ہیں "آپ سے اس روز کے بعد سے نیاز ہی نہیں حاصل ہوا۔ کئی نظمیں اور غزلیں وغیرہ ہوئی ہیں لیکن افسوس کہ بیاض ساتھ نہیں ہے۔ البتہ رات دو تین قطعے ہوئے تھے جن کو ایک پرچے پر لکھ لیا تھا۔ دیکھیے دیکھتا ہوں وہ پرچہ بھی ہے یا نہیں۔" پھر جیبیں ٹٹول کر اور کئی میلے کچیلے کاغذ کے پرزے نکال کر مسرت سے "جی مل گیا" تو سنئے "عرض کیا ہے" کہہ کر گلا صاف کرتے ہیں۔ اب آپ ماحول سے بے نیاز۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ کسی چوراہے پر یا کسی پیشاب خانے کی بغل میں اور آنکھیں بند کر کے ہلکے ترنم کے ساتھ اپنا کلام بلاغت نظام جو فردوس گوش کرنے لگتے ہیں تو دو تین قطعوں کے بعد دو تین غزلیں اور نظمیں بھی ختم ہو جاتی ہیں اور میں واہ واہ کرتے کرتے آہ آہ کرنے

کراہنے لگتا ہوں۔ لیکن آپ سُنانے ہی چلے جاتے ہیں اور میری طرف توجہ ہی نہیں فرماتے کہ مجھ پر کیا بیت رہی ہے۔

آپ جب کبھی نظر آ جاتے ہیں میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جانا یا کسی گوشۂ عافیت میں چھپ جانا چاہتا ہوں، لیکن ہر بار بے قصور ہی پکڑا جاتا ہوں اور بہرحال کچھ شعر سنا ہی پڑتے ہیں۔

آپ سے ملئے　　آپ بزعم خود بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔ لیکن آپ اتنے ہی اچھے آرٹسٹ ہیں، جتنے ہمارے لیڈر، اچھے اور صحیح معنوں میں لیڈر، ہوتے ہیں تاہم آپ کو مصوری کا خبط ہے اور اس میں شک نہیں کہ آپ صورت گری کر بھی لیتے ہیں اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ جتنا چاہتے ہوں انسان اور وہ ماضی کی طرف دوڑ کر بن جائے بندر۔ آپ بنانا چاہیں مرد اور وہ "چلو ہٹو" کہہ کر ہو جائے عورت تو خیر اپنے میلان طبع کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے ایک پکچر اسٹال بھی کھول رکھا ہے اور آرٹ پرور نوجوانوں اور کشتہ کھائے ہوئے بڈھوں کے لئے پیرس وغیرہ کی ممنوعہ تصویریں بھی سپلائی کرتے ہیں۔

جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب کہ آپ سے تعارف ہوا تھا۔ بس اب جب کبھی مجھ سے مڈبھیڑ ہو جاتی ہے یا تو مجھے دوکان پر گھسیٹ لے جاتے ہیں یا پھر جگہ ہر جگہ وہ تمام تصویریں دکھانے تک نہیں ملتے جو اس وقت آپ پر لدی ہوتی ہیں۔

ایک روز میں باغ عامہ میں جھنڈے کے قریب سبزے کے فرش پر بیٹھا مناظر قدرت کی دلفریبیوں پر سر دھن رہا تھا کہ "آداب عرض ہے!" کی گمبھیر آواز نے مجھے چونکا دیا میں نے سر اٹھا کے دیکھا تو آپ کھڑے مسکرا رہے تھے۔ آپ کو تقریب ملاقات سے لیس یعنی تصویروں کا بستہ بغل میں دابے دیکھتے ہی میں سناٹے میں آ گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بکری قصائی کو چھرے کے ساتھ دیکھ کر سہم جاتا ہے۔ میں نے میانے کے انداز میں

کہا "اخاہ! آپ، آداب عرض ہے، تشریف رکھئے"۔ آپ بیٹھ گئے اور کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنا دفتر کھولا اور تصویروں کی نمائش شروع کر دی۔ تین چار تصویروں کے بعد ایک قلمی تصویر جس میں ایک عورت کو بالکل عریاں، انگڑائی لیتے ہوئے بنایا گیا تھا۔ آپ نے میرے سامنے کر دی اور اس کے بعد گہر افشانی کہنے لگے کہ "یہ......"

کہ اتنے میں چند نوجوان لڑکیوں کی ایک ٹولی ہمارے سامنے سے گذری اور ہم سے دو چار قدم آگے بڑھ کر ایک نے دوسری سے کہا "دیکھا ان مردوں کی بے حیائی کو کہ کس ڈھٹائی سے عورتوں کی ننگی تصویروں کو اس طرح منظر عام پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر اپنے جنسی جذبات کو آسودہ کر رہے ہیں۔ تف ہے ایسی قوم پر جس میں ایسے نوجوان پیدا ہوتے ہوں" دوسری جو کچھ ظریف معلوم ہوتی تھی ہماری طرف شرارت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ع

آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہو سوار

اور ساتھ ہی ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ میرے مصور دوست کی حالت نہ پوچھئے۔ بے چارہ پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ لیکن میرے لئے تو یہ ایک زریں موقع تھا بند چھڑانے کا۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "ہاں صاحب اب رہنے دیجئے۔ ان تصویروں کو یہ موزوں جگہ نہیں ہے۔ پھر اب شام بھی ہوا چاہتی ہے"۔

آپ سے ملئے ——— آپ ہکلے ہیں اور ہکلے بھی اس پایہ کے کہ آپ کے ہکلے پن کے نسخے کو بڑے بڑے ماہر ڈاکٹروں کی ان تھک کوششیں کی ترشی بھی نہ اتار سکی۔ بات کرتے ہیں تو آپ پر رحم آنے لگتا ہے گردن اکڑ جاتی ہے۔ منہ کھل جاتا ہے اور منہ سے تھوڑی دیر تک اگر جملہ الف سے شروع ہو رہا ہو تو "آ آ" اور بے سے شروع ہو رہا ہو تو "با با" کی آواز نکلتی ہے جیسے کسی کے حلق میں روٹی پھنس گئی ہو اور وہ پانی مانگ رہا ہو۔ بیٹھے ہوئے رہے تو دونوں ہاتھ جھٹکنے لگتے ہیں اور کھڑے ہوئے رہے تو ایک پاؤں دوسرے پاؤں مارتے ہیں جس کی وجہ سے سارا جسم لرزنے لگتا ہے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرگی کا دورہ پڑ رہا ہے۔ لیکن آپ اس معذوری کے باوجود بڑے باتونی واقع ہوئے ہیں اور تو اور آپ کو اس پر گانے کا بھی شوق ہے۔ اور واہ ری قدرت کہ جب گاتے ہیں تو بالکل نہیں ہکلاتے۔

آپ کے گانے کے شوق کا یہ عالم ہے کہ جب دیکھو گنگناتے رہتے ہیں اور کم از کم جب کبھی مجھ سے ملتے ہیں تو گانے ہی کے بارے میں بات چیت کرتے ہیں:" آ آ آ اے صاحب اب ہندوستان میں کلاسیکل موسیقی تو آخری سانس لے رہی ہے اور جو کچھ باقی تھی سو اس کو فلم کمپنیاں ت ت تباہ کر رہی ہیں۔ اور ہر بار تمہید کے طور پر کچھ در فن موسیقی پر گفتگو کرنے کے بعد حرفِ مطلب پر آتے ہیں۔ آج ہی میں نے ایک گانے کی ن ن ن نئی دھن بنائی ہے۔ بڑی پیاری۔ سنئے گا تو پھڑک جائیے گا۔ اجازت ہو تو دھی دھی دھیمے سروں میں پیش کروں (واضح رہے کہ ہم سڑک پر چل رہے ہیں) تو سنئے آنا دُ نا دُ آ۔۔۔۔۔

اچھا اب آپ سے ملئے ——— جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں آپ بمشکل ۴½ یا ۴ فٹ کے مختصر سے پاکٹ ایڈیشن قسم کے آدمی ہیں۔ لیکن آپ کی ہمتیں کوہ ہمالیہ کی چوٹیوں سے بھی بلند اور خیالات بحرِ ہند سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ لیکن خدا بھلا کرے اس پست قامتی کا کہ آپ کسی کی نظروں میں نہیں بھرتے۔ جب آپ کسی مجمع کے سامنے تقریر کرنے اسٹیج پر تشریف لاتے ہیں تو اکثر غیر سنجیدہ لوگ ہنس پڑتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک من چلے نے جب آپ تقریر کرنے ایستادہ ہوئے تو پیچھے سے بآوازِ بلند کہا "کھڑے ہو جائیے" لیکن پھر بھی آپ تقریر کرنے سے باز نہیں آتے۔ آپ کے اندر ان "تقریری جراثیم" نے اتنی خطرناک صورت اختیار کر لی ہے کہ آپ اسٹیج تو اسٹیج سڑک کے فٹ پاتھ پر بھی تقریر کرنے سے نہیں چوکتے۔ یعنی آپ سڑک پر بھی اپنے مخاطب سے اس انداز میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر۔ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر پینترے بدل بدل کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر گفتگو کرتے

ہیں کہ لوگ یکبارگی کسی کے دھوکے میں آپ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں لیکن جب آپ اول قول کہتے ہوئے ان کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہیں تو وہ مسکراتے ہوئے "معاف فرمائیے" کہہ کر چل دیتے ہیں۔

میں کسی عالم میں بھی آپ سے ملوں۔ جب تک "خیالات حاضرہ" پر تقریر نہیں کر لیتے مجھے جانے نہیں دیتے۔

ان مشتے نمونے از خروارے کے بعد عرض ہے کہ اگر آپ بھی "تعدد ازدواج" کی لذتوں کے مدنظر بُری طرح "کثیر الاحباب" ہوں اور آج "دوست روک" استعمال نہ کرنے کے باعث نالاں تو آئیے پھر آپ اور میں سر جوڑ کر روئیں۔ لیکن اگر بفضل خدا آپ کے ملنے والوں اور شناساؤں کی تعداد کم ہے تو زنہار اس کو نہ بڑھائیے۔ ورنہ یاد رکھئے پچھتائیے گا۔

(بہ اجازت نشرگاہ، حیدر آباد)

سلیمان اریب

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغاخاں صاحب   عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰ ۰
جاری شدہ سرمایہ	۲۲ لاکھ ۴۴ ہزار ۶۰	۲ ۲ ۴ ۴ ۰ ۶ ۰
ادا شدہ سرمایہ	۱۲ لاکھ ۵۰ ہزار	۱ ۲ ۵ ۰ ۰ ۰ ۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل آگ، زندگی، ریل، دریائی، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم

بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمدآباد، کانپور

فلسطین (TEL-VIV)

جامعہ

زیرِ ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم - اے

جلد ۔ ۴ ۔ نمبر ۱	بابت ماہ جولائی سنہ ۴۵ء	سالانہ چندہ صہ ۔ فی پرچہ ۸ ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر محمد مجیب صاحب پبلسلہ (دکن) محبوب المطابع پریس دہلی

جنگ کے بعد قیمتوں اور شرح مبادلہ کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟

ہندوستان میں قیمتوں کی عام سطح، جنگ سے پہلے کے مقابلے میں، بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر ۱۹۳۹ء کی قیمتوں کے اوسط کو سو مانا جائے تو اس کے مقابلے میں انجمن اقوام کے اعداد کے مطابق ۱۹۴۳ء میں قیمتیں ۳۱۱ ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد سے اعداد اشاریہ برابر کمی کو ظاہر کر رہے ہیں۔ اگست ۱۹۴۴ء میں عدد اشاریہ ۳۰۲ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد غالباً اور زیادہ کمی ہوئی ہے اور اب اسے تقریباً تین سو سمجھنا چاہیے۔ لیکن اب بھی اکثر دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری قیمتیں بہت زیادہ بڑھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ امریکہ کے مقابلے میں ہمارا عدد اشاریہ ۱۶۰ کے بقدر زیادہ ہے اور انگلستان کے مقابلے میں ۱۳۰ کے بقدر۔ کیونکہ امریکہ کا عدد اشاریہ ۱۹۴۴ء کے لئے ۱۴۰ تھا اور انگلستان کا ۱۷۰۔

قیمتوں کی اتنی بڑی تبدیلی نے جماعت کے اندر سخت ابتری پیدا کردی ہے اور اس کی وجہ سے دولت کی تقسیم کی نوعیت بہت بدل گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے خوب روپیہ کمایا ہے اور کچھ نان شبینہ کے محتاج ہوگئے ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں تاجروں اور ٹھیکیداروں نے خوب منافع کمایا ہے مزدوروں کو بھی زیادہ اُجرتیں ملی ہیں اور ان کی مانگ بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ کاشتکار کو بھی اپنی پیداوار کی قیمت زیادہ ملی ہے لیکن دوسری طرف ہزاروں آدمی فاقے سے مر رہے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعداد فاقہ کی سرحد تک پہنچ گئی ہے۔ مختلف طبقوں کی حالت پہلے کے مقابلے میں کتنی بہتر یا خراب ہوگئی ہے اس سوال کے جواب کی تفصیلات میں گئے بغیر یہ بات بالکل صاف ہے کہ ۱۹۴۳ء کے بعد سے جب کہ قیمتیں اپنی انتہائی حدِ عروج تک پہنچ گئی تھیں دولت

کی تقسیم کی نوعیت بہت تبدیل ہوگئی ہے

بہر حال اب سوال یہ ہے کہ جنگ کے بعد کے سالوں میں ہندوستان میں قیمتوں کو کس سطح پر قائم کیا جائے؟ کیا موجودہ ۳۰۰ کی سطح پر قائم کردیا جائے یا انھیں خاص کم کیا جائے یا انھیں جنگ سے قبل جیسا کردیا جائے۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتوں کے بڑھنے کے جو اسباب ہیں ان کا تجزیہ کرلیا جائے۔

قیمتوں کے بڑھنے کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ متحدہ اقوام کی افواج کو رسد فراہم کرنے کا کام خصوصاً جاپان کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد سے بہت کچھ ہندوستان ہی کو کرنا پڑا۔ یہاں سے اشیاء اور خدمات کی بڑی مقدار خریدی جاتی رہی اور اس کے دام روپے کی صورت میں ادا کئے جاتے رہے۔ ملک معظم کی حکومت نے سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء تا سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں تقریباً تیرہ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ ہندوستان میں خرچ کیا اور اس خرچ کے لئے جتنے روپے کی ضرورت تھی وہ اس نے ریزرو بنک کے ہاتھ اپنے اسٹرلنگ تمسکات فروخت کرکے نوٹوں کی صورت میں حاصل کیا۔ اور اس سے یہاں کے لوگوں کو اُن کے مال اور خدمتوں کی قیمت ادا کی۔ پھر اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں خود حکومت ہند کا خرچ بھی مدافعت اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں بہت بڑھ گیا۔ اس خرچ کو کچھ تو زائد ٹیکس لگاکر پورا کیا گیا اور کچھ روپے قرض لے کر۔ حکومت ہند نے جو زائد خرچ سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء تا سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں جنگ کے غیر معمولی حالات کی وجہ سے کیا، وہ آٹھ ارب ۷۹ کروڑ روپیہ ہوتا ہے۔ گویا ان سالوں میں ہمارے ملک میں ۲۲ ارب ۲۹ کروڑ روپیے کے خرچ کا اضافہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بہت زیادہ اثر ہماری قیمتوں پر پڑا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں روپیہ کے اس خرچ کے اضافہ کے ساتھ

چیزوں کی تیاری میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مال کی تیاری میں کچھ اضافہ ضرور ہوا۔ لیکن یہ اضافہ غیر استعمالی چیزوں میں ہوا جس سے صارف کو کوئی سہارا نہیں ملا اور اس سے قیمتوں کے اس اضافہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی جو ترقی یافتہ آمدنیوں کی زائد طلب کی وجہ سے رونما ہو رہا تھا۔ پھر جو استعمالی چیزیں ملک میں تیار کی جا رہی تھیں وہ بھی شہری آبادی کا حق چھین کر دفاعی کاموں میں استعمال کی جانے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو زائد آمدنیاں لوگوں کو مل رہی تھیں جب اُن سے بازار میں مال خریدنے کی کوشش کی جاتی تھی تو خریداروں کے باہمی مقابلے کی وجہ سے اُن کی قیمتیں بڑھ جاتی تھیں۔ اور پہلے کے مقابلے میں کم اشیاء لوگوں کو میسر آسکتی تھیں۔ اس کے علاوہ جنگ سے پہلے ہندوستان میں خاصی بڑی تعداد میں مصنوعہ چیزوں کو دوسرے ملکوں سے منگایا جاتا تھا۔ لیکن جنگ کے زمانے میں درآمد بہت کم ہو گئی بلکہ اس کی جگہ خود ہندوستان سے مصنوعہ چیزیں باہر جانے لگیں جس سے استعمالی چیزوں کا ذخیرہ شہری آبادی کے لئے اور بھی کم ہو گیا۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے زندگی کے تمام مصارف بڑھ گئے۔ لوگوں نے مہنگائی کے بھتے کے لئے کوشش کی۔ یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔ لیکن یہ زائد آمدنی زندگی کے مصارف کو اور زیادہ بڑھانے کا موجب بن گئی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ نقل و حمل کی دشواریوں نے بھی قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو تیز کیا۔ کیونکہ مال کے نہ پہنچنے کی وجہ سے مقامی قلت رسد اور اعتبار میں کمی رونما ہو رہی جن کی وجہ سے مقامی قیمتیں چڑھ جاتی تھیں اور پھر ناگزیر طور پر سارے ملک کی قیمتوں کی سطح بلند ہو جاتی تھی۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک کے لئے ریل، سڑک اور ساحلی نقل و حمل کو معاشی نظام کا خون زندگی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ملک کے اندر ریلگاڑیوں، موٹروں اور ساحلی جہازوں میں اضافہ کرنا ممکن نہیں تھا اور نہ ہی معدنی تیل کی رسد ہو سکتی تھی۔ دوسری طرف فوج کے سامان اور فوجی آدمیوں کی منتقلی بہت بڑھ گئی تھی

اس لئے لازمی طور پر مقامی قلت رسد اور قیمتوں کی سطح میں بلندی رونما ہوئی۔

زر کے اصول کا مطالعہ کرنے والوں نے اب اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ قیمتوں کے تغیرات میں اعتبار و اعتماد کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہاں بہت سے ناموافق حالات جمع ہوگئے تھے۔ مثلاً جاپان کا جنگ میں شامل ہونا۔ ملک کو دشمن کا خطرہ لاحق ہونا۔ جنگ کے شروع زمانے میں اتحادیوں کی ناکامیاں۔ مقامی طور پر اشیاء کی قلت۔ حکومت کے بڑھتے ہوئے مصارف کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کی توقع وغیرہ۔ جنھوں نے لوگوں کے اعتماد کو زائل کردیا تھا اور تاجر اور خریدار دونوں بڑے پیمانے پر چیزوں کا ذخیرہ کرنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چور بازار وجود میں آگئے اور ان سب نے قیمتوں کے اضافہ کی رفتار کو بہت تیز کردیا۔

آخری وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں معاشی کنٹرول اور افراط زر کی روک تھام کے لئے وہ طریقے اختیار نہیں کئے گئے جو دوسرے شریک جنگ ملکوں میں کئے گئے تھے۔ ایسا کیوں نہیں کیا گیا، اس بحث میں پڑنا فضول ہے۔ اس کا کچھ سبب تو بلاشبہ یہ تھا کہ اس ملک میں جاپان کے جنگ میں شریک ہونے تک قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اور بڑے پیمانے پر بڑھنے کا رجحان شروع نہیں ہوا تھا اور اس کا کچھ سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ ملک کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ کھیتی کا انتظام چھوٹے پیمانے پر اور ذاتی گذارے کے لئے کیا جاتا ہے اور کچھ یہ تھا کہ حکومت اور رعایا میں اشتراک عمل کی کمی پائی جاتی تھی۔ بہرحال تازہ ترین حالات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ رکاوٹیں ایسی نہیں تھیں جن پر قابو نہ پایا جا سکتا ہو۔ اس لئے کچھ الزام تو حکومت پر عائد کرنا ہی ہوگا کہ اس نے افراط زر کے خلاف معاشی کنٹرول کی وہ پالیسی اختیار نہیں کی جو اس نے بعد میں مئی ۴۳ء میں اختیار کی اور جس کے نتیجے کے طور پر بعد میں ہندوستانی قیمتوں میں اضافہ کا رجحان رک گیا ہے۔

غرض اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں قیمتیں دوسرے ملکوں کے مقابلے

میں بہت زیادہ ہیں اور یہ بات محض صنعتی اشیا پر ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ اناج کے لئے بھی صادق آتی ہے۔

موجودہ صورت حال کا خلاصہ یہ ہے:۔

(۱) ہندوستان کی سطح قیمت ۱۹۳۹ء کے مقابلے میں دوسو فی صد زیادہ ہے۔

(۲) زندگی کے مصارف میں اضافہ کا تخمینہ ۲۲۹ فی صد تک کیا گیا ہے۔

(۳) ہندوستان کے رزرو بنک میں شعبہ اجرائے نوٹ کے ذخیرے محفوظ ہیں۔ ۸ ارب ۲۵ کروڑ روپیہ کے اسٹرلنگ تمسکات موجود ہیں۔ اور شعبہ ساہوکارہ کے ذخیرہ محفوظ ہیں، ۳ ارب ۳ کروڑ کے گویا جنگ سے قبل کے مقابلے میں بصورت مجموعی ۱۱ ارب ۲۸ کروڑ روپے کے زاید اسٹرلنگ تمسکات ہندوستان کے رزرو بنک میں موجود ہیں۔

قیمتوں کے اضافہ کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد اب ہم اس سوال پر غور کریں گے جسے ہم نے مضمون کے شروع میں اٹھایا تھا یعنی کیا قیمتوں کو ان کی موجودہ سطح پر قائم کردیا جائے یا انھیں تیزی کے ساتھ گرا کر کم کردیا جائے۔

قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کی حمایت کرنا سخت غلطی اور ناانصافی ہوگی۔ اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں۔ اول وجہ یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں ہندوستان کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے وہ غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ہے۔ اناج کی قیمت، جنگ سے قبل کے مقابلے میں آج تین گنا زیادہ ہے اور ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء کے مقابلے میں بھی جو کسانوں کے لئے بہت اچھے سال تھے یہ قیمت بہت زیادہ ہے۔ زرعی مفاد کے نہایت سرگرم حامیوں کی طرف سے اس کی تائید میں صرف ایک دلیل پیش کی گئی ہے کہ زراعت کی لاگتوں میں اور ان چیزوں کی قیمت میں جنھیں کسان بازار سے خریدتا ہے چونکہ بہت اضافہ ہوگیا ہے اس لئے زراعتی پیداوار کی قیمت بھی زیادہ رہنا چاہیے

لیکن جنگ کے ختم ہونے اور تجارت کے معمولی حالات میں واپس آجانے کے بعد استعمالی چیزوں کی قیمت لازمی طور پر کم ہو جائے گی اور ایک حد تک زراعت کی مانگیں بھی ضرور کم ہو جائیں گی اس لئے اس دلیل کی اہمیت زائل ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جب اس بات پر غور کیا جاتا ہے کہ قیمتوں کو موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی وجہ سے اصلاح و مرمت کے مصارف کس قدر بڑھ جائیں گے اور معاشی ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا مالی اعتبار سے کس درجہ مشکل ہو جائے گا تو اس کی خرابی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ پھر قیمتوں میں موجودہ اضافہ چونکہ زیادہ تر افراط زر کی وجہ سے رونما ہوا ہے اس لئے آبادی کے مختلف طبقوں کی آمدنیوں اور مصارف میں مطابقت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ بعض طبقوں نے غیر معمولی فائدے حاصل کئے ہیں اور دوسرے طبقوں نے خصوصاً جن کی آمدنی مقرر ہے غیر معمولی نقصانات اور تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ افراط زر کی وجہ سے قومی آمدنی کی جس طرح از سر نو تقسیم ہوئی ہے اسے ہرگز انصاف پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا اور اسے ارادتاً دائمی بنانا اور بھی ناانصافی ہوگی۔ آخر میں اس بات کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ جنگ کے زمانے میں قیمتوں کا جو اضافہ ہوا ہے اور جس کے اسباب تفصیل کے ساتھ اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ اس وقت بھی قائم رہے گا۔ جب جنگ کے ختم ہونے کے بعد یہ اسباب غائب ہو جائیں گے۔ خصوصاً جب متحدہ اقوام کے وہ فوجی مصارف جو اس وقت ہندوستان میں کر رہی ہیں ختم ہو جائیں گے اور باہر کا مال آزادی کے ساتھ ہندوستان میں آسکے گا، اور اعتبار و اعتماد کو عام طور پر ترقی ہو جائے گی تو اس وقت خود قیمتوں کی سطح کم ہو جائے گی۔ اگر ہم ان سب متوقع اسباب کو نظر انداز کر کے موجودہ حالات کو دائمی سمجھ لیں گے تو ہم بڑی سخت غلطی کا ارتکاب کریں گے۔ دوسرے ملکوں میں جہاں قیمتوں میں جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے مقابلے میں کم اضافہ ہوا ہے۔ چاہے قیمتوں کا رجحان بڑھنے یا قائم رہنے کی طرف ہو لیکن ہندوستان میں

مزید زوال کی طرف مائل ہوگا۔ اس لئے ہمیں اپنی قیمتوں کو دائمی طور پر موجودہ سطح پر قائم رکھنے کی ہرگز کوئی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

اس کے بعد اب دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا انھیں تیزی کے ساتھ گرنے دیا جائے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی قیمتوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے لیکن اگر اس فرق کو دور کرنے کے لئے ہندوستان کی قیمتوں کو تیزی سے گرنے دیا گیا تو جنگ کے زمانے میں جو صنعتیں شروع کی گئی ہیں اُن کا دیوالہ نکل جائے گا اور ملک میں بے روزگاری اور مزدوروں کے جھگڑے اور کساد بازاری شروع ہو جائے گی اور اس کا نقصان صرف صنعت تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ زراعت بھی متاثر ہوگی اور بالواسطہ در بالواسطہ ملک کی ساری آبادی پریشانی میں مبتلا ہو جائے گی۔

اس لئے بہترین مشورہ یہ ہے کہ کوئی کام جلد بازی اور قطعی فیصلے کے ساتھ نہ کیا جائے بلکہ ملکی اور غیر ملکی حالات کا صبر اور سکون کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور انھیں از خود مستحکم بنیاد پر قائم ہونے کا موقع دیا جائے اور جب وہ طلب و رسد کی قوتوں کے ماتحت کسی دیرپا سطح پر قائم ہو جائیں تب قیمتوں کے استحکام کی پالیسی کو شروع کیا جائے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کی شرح مبادلہ کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ جنگ کے زمانے میں ہماری شرح مبادلہ کو برابر ایک شلنگ چھ پنس پر قائم رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ہماری داخلی قیمتوں سے اس کا کوئی تعلق قائم نہیں رہ سکا ہے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہماری بڑھی ہوئی قیمتوں اور ہمارے زر کی قوت خرید کی کمی کا یہ تقاضا تھا کہ ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے گھٹا کر بہت کم کر دیا جاتا۔ دوسری طرف ہندوستان کے ریزرو بینک میں اسٹرلنگ تمسکات کا جو ذخیرہ تیزی کے ساتھ اکٹھا ہوتا جا رہا ہے اس نے بین الاقوامی منڈی میں ہمارے زر کی حیثیت کو بہت مضبوط بنا دیا

ہے۔ اسٹرلنگ تمسکات کا۔ یہ ذخیرہ اب اتنا ہو گیا ہے کہ گزشتہ بیس سال میں ہمارا توازن تجارت جس قدر ناموافق رہا ہو اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔ یہ بات ایسی ہے جو ہماری شرح مبادلہ کو ایک شلنگ چھ پنس سے کہیں زیادہ بلند سطح پر قائم رکھ سکتی ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس وقت اپنی شرح مبادلہ کو نہ بڑھانا مناسب ہوگا نہ کم کرنا۔ کم کرنا تو اس لئے مناسب نہ ہوگا کہ ہماری داخلی قیمتوں کا عروج دائمی معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرے ہمارے پاس سٹرلنگ تمسکات کا بڑا زبردست ذخیرہ موجود ہے جس کی قوت خرید کو خود کم کرنا حماقت ہوگی۔ شرح مبادلہ کو بڑھانا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ ہمیں ابھی تک اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر نو اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں ہمیں کس قدر مال باہر سے منگانا ہوگا۔ دوسرے ملکوں میں قیمتوں کے اضافہ کی مقدار کیا ہوگی اور ہمارے اسٹرلنگ تمسکات ہمیں کس طرح اور کتنی مدت کے دوران میں ادا کئے جائیں گے۔ اسی لئے جب تک ان تمام عوامل کا جو اس سلسلے میں اثر انداز ہو سکتے ہیں پوری طرح پتہ نہ چل جائے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شرح مبادلہ کو نہ بدلا جائے۔ جب حالات دوسرے ملکوں اور خود اپنے ملک میں یک گونہ معمولی حالت پر آجائیں گے۔ تب اس کے بارے میں بھی آخری فیصلہ کرنا مناسب ہوگا۔

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی حالت اور سارجنٹ سکیم

سنہ ۱۹۲۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں دکھلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی ۳۱ کروڑ آبادی میں سے صرف پونے پانچ کروڑ ایک سادہ اور آسان خط لکھ پڑھ سکتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں یہ تعداد اس سے بھی کم یعنی صرف سوا دو کروڑ تھی۔ گویا دس سال کے عرصے میں خواندہ لوگوں میں سو فی صدی سے زیادہ اضافہ ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود خواندہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے معنی یہ تھے کہ پانچ سال سے اونچی عمر کے لوگوں میں صرف ساڑھے چودہ فی صدی خواندہ تھے۔

جب ان اعداد کو عورتوں اور مردوں پر تقسیم کرکے دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ پانچ سال سے زیادہ عمر کے مردوں میں تعلیم کا اوسط ۲۲ ½ فی صدی اور عورتوں میں ۵ ½ فی صدی تھا۔

عورتوں اور مردوں کی خواندگی میں فرق کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ابتدائی مدرسوں کے لئے پڑھانے والی عورتیں کافی تعداد میں نہ ملتی تھیں۔ دوسرے معاشرتی اور معاشی اسباب کی بنا پر بھی عورتوں کی تعلیمی ترقی سست تھی۔ لیکن ان سے بڑھ کر رکاوٹیں یہ تھیں کہ ایک تو آبادی کی اکثریت (یعنی ۸۰ فی صدی سے زیادہ) ایسے گاؤں میں رہتی تھی جن کی آبادی پانچ سو یا اس سے کم تھی۔ اس کے علاوہ کسانوں کا افلاس اور سرکاری آمدنی کی قلت بھی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود گذشتہ دس سالوں میں جو ترقی ہوئی وہ بہت حوصلہ افزا ہے لیکن اگر آئندہ کے لئے ہندوستان کی تمام بالغ آبادی کو خواندہ بنانا ہے تو لازماً اس رفتار کو بہت زیادہ تیز کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے وسیع نظام تعلیم میں حسب ذیل مدارج شامل ہیں۔ پندرہ

یونیورسٹیاں اپنے ۲۲۵ آرٹ اور سائنس کے کالجوں کے ساتھ۔ ۵۰۰ پیشہ ورانہ کالج، ۲ لاکھ ۳۰ ہزار ۴۶۲ فوقانیہ، وسطانیہ اور تحتانیہ اور ہر قسم کے مخصوص مدرسے ۱۹۴۱ء میں ان ۲ لاکھ ۲۴ ہزار ۹۰۰ مجموعی تعلیمی اداروں میں ایک کروڑ، ۵ لاکھ ۶۹ ہزار ۹۰۸ طلبہ (لڑکے اور لڑکیاں) تعلیم پا رہے تھے۔

یہ نظام تعلیم بہت زیادہ عظیم الشان ہے۔ لیکن ملک کی ضرورتیں اس سے بھی زیادہ بڑی ہیں۔ ہندوستان میں ۷ لاکھ ۵۰ ہزار سے زیادہ گاؤں پائے جاتے ہیں اور آبادی میں اضافہ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہو رہا ہے۔ ان حالات میں لازمی تعلیم کے جاری کرنے کا اختیار مجبوراً مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو جو سب منتخب کی ہوئی جماعتیں ہیں سپرد کرنا پڑا ہے۔ یہ اپنی موجودہ مالی حالت اور سہولتوں کو دیکھنے کے بعد اس کا فیصلہ کرتی ہیں کہ لازمی تعلیم مناسب ہے گی یا نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں چھ اور گیارہ سال کی درمیانی عمر کے بچوں کے لئے ۱۹۲ شہروں اور ۱۴ ہزار ۱۰۵ گاؤں میں جبریہ تعلیم رائج کی گئی تھی۔ ان علاقوں میں بھی جبریہ تعلیم صرف لڑکوں کے لئے رکھی گئی تھی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں مثلاً احاطہ مدراس میں یہ اصول لڑکیوں پر بھی عائد کیا گیا تھا۔

۱۹۲۱ء سے یعنی جب سے ۱۹۱۹ء کے دستوری قانون کا نفاذ ہوا تعلیم پورے طور پر صوبائی حکومتوں کی نگرانی میں دے دی گئی ہے۔ برطانوی ہندوستان میں مرکزی اور صوبائی اختیارات کو صراحت کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے منتخب شدہ ہندوستانی وزراء جو صوبائی مقننہ کو جواب دہ ہوتے ہیں تعلیم کی دیہاتی مدرسوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک نگرانی کر رہے ہیں۔ مرکزی حکومت کو تعلیم پر کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔ وائسرائے کی عاملہ کے وزیر تعلیم کو صرف بعض چھوٹے وفاقی علاقوں (مثلاً دہلی کے دار السلطنت) کی تعلیم پر جو مرکزی حکومت کی راست نگرانی میں ہے، اختیار حاصل ہے اس کے علاوہ باقی تمام ہندوستان کی تعلیم کے بارے میں وزیر تعلیم اور اس کے ماہران تعلیم

کا کام صرف مشورہ دینا ہے۔ ایک مرکزی تعلیمی مشاورتی بورڈ کے ذریعے صوبوں نیز ریاستوں کے وزرائے تعلیم کے کام میں مشورہ دیا جاتا ہے اور اس میں یک جہتی پیدا کی جاتی ہے۔

ہر صوبے میں عوام کی منتخب کردہ کابینہ کا ایک رکن وزیر تعلیم ہوتا ہے اور تعلیمی انتظامات کے صدر مستقل کو جس کا کام وزیر تعلیم کو مشورہ دینا ہوتا ہے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی ۹۰ فی صدی تعلیم گاہوں کی صوبائی حکومت نگرانی کرتی ہے۔ جو تعلیم گاہیں حکومت سے اپنی اسناد تسلیم کرانا یا مالی امداد لینا چاہتی ہیں انھیں حکومت کی نگرانی کو قبول کرنا پڑتا ہے اور ان کا سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں ذمہ داری کچھ تو صوبائی حکومتوں کی ہوتی ہے اور کچھ خود یونیورسٹیوں کے حوالے کردی جاتی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے معاملے میں صوبائی حکومتیں، میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ساتھ یا تو ذمہ داری میں شرکت کرتی ہیں یا اپنے اختیارات انھیں منتقل کردیتی ہیں۔

مدرسے کا نظام تحتانیہ یا ابتدائی مدرسوں میں چھ سے دس سال تک کی عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا عام مقصد "خواندگی کے معیار تک پہنچنا اور کام چلانے کے لائق حساب سیکھنا ہوتا ہے۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ابتدائی تعلیم کی بنیاد کو وسیع کرنے اور اسے طلبا کے ماحول سے براہ راست متعلق کرنے کی مختلف کوششیں کی جارہی ہیں ۱۹۳۶ء سے صوبائی حکومتیں اس مسئلے پر توجہ کررہی ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس نے ایک زیادہ عملی اور دلچسپ نصاب کو رائج کرنے کی سفارش کی۔ یہ بنیادی تعلیم کی اسکیم تھی جس میں کئی ان خیالات کو قبول کیا گیا تھا جنھیں مہاتما گاندھی نے پیش کیا تھا۔ بنیادی تعلیم کی اس اسکیم پر جنگ کے باوجود' دیسی ریاستوں کے علاوہ برطانوی ہند کے چار بڑے صوبوں یعنی بمبئی، سی پی، بہار اور یوپی میں تجربہ کیا جارہا ہے۔

وسطانیہ اسکولوں میں عموماً دس سے ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے

ان کے دو بڑے نمونے پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ مقامی طور پر ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں۔ اول "ورناکلر" مڈل اسکول جن میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے لیکن ذریعہ تعلیم نہیں ہے۔ دوسرے "اینگلو ورناکلر" مڈل اسکول جو طالب علم کو پندرہ سال ختم کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اور جن میں اونچی جماعتوں میں بعض مضامین کی تعلیم کے لئے ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔

مدرسوں کی زیادہ تر تعداد ایسی ہے جن میں باقاعدہ طور پر مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ جن مدرسوں میں تمام یا اکثر طلباء کا ایک مذہب سے تعلق ہوتا ہے۔ وہاں کچھ گھنٹے اخلاقی تعلیم کے لئے مخصوص کر دئے جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی کوئی جداگانہ تعلیم نہیں دی جاتی۔ دینیات کی تعلیم کے لئے بھی کچھ مدرسے بعض ذاتیں اور فرقے مختلف طریقوں پر چلا رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری نظام تعلیم سے باہر ہیں۔

تقریباً ۵ لاکھ طلبہ ایسی تعلیم کا ہوں میں پڑھ رہے ہیں جنھیں حکومت تسلیم نہیں کرتی۔ یہ عام طور پر وہ مدرسے ہیں جنھیں خاص خاص ذاتوں یا فرقوں نے کھول رکھا ہے اور یہ عموماً مندروں اور مسجدوں سے متعلق ہوتے ہیں۔

ابتدائی اور یونیورسٹی کی درسگاہوں میں مخلوط تعلیم کو قبول کر لیا گیا ہے لیکن ان میں لڑکیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مدرسے اور کالج بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ان کی میزان ۱۹۴۲ء میں حسب ذیل تھی:-

۲۶ ہزار ۲۴۲ ابتدائی مدرسے۔ ایک ہزار ۲۵۷ وسطانیہ مدرسے - ۲۹۷ فوقانیہ مدرسے - ۵۰۰ مخصوص مدرسے ۸ پیشہ ورانہ تعلیم کے اور ۴۵ عام تعلیم کے کالج۔ کل میزان ۲۸ ہزار ۴۵۵ تھی جس میں ۴۴ لاکھ ۲۲ ہزار طالبات زیر تعلیم تھیں۔

یونیورسٹی کی تعلیم | یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے کالجوں کی میزان

۱۰۷ ہوتی تھی، جس میں آرٹ اور سائنس اور پیشہ ورانہ تعلیم سب کے کالج شامل تھے۔ ۱۹۴۹ء میں ان میں ایک لاکھ باون ہزار ۲ سو طلبہ پڑھتے تھے۔ اس تعداد میں ۱۲ ہزار ۵۰۰ طالبات بھی شامل تھیں جو یا تو آرٹ یا میڈیسن یا مدرسی یا قانون کی سند کے لئے تیاری کررہی تھیں۔ ہندوستان کی یونیورسٹیاں۔ اگر ان میں سے بعض ممتاز اقامتی یونیورسٹیوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے، عام طور پر الحاق کرنے والی یونیورسٹیاں ہیں۔ اور ان کو قریب قریب انگلستان کی لندن یونیورسٹی کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ ان کی اسناد کو، آکسفورڈ کیمبرج لندن اور دوسری برطانوی اور یورپین یونیورسٹیاں اپنی اسناد کے برابر تسلیم کرتی ہیں۔ ان کے امتحانات عام طور پر سخت ہوتے ہیں اور ان کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ڈاکٹری اور تحقیقات کی سندوں کو بہت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

استادوں کی حالت نہایت قدیم زمانے سے ہندوستان میں عالموں کی عزت کا رواج چلا آرہا ہے اور گرو (استاد) کا درجہ بہت بلند و محترم سمجھا جاتا رہا ہے۔ لیکن استاد سے یہ توقع کی جاتی رہی ہے کہ وہ ولیوں اور مہاتماؤں جیسی سادہ زندگی بسر کرے۔ اس لئے اُسے معاوضہ بہت کم دیا جاتا ہے۔ یہ روایت اب بھی استادوں خصوصاً ابتدائی مدرسے کے استادوں کی تنخواہ کی کمی کی صورت میں جاری ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت کم گاؤں کے استاد ایسے ہیں جو اپنے کام کو ایک ضمنی کام سے زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں۔

ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں استادوں کی مجموعی میزان ۵ لاکھ ۱۸ ہزار ۱۸ ہوتی تھی۔ اس میں سے صرف ۲ لاکھ دس ہزار ۹۰۶ تربیت یافتہ استاد تھے۔ ثانوی مدرسے کے استادوں کو تربیت دینے کے لئے ۴۶ مدرسے تھے۔ جن سے سالانہ صرف ۱۹ ہزار ۲۹۳ استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔ گریجویٹ استادوں کی تربیت کے لئے ۲۰ ٹریننگ کالج تھے جن سے سالانہ ایک ہزار ۶۱۳ استاد تربیت پاکر نکلتے تھے۔

تعلیم پر جنگ کے اثرات خوش قسمتی سے ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے تعلیم کا کچھ زیادہ ہرج نہیں ہوا ہے۔ برما کے فتح ہو جانے کے بعد مشرقی ساحل کی کچھ درس گاہوں نے اپنے اسکولوں کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا تھا۔ لیکن اب انھوں نے اپنا کام حسب معمول شروع کر دیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے کام میں البتہ کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ کیونکہ اس سے ملحقہ کچھ کالج جاپانی بمباری کے بعد زیادہ محفوظ علاقوں میں منتقل ہو گئے تھے۔

جنگ کے بقیہ تمام اثرات تعلیم کے لئے موافق ثابت ہوئے ہیں جنگی صنعتوں کی طلب نے فنی تعلیم کی بہت حوصلہ افزائی کی ہے۔ سرکار نے اپنی ٹیکنیکل اسکیم کو ۱۹۴۰ء میں بہت مختصر پیمانے پر شروع کیا تھا، لیکن اب اسکیم کے ماتحت چار سو مرکز چل رہے ہیں۔ اور ایک لاکھ فنی ماہر تربیت پا چکے ہیں۔ برطانیہ کے وزیر مزدوران، مسٹر ارنسٹ بیون نے جس اسکیم کو شروع کیا تھا اس کے ماتحت ہندوستان کے ماہر مزدوروں اور امیدواروں کی ٹولیاں معینہ وقفوں کے بعد ہتھیار اور گولہ بارود اور جہاز سازی کے کارخانوں میں تربیت پانے کے لئے جاتی رہتی ہیں۔ سائنس کی تحقیقات کو سر ایم بھٹناگر کی سرکردگی میں کاؤنسل آف انڈسٹریل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ قائم کر کے بہت ترقی دی گئی ہے۔ یہ کاؤنسل نہ صرف اپنے طور پر تحقیقات کا کام جاری رکھتی ہے بلکہ دوسرے بہت سے مرکزوں کے کام میں بھی یک جہتی پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور ہندوستان کے وسائل کو جنگ اور صنعت کے کام میں استعمال کرنے میں اسے بعض نمایاں کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔

فوج کا تعلیمی اثر جنگ کے زمانے میں تعلیمی ترقی کو، خود ہندوستانی فوج نے بھی ایک نہایت اہم اور دیرپا امداد پہنچائی ہے۔ ہندوستانی فوج کی تعداد اب بیس لاکھ سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس فوج میں جس کی بھرتی رضاکارانہ طریقے پر ہوتی ہے زیادہ تر کسانوں کا طبقہ شامل ہے جو بھرتی کے وقت عموماً ناخواندہ ہوتے ہیں۔ فوج میں انھیں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ انھیں خواندہ بنایا جاتا ہے اور ایک مشترکہ زبان یعنی لاطینی رسم خط

میں لکھی ہوئی اردو سکھائی جاتی ہے (لاطینی خط میں لکھی ہوئی اردو ہندوستانی فوج کا مشترکہ ذریعہ تعلیم ہے) انھیں معقول بنیادی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس کا ابتدائی مقصد اگرچہ سپہ گری کی تعلیم ہوتا ہے لیکن جس میں پھر بھی اس دیہی پس منظر کا خیال رکھنا پڑتا ہے جہاں سے سپاہی بھرتی ہوا ہے اور جہاں جنگ کے بعد اسے دوبارہ واپس جانا ہوگا۔ بہت سے اہل نظر حضرات کا یہ خیال ہے کہ جنگ کے بعد جب وہ سپاہی جس نے فنی مہارت حاصل کی ہے، جس نے اپنی نگاہ میں وسعت پیدا کی ہے جس نے، ہر قسم کی مشینوں اور حفظان صحت اور صفائی کے اصولوں سے اپنے آپ کو روشناس کیا ہے۔ جس نے جماعتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی تربیت حاصل کی ہے، اور بہت سے مذہبوں اور ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی عادت ڈالی ہے جب یہ سپاہی جنگ سے لوٹے گا تو ترقی کے کام میں بہت معاون ثابت ہوگا۔

سارجنٹ اسکیم جنگ کے بعد کی تعلیمی ترقی کے لئے جو منصوبہ ہندوستان میں بنایا گیا ہے وہ اتنا ہمہ گیر اور ایسے بڑے پیمانے پر ہے کہ اس سے پہلے ایسا منصوبہ کبھی نہیں بنایا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں جسے حکومت ہند کے مشیر تعلیم مسٹر جان سارجنٹ کے نام پر سارجنٹ اسکیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے چھ اور چودہ سال کے درمیانی عمر کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے لازمی ہمہ گیر تعلیم کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس تعلیم کا مقصد محض "خواندگی" کا معیار حاصل کرنا نہیں ہوگا بلکہ طلبہ کو شہریت کے فرائض انجام دینے کے لئے کم ترین طریقے پر تیار کرنا ہوگا۔ چھ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے گہوارہ کے مدرسوں کو بھی منصوبہ میں رکھا گیا ہے اور ان سب بچوں کو جن میں اس کی صلاحیت دیکھی جائے گی ثانوی اور فوقانی تعلیم کا بھی موقع دیا جائے گا۔ یونیورسٹی کی تعلیم میں منتخب طلبہ کے لئے خاص زور پوسٹ گریجوایٹ اور ریسرچ کے کام کی سہولتوں پر دیا جائے گا اور کالجوں کی موجودہ گنجائش کو دوگنا کردیا جائے گا۔ ٹیکنیکل تجارتی اور آرٹ کی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا بالغوں کی پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ

تعلیم کا مقصد یہ ہوگا کہ ۲۵ سال کے دوران میں ۴۰ سال سے کم عمر کے تمام لوگوں کو خواندہ بنا دیا جائے۔ اس اسکیم کو چلانے کے لیے ۲۰ لاکھ مزید استادوں کی ضرورت ہوگی، اور ان میں کا ہر استاد معقول طریقے پر تربیت یافتہ ہوگا۔ اسکیم کے خرچ کا اندازہ جب اس پر پوری طرح عمل جاری ہو جائے گا۔ تین ارب بارہ کروڑ روپیہ سالانہ کیا گیا ہے۔ جنگ کے قبل سرکار کی طرف سے تعلیم پر صرف ۱۲ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کئے جاتے تھے۔

ہندوستان میں اس رپورٹ کو عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور اب اس پر حکومت ہند اور صوبے کی حکومتیں غور کر رہی ہیں۔

روس انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب روس کی کامیابی کا دنیا کو پہلی بار اس وقت احساس ہوا جب روس نے اپنے پنج سالہ منصوبہ نمبر ا کو وقت سے پہلے مکمل کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب کے ملکوں میں نہایت ہولناک کساد بازاری کا دور دورہ تھا۔ لیکن روس اس عالمگیر وبا سے محفوظ رہا اور اس کی آبادی مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو بلند کرنے کی تدبیروں میں لگی رہی۔

اس کے بعد سے روس کی تعریف میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن ان کے لہجے میں مربیانہ شفقت اور سرپرستی کا انداز پایا جاتا تھا۔ موجودہ جنگ عظیم تک روس کے کارناموں کو سراہا جاتا رہا، لیکن مغرب کے دول عظمےٰ روس کی طاقت کو اپنے سے کم درجے کا سمجھتے رہے جرمنی کے مقابلے میں روس کی ابتدائی پس پائیوں سے لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ روس اب نہ پنپ سکے گا اور چین کی طرح اندرونی خانہ جنگیوں اور قحط سالیوں کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن اس کے بعد جس حیرت انگیز طریقے پر روس نے اپنے مفتوحہ علاقوں کو واپس لیا اور اپنی جارحانہ پیش قدمیوں کو مسلسل جاری رکھا اس نے روز بروز لوگوں کے دلوں میں روس کا احترام اور اس کے ساتھ عقیدت و احسان مندی کو جاگزیں کرنا شروع کر دیا۔ اب لوگوں نے اس بات کو دل سے مان کر انقلاب نے واقعی روس کی زندگی کا نقشہ بدل دیا ہے۔ روس کا نظام مستحکم اور پائدار بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے اور اس کے پرندے

اور منتشر ہو جانے کے امکانات مفقود ہو گئے ہیں۔ وہ لوگ جن کا شمار کل تک ذلیل انقلابیوں اور کم حیثیت مزدوروں اور کسانوں میں کیا جاتا تھا آج دنیا کے ممتاز ترین مدبر، جنرل اور صنعتی رہنما بن گئے ہیں۔ اس اعتراف کے ساتھ ساتھ دول عظمیٰ کے قدامت پسندوں میں روس کی جانب سے خوف و اندیشہ بھی پیدا ہو گیا ہے کیونکہ اب وہ اسے پرانے نظام کا ایک خطرناک دشمن سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں قدرتی طور پر یہ جستجو پیدا ہوتی ہے کہ انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کی زندگی کے فرق کا اچھی طرح جائزہ لیا جائے اور ان اصلاحوں اور ترقیوں کا پتہ لگایا جائے جنھوں نے روس کے جاہل اور پس ماندہ عوام کو دنیا کی مہذب ترین قوموں کا مد مقابل بنا دیا ہے اور ان کے ملک کو دنیا کے عظیم ترین دول میں شامل کر دیا ہے۔

اس مختصر مضمون میں اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرنا تو ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اصلاح معاشرت کی چند مخصوص تحریکوں کو منتخب کر کے ان کے بارے میں کچھ سرسری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن اس کام کو شروع کرنے سے پہلے تبدیلی کا ایک عام خاکہ پیش کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

روس کے عوام انقلاب سے پہلے جاہل تھے، اوہام پرست تھے، غیر معمولی طور پر بیماریوں میں مبتلا تھے اور بعض علاقوں میں واقعی وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے حکمران ایک غیر ملکی نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن زوال اور انحطاط کا شکار ہو چکے تھے اور بد اخلاقیوں میں مبتلا تھے۔ اس ملک کا سیاسی دستور نکما اور دقیانوسی ہو چکا تھا۔ انقلاب کے بعد جب ۱۹۱۷ء میں اس ملک کی رہنمائی لینن نے اپنے ہاتھ میں لی اس وقت کی حالت کا نقشہ ایک نہایت واقف کار شخص ڈاکٹر ایس جوزف ڈیلن نے اپنی کتاب "دی اکلپس آف رشیا" (روس چاند گہن میں آگیا) میں کھینچا ہے۔ مصنف مذکور کی ساری پونجی انقلاب میں برباد ہو گئی تھی اور وہ بالشوزم کو اس زمانے میں جا

کی نگاہ سے دیکھتا تھا اس لئے اس پر جانب داری کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ زار کے زمانے کے روس میں نسلوں اور مذہبوں کے جو بے شمار اختلافات پائے جاتے تھے ان کو دکھلانے کے بعد وہ لکھتا ہے :۔

جب روس کی قوموں سے قطع نظر کرکے وہاں کے عوام یعنی زراعت پیشہ آبادی پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو نظر آتا ہے کہ اس کے معاشری ادارے عہد وسطیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی کوششیں ایشیا کے باشندوں جیسی تھیں اور زندگی کے بارے میں اس کا تصور زمانہ قبل تاریخ جیسا تھا۔ کسانوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جاپانیوں کو، مانچوریا میں روس کے مقابلے میں جو کامیابی ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جاپانیوں نے جراثیم کی شکل اختیار کرلی تھی اور روسی سپاہیوں کے بوٹوں میں گھس گئے تھے اور ان کے پاؤں کو کاٹ کر انھیں مار ڈالتے تھے۔ جب کسی ضلع میں کوئی وبا پھیلتی تھی تو وہ سب سے پہلے وہاں کے ڈاکٹر کو مارتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کنوؤں میں زہر ڈال کر بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ وہ جادوگرنیوں کو زندہ جلاکر خوش ہوتے تھے اور بھوت کو دفن کرنے کے لئے مردے کی لاش کو قبر سے نکالتے تھے۔ بے وفا بیویوں کو مادر زاد ننگا کرکے انھیں گاڑی سے باندھ دیتے تھے۔ اور ان پر کوڑے برساتے تھے اس لئے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ کسانوں کے تمدن کا معیار جن کا نام نہ کروڑوں کو اس وقت بتایا جارہا ہے۔ مغربی یورپ کے مقابلے میں بہت ادنےٰ سطح پر ہے۔ جب کسانوں کے اوپر سے وہ پابندیاں اُٹھالی گئیں جو امن وامان قائم کئے ہوئے تھیں تو جماعت کے لئے اس کے نتائج لازماً نہایت اندوہناک ثابت ہوئے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کی طرح کسانوں میں بھی اس معاشری حس کا فقدان ہے جو ایک قوم میں اتفاق، یگانگت اور سیاسی اتحاد کو قائم رکھتی ہے۔ یہاں کے عوام کو جو چیز تاراج کا شکار بننے سے بچائے ہوئے تھی وہ خدا کا ایک ابتدائی تصور اور زار روس کا خوف تھا۔ لیکن مانچوریا کی شکست کے بعد

سے ان میں کمزوری پیدا ہونا شروع ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روس کے اکثر کسان ایسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں جو سوروں کے رہنے کی جگہ سے بھی زیادہ گندے اور بدبودار ہوتے ہیں۔ وہ سردی کے موسم میں چھ بجے بلکہ پانچ بجے سو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس مٹی کا تیل خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ انھیں نہ گوشت کھانے کو ملتا ہے نہ انڈے نہ مکھن، نہ دودھ اور اکثر کو بھی نمک نہیں ملتا۔ وہ زیادہ تر سیاہ روٹی اور آلوؤں پر زندہ رہتے ہیں۔ بہیں بلوں کہئے ان کی ناکافی مقدار پر بھوکے مرتے ہیں۔ آج بھی (یعنی ۱۹۱۷ء میں) جبکہ یورپ میں ایسے بے شمار کسان ہیں جو کافی غذا نہ ملنے کی وجہ سے بھوک سے مرے ہیں۔ وائٹ الشیہ میں اس وقت جبکہ فوج کے محفوظ دستے جنگ پر جا چکے ہیں۔ بہت سے ایسے گھر ہیں جن میں خاندان کے گذر کے لئے آدھ سیر جو بھی نہیں ہے، اور نہ ہی کمانے والا گھر پر موجود ہے۔ پھر تماشہ یہ ہے کہ ان فاقہ زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں نے اپنے کھیتوں پر کافی غلہ پیدا کیا تھا۔ لیکن فصل کٹنے کے بعد سرکاری محصول ادا کرنے کے لئے انھیں سے فروخت کر دینا پڑا تھا اور اس کی بعض محض برائے نام قیمت ملی تھی۔ سیاست سے انھیں کوئی واسطہ اور مطلب نہیں ہے اور اس کو یہ بالکل نہیں سمجھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ چالاک اور زمین کے لالچی ہیں۔ پہلے ان کی کوئی آواز اور اہمیت نہیں تھی اب باشعور طبقوں، خصوصاً سرکاری طبقوں نے ان کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ صرف زمین کے طلبگار تھے، زمین انھیں کس طرح ملے۔ اس کے بارے میں یہ کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ ملکیت کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان کے ذاتی مقبوضات کو تو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ البتہ زمینداروں کے حقوق بلا تامل ان سے چھینے جا سکتے ہیں۔ یہ ایک سادہ لوحانہ اشتراکیت تھی جسے صدیوں کی جہالت، غلامی اور گمراہی نے پیدا کیا تھا یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس عنصر کی مکمل آزادی کے معنی لازماً یہ ہوں گے کہ زار شاہی تباہ ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گیارہ سال ہوئے (یعنی ۱۹۱۷ء میں) میں نے لکھا تھا "روس

دیہی کسانوں کے سوال کو انقلاب کی ابتدا اور انتہا سمجھنا چاہیے۔ یہ وہ تخریبی آلہ ہے جو زار کی فوجی طاقت کے باوجود پرانے نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے گا۔ البتہ اگر زمین کے اہم مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل نکل آیا تو پھر انقلاب بہت کمزور ہو جائے گا۔ .... کیونکہ اس بات کو ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اسی فی صدی آبادی ناخواندہ ہے اور لاکھوں ایسی تاریک جہالت اور اوہام پرستی میں مبتلا ہیں جس کا غیر ملکی لوگ کوئی تصور بھی قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے انھیں اکسانے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ...... یہ نعرہ "زمین کس کی؟ کسانوں کی" ان پر ایک نشہ طاری کر دیتا ہے اور انھیں بالکل دیوانہ بنا دیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دوسروں کی جان و مال کے خلاف ہر قسم کے جرم کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ اس سے ایک ایسی بے اندازہ انقلاب انگیز طاقت وجود میں آتی ہے جس سے موجودہ معاشرتی اور سیاسی نظام کو درہم برہم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں زار کی فوج کی طاقت بالکل حقیر اور ہیچ معلوم ہوتی ہے کیونکہ فوج کا منبع بھی خود یہی طاقت ہے اور وہ اپنی جد و جہد اور میلانات سے فوج کو بھی متاثر کر سکتی ہے ...... غرض اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک سیاہ پسند شخص بے تدبیر جاہل، دروغ گو اور نیا غیر منظم گروہ جس پر خون خواری کے دورے پڑتے ہیں۔ پیدا ہو جاتا ہے، اسے پیراگوئے کے جنگلی گاکوس قبیلے سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔"

۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر ڈلن نے لینن اور اس کے رفقاء کے بارے میں حسب ذیل رائے قائم کی تھی:-

"بالشویک تحریک میں ذرہ برابر بھی تعمیری اور اجتماعی تصور نہیں ہے، لینن اور ٹروٹسکی کے مغربی مداحوں کو بھی بالشوزم میں یہ چیز کہیں نظر نہیں آ سکتی۔ صحیح سوشلزم کے معنی ہیں اجتماعی زندگی کی تنظیم اور ترکیبی تنظیم لیکن بالشوزم میں اس کے کوئی آثار نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک جز کو کل قرار دے دیا گیا ہے اور بقیہ حصہ کے ساتھ بڑا

کیا جاتا ہے وہ انگز نڈر اول اور نکولس اول کے زمانے کے بیگاریوں سے بہتر نہیں ہے۔ بالشوزم کو دراصل زارشاہی کی ایک الٹی شکل سمجھنا چاہئے۔ سرمایہ داروں کے ساتھ اس کا سلوک ایسا ہی خراب ہے جیسا کہ زاروں کا بیگاریوں کے ساتھ تھا۔ بالشوزم اخباروں کا گلا گھونٹتا ہے، آزادی کی مخالفت کرتا ہے۔ قوم کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کو گرفتار یا جلا وطن کرتا ہے۔ اور ان جرائم کی طرف سے چشم پوشی کرتا ہے جو اپنی خونخواری میں بالکل شیطانی معلوم ہوتے ہیں "

لیکن دس سال بعد ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر ڈلن دوبارہ اشتراکی جمہوریت ہائے متحدہ روس میں وارد ہوا تو وہاں کی باتیں دیکھ کر حیرت زدہ ہوگیا۔ وہ اپنی کتاب "رشیا ٹوڈے اینڈ ٹومارو" (روس اب اور آئندہ) میں لکھتا ہے:- ہر جگہ لوگ غور کر رہے ہیں، کام کر رہے ہیں، متحد ہو رہے ہیں، علمی انکشاف اور صنعتی ایجادیں کر رہے۔ اگر کسی شخص کے لئے روسی جمہوریتوں پر طائرانہ نگاہ ڈالنا ممکن ہو تو وہ اپنے حواس کی شہادت کا مشکل ہی سے یقین کر سکتا دنیا میں آج تک ایسی یا اس سے ملتی جلتی کوئی پیزر اپنے مقصد کے تنوع اور وسعت اور ہمہ گیری کے لحاظ سے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ انقلابی کوشش پہاڑ جیسی رکاوٹوں کو روئی کی طرح ملنے سے ہٹا رہی ہے اور غیر ہم آہنگ عناصر کو ایک عظیم قوم میں جذب کر رہی ہے اور جب میں قوم کا یہ لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کے پرانے معنی نہ لئے جائیں بلکہ اس سے میری مراد ایک ایسی مضبوط جماعت ہے جو گویا مذہبی جوش سے سرشار ہو کر متحد ہوگئی ہے ... بالشوکوں نے جو کچھ ارادہ کیا تھا اس کے بہت بڑے حصے کو مکمل کر لیا ہے اور جو کام انھوں نے کیا ہے اور جن ناموافق حالات کا مقابلہ کر کے کیا ہے وہ کسی دوسری انسانی تنظیم کے لئے قابل حصول نہیں تھا۔ انھوں نے پندرہ کروڑ ایسے آدمیوں کو جو بالکل قالب بے جان نظر آتے تھے، ایک نئی روح سے معمور کر دیا ہے۔ انھوں نے کرۂ زمین کے چھٹے حصے سے پرانی دنیا کے نظام کو نیست و نابود کر دیا ہے اور دنیا کے

باقی سب حصوں میں بھی اس کے لئے قبریں تیار کر رہے ہیں۔ انھوں نے ہنگامی مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں اپنی قابلیت اور عزم وہمت اور اچھے مواقع سے فائدہ اٹھانے کا پورا ثبوت فراہم کردیا ہے۔ اپنے ملک کی مختلف قوموں کے ساتھ جو برتاؤ انھوں نے کیا ہے اور جو وطنی اتحاد انھیں عطا کی ہے اسے جدت اور سلیقے کا شاہکار مانا جاسکتا ہے۔ اقلیتوں کے مطالبوں کو پورا کرنے کے جو طریقے انھوں نے اختیار کئے ہیں ان کا مقابلہ دنیا کا کوئی موجودہ مدبر نہیں کرسکتا۔ ان تمام معاملوں میں اور دوسرے اقدامات میں جو قوت ان سے کام کرا رہی ہے وہ ناقابل تسخیر بلکہ معجزہ نما معلوم ہوتی ہے ... بالشوزم تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کی عظیم الشان مصلحوں میں سے ہے جسے بعض وقت ہم مشیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور جس کا ظہور طویل مدتوں کے وقفہ کے بعد انسانی زندگی کے فسادات کو دور کرنے کے لئے اور نئے انسانی نظاموں کے واسطے زمین کو ہموار کرنے کے لئے ہوا کرتا ہے جبرانیوں نے حضرت موسیٰ۔ ہنوں نے اٹیلا۔ منگولوں نے چنگیز خاں کی رہنمائی میں جو کام کیا تھا وہی بالشوکوں نے لینن کی رہنمائی میں کیا ہے۔ یہ سب ایک ہی بالائے فہم نقاش کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں۔ بالشوزم کی ابتدا، زندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ہوئی ہے اور اگر ان ناانصافیوں کا ختم کرنا ضروری نہ ہوتا جن میں ہماری فرسودہ تہذیب مبتلا ہے تو یہ کبھی وجود میں نہ آتا۔ بالشوزم، خیر وشر، رحم ومروت سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ یہ ایک فوق تجربی شے ہے۔ یہ عیسائیت کی طرح دنیا میں امن پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ جنگ کرانے کے لئے آیا ہے اور اس کے شکار کئے ہوئے لوگوں کی تعداد سخت سے سخت خونریز جنگوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کا انجام چاہے خیر ہو چاہے شر لیکن مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ اس وقت دنیا میں ایک نہایت زبردست قوت محرکہ ہے۔ بلاشبہ یہ ایک نہایت بے درد حقیقت ہے۔ اس کے افسانوں [illegible] ایک مقصد اور مشن ہے جو یقیناً پورا ہو کر

رہے گا:"

بالشویکوں کے بارے میں ڈاکٹر ڈلن جیسے واقف کار اور غیر جانب دار شخص کو ان کی دس سال کی کارگذاریوں کو دیکھنے کے بعد ۱۹۲۸ء میں جس طرح اپنی رائے میں بنیادی تبدیلی کرنا پڑی تھی، اسی طرح اب دوسرے اور بہت سے مصنفوں کو بھی بالشویکوں کے ۲۵ سال کے کارناموں کو دیکھ کر اپنی رائے تبدیل کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لئے ان کی رہنمائی میں روس کی زندگی میں جو غیر معمولی اصلاح و ترقی ہوئی ہے وہ کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہی ہے لہٰذا اس پر مزید بحث کئے بغیر اب ہم اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ انہیں اس کام کو انجام دینے کے لئے انھوں نے کون کون سے طریقوں کو اختیار کیا۔ ان طریقوں کو ہم حسب ذیل عنوانوں کے تحت تقسیم کرتے ہیں:-

۱۔ عورتوں کی اصلاح و ترقی اور شیر خوار بچوں کی نگہداشت۔
۲۔ صحت و صفائی کی اصلاح و ترقی۔
۳۔ معاشی اطمینان و عافیت کی ترقی
۴۔ تعلیم کی ترقی (الف) ابتدائی فنی اور اعلیٰ تعلیم۔
۵۔ تعلیم کی ترقی (ب) جسمانی، سیاسی اور جمالی تربیت اور تعطیلات و تفریحات کی تنظیم۔
۶۔ مکانوں کی فراہمی اور شہروں کا منصوبے کے مطابق بسانا۔
۷۔ میونسپل خدمات کی ترقی

(باقی)

ہندوستان کی بنک کاری کا مستقبل

دورانِ جنگ میں ہندوستانی بنکوں کی حالت میں دو غیر معمولی تغیرات ہوئے ہیں۔

(۱) بنکوں کی امانتوں میں اضافہ ہوا ہے۔

(۲) لیکن بنکوں سے کم مقدار میں قرضے لئے گئے ہیں جس کی وجہ سے امانتوں اور قرضوں کا باہمی تناسب فی صد گر گیا ہے۔

امانتوں میں اضافہ کے اسباب :- امانتوں میں اضافہ کے اسباب متعدد ہیں

(۱) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حکومتِ ہند و حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر خریداریاں کی ہیں جس کی وجہ سے صناع، تاجر اور ٹھیکہ داروں کی آمدنیوں میں اضافہ ہوا ہے اور انھوں نے اپنی ان رقومات کو بنکوں میں رکھا ہے

(۲) جنگ کی وجہ سے بعض ایسے طبقوں کی آمدنیوں میں اضافہ ہو گیا ہے، جو پہلے بنکوں میں امانتیں نہیں رکھاتے تھے۔ اب یہ لوگ بھی بنکوں میں امانتیں رکھانے لگے ہیں۔

(۳) امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراطِ زر بھی ہے۔ حکومت ہند نے حکومت برطانیہ کی خریداری کے لئے روپیہ فراہم کرنے کا انتظام اپنے ذمے رکھا ہے۔ حکومت برطانیہ ان خریداروں کی ادائی اسٹرلنگ میں کرتی ہے جو ہندوستان کے نام لندن کے ذخیرہ اسٹرلنگ میں جمع کر دیے جاتے ہیں اور ان کے معاوضہ میں روپے کی اجرائی کے لئے تمسکات اسٹرلنگ ریزرو بنک کے شعبہ بنک کاری سے شعبۂ اجرائی میں منتقل کئے جاتے ہیں جن کی پشت پناہی پر روپیہ جاری کیا جاتا ہے۔ غرض کہ افراطِ زر کے اس طریقے کی وجہ سے صناع، تاجر، ٹھیکہ داروں اور سٹہ بازوں کی آمدنیوں میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں نے بنکوں میں زیادہ امانتیں رکھائی ہیں

قرضوں میں تخفیف کے اسباب:-

قرضوں کی مقدار میں حسب ذیل اسباب کی بنا پر تخفیف ہوئی ہے۔

(۱) حکومت نے خود اپنے طور پر جنگی ٹھیکوں کے لئے رقمی مدد دی۔

(۲) اشیاء کی خریداری کے لیے حکومت نے فوراً اپنے پاس سے رقم ادا کی۔

(۳) صنعتی کاروبار میں اضافہ ہوا اور حرفت کاروں کو منافع بھی اچھا ملا جس کی وجہ سے ان لوگوں نے بنکوں سے نقد رقم کم مقدار میں قرض لی

(۴) مشترک سرمایہ دار کمپنیوں سے محصول وصول کرنے میں دیر کی گئی جس کی وجہ سے انھیں رقم لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔

(۵) حکومتوں نے قیمتوں کی نگرانی کی اور فصلوں کو براہ راست کاشتکاروں سے خریدا۔

(۶) درآمدی اشیاء کے تھوک اور جلد فروشندے اپنے ذخیروں کو نہ بڑھا سکے۔ کیونکہ یہ اشیاء انھیں دستیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اس عدم دستیابی کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ حکومت نے ان کی کافی مقدار حاصل کر لی تھی اور دوسرے یہ کہ درآمد پر سختی سے نگرانی عائد کردی گئی تھی۔ چونکہ تاجر درآمدی اشیاء کے ذخیروں میں اضافہ نہیں کرسکتے تھے اس لئے ان کو زیادہ مقدار میں بنکوں سے رقومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی

غرض کہ دوران جنگ میں مختلف وجوہات کی بنا پر امانتوں میں اضافہ اور قرضوں میں تخفیف ہوئی۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوران جنگ میں زر کی مقدار میں جو توسیع کی گئی ہے، وہ اگر بعد جنگ ختم ہو جائے تو بنک کی امانتوں اور قرضوں پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے۔ پھر دوسرے یہ کہ جنگ کی وجہ سے جو صنعتی و تجارتی گرم بازاری پیدا ہوگئی ہے، جنگ کے بعد اگر یہ گرم بازاری ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟

ان دو تنقیحات کی روشنی میں ہم بنکوں کی امانتوں اور قرضوں کے مستقبل کا

مطالعہ کریں گے۔

سوال یہ ہے کہ کیا جنگ کے بعد امانتوں کی مقدار میں تخفیف ہوجائے گی؟

جنگ کے بعد امانتوں میں کمی کے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) جنگ کی وجہ سے تجارتی، صنعتی اور کاروباری سرگرمی پیدا ہوگئی ہے، بنکوں نے بھی اس سرگرمی میں حصہ لیا ہے اور قرضے دئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد بنک اپنے ان قرضوں کو واپس طلب کریں اور یہ قرضے ادا کردئے جائیں تو پھر بنک کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ —— لیکن یہ پیش قیاسی کی جاسکتی ہے کہ جنگ کے بعد بنک اپنے یہ قرضے واپس طلب نہیں کریں گے، کیونکہ ہندوستان کے پیش نظر اس وقت تعمیر و ترقی کے وسیع معاشی منصوبے ہیں اور ملک کے کاروباری ماہرین ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اس لئے اندازہ یہی ہے کہ جنگ کے بعد تعمیر و ترقی کے ان منصوبوں کو روبہ عمل لانے کے لئے بنکوں سے زیادہ خدمات طلب کی جائیں گی۔ اس لئے موجودہ قرضوں کی واپسی کا امکان کم ہے۔

(۲) حکومت نے دوران جنگ میں کافی مقدار میں قرضے حاصل کئے ہیں۔ اگر جنگ کے بعد حکومت بھاری محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کرکے ان قرضوں کو ادا کردے تو پھر بنکوں کی امانتوں میں تخفیف ہوگی کیوں کہ ان محاصل کی ادائی کے لئے محاصل ادا کنندے اپنی رقومات بنکوں سے نکالیں گے۔

اس سلسلے میں چند امور غور طلب ہیں۔ حکومت محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کرکے قرضوں کی ادائی کا اسی وقت بند و بست کرسکتی ہے جب کہ وہ جنگ کے بعد بچت والے موازنے تیار کرے۔ مگر امکانات یہ ہیں کہ حکومت تعمیر و تنظیم مابعد جنگ کی اسکیموں میں عملی طور پر حصہ لے گی، جس کے لئے اس کو کثیر مالی وسائل کی ضرورت لاحق ہوگی۔ اس لئے اس بات کا امکان نہیں ہے کہ حکومت جنگ کے بعد قرضے نہیں لے گی۔

پھر یہ چیز غور طلب ہے کہ اگر حکومت جنگی قرضوں کی ادائی کے لئے محاصل کے ذریعے رقومات حاصل کرے گی۔ تو یہ رقومات ان ہی لوگوں کو دے گی جنھوں نے جنگی قرضوں میں حصہ لیا تھا اور یہ واضح رہے کہ حکومت کے جنگی قرضوں میں حصہ لینے والوں کی اکثریت ان ہی اشخاص کی تھی جن پر حکومت بعد جنگ محاصل لگائے گی۔ گویا جس طبقے سے اس زمانے میں قرضہ لیا گیا ہے۔ اسی طبقہ سے محصول کے ذریعے رقم لے کر اس کا قرضہ بیباق کردیا جائے گا۔ اس طرح ان طبقوں کو اپنے بنک کی امانتوں میں تخفیف کرنے کی بڑی حد تک ضرورت نہ ہوگی۔

(۳) اگر جنگ کے بعد ہندوستان کا توازن تجارت مخالف ہوجائے یعنی ہندوستان کی درآمد اس کی برآمد سے بڑھ جائے تو اس کا امکان ہے کہ بنک کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ کیونکہ ہندوستانی درآمد کنندے بنکوں سے اپنی رقومات نکال کر ان درآمدات کی ادائی کریں گے۔

لیکن یہاں بھی بعض امور غور طلب ہیں۔

(۱) ہمارا توازن تجارت اسی وقت مخالف ہو سکتا ہے جب کہ نگرانی مبادلہ کو برخواست کردیا جائے۔

(۲) مخالف توازن تجارت کے باوجود اگر ہمیں اپنے فاضلات اسٹرلنگ کے آزادانہ استعمال کی اجازت دی جائے تو پھر امانتوں میں تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ مخالف توازن تجارت کی بھرپائی یا بالفاظ دیگر زائد درآمدات کی قیمتوں کی ادائی فاضلات اسٹرلنگ سے کی جائے گی ایسی صورت میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے فاضلات اسٹرلنگ کی مقدار گھٹ جائے گی۔ لیکن بنکوں کی امانتوں میں بہرحال تخفیف نہیں ہوگی۔

(۳) جنگ کے بعد ہم اپنی معاشی تعمیر و ترقی کے لئے کثیر مقدار میں اشیائے اصل درآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اگر محض اشیائے اصل کی زائد درآمد کے باعث توازن تجارت مخالف ہوجائے

تو اس کی وجہ سے امانتوں کی مقدار میں بڑی حد تک غیر معمولی تخفیف نہ ہوگی۔ کیونکہ اشیائے اصل کی درآمد کے باعث ملک کی معاشی صنعتی سرگرمی میں اضافہ ہوگا اور اس طرح بنکوں سے زیادہ مالی امداد طلب کی جائے گی، اور اس حد تک امانتوں کی تخفیف کو روکا جاسکے گا۔

(۱۶) زیادہ امکان تو اس امر کا بھی ہے کہ توازن تجارت ہمارے مخالف نہیں رہے گا ہندوستان کا توازن تجارت ہمیشہ موافق رہا ہے۔ ہندوستان سے بعض اشیاء مثلاً چمڑے، سن، تیل وغیرہ جتنی مقدار میں پہلے برآمد ہوتی تھیں، امکان یہی ہے کہ جنگ کے بعد بھی ہوتی رہیں گی، کیونکہ یہ چیزیں دوسرے ممالک سے کم داموں حاصل نہیں ہوسکتیں لہٰذا ہندوستان کا موافق توازن تجارت جنگ کے بعد بھی باقی رہے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ ہم اشیائے اصل (مشنری وغیرہ) زیادہ مقدار میں درآمد کریں گے۔ اس لئے ممکن ہو کہ توازن تجارت مخالف ہو جائے، تو اس کا امکان یوں کم ہے۔ ہم اپنے فاضلات اسٹرلنگ سے ان درآمد شدہ اشیائے اصل کی قیمت کے ادا کریں گے۔

(۱۷) بیان کیا جاچکا ہے کہ امانتوں میں اضافہ کی ایک وجہ افراط زر بھی ہے۔ اگر جنگ کے بعد اتنے وسیع پیمانے پر تعمیری کاروبار شروع نہ کئے جائیں تو زر کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا جاسکے گا اور اس لئے امانتوں میں بھی اضافہ نہ ہوگا۔

اگر جنگ کے بعد خانگی تاجروں اور صناعوں نے ریزرو بنک کو روپیہ دے کر اس کے معاوضہ میں اسٹرلنگ حاصل کرلیا تاکہ وہ اپنی درآمد کردہ اشیاء کی قیمت ادا کرسکیں تو اس طریقہ کار کی وجہ سے بنکوں کی امانتوں میں تخفیف ہوگی۔ پھر جب ریزرو بنک کو اسٹرلنگ کے معاوضہ میں روپیہ مل جائے گا تو وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ان روپیوں کو، جن کی پشت پناہی پر اسٹرلنگ نہیں ہیں، خارج کردے گا گویا تفریط زر کی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ اگر اس حکمت عملی کو اختیار کیا جائے گا تو امانتوں میں یقیناً تخفیف ہوگی۔

اس کے تدارک کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ حکومت اس حکمت عملی کو اختیار نہ کرے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بنک عوام میں کفایت شعاری کی مہم کو آگے بڑھائیں۔ ہندوستان میں اس مہم کو جاری کرنے کی سخت ضرورت ہے، کیونکہ یہاں کا طریقہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے۔

(ب) قرضے:۔ آیا جنگ کے بعد قرضوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا یا تخفیف ہوگی؟ جنگ کے بعد دشمن ممالک سے تجارت ہونے لگے گی۔ درآمد برآمد پر سے نگرانی برخواست ہو جائے گی۔ بین صوبجاتی حمل ونقل پر جو امتناع اس وقت عائد کیا گیا ہے، اٹھالیا جائے گا۔ ان حالات میں کاروباری سرگرمی بڑھے گی اور قرضوں کی طلب میں اضافہ ہوگا، لیکن جنگ کے بعد اگر سرد بازاری کا دور دورہ ہوا تو پھر قرضوں کی طلب میں اضافہ نہیں ہوگا۔ بلکہ وہی حالت رہے گی جو اب دوران جنگ میں ہے۔

قانون بنک کاری:۔

دوران جنگ قانون بنک کاری میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بنک کاری سے متعلق ایک جامع قانون کی ضرورت عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں آنجہانی سرجیمس ٹیلر سابق گورنر ریزرو بنک نے حکومت ہند کے پاس ایک مسودۂ قانون روانہ کیا تھا، اور یہ مسودہ عوام میں گشت بھی کر رہا تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے اس سلسلے میں مزید قدم نہیں اٹھایا گیا۔ البتہ اس اثنا میں قانون کارخانہ جات کی بعض دفعات میں جن کا تعلق بنک کاری سے تھا، ترمیم کی گئی۔ لیکن گذشتہ تین سال میں بہت سے نئے بنکوں کا افتتاح عمل میں آیا، اور کئی نئی شاخیں کھولی گئیں ہیں۔ جس کی وجہ سے ملک کا یہ عام مطالبہ تھا کہ بنک کاری کے متعلق ایک جامع قانون بنایا جائے۔ ریزرو بنک نے اپنے پرانے مسودے میں چند تبدیلیاں کرنے کے بعد حکومت کے پاس روانہ کیا تھا۔ اور وزیر مالیہ سر جرمی ریزمن نے اسی کو مسودۂ قانون کی شکل میں ۶ نومبر ۱۹۴۴ء کو مجلس مقننہ

میں پیش کیا ہے۔ اس مسودہ کی پہلی خواندگی ہو چکی ہے اور امید ہے کہ یہ مسودہ بہت جلد قانون بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ مستقبل میں ملک کی بنکاری کی تشکیل بڑی حد تک اسی قانون کے تحت ہوگی، اس لئے یہاں ہم اس مسودہ کے بعض دفعات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

(۱) بنک کاری کی تعریف:۔ بنک کاری کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "بنک کاری کے معنے ہیں امانتوں کو قبول کرنا اور عندالضرورت اُن کو ادا کرنا"۔ یہ تعریف بہت ہی سادہ اور جامع ہے۔ توقع ہے کہ بنک کاری کے کاروبار میں جو قانونی اور کاروباری پیچیدگیاں پیدا ہو جایا کرتی تھیں۔ اب اس تعریف کے بعد رفع ہو جائیں گی۔

(۲) اداشدہ اصل و ذخیرہ محفوظ:۔ موجودہ نافذہ قانون کی رو سے بنکوں کا اداشدہ اصل اور ذخیرہ محفوظ کم سے کم پچاس ہزار روپیہ ہونا چاہئے۔ لیکن موجودہ مسودہ میں اس کی مقدار بڑھا کر ایک لاکھ کر دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں بنک کے اصل و ذخیرہ محفوظ کا تعین اس کے محل وقوع اور آبادی کے لحاظ سے کیا گیا، مثلاً بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے بنکوں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا ہے کہ پانچ لاکھ کا اصل رکھیں۔ ان کے علاوہ دیگر شہروں (جن کی آبادی ایک لاکھ ہو) کے بنکوں کے لئے دو لاکھ روپیہ رکھنا لازمی ہے جن بنکوں کی رجسٹری برطانوی حصہ سے باہر (مثلاً دیسی ریاستوں) یا سلطنت متحدہ میں ہوئی ہو تو انھیں چاہئے کہ کم سے کم ۲۰ لاکھ روپیہ نقد ریزرو بنک میں جمع کرائیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان قواعد کا اثر بنک کاری کے مستقبل پر کیا پڑے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصل کا اتنا اعلیٰ معیار اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس امر کا لحاظ کئے بغیر کہ کون سا بنک کتنے پیمانے پر کاروبار کرتا ہے، اصل کا اعلیٰ معیار مقرر کر دینے سے کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو جاتا ہے؟

اداشدہ اصل اور ذخیرۂ محفوظ کو اس قدر بڑھا کر مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کے باعث بڑے شہروں میں بنکوں کی شاخوں کو زیادہ بہتر طریقے پر منظم کیا جا سکے گا۔ لیکن ہمارے خیال میں محض اداشدہ اصل کی مقدار بڑھا دینے سے نہ تو شاخوں کی تنظیم ہو سکتی ہے اور نہ ہی کھاتہ داروں کے مفاد کا تحفظ ہو سکتا ہے۔

پھر بڑے شہروں کے بنکوں کے لئے اصل کی جو زائد مقدار مقرر کی گئی ہے اس وجہ سے ان شہروں میں چھوٹے بنک کھلنے نہیں پائیں گے۔ عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ چھوٹے بنکوں کے باعث کاروبار میں افراتفری پھیلتی ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بنک اپنے حلقے کے لوگوں سے شخصی طور پر واقف ہونے اور ربط رکھتے ہیں اور ان کی وجہ سے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتبار کی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن اب ان قواعد کے نفاذ کی وجہ سے اُن لوگوں کو اعتبار و قرض کے سلسلے میں گوناگوں دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قانون کی ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ برطانوی ہند سے باہر جن بنکوں کی رجسٹری ہوئی ہو، وہ اگر کسی صوبے میں اپنی شاخیں کھولیں تو انھیں دو لاکھ روپے ریزرو بنک کے پاس جمع کرانے ہوں گے۔ اس دفعہ کے مضمرات یہ ہیں کہ دیسی ریاست کا بنک بمالک ہندکے کسی صوبے میں اپنی شاخ بمشکل ہی کھول سکے گا۔ بالفاظ دیگر اس دفعہ کے باعث ملک کے اندر بنک کاری کی خاطر خواہ توسیع نہ ہو سکے گی اور چھوٹے چھوٹے تاجروں اور صناعوں کو اعتباری سہولتیں فراہم نہ ہو سکیں گی۔

اس مسودۂ قانون کی ایک اہم دفعہ یہ ہے کہ ہر بنک اپنی امانتوں کا ۵ فی صد نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھے گا۔

یہ قاعدہ بھی کچھ زیادہ دل خوش کن نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ان چھوٹے چھوٹے بنکوں کے راستے میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی جو زیادہ تر زرعی کاروبار کے لئے

اعتباری سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے فنڈ کا اتنا بڑا حصہ محفوظ رکھوانے سے ان کے کاروبار میں وقت اور کمی ہوگی۔ پھر دوسرے یہ کہ زراعت کو رقمی امداد کی ضرورت موسمی ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ رقم چھوٹی مدت کے لئے دی جاتی ہے۔ جو بنک یہ کاروبار کرتے ہیں انھیں موسمی امانتوں کو حاصل کرنے کے لئے مزید تشویق و ترغیب سے کام لینا پڑتا ہے یعنی امانتیں حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ شرح سود دینی پڑتی ہے جب اس دفعہ کے تحت اُن کے کاروبار میں کمی ہوگی تو وہ اعلیٰ شرح سود کس طرح دے سکیں گے؟ بالفاظ دیگر زرعی کاروبار کے لئے جو بنک اعتبار کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں۔ اس دفعہ کے تحت اپنی امانتوں کا ایک بڑا حصہ نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھ کر وہ اپنے کاروبار میں کمی کریں گے اور جب اُن کے کاروبار میں کمی ہوگی تو وہ اعلیٰ شرح سود نہ دے سکیں گے۔ جس کے باعث انھیں زیادہ مقدار میں امانتیں حاصل نہ ہو سکیں گی اور اس طرح وہ زرعی کاروبار کے لئے اعتباری سہولتیں بہم نہ پہنچا سکیں گے۔

مناسب یہ ہے کہ امریکہ کی مانند کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ مقدار کا قانوناً تعین کر دیا جائے اور ریزرو بنک کو اختیار دیا جائے کہ ان حدود کے اندر امانتوں کا جو فیصلہ چاہے نقد یا تمسکات کی صورت میں رکھوائے۔

(۳) بنکوں کے نظار کو یا ایسی کمپنیوں کو جن میں یہ نظار حصہ دار ہوں قرضے دینے کے متعلق مختلف بندشیں عائد کی گئی ہیں۔ اس قسم کی بندشیں مناسب، موزوں اور ضروری ہیں۔

(۴) برطانوی ہند سے باہر یا سلطنت متحدہ میں رجسٹری شدہ بنکوں کے لئے ریزرو بنک سے اجازت نامہ لینا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ریزرو بنک اجازت نامہ دینے سے قبل ضروری معلومات حاصل کرے گا۔ یہ دفعہ بھی مناسب ہے۔ اس کی وجہ سے ملکی بنکوں کو ترقی کرنے کا موقع ملے گا۔

(۵) ریزرو بنک کو دوسرے بنکوں پر نگرانی و تنقیح کے وسیع اختیارات دئے گئے

ہیں ——— مگر ہمارے خیال میں یہ اختیارات ناکافی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریزرو بنک کو اس سے زیادہ اختیارات دئے جائیں تاکہ وہ ملک کے تمام بنکوں کو اپنے زیر اثر رکھ سکے۔ اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ ریزرو بنک سے اجازت حاصل کئے بغیر نہ تو کسی بنک کا افتتاح عمل میں آئے اور نہ اس کی کوئی شاخ کھلنے پائے۔ اس طرح ریزرو بنک کو نگرانی کے پورے اختیارات حاصل ہو جاتے۔ مگر اس دفعہ کے تحت مرکزی حکومت نے یہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور ریزرو بنک کے سپرد صرف تنقیح و جانچ کا کام کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے نظام بنک کاری کی موثر تنظیم نہیں ہو سکے گی۔ ضرورت ہے ریزرو بنک کو نگرانی وغیرہ کے سلسلے میں راست طور پر ذمے دار قرار دیا جائے۔

(۵) دیسی بنک کاروں کے الحاق کا مسئلہ:۔

پندرہ سال قبل بنک کاری کی تحقیقاتی کمیٹی نے اس مسئلے پر زور دیا تھا اور اپنی سفارشات پیش کی تھیں۔ لیکن اس وقت سے اب تک یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ ہمارے نظام بنک کاری کو زیادہ کارگزار وسیع اور مؤثر بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریزرو بنک دیسی بنک کاروں سے تعلق پیدا کرے اور ان کو اپنے زیر اثر لائے تاوقتیکہ ان بنک کاروں کو نظام بنک کاری کے سلسلے کی ایک مضبوط کڑی نہیں بنایا جائے گا۔ ہندوستانی بنکوں کا مستقبل درخشاں نہ ہوگا۔

محمد احمد خاں ایم۔ اے علیگ
ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)

دلّی کی لاہوری برادری

(گزشتہ سے پیوستہ)

سادہ کاری کی سب سے خاص منزل اس کا مطلب یہ ہے کہ سادہ کاری کے تمام درجوں میں کھلائی اور جڑائی مرکزی کام ہے۔ اس لئے صرف اسی ایک حصے کا کاریگر سادہ کار ہے۔ لیکن حقیقی بات یہ ہے کہ کاریگر خواہ وہ زیور کے کسی حصے کا ماہر خصوصی ہو، سادہ کار ہے۔ البتہ ایک درجے میں مثلاً میناکاری، چھلائی وغیرہ میں وہ امتیاز رکھتا ہے۔

راقم نے تیاری کے درجوں میں سے بہت سی نازک تفصیلات قصداً چھوڑ دی ہیں کیونکہ یہ سرسری بیان سادہ کاری کی صنعت کا ایک تصور دینے کے لئے ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ سادہ کاری جیسی پیچیدہ اور اہم صنعت کے تفصیلی ذکر کے لئے ایک بڑی کتاب کی ضرورت ہے۔

سادہ کاری میں دوسروں سے مقابلہ سادہ کاری کی صنعت کے میدان میں لاہوری کاریگر ایک مدت اکیلے رہے اور کوئی ان کے مقابلے میں نہیں آیا۔ سادہ کاری بجائے خود مشکل صنعت ہے، کتابی رہبری سے سیکھی نہیں جاسکتی۔ طویل عملی مشق اس کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لاہوری برادری کے کاریگر کو اس کام کی مہارت نسلاً بعد نسل ورثے میں ملتی ہے۔ فطرت اس کے ہاتھ میں وہ لچک اور اس کی نظر میں وہ تنقیدی نظر خود عطا کرتی ہے جو اس کام کے لئے ضروری ہے۔ اس پر بھی بہت بچپن سے وہ استاد کے پاس بٹھادیا جاتا ہے تب کہیں دس بارہ برس میں جاکر وہ کارآموزی کا نصاب پورا کرتا ہے۔ اس پر اضافہ کیجئے۔ مشرقی استادِ فن کی یہ روایتی وضع داری کہ وہ برادری کے شاگرد کو بھی کام

کے سکھنے سکھانے میں بخل کرتا ہے اس لئے دوسری برادری کے آدمی کو تو کبھی ہمت ہی نہیں پڑتی کہ وہ سادہ کاری سیکھنے کی جرأت کرتا۔ لیکن وقت نے جو سب سے بڑا مصلح ہے ایک ایسی دنیا سامنے کر دی جس میں زندگی کا سارا نظام بدلا ہوا تھا۔ لاہوریوں کے علاوہ دوسروں نے یہ صنعت کسی قدر سیکھی۔ لیکن وہ اتنے کم تھے کہ مقابلہ نہ کر سکے بلکہ لاہوریوں میں رل مل گئے۔

ملکی مقابلہ مرہٹہ کاری گر اور زیادہ تر بنگالی کاری گروں نے البتہ مقابلہ کیا۔ لیکن مجموعی حیثیت سے لاہوری برادری کے صناع کو بازار میں ترجیح دی گئی۔

غیر ملکی مقابلہ ملکی مقابلے سے نبٹے تو غیر ملکی مقابلہ پیش آیا جو زیادہ سخت تھا۔ زیکوسلواکیہ کی نقلی اور اصلی زیورات کی دستکاری نے جس کی بنیاد مشین اور سائنس کی ترقی نے مضبوط کی تھی، لاہوری برادری کے دستکار کو بہت پریشان کیا۔ نقلی زیورات Imitation jewellery کی عام مقبولیت نے لاہوری برادری کے معمولی کاریگر کو بے کار کر دیا۔ اور اسنے یورپ کی اصلی جوہری کی سرپرستی کو اپنے تئیں نشان بنایا تھا۔ اس نے لاہوریوں کا اوسط اور اعلیٰ دستکار کم وزن ہو گیا۔ مشینی طریقے کا استعمال تعلیم اور جرأت کی کمی سے لاہوری کر نہیں سکتے تھے۔ بہت معمولی مشینی استعمال بدرجہ مجبوری انھوں نے شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ پھر بھی وہ ولایتی مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن فنا ہونے سے بچ گئے۔

سادہ کاری میں بڑے پیمانے پر تیاری بڑے پیمانے پر تیاری (mass production) زیادہ تر چاندی اور نقلی دھاتوں کے زیور میں ممکن ہے۔ لیکن لاہوری کاریگر جو صنعتی ضرورت سے تقسیم عمل کے قدرتی طور پر پابند ہو گئے ہیں تجارتی حیثیت سے تقسیم کار کے اصول سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ جہاں روپے اور تعلیم کی کمی ہے وہاں ان کو صحیح مشورہ دینے والا بھی کوئی نہیں۔ ورنہ برادری اتنا سرمایہ ضرور جمع کر سکتی ہے جو ایک ایسے صنعتی مرکز کے کھلنے کے لئے کافی ہے۔ جس سے لاہوریوں کا عام سادہ کار طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بہت ترقی کر سکتا ہے۔ اب جنگ کی وجہ سے باہر کا مال بند ہوا اور دیسی مال کی مانگ بڑھی تو عام

سادہ کار طبقہ ذرا ہوشیار ہوا، لیکن کوئی منظم کوشش نظر نہیں آئی۔ عجیب افراتفری ہے۔ ہر کاری گر دوسرے چند کاریگروں کو ملا کر کسی قدر تیزی کے ساتھ مال تیار کرتا ہے اور سمجھتا ہی بازار میں اس سے زیادہ مال کی کھپت نہیں۔ اور چاہتا ہی کہ جتنا نفع جلد سے جلد اُسے مل جائے غنیمت ہے۔

سونے کے زیورات بڑے پیمانے پر بنانا مشکل ہیں

اصل جیولری یعنی سونے کا زیور، بڑے پیمانے پر بنانا یہاں محال نظر آتا ہی۔ حالانکہ سونے کے زیور سازی کے اتنے ہی بڑے کارخانے انگلستان میں ہیں جتنے بڑے صابن یا تیل کے کارخانے ہیں اور جہاں زیور کی تیاری کا ہر درجہ مشین سے پورا ہوتا ہی۔ لڑائی کی وجہ سے سونے کا ولایتی مال بازار میں کم ہی۔ اس لئے اعلیٰ درجے کا لاہوری صناع اس وقت تیزی سے کام کر رہا ہی۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ لاہوری کاریگر کے ہاتھ کا بنا ہوا سونے کا پرزہ ولایت کے سونے کے پرزے سے زیادہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا دنیا میں قدروں کے سانچے بدل گئے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے کمالِ صنعت کی بقا کے لئے جہاں لاہوری استاد کے فن کا وجود ضروری ہی۔ لاہوریوں کی قومی بقا کے لئے صنعت کی تجارتی ترقی کی تدابیر بھی اتنی ہی ضروری ہیں۔ مستقبل کا مسئلہ لاہوریوں کے سوچنے کی چیز ہے۔ ایک دم سے عظیم الشان کارخانے قائم کرنا نہ ممکن ہی نہ مفید۔ لیکن مشین کی مناسب مدد سے انھیں اپنی عام سادہ کاری کی رفتار تیز کرنی ہوگی تاکہ جنگ کے بعد کے بازار میں اُن کا مال اتنا تو کھپ سکے جو اُن کے مزدوروں کی زندگی کی حفاظت کر سکے۔

لاہوری برادری میں پیشے کی تبدیلی

لاہوری برادری میں بعض لوگ اپنا پیشہ تبدیل بھی کر لیتے ہیں۔ مہر کی مہارت بیٹے کو باپ سے ورثے میں ملتی ہے۔ لیکن کہیں کہیں فطری طور پر فرق یا اختلاف واقع ہوتا ہی۔ مثلاً سادہ کار کے ایک لڑکے کو اپنے باپ کے کام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوئی وہ ایک لوہے کے کام کے کارخانے میں اکثر جا بیٹھتا، اور بڑے شوق سے کام میں شرکت

ہوجاتا۔ باپ کے ڈانٹنے پر اُس نے صاف کہہ دیا کہ میں سادہ کاری نہیں سیکھنا چاہتا۔ مجھے تو لوہے کا کام اچھا معلوم ہوتا ہی۔ آخر اُسے ایک اچھے مستری کے پاس کام سیکھنے کے لئے بٹھلا دیا گیا۔ ایک لڑکے نے اپنے باپ کا لکڑی کی خراد کا کام پسند نہیں کیا اور سادہ کاری سیکھی کہیں پیشے کی تبدیلی غلط وجہ سے ہوتی ہی۔ مثلاً ایک بہت باکمال مصور کے لڑکوں نے دیکھا کہ باپ کی مذہبی حیثیت برادری میں مشتبہ ہی۔ یہاں تک کہ مسجد میں اس کا چندہ اس لئے قبول نہیں کیا گیا کہ وہ تصویر بنا کر کمایا گیا ہی۔ اس لئے بڑے لڑکے نے سادہ کاری سیکھی۔ اور چھوٹے نے لکڑی کی خراد کا کام سیکھا۔ دونوں اپنے کام کے معمولی کاری گر ثابت ہوئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مصوری میں باکمال ہوتے یا معمولی درجہ حاصل کرتے۔ واضح رہے کہ پیشوں کی یہ تبدیلی صرف برادری کے رائج حرفوں میں عمل میں آتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ پیشہ تبدیل کرنے میں کسی ایسے حرفے کا انتخاب کیا جائے جو برادری میں رائج نہ ہو۔ مثلاً یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کساد بازاری سے تنگ آکر کوئی لاہوری کاری گر کوئی عامیانہ صنعت کا کاروبار کرے یا ادنیٰ حرفتی کام کرنے لگے۔ جیسے جُوتی سازی قلعی گری وغیرہ

بالکل نئے پیشے زندگی کے انقلاب نے اب نئی نئی صنعتیں پیدا کیں۔ اس طرح کہ ہر صنعت ہزار دو ہزار صنعتیں اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ بے شک ان نئے کاموں میں سے چند کاموں پر لاہوریوں کی نظر انتخاب گئی۔ مگر انتخاب میں وہی فن کا نقطۂ نظر سامنے رہا۔ چنانچہ لوہے کا مشینی کام اور بجلی کا کام جو مہندس سی ذہانت چاہتا ہے اور گھڑی سازی کا کام جس میں سادہ کار سا نہ دماغ اور نظر درکار ہی۔ لاہوریوں کے کچھ افراد نے اختیار کیا، اور ان میں بھی امتیازی درجہ حاصل کیا۔

علمی پیشے علمی پیشوں کی مثالیں بھی مل جائیں گی۔ یعنی لاہوری برادری میں ڈاکٹر، وکیل طبیب، مدرس وغیرہ بھی کچھ لوگ نکل آئیں گے۔ سرکاری دفتر کے ملازم بھی کچھ نہ کچھ ہیں صدر بازار کے تاجروں کی صف میں دو ایک ممتاز سوداگر لاہوری برادری کے بھی ملیں گے

قدیم علمی روایات کی جھلک بھی کہیں نظر آئے گی اور لاہوریوں میں ایک آدھا عالم دین، وکیل، مدرس اور شاعر بھی مل سکے گا لیکن آخر کار لاہوری برادری فی الجملہ ایک صناع برادری ہے، اور صنعت کا کمال اس کے امتیاز کے لئے بس کرتا ہے۔

لاہوری برادری اور ساہوکار

جیساکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے، لاہوری برادری صنعت کی صرف مزدوری لیتی ہے، اس کا تجارتی فائدہ ہندو ساہوکار اور جوہری اٹھاتے ہیں ہندو دوکاندار کی بنیاد صرف لاہوری کاری گر ہے۔ کاریگر ہندو بیوپاری کی مٹھی میں رہتا ہے۔ مزدوری اسے کم ملتی ہے۔ خرچ کی زیادتی اور آمدنی کی کمی سے وہ قرض لینے پر مجبور ہے اور یہ دیانت کبھی سوچنے بھی نہیں دیتا کہ بس کی مزدوری اس کی خوش حالی کے لئے کافی ہوسکتی ہے۔ جب حال یہ ہے تو سونا، در جواہر غریب سادہ کار کہاں سے لائے گا جس سے وہ مال تیار کرے اور آزادی سے کسی دوکاندار کو دے سکے۔ وہ عموماً ایک ہی سیٹھ کا پابند ہوتا ہے۔ بڑے درجے کے سادہ کار جو نسبتاً آسودہ حال ہوتے ہیں، اپنا سونا لگا کر مال تیار کرسکتے ہیں۔ لیکن ہندو سیٹھ کے پرانے تعلق، اخلاقی دباؤ انھیں وضع داری کے ساتھ اسی کا پابند رکھتا ہے۔ یہ بڑے سادہ کار کمالِ فن کے استغنا سے کبھی غور بھی نہیں کرتے کہ زیورات کی اجرت کے علاوہ اس کا تجارتی منافع بھی کوئی چیز ہے۔

لاہوری اور زیورات کی تجارت

کسی صاحب ثروت سادہ کار نے اس طرف توجہ بھی کی تو وہ ہندو بیوپاری کا کیا مقابلہ کرسکتا ہے۔ جس کا قبضہ بازار پر سینکڑوں برس سے ہے۔ اور وہ تعداد میں بھی لاہوری تاجر زیورات سے ہزار گنا ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تجارت اور صنعت الگ الگ ذہن اور استعداد چاہتی ہیں۔ لاہوری صناع سے تجارت کی توقع ظلم ہوگا۔ لیکن یہ توقع بے جا نہیں ہے کہ لاہوری برادری کے صاحب ثروت لوگ جو سادہ کاری نہ کرتے ہوں، اپنے کام کی تجارت پر دھیان دیں۔ انھیں اپنی قوم کی حمایت مفت میں حاصل ہے۔ لاہوری کاریگر، لاہوری بیوپاری کو اپنا مال کیوں نہ دے گا۔ اگر اس کو وہی آسانیاں

ملیں جو ہندو سیٹھوں سے ملتی ہیں؟ لاہوری برادری کے لوگ اپنے مشترکہ سرمایہ سے زیورات کی تجارت کا ایک مرکز بنا سکیں۔ اور زیادہ سے زیادہ لاہوری کاریگر اس مرکز سے متعلق ہو جائیں تو تجارتی منافع دوسروں کے پاس نہ جائے۔ کاریگر کی شرح اُجرت بھی بڑھ جائے اور قومی خوشحالی میں ترقی ہو۔ لاہوری قوم کو ایسی منظم تجارتی کوشش سے ہندو بازار کی مخالفت کے جو اندیشے ہیں اُن سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن اگر اچھی طرح زندہ رہنا ہے تو ان سب اندیشوں اور رکاوٹوں کو جلد سے جلد دور کرنا ہی ہوگا۔ صنعت کے محض اجرتی منافع سے لاہوری قوم کبھی خوشحال قوم نہیں بن سکتی؛ حالانکہ اس عجیب بڑی صنعت کی مالک قوم کا قدرتی حق یہ ہے کہ وہ اچھی طرح زندگی گذارے۔

لاہوریوں کی توجہ زیورات کی تجارت کی طرف

ہمیں خوشی ہے کہ لاہوری برادری کی طرف سے اس میدان میں کچھ قدم اُٹھائے گئے ہیں۔ ہندوؤں کی بہت سی کروڑپتی فرموں کے بیچ میں دو ایک دوکانیں زیورات کی تجارت کی ایسی نظر آتی ہیں جن کے مالک لاہوری ہیں۔ کچھ کاریگروں نے انفرادی کوشش بھی شروع کر رکھی ہے۔ وہ مال بنا کر بیوپاری کو دیتے ہیں۔ مگر کبھی طور پر براہِ راست گاہک تک بھی مال پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے گاہک کو کچھ بچت ہوتی ہے اور کاریگر کو وہ نفع بچ رہتا ہے جو درمیانی آدمی لے لیتا تھا۔ یہ تاجر سادہ کار (Manufacturing Jewellers) نیک فالی کی علامت ہے۔ دیانت داری سے کوششیں جاری رہیں تو گاہک اور کاریگر کے بیچ میں وہ روایتی مشکل جس کا نام "بازار پر ہندو قبضہ" ہے۔ رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔ ہندو جوہری اگر ایک لاکھ روپیہ ماہوار کما سکے گا تو لاہوری تاجرِ زیور یا تاجرِ سادہ کار ایک ہزار تو کما سکے گا۔

ختم کلام

اب ہم لاہوری برادری پر ایک آخری نگاہ ڈالتے ہیں۔ جیسے ایک سیاح

شاہی عمارتوں کے کھنڈرات کو دیکھ کر مایوس ہو رہا ہو۔ اور چلتے چلتے مڑ کر ایک بار پھر ان کھنڈرات کی طرف دیکھے

لاہوریوں کا سب سے اہم مسئلہ تعلیم

اس آخری نگاہ کے ساتھ ہم لاہوری برادری کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہتے ہیں۔ وہ بات اس برادری کی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ لاہوری برادری کی معلومات کی فراہمی کے سلسلے میں ہم بعض لاہوری بزرگوں اور فرقے دار لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اکثر کو پایا کہ وہ اپنی برادری کی طرف سے مایوس ہیں، اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ لاہوری برادری کی خرابیوں کا علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً چودھری حاجی حبیب احمد صاحب سادہ کار نے فرمایا —— "لاہوری قوم پر آپ کوئی مضمون لکھنا چاہتے ہیں؟ تو بس لکھ دیجئے گا۔ یہ دہلی کی ایک قوم ہے جو صبح سے شام تک سونے چاندی سے کھیلتی ہے۔ لیکن سونے سے جاگنا نہیں چاہتی۔ یہ قوم رشک، حسد اور ایک دوسرے کی برائی میں مبتلا ہے اور اب شاید موت کی نیند سونا چاہتی ہے ——"

بے شک وہ برادری جو زبردست تاریخی روایات کی حامل ہو، اب پستی کی حالت میں ہے، یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ حاجی صاحب کی اس بات میں مزید طنز پوشیدہ ہے لیکن سچ سچ لاہوری بہ حیثیت مجموعی زبوں حال ہیں۔ ان میں وہ سب آثار پائے جاتے ہیں جو ایک فانچر گروہ میں ہوتے ہیں۔ وہی جمود اور سب سے بے خبری، وہی بزرگوں کے کارناموں پر فخر اور خود کچھ نہ ہونا، وہی صرف ذاتی فائدے کی ہوس اور دوسرے کے نقصان سے بے پروائی۔ وہی عزیزوں سے بے گانگی کا سلوک، وہی ہزاروں گندریوں میں ایک کے گندے پن … اور بہت سی جھونپڑیوں کے بیچ میں ایک اونچی شاندار کوٹھی۔ لیکن لاہوری قوم کی ہر خرابی کا سبب تعلیم سے بے گانگی ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ لاہوریوں کو تعلیم کا شوق نہیں یا وہ تعلیم کے فائدوں سے بے خبر ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم کے بارے میں صحیح رہنمائی کے نہ ہونے سے وہ تعلیم سے خوف زدہ ہیں۔ وہ ہر قدم پر تعلیم کی ضرورت محسوس

کرتے ہیں۔ لیکن اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے نتائج غلط دیکھتے ہیں اس لئے وہ تعلیم سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔

لاہوریوں کی تعلیمی دقتیں

لڑکا میٹرک کرکے کام سیکھنے کی عمر کھو دیتا ہے سیکھنے کی گنجائش بھی ہو تو وہ کام کو حقیر جانتا ہے۔ وہ ملازمت کو پسند کرتا ہے لیکن ظاہر ہے یہ تعلیم کا نہیں، نظام تعلیم کا قصور ہے۔ لاہوریوں کی بڑی تعداد اس لئے بھی بچوں کو تعلیم سے محروم رکھتی ہے کہ اس سے دہرا مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایک تعلیم کا خرچ، دوسرے اس آمدنی کا نقصان جو بچہ کام سیکھنے کے دوران میں ماں باپ کو لاکر دیتا ہے۔ خرچ کی یہ تکلیف غریب طبقے کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ لیکن بات تو ذمے دار جاننے والوں کے سوچنے کی ہے کہ وہ تعلیم کا کوئی ایسا ڈھنگ بتائیں جس میں اس صنعت پیشہ قوم کی ضرورتوں کی رعایت رکھی گئی ہو، جس سے لڑکا پڑھ لکھ بھی جائے اور قومی صنعت کو فروغ بھی حاصل ہو اور اس طریقے میں غریب بچوں کے لئے بھی کوئی تدبیر کی گئی ہو۔ یہ سب باتیں ان کو سوچنے دیجیے، جن کا یہ کام ہے۔ لیکن لاہوریوں کے ذمے یہ فرض رہ جاتا ہے کہ وہ برادری کو تعلیم کے لئے تیار کریں، جو نہ جانتے ہوں انھیں تعلیم کا فائدہ سمجھائیں۔ جواب تو سوال ہی سے ملے گا، لاہوریوں میں کچھ صاحب ہمت نوجوان اٹھیں اور جاننے والوں سے تعلیم کی مشکل کا حل پوچھیں اور پھر اس حل کے مطابق کام کریں۔ یہ کام برادری کے کچھ ایثار پیشہ خادم بھی مانگتا ہے۔ کٹھن کام ہے۔ زندگیاں اس میں ختم ہو جاتی ہیں تب خدمت کہیں پھل لاتی ہے چند زندگیوں کی قربانی ہزاروں زندگیوں پر بہار لے آئے گی۔ قوم پڑھ لکھ جائے تو دوسری سب کمزوریاں اپنے آپ دور ہو جائیں۔ قوم جب تک پڑھی لکھی نہ ہو ساری اصلاحی کوششیں اور ترقی کی تجویزوں کا وعظ بے کار ہے۔ زمین جب تک جھاڑیوں اور پتھروں سے صاف کرکے پانی سے نرم نہ کر لی جائے اس میں بیج بونا بیج کو ضائع کرنا ہے۔

لاہوری قوم کی اصلاحی کوششیں کیوں بے کار گئیں

لاہوری قوم کو جگانے اور ترقی پر مائل کرنے کی اس سے پہلے کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہو چکی ہیں۔ لیکن وہ سب بے کار گئیں اور بیکار رہے جب تک قوم پڑھ لکھ نہ جائے وہ کوئی بات سن سکتی ہے نہ سمجھ سکتی ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر ہم حوالے کے لئے اس جگہ ترقی و اصلاح کی گذشتہ کوششوں کا ذکر کر دیں

اصلاحی کوششوں کا ریکارڈ

۱۹۱۶ء۔ انجمن قوم لاہوریان قائم ہوئی۔ انجمن کے صدر نیاز الدین صاحب تھے۔ قواعد انجمن حافظ عبدالستار صاحب نے چھاپ کر شائع کئے۔ اس میں اغراض و مقاصد "ترقی ہر قسم" بیان کئے گئے ہیں۔ اور ترقی کے لئے "تدبیر صرف" جلسے اور تقریر اور مضامین" قرار پائے

۱۹۲۱ء۔ نثار احمد صاحب نے دعوتِ قوم کے نام سے ایک مضمون شائع کیا۔ اس میں قوم سے دردناک اپیل کی کہ تم لوگ خواب غفلت میں ہو۔ اور قومی ترقی کے لئے ایک ماہوار رسالہ شائع کرنے کی تجویز پر قوم لاہوریاں سے رائے مانگی۔ شاید قوم نے تائید نہیں کی، کیونکہ رسالہ نہیں نکلا۔ نثار احمد صاحب اب بمبئی میں حکیم اکرامی کے لقب سے طبیب ہیں۔ اور پر جوش کانگریسی کارکن ہیں۔ افسوس ہے وہ اپنی برادری کو تنگ ملنے کو خدمت کے لئے ناکافی سمجھ کر کانگریس کے وسیع تر سمندر میں نکل گئے۔

۱۹۲۶ء۔ انجمن خدام قوم لاہوریاں قائم ہوئی۔ اسے ۱۹۱۶ء کی انجمن قوم لاہوریاں کا نیا چولا سمجھئے۔ اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب خلف نیاز الدین صاحب تھے انھوں نے بھی اس نئی انجمن کے قواعد و ضوابط چھاپ کر شائع کر دئے جو ۱۹۱۶ء والی انجمن کے نسخہ سے مشابہ تھے۔

۱۹۲۶ء۔ قوم لاہوریاں کا پہلا عام جلسہ ثناء اللہ خاں صاحب کے کارخانے واقع پہاڑ گنج میں ہوا۔ اس کا ایجنڈا ہمارے سامنے ہے جس میں ساری کارروائی شادی بیاہ اور غمی کی خرچیلی رسموں کو روکنے کی تجویزوں پر مشتمل ہے۔

۱۹۳۲ء ۔ ۱۹۲۶ء میں جو انجمن نئے سرے سے قائم ہوئی تھی اس کے سکریٹری رضی الدین احمد صاحب نے ایک سہ ماہی رسالہ خادم قوم نکالا ــ دے کر تحریر و تقریر یک ایک ٹیہ انجمن نے اصلاح و ترقی قوم کے لئے سوچی تھی۔ اس تدبیر کو بروئے کار لانے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا جس کے صرف ۳ نمبر ہماری معلومات کے مطابق شکل کے (و شائع شدہ) کی اشاعت میں کچھ کارآمد مضامین ملتے ہیں۔ اس کے ایک ... میں لاہوریوں کے صنعتی زوال کا سبب تعلیمات قرآنی کے چھوڑ دینے کو ٹھہرایا گیا ہے۔ ایک مضمون میں یہ دلچسپ بحث ہے کہ سادہ کار بے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے کس طرح سہار بیوپاری سے دھوکا کھاتا ہے۔

ایک مضمون میں تعلیمی مشورہ یوں دیا گیا ہے کہ لڑکا پہلے میٹرک پاس کرے۔ پھر سادہ کاری سیکھے۔ انجمن کی سالانہ رپورٹ کا خلاصہ سکریٹری کی طرف سے اسی نمبر میں شائع ہوا ہے جس کا ایک قابل حوالہ نوٹ یہ ہے کہ ایک تجویز منظور کی گئی کہ قوم لاہوریاں کی تاریخ مرتب کی جائے اور منتظمہ کمیٹی اس تاریخ کے لئے مواد فراہم کرے۔

[illegible]ء۔ پہاڑ گنج کے چند حوصلہ مند روشن خیال نوجوانوں نے ایک ہنگامی جلسہ کرکے قومی اصلاح و ترقی کی تعمیری تجاویز مرتب کرنی چاہئیں
افسوس ہے بعض وجوہ سے یہ تجاویز بن ہی نہ سکیں۔

مندرجہ بالا سب کارروائیاں لاہوریوں کی اضطراری حرکات ہیں اور کسی اندرونی خلش کا پتہ دیتی ہیں۔ دلوں میں کام کی اُمنگ، اور ترقی کی تڑپ ضرور موجود ہے۔ لیکن بیماری

کی تشخیص میں اب تک چوک ہوتی رہی، اس لئے تجویزیں بھی وعظ اور ادبی تقریروں پر مشتمل رہیں —— ہم پھر دہراتے ہیں۔

بیماری کا سبب صحیح تعلیم کا نہ ہونا ہے۔ اس کا انتظام کیجیے اور یقین کیجیے کہ لاہوری برادری اپنی پچھلی اونچی سطح پر پہنچ جائے گی۔

تعلیم کے سردست دو طرح کے انتظام ہوں گے ایک بڑی عمر کے بے پڑھے یا کم پڑھے لکھوں کے لئے انتظام۔ دوسرے برادری کے بچوں کے لئے خاص قسم کے اسکول یہ اسکول تعلیم کا کام کرنے والے ماہروں کے بتائے ہوئے طریقوں اور نصاب کے مطابق ہوں گے۔

ہم لاہوریوں کی تعلیم کے انتظام کے لئے، کہ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، پر امید نگاہوں سے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یقین ہے کہ لاہوری نوجوان اب اپنی قوم کے لئے اٹھیں گے —— خدا کرے عزم اور استقلال ان نوجوانوں کا رہبر ہو۔

(باقی)

رجز

رن کو شمشان بنا دوں میں بہ فیضِ شمشیر		زد میں آئے تو نہ چھوڑے کبھی میرا خنجر
کس کی طاقت کہ مرے پاؤں میں ڈالے زنجیر		میرے ہر فعل سے خود بنتی ہے میری تقدیر
میں بہادر ہوں، رضامند ہے یزداں مجھ سے

میری فطرت کو نہیں راس غلامی کی ہوا		نام آزادی پہ ہوں روزِ ازل ہی سے فدا
سطوتِ ملکِ سلیماں سے ڈرے میری بلا		مور بے مایہ سہی ہمتیں میری ہیں سوا
میں بہادر ہوں، درِ زنداں ہے لرزاں مجھ سے

میرے اشعار، مرا زمزمہ، مرا ساز جواں		آتشِ قلب سے دہکی ہوئی آواز جواں
میرے رہوار جواں، سال کے انداز جواں		میری تلوار، مری مونس و دمساز جواں
میں بہادر ہوں، جوانی ہے پرافشاں مجھ سے

میں وطن دوست ہوں لیکن نہیں انساں دشمن		میرا دل شیشۂ نازک، مرا سراپا آہن
امن عالم کا میں بیتا سپرِ ظلم شکن		عدل و انصاف کا باقی ہے مرے دم سے چلن
میں بہادر ہوں، یہ دنیا ہے گلستاں مجھ سے

میرے مذہب میں ہے عصمت کی حفاظت داخل		میرے مسلک میں ہے طفلی سے محبت داخل
میرے مشرب میں ہے پیری کی حفاظت داخل		ہے مرے کیش میں انسانی اخوت داخل
میں بہادر ہوں، عزازیل ہے نالاں مجھ سے

زیست کو رزم میں ہر بار سجایا میں نے		موت کو رزم میں ہر بار ہرایا میں نے
زیست کے شوق کو ہر دل میں جگایا میں نے		موت کے خوف کو ہر دل سے مٹایا میں نے
میں بہادر ہوں، اجل خود ہے گریزاں مجھ سے

سلیمان اریب

حالاتِ حاضرہ

شروع مئی میں یورپ کی جنگ ختم ہوئی اور اب آخر میں متحدہ قوموں کی کانفرنس نے اپنا کام سرانجام کیا۔ یہ کارپردازی بہت قابلِ تعریف ہے، خاص طور پر ان قوموں کے لئے جن کے متعلق جنگ سے پہلے تک مشہور تھا کہ وہ کسی معاملے کو طے کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔ کانفرنس کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ روس نے مختلف فیہ مسائل سے بحث بہت کم کی۔ اور دوسرا سبب یہ تھا کہ اس نے ان قوموں کی سرداری تسلیم کر لی جن کی قوت اور مستعدی کی بدولت اٹلی اور پھر جرمنی کو شکست دی جا سکی یا جنھوں نے جنگ میں بہت نقصان اٹھایا تھا۔ چین کو سرداری کا مرتبہ اس استقلال کے حصہ میں ملا ہے جس سے اس نے جاپان کا مقابلہ کیا۔ فرانس کو یہ مرتبہ اصولاً تو نہیں ملنا چاہیے تھا، لیکن مصلحت اسی میں تھی کہ اس کی عزت افزائی کی جائے۔ متحدہ قوموں نے اس بات کو بغیر بحث کے مان لیا کہ متحدہ ریاستیں برطانیہ، روس، فرانس اور چین سیاست کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ غور اس بات پر کیا گیا کہ ان کے ساتھ کتنی اور ریاستوں کو شریک کیا جائے اور انھیں کتنا اختیار دیا جائے۔ پولینڈ کے مسئلے پر زیادہ اختلاف ہونے لگا تو کانفرنس نے اصرار نہیں کیا کہ اسی کا فیصلہ صحیح مانا جائے، بلکہ جھگڑا چکانے کا کام متحدہ ریاستوں، برطانیہ اور روس کے سپرد کر دیا۔ کانفرنس پولینڈ یا اس قسم کے اور معاملات میں الجھ جاتی تو اس کا اصل کام رہ جاتا، اور اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قومیں ایک بنیادی حق سے دست بردار ہو گئیں مگر اس دست برداری کی پشت پر بڑی مصلحتیں تھیں جن کی اہمیت اب ظاہر ہو رہی ہے۔

سین فرانسسکو میں نئے بین الاقوامی نظام کا دستور مرتب ہو گیا ہے۔ یہ نظام ایک حفاظتی کاؤنسل، ایک معاشی و معاشرتی کمیٹی، ایک مجلس تولیت۔ ایک بین اقوامی عدالت

اور ایک دفتر پر مشتمل ہوگا۔ مجلس عامہ میں متحدہ قوموں میں سے ہر ایک کو ایک نشست حاصل ہوگی۔ لیکن چونکہ مجلس کا مقصد قوموں کے اتحاد عمل کو فروغ دینا ہوگا، اس لئے ہر قوم مجلس میں پانچ نمائندے تک بھیج سکے گی۔ اس طرح مجلس کی بحثوں میں شریک ہونے والوں کی تعداد ڈھائی سو تک ہو سکتی ہے۔ مجلس کا طریق کار ویسا ہی ہوگا جیسا کہ قانون ساز جماعتوں کا ہوتا ہے۔ اس کا مقررہ مدت تک سالانہ اجلاس ہوگا اور وہ تمام مسائل پر بحث کر سکے گی، اور رائے دے سکے گی سوائے اُن معاملات کے جن پر کہ حفاظتی کاؤنسل ان حقوق اور اختیارات کے مطابق جو اُسے دستور میں عطا کئے گئے ہیں غور کر رہی ہو۔ بین اقوامی اتحاد عمل کا ذریعہ اور نمونہ یہی مجلس ہوگی، اور سوائے اِن جھگڑوں کے جس کا نتیجہ جنگ ہو سکتی ہے اور ان معاملات کے کہ جن میں حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین میں سے کسی ایک کی بڑی غرض یا مصلحت مانع ہو، وہ ہر مسئلے پر بحث کر سکے گی اور رائے دے سکے گی۔ حفاظتی کاؤنسل کے اصل منصب بین اقوامی امن قائم رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے کوئی خطرہ پیدا ہو تو وہ اس کا تدارک کرے گی۔ جھگڑے چکائے گی اور جنگ چھڑنے کا اندیشہ ہو تو ہر قوم سے مقررہ امداد طلب کرے گی۔ اس کی حیثیت ایک کابینہ کی سی نہ ہوگی جو قانون ساز مجلس کی رہنمائی کرتی ہے، تجاویز پیش کرتی ہے اور مجلس سے انھیں منظور کراتی ہے۔ اس قیام میں بیشتر یہی مدنظر ہے کہ اس کے مستقل اراکین، جو اپنی قوت کے مناسب حقوق رکھتے ہیں، اپنے حقوق کو محفوظ رکھ سکیں، قوت کا موجودہ توازن نہ بدلنے پائے اور سیاست میں کوئی ایسا انقلاب نہ ہونے پائے جو دنیا کو پھر جنگ میں مبتلا کر دے۔ حفاظتی کاؤنسل کے مستقل اراکین بے غرض ہونے کا دعوے نہیں کرتے، ان کی امن پسندی کے ساتھ جو شرطیں لگی ہوئی ہیں ان کا اندازہ اس رویتے سے کیا جا سکتا ہے جو حال میں فرانس نے شام اور لبنان میں اختیار کیا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ فرانس کے سوا باقی سب مطمئن ہیں، یعنی ان کا فائدہ اس میں ہے کہ امن قائم رہے اور انھیں بے فکری سے

اپنے تعمیری کاموں میں لگ جانے کا موقع ملے۔ فرانس کی بے اطمینانی کا سبب یہ ہے کہ اُسے اپنے دوستوں سے اندیشہ ہو کہ وہ اصولی بحث اور اخلاقی تلقین کرتے کرتے ہمیں کا حق مار لیں گے اور ان مقبوضات کو آزاد کرا دیں گے جنھیں قابو میں رکھنے کی طاقت فرانس اب تک پیدا نہیں کر سکا ہے۔ مگر فرانس کو بھی بہت جلد اطمینان ہو جائے گا اور تب یہ کہا جا سکے گا کہ حفاظتی کاونسل کا کوئی رُکن ایسا نہیں ہے جو طاقت کا بے جا استعمال کرے۔ بہر حال نئے بین اقوامی دستور کے مطابق حفاظتی کاونسل ان اغراض کی نمائندگی کرے گی جو اس وقت دنیا پر حاوی ہیں اور ہمیں یہ یقین کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ ان اغراض کا پورا ہونا حفاظتی کاونسل کے مستقل اراکین کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے مفید ہوگا۔ اس دعوت کو سین فرنسسکو کانفرنس میں رد کرنے کی کچھ تحریک ہوئی، مگر پھر یہی مناسب سمجھا گیا کہ اسے قبول کیا جائے جب تک کہ اُسے رد کرنے کے لئے کافی دلیلیں مہیا نہ ہو جائیں۔

مجلس تولیت کے متعلق بحث شروع ہوئی تو اس کی کچھ امید تھی کہ سین فرنسسکو کانفرنس قومی آزادی کے اصول کی حمایت کرے گی، اور اس کا مطالبہ کرے گی کہ دنیا کی ہر قوم آزاد کر دی جائے۔ برطانیہ نے پہلے ہی اس کا اعلان کر دیا تھا کہ کانفرنس کو اس کی نوآبادیوں اور مقبوضات کے متعلق بحث کرنے کا اختیار نہ ہوگا اور ہندوستان کی طرف سے تین نمائندے یہ کہنے کے لئے پہنچ گئے کہ ہم جتنی آزادی چاہتے ہیں وہ ہمیں حاصل ہے تو کانفرنس ہندوستان کے سرکاری نمائندوں کے بجائے مسز پنڈت کو جلسوں میں کیسے شریک کر سکتی تھی۔ ہندوستان کا معاملہ اس طرح طے ہو گیا تو برہما، ملایا، جزائر مشرقی ہند وغیرہ کا سوال کون اُٹھاتا۔ اس کے علاوہ متحدہ ریاستوں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ انھیں بحرالکاہل کے ان تمام جزیروں کا متولی اور حق دار حاکم تسلیم کیا جائے جن پر قبضہ رکھنا دنیا میں امن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سلسلے میں تولیت کے بارے

میں ریزولیوشن منظور ہوئے اور مجلس تولیت قائم ہوئی جو ایسے علاقوں کی نگرانی کرے گی جن پر متحدہ ریاستوں یا متحدہ قوموں میں سے کسی اور کو قبضہ کرنے کا حق دیا گیا ہے یا دیا جائے گا۔ بظاہر تو وہ ریاستیں جو متولی مقرر ہوئی ہیں اس کی پابند ہیں کہ ماتحت آبادیوں کی خوش حالی اور ترقی کا ہر طرح سے انتظام کریں اور اس کی کوشش کریں کہ وہ جلد آزاد اور خود مختار ہونے کے قابل بن جائیں، لیکن مجلس تولیت شاید کبھی یہ طے نہ کرسکے گی کہ کس متولی نے اپنے فرائض جیسا کہ چاہئے انجام دئے ہیں اور کس نے ایسا نہیں کیا۔

بین اقوامی نظام کے باقی تین ادارے، معاشی و معاشری مسائل کی کمیٹی، بین اقوامی عدالت اور بین اقوامی دفتر، تینوں بہت مفید ثابت ہوں گے، اور غالباً ان کی کارگذاری سب سے زیادہ اہم ہوگی۔ بین اقوامی لیگ نے جو تہذیبی خدمات انجام دیں وہ اس کی کارگذاری کا سب سے روشن پہلو تھیں، اور اس مرتبہ بھی بین اقوامی اتحاد کے کارناموں کا میدان دنیا کی معاشرت اور تہذیب ہوگی۔

نئے بین الاقوامی دستور میں سیاسی مصلحتوں کا جو لحاظ کیا گیا ہے اس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ اسی کی ایک شکل یہ ہے کہ ایسی ریاستیں جو ایک بر اعظم میں ہیں یا جن کی معاشی اور سیاسی زندگی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اپنے خطے کی الگ تنظیم مشترک طور پر کرسکتی ہیں۔ البتہ یہ تنظیم بین اقوامی نظام کے ماتحت اور بین اقوامی دستور کے اصولوں کے مطابق ہوگی۔ ایسی تنظیم کے حق کا مطالبہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں نے کیا، اور وہی اپنے مطالبے کو حق بجانب ثابت کرسکتی تھیں۔ لیکن اب ایسی تنظیم کا حق عام ہو گیا ہے، اور کوئی تعجب نہ ہوگا اگر برطانیہ اس کی بنا پر اپنی اور نوآبادیوں اور ہندوستان کی تنظیم الگ کرنا چاہے اور روس سلاف ملکوں کی تنظیم الگ، اور اس تنظیم کی پشت پر اتحاد عمل کے فائدے پیش نظر نہ ہوں بلکہ طاقت وروں کی مصلحت۔

جنگ کے واقعات میں سب سے اہم یہی بات ہے کہ بین اقوامی نظام کا دستور بن گیا

دلچسپی اور مسائل سے بھی ہوسکتی ہے۔ امریکیوں نے جزیرہ اوکنیاوا فتح کرلیا ہے، اگرچہ اس میں اُن کے بہت سے سپاہی اور شاید جہاز بھی ضائع ہوئے۔ اب جنرل میک آرتھر خاص جاپان کے جزیروں میں کہیں پر فوج اُتارنے کی تدبیریں کر رہے ہوں گے۔ انگریزوں کا تقریباً پورے برہما پر قبضہ ہوگیا ہے اور کسی دن بھی یہ خبر آسکتی ہے کہ انھوں نے سنگاپور پر حملہ کر دیا ہے۔ شام اور لبنان کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے فرانسیسی ایک طرف انگریزوں پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے شام اور لبنان کی آبادی کو بغاوت پر آمادہ کیا، دوسری طرف یہ کہتے ہیں کہ ہم برطانیہ کے ساتھ اتحادِ عمل کرنا چاہتے ہیں اور کریں گے۔ برطانوی سیاست نے شام میں بازی جیتی اور بڑی نیک نامی کے ساتھ جیتی ہے۔ فرانسیسیوں کی یہ کوشش بھی کہ شام اور لبنان کے عیسائیوں اور مسلمانوں میں فساد ہو جائے بے سود رہی۔ لیکن کوئی تین ہفتے ہوئے برطانیہ کے اخبار "آبزرور" نے لکھا تھا کہ برطانیہ کو زیادہ احتیاط سے کام لینا چاہیے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو جو شیشے کے گھر میں رہتے ہوں، پتھر پھینکنے کی عادت نہ ڈالنا چاہیے۔

جامعہ

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۴ - نمبر ۱۱	بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۵ء	سالانہ چندہ صہ فی پرچہ ۴

فہرست مضامین

[illegible] محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس - دہلی

جنگ اور [illegible]

ایک زمانہ تھا جب مشہور مفکرین [illegible] حکومت کی کم ترین مداخلت کو بہترین پالیسی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب اس کے خلاف ایک منظم کوشش ہو رہی ہے۔ آئندہ نسلوں کی بہبودی اور معاشرتی انصاف کے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے حکومت کی زیادہ سے زیادہ مداخلت کو پسندیدہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس لئے اب یہ سوال اہم ہوتا جا رہا ہے کہ ان کثیر ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لئے جن کی روز بروز حکومت سے زیادہ توقع کی جا رہی ہے روپیہ کہاں سے حاصل کیا جائے۔

لوگ حکومت سے بہتر تعلیم کا مطالبہ کرتے ہیں اور تعلیم کے کم ترین معیار کو روز بروز بڑھاتے جا رہے ہیں۔ لوگ حکومت سے حفظانِ صحت، علاج و معالجہ، نگہداشت اطفال، خدماتِ زچگی کے بہترین حالات فراہم کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔ بے روزگاری کے بیمہ اور دیگر بے شمار خدمات کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ان سب کو حکومت کیسے فراہم کرے۔ ان کے سامان اور آدمی کیسے اکٹھا کرے۔ ان سب کاموں کے لئے روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ حکومتوں کا ذریعہ آمدنی ان کی رعایا ہوتی ہے۔ لیکن اسے محصول کی ادائی شاق گزرتی ہے۔ غرض ایک طرف خدمات کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ اور دوسری طرف محاصل ادا کرنے کی کم سے کم آمادگی — یہ متضاد کشمکش ہے جس میں حکومتوں کو مبتلا رہنا پڑتا ہے۔

لیکن یہ بات حیرت کی ہو گی کہ وہی حکومتیں جو امن کے زمانے میں تعلیم کا [illegible] برداشت کرنے سے ہچکچاتی ہیں جنگ کے زمانے میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے ملک کے تعمیری کام شروع کرنے کے لئے حکومت [illegible] وسائل اور [illegible] ہوگی؟ کیا حکومت ان محاصل اور قرضوں کو جنہیں وہ جنگ کے [illegible] عائد کرتی ہے۔ امن کے زمانے میں بھی جاری نہیں رکھ سکتیں؟ ذیل کے صفحات میں ہندوستان کی مالیات جنگ کا تجزیہ کرنے کے بعد اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے گی۔

جنگ کے زمانے میں حکومت ہند کو اپنے مصارف بہت زیادہ بڑھا دینا پڑے۔ جن کا اندازہ ذیل کے اعداد سے کیا جا سکے گا۔

جنگ سے قبل کے مصارف:-

[illegible]ء	۴۹ کروڑ پندرہ لاکھ روپے

جنگ کے زمانے میں:-

[illegible]ء	۴۹ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے
[illegible]ء	ایک ارب ۱۴ کروڑ ۸۱ لاکھ روپے
[illegible]ء	ایک ارب ۶۴ کروڑ ۲۹ لاکھ روپے
[illegible]ء	دو ارب ۹۸ کروڑ ۵ لاکھ روپے
[illegible]ء	۴ ارب ۲۹ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے
[illegible]ء	۵ ارب ۱۲ کروڑ ۹۵ لاکھ روپے
میزان	۱۵ ارب ۹۲ کروڑ ۵۹ لاکھ روپے

[illegible] حکومت کے جو مصارف تھے ان کو اوسط قرار دے کر جب جنگ [illegible] کی میزان نکالی جائے گی تو یہ میزان ۵ ارب ۱۱ کروڑ ہوگی۔ لیکن چونکہ [illegible] ارب [illegible] کروڑ روپے صرف ہوئے اس سے کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کی وجہ سے [illegible]

سے ہندوستان کو کرنا پڑا

اس زائد خرچ کا سب سے بڑا حصہ فوجی ... کیا گیا ... دفاع کا خرچ [illegible] میں ۴۹ کروڑ ۱۸ لاکھ تھا [illegible] میں تین ارب ۹۷ کروڑ ۲۳ لاکھ تھا یعنی ۸ گنا بڑھ گیا تھا۔ خرچ کی سال بہ سال تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

جنگ سے قبل۔

[illegible] ء	.. ..	۴۹ کروڑ ۱۸ لاکھ روپے

جنگ کے زمانے میں۔

۱۹۳۹-۴۰ء	.. ..	۴۹ کروڑ ۵۴ لاکھ روپے
۱۹۴۰-۴۱ء	.. ..	۷۳ کروڑ ۶۱ لاکھ روپے
۱۹۴۱-۴۲ء	.. ..	ایک ارب ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے
۱۹۴۲-۴۳ء	.. ..	دو ارب ۱۴ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے
۱۹۴۳-۴۴ء	.. ..	تین ارب ۵۸ کروڑ ۰۴ لاکھ روپے
۱۹۴۴-۴۵ء	.. ..	تین ارب ۹۷ کروڑ ۲۳ لاکھ روپے
میزان	.. ..	گیارہ ارب ۱۷ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے

بحر حال یورپ کی جنگ کے زمانے کا مجموعی خرچ گیارہ ارب ۱۷ کروڑ ہوتا ہے اگر جنگ سے قبل کی بنیاد پر ان سالوں کے خرچ کا تخمینہ کیا جائے تو اس کی میزان صرف دو ارب ۷۵ کروڑ ہوگی۔

مدافعت کے خرچ کا انتہائی اندازہ [illegible] کو کہنا چاہئے کیونکہ [illegible] کے جو [illegible] کیا گیا ہے اس میں مدافعت کے مصارف صرف تین ارب ۹۶ کروڑ کے [illegible] ... کروڑ کم ہیں۔

[illegible] سے بہت زیادہ ہیں۔ اس زیادتی کا سبب یہ ہے کہ حکومت ہند نے مدافعت کے سلسلے میں بہت سے مزید مصارف ایسے کئے ہیں جنہیں بعد میں برطانیہ کی حکومت سے یا دیگر اتحادی حکومتوں سے وصول کیا جا سکے گا۔ چنانچہ ان مصارف کو ہندوستان کے میزانیہ میں شریک نہ کیا جاتا۔

برطانیہ کی حکومت سے جو رقم واجب الوصول ہے اس کا بیشتر حصہ وہ ہے جس کا حکومت ہند ۱۹۴۰ء کے "مالیاتی سمجھوتے" کی بنیاد پر برطانیہ کی حکومت سے مطالبہ کر سکتی ہے۔ مالیاتی سمجھوتہ کا خلاصہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ اس کی رو سے حکومت ہند نے مدافعت کے صرف ان مصارف کی ذمہ داری قبول کی ہے جو ہندوستان کی مدافعت کے لئے براہِ راست ضروری ہیں۔ لیکن جہاں ہندوستان کی فوج کو ہندوستان سے باہر شہنشاہی مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کیا گیا ہو وہاں جتنے مزید مصارف ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری برطانیہ کی حکومت کو اٹھانا پڑے گی۔

آئیے اب اس سمجھوتے کی بنیاد پر ہندوستان کی مدافعت کے خرچ کا تجزیہ کریں۔ جس کی تفصیلات ذیل کے جدول میں درج کی گئی ہیں۔

سال	مدافعت کا مجموعی خرچ	حکومت ہند کا حصہ	حکومت برطانیہ کا حصہ
[illegible]	۵۴ کروڑ روپے	۵۰ کروڑ روپے	۴ کروڑ روپے
[illegible]	ایک ارب ۲۷ کروڑ روپے	۷۴ کروڑ روپے	۵۳ کروڑ روپے
[illegible]	۳۰۰ ۔ ۔	ایک ارب ۴ کروڑ روپے	ایک ارب ۹۶ کروڑ روپے
[illegible]	۔ ۔ ۴۳۰ ۔ ۔	۲ ۔ ۱۵ ۔ ۔ + ۵۸ ۔ ۔ له	۳ ۔ ۔ ۹ ۔ ۔

[illegible] پیش کرنے میں یہ جدت کی گئی تھی کہ مصارف کو حسابِ جاری اور

حکومت برطانیہ کا حصہ	حکومت ہند کا حصہ	مدافعت کا مجموعی خرچ	سال
[illegible] ارب [illegible] کروڑ روپے ،، ،، ۲۹ ،، ،،	[illegible] ارب ۱۰ کروڑ روپے ،، ،، ۳۰ ،، ،، ،، ۹۶ ،، ،، ،، ،، ۹۰ ،،	[illegible] ارب ۲ کروڑ روپے ،، ،، ۹۶ ،، ،،	[illegible] [illegible]
۱۳ ارب ۷۲ کروڑ روپے	۱۱ ارب ۵۰ کروڑ روپے ۱۰ ارب ۵۰ ،، ،، ،، ۱۳۰ ،، ۴۸ ،، ،،	۲۴ ارب ۲۲ کروڑ روپے	میزان

اوپر کی اس بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں یورپ کی جنگ کے زمانے میں ۲۴ ارب ۲۲ کروڑ روپے مدافعت پر خرچ کیے گئے۔ جس میں سے ہندوستان کا گیارہ ارب ۵۰ کروڑ روپیہ تو اس طرح پر خرچ ہوا کہ اس سے آئندہ کسی سود مند نتیجے کی کوئی امید نہیں ہو[illegible] ایک ارب ۰۰ کروڑ روپے کی مالیت کا اثاثہ اس کے پاس ٹھوس صورت میں موجود ہے اور تیرہ ارب ۷۲ کروڑ روپیہ ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے خرچ کیا گیا۔ اس کا کچھ ہندوستان کے میزانیے میں اندراج نہیں کیا گیا۔ لیکن اس کے بوجھ کے بہت بڑے حصے کو ہندوستان ہی کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ بوجھ ہندوستان کو کس طرح اٹھانا پڑا، اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ [illegible] کیا جائے گا۔ فی الحال ہم یہاں [illegible] صرف مرکزی میزانیے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] میں حکومت ہند کے بیرونی اخراجات کی مجموعی رقم کا اندازہ لگایا جا چکا ہے۔ پندرہ ارب ۲۰ کروڑ روپے ہوگی۔ اب سوال یہ ہے کہ حکومت ہند نے ان کثیر مصارف کو پورا کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے۔

حکومت ہند کی آمدنی کے بڑے ذرائع کو ذیل کے عنوانوں کے ماتحت تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

محاصل

دیگر ذرائع آمدنی

محکمہ ڈاک اور تار سے خاص آمدنی

ریلوں سے خاص آمدنی

اگر آمدنی کے یہ ذرائع ناکافی ثابت ہوں تو خسارہ کو پورا کرنے کے لئے حکومت ہند کو قرض لینا پڑتا ہے۔

آمدنی کے ان مختلف ذرائع سے حکومت ہند کو جو سال بہ سال آمدنیاں حاصل ہوتی رہی ہیں انہیں ذیل کے جدول میں دکھلایا گیا ہے۔

جنگ سے قبل کا سال۔

[illegible]	۸۴ کروڑ ۱۵ لاکھ

جنگ کے زمانے میں۔

[illegible]	۸۹ کروڑ ۷۰ لاکھ
[illegible]	۹۹ 〃 ۸۰ 〃
[illegible]	ایک ارب ۲۳ کروڑ ۷۵ لاکھ
[illegible]	۱ 〃 ۶۷ 〃 ۸۸ 〃

[illegible]

[illegible]

میزان — گیارہ ارب ۹۰ کروڑ ۷۳ لاکھ

جنگ کے ابتدائی ۵ سال میں حکومتِ ہند کو مجموعی گیارہ ارب ۹۰ کروڑ کی آمدنی حاصل ہوئی۔ اگر آمدنی اس کے زمانے کے اوسط کے مطابق ۹۰ کروڑ ۵۰ لاکھ سالانہ کی رفتار سے ہوتی رہتی تو مجموعی آمدنی کا تخمینہ صرف ساڑھے ۴ ارب ۵۰ کروڑ ہوتا۔ اس لئے ۵ ارب [illegible] کروڑ کے فرق کو جو حقیقی آمدنی اور اس مفروضہ تخمینہ میں پایا جاتا ہے محصول کے اس اضافہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جو جنگ کی وجہ سے حکومت نے اپنی رعایا پر عائد کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند اس زمانے میں اپنے محاصل کے اندر سو فی صدی اضافہ کرنے میں کامیاب ثابت ہوئی۔

اس اضافہ کا کتنا حصہ محاصل کی قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور کتنا محاصل کے عائد کرنے کا، اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے جب سے انکم ٹیکس کی وصول یابی میں ایک سسٹم کی پیروی کی جا رہی ہے۔ انکم ٹیکس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا سبب [illegible] کی توسیع کی وجہ سے نئے افراد انکم ٹیکس کی تعداد میں آتے جا رہے ہیں۔ اسی طرح صنعتی پیداوار کی ترقی کی وجہ سے اکسائز کے محاصل میں بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لئے آمدنی کے اضافہ کا ایک حصہ تو قدرتی توسیع کا نتیجہ ہے اور اگر اوپر دی ہوئی مثالوں اور دیگر وجوہ کے پیشِ نظر محاصل کے ایک تہائی اضافہ کو قدرتی اسباب کا نتیجہ تصور کیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ اس لئے اس اضافہ کو منہا کرنے کے بعد آمدنی کے کم سے کم دو تہائی اضافہ کو جنگ کے [illegible] کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے۔

جنگ کے زمانے میں محاصل کے [illegible]

[illegible]

بھی گئیں۔ اس سال محاصل کے بڑھانے کی دوسری تدبیریں اختیار کی گئیں کہ شکر پر اکسائز کا محصول اور [illegible] کا محصول ۱۰ روپیہ فی ہنڈرڈ ویٹ سے بڑھا کر تین روپیہ ہنڈرڈ ویٹ کر دیا گیا۔ پٹرول ٹیکس کو یعنی پٹرول پر اکسائز اور کروڈ گیری دونوں کو دس آنے فی گیلن سے ۱۲ آنے فی گیلن کر دیا گیا۔ نومبر ۱۹۴۱ء میں ضمنی بجٹ پیش کیا گیا جس میں تمام انکم ٹیکس پر (جس میں سوپر ٹیکس اور کارپوریشن ٹیکس بھی شامل تھے) ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگا دیا گیا اور ڈاک اور تار کے محصول اور ٹیلیفونوں کے کرایہ میں بھی تھوڑا سا اضافہ کر دیا گیا۔

۴۳-۱۹۴۲ء کے بجٹ میں زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۵۰ فی صدی سے بڑھا کر ۶۶ ۲/۳ فی صدی کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس پر جو ۲۵ فی صدی کا زائد محصول لگایا گیا تھا اس کو بڑھا کر ۳۳ ۱/۳ فی صدی کر دیا گیا۔ ہوا بھرنے والے ٹائروں اور ٹیوبوں پر ان کی مالیت کے لحاظ سے ۱۰ فی صدی اکسائز کا نیا محصول لگایا گیا۔ مصنوعی ریشم کے تاگے کی درآمد پر محصول کو تین آنے فی پونڈ سے بڑھا کر پانچ آنے فی پونڈ کر دیا گیا۔

۴۴-۱۹۴۳ء میں انکم ٹیکس کی تشخیص کے لئے آمدنی کی آخری حد کو دو ہزار روپے سالانہ سے گھٹا کر ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ کر دیا گیا۔ انکم ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو ۳۳ ۱/۳ فی صدی کی جگہ اس طرح بڑھایا گیا کہ ڈیڑھ ہزار سے پانچ ہزار تک کی آمدنیوں پر شرح محصول ۶ پائی فی روپیہ رکھی گئی اور اس کے بعد کی پانچ ہزار آمدنیوں پر ۹ پائی فی روپیہ اور اس کے بعد کے پانچ ہزار پر ایک آنہ دو پائی فی روپیہ اور پندرہ ہزار سے اوپر کی بقیہ آمدنی پر ایک آنہ تین پائی فی روپیہ۔ سوپر ٹیکس پر زائد محصول کی شرح کو پچاس فی صدی بڑھا دیا گیا اور کارپوریشن ٹیکس کی شرح کو ڈیڑھ آنہ فی روپیہ کر دیا گیا۔ زائد نفع کے ٹیکس کی شرح کو ۶۶ ۲/۳ فی صدی قائم رکھا گیا۔ لیکن کاروبار کے انتظام میں کفایت شعاری کی حوصلہ افزائی کرنے کے لئے حکومت اس بات پر راضی ہو گئی کہ اگر محصول ادا کنندہ اس کی دوگنی رقم کو حکومت کے پاس امانت جمع کرے گا تو حکومت زائد نفع کے ٹیکس کے ۱/۲ حصے کو ایک ایسے سرمایہ محفوظ

میں اپنی طرف سے جمع کر دے گی جس سے جنگ کے بعد صنعت کے لئے نیا سامان خریدا جاسکے گا۔

•

تمام محاصل درآمد پر ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ۱/۵ زائد محصول عاید کیا گیا اور اس اضافہ سے صرف مندرجہ ذیل تین چیزوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ (۱) خام روئی۔ اس وجہ سے کہ اس پر ایک خاص ضرورت سے محصول سو فی صدی بڑھایا جاچکا تھا (۲) پٹرول کہ اس پر کسائز اور کروڑگیری کے محصول ۲ ½ فی گیلن کی شرح سے بڑھائے جاچکے اور (۳) نمک کو۔

چاندی اور مٹی کے تیل پر اکسائز کے محاصل کو بھی نئے محاصل درآمد کے برابر کر دیا گیا اور ڈاک تار اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں کو بھی اور زیادہ بڑھا دیا گیا۔

۵۳-۱۹۵۲ء میں ایسی متعدد تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا دو گونہ مقصد تھا ایک طرف تو زیادہ محصول حاصل کرنا اور دوسری طرف افراطِ زر کو روکنا۔ پانچ ہزار سے زیادہ آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو بڑھایا گیا۔ جس کی وجہ سے انکم ٹیکس کی بنیادی شرح پر زائد محصول کی شرح ۶۶ ⅔ فی صدی ہو گئی۔

سوپر ٹیکس میں بھی ۲۵ ہزار اور ۳ ½ لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول کی شرح کو یکساں طور پر ۶ پائی فی روپیہ کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زائد محصول کو ملا کر سوپر ٹیکس کی شرح ۲ فی روپے کی کمترین شرح سے لے کر ساڑھے دس آنے فی روپے کی انتہائی شرح تک پہنچ گئی۔ کارپوریشن ٹیکس کو بھی نصف آنہ بڑھا کر ۲ فی روپیہ کر دیا گیا۔

دو نئے اکسائز محاصل لگائے گئے ایک تمباکو پر اور دوسرا بناسپتی گھی پر۔ تمباکو سے اول سال میں ۱۰ ½ کروڑ روپیہ وصول ہونے کی توقع قائم کی گئی اور بناسپتی گھی پر شرح ۵ روپے فی ہنڈرڈ ویٹ رکھی گئی اور اس سے ایک کروڑ روپے وصول ہونے کی امید کی گئی۔ ڈاک اور ٹیلیفون کے بعض کرایوں میں مزید اضافہ کیا گیا جس سے ایک کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کی توقع کی گئی۔

اسی طرح [illegible] کی مالیاتی تدابیر سے بھی آمدنی میں نہ صرف جنگ اور مابعد جنگ کے زمانے کی ضرورتوں کا خیال کرکے اضافہ کیا گیا بلکہ زائد زر کو جذب کرنے کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ لوگ اپنے انکم ٹیکس کو پیشگی ادا کر سکتے تھے۔ زائد منافع کے ٹیکس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی لیکن لازمی امانت کے تناسب کو کمپنیوں کے لئے ٹیکس کا ½ اور دوسروں کے لے ¼ کر دیا گیا۔ گویا اس کے بعد لوگوں کو تمام ایسے زائد منافع سے فوری فائدہ اُٹھانے سے محروم کر دیا گیا جو زائد منافع کے محصول کو ادا کرنے اور بقیہ پر انکم ٹیکس اور سوپر ٹیکس ادا کرنے کے بعد باقی بچا کرتا تھا۔

جن لوگوں کی آمدنیاں دو ہزار روپے سے کم تھیں ان کے ساتھ رعایت کی گئی اور محصول کی کم ترین حد کو ڈیڑھ ہزار روپے سے بڑھا کر دو ہزار روپے کر دیا گیا۔ دس ہزار روپے سے پندرہ ہزار روپے تک کی آمدنیوں پر زائد انکم ٹیکس کی شرح کو دو پائی بڑھایا گیا یعنی ۲۴ پائی کی بنیادی شرح پر ۱۶ پائی سے ۱۸ پائی فی روپیہ کر دیا گیا اور ۱۵ ہزار روپے سے زائد کی بقیہ آمدنیوں پر شرح کو چار پائی بڑھایا گیا یعنی ۳۰ پائی کی بنیادی شرح پر ۲۰ پائی سے ۲۴ پائی فی روپیہ کر دیا گیا۔ سوپر ٹیکس پر بھی ۳۵ ہزار اور دو لاکھ کی درمیانی آمدنیوں پر زائد محصول میں دو پیسہ کا مزید اضافہ کیا گیا۔ اسی طرح کارپوریشن ٹیکس کو ایک آنے سے بڑھا کر تین آنے کر دیا گیا۔ لیکن کمپنی کی ایسی مجموعی آمدنی پر جو مقررہ شرح منافع کے علاوہ بطور مزید منافع کے حصہ داروں کے درمیان تقسیم نہیں کی جاتی تھی۔ ایک آنہ فی روپے کی چھوٹ دی گئی۔

تمباکو پر ایکسائز محاصل کو اور زیادہ بڑھایا گیا جس کی وجہ سے دس کروڑ روپے کی مزید آمدنی حاصل ہونے کی اُمید قائم کی گئی۔ تین نئے ایکسائز کے محاصل لگائے گئے یعنی چھالیہ، قہوہ اور چاء پر ۲ آنہ فی پونڈ کی شرح سے۔

ان ذرائع سے مزید آمدنی کی جو توقع قائم کی گئی وہ ۳۰۔۱۲ کروڑ روپے ہوتی تھی اور

افراط زر کے تدارک کے سلسلے میں ان نئی تدبیروں سے تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپیہ کی واپسی کی توقع کی گئی۔

۴۵-۱۹۴۴ء میں محاصل میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ پندرہ ہزار سے زائد کی آمدنی پر زائد محصول کو تین پائی کے بقدر بڑھایا گیا جس سے چار کروڑ روپے کے حاصل ہونے کی اُمید قائم کی گئی۔ نہایت اعلیٰ قسم کے تمباکو پر بھی اکسائز کے محاصل اور زیادہ کئے گئے جن سے ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ کی آمدنی حاصل ہونے کی اُمید تھی۔ غیر مصنوعہ تمباکو کی درآمد پر بھی اسی کی مناسبت سے محصول میں اضافہ کیا گیا جس سے ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ وصول ہونے کی امید کی گئی۔ اندرون ملک کے ڈاک کے پارسلوں کے کرایہ میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا اور ٹرنک ٹیلیفون کال اور تار کے کرایہ پر بھی زائد محصول لگایا گیا۔ جس سے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ کی آمدنی کی توقع کی گئی۔

ذیل کے جدول کے ذریعے جنگ کے زمانے میں محاصل کی مختلف مدوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں دکھلایا گیا ہے۔

(کروڑ روپیہ)

سال	محاصل کروڑ گیری	مرکزی محاصل اکسائز	کارپوریشن ٹیکس	کارپوریشن ٹیکس کے علاوہ دیگر انکم ٹیکس	نمک کا محصول
جنگ سے قبل ۳۹-۱۹۳۸ء	۴۰ کروڑ ۱۵ لاکھ	۸ کروڑ ۲۲ لاکھ	۲ کروڑ ۱۲ لاکھ	۱۵ کروڑ ۴۴ لاکھ	۸ کروڑ ۱۳ لاکھ
جنگ کے پہلے سال ۴۰-۱۹۳۹ء	۴۵ ۰ ۸۸ ۰	۹ ۰ ۹۷ ۰	۲ ۰ ۳۸ ۰	۱۷ ۰ ۹۹ ۰	۱۰ ۰ ۸۹ ۰
۴۱-۱۹۴۰ء	۳۷ ۰ ۳۰ ۰	۹ ۰ ۴۹ ۰	۴ ۰ ۱۴ ۰	۲۱ ۰ ۶۹ ۰	۷ ۰ ۷۶ ۰
۴۲-۱۹۴۱ء	۳۷ ۰ ۸۹ ۰	۱۳ ۰ ۱۵ ۰	۵ ۰ ۴۴ ۰	۳۲ ۰ ۴۰ ۰	۹ ۰ ۳۰ ۰
۴۳-۱۹۴۲ء	۲۳ ۰ ۱۲ ۰	۱۲ ۰ ۷۵ ۰	۲۱ ۰ ۴۰ ۰	۵۴ ۰ ۲۹ ۰	۲ ۰ ۹ ۰
۴۴-۱۹۴۳ء	۲۶ ۰ ۵۷ ۰	۲۲ ۰ ۹۲ ۰	۵۱ ۰ ۲۸ ۰	۶۶ ۰ ۸۹ ۰	۴ ۰ ۳۹ ۰
۴۵-۱۹۴۴ء	۴۰ ۰	۳۹ ۰ ۰ ۰	ایک ارب [illegible] کروڑ [illegible] لاکھ		۹ ۰ ۳۰ ۰

اس جدول کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصل کروڑگیری میں اس سال جب کہ ان میں ۲۰ فی صدی کا ناپید محصول لگایا گیا۔ جنگ سے قبل کے سال کے مقابلے میں ۴۰ فی صدی کم ہوکر صرف ۲۵ کروڑ رہ گئے۔ ۱۹۴۳-۴۴ء کی تھوڑی سی کمی کو نظر انداز کر دیا جائے تو محاصل ایکسائز میں متواتر توسیع نظر آتی ہے۔ انکم ٹیکس میں (جس میں کارپوریشن ٹیکس بھی شامل ہے) غیر معمولی طور پر نمایاں اضافہ نظر آتا ہے یعنی ۱۷ کروڑ سے بڑھ کر یہ دو ارب دس کروڑ تک پہنچ گیا۔ نمک کا محصول کم وبیش قائم حالت پر رہا۔

حکومت کے بعض تجارتی شعبوں کی آمدنی سے بھی مثلاً ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں سے سرکار کی عام آمدنی میں بڑا اچھا اضافہ ہوا۔ ذیل کے جدول میں مثال کے طور پر ڈاک اور تار اور ریل کے محکموں کی آمدنیوں کو دکھلایا گیا ہے۔

سال	ڈاک اور تار کے محکمے سے خالص آمدنی	ریلوں سے خالص آمدنی
جنگ سے قبل		
۱۹۳۸-۳۹ء	۱۹ لاکھ روپے	ایک کروڑ ۳۷ لاکھ
جنگ کے زمانے میں		
۱۹۳۹-۴۰ء	۲۹ " "	۴ " ۳۳ "
۱۹۴۰-۴۱ء	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ	۱۲ " ۱۹ "
۱۹۴۱-۴۲ء	۳ " ۴۱ "	۲۰ " ۱۷ "
۱۹۴۲-۴۳ء	۴ " ۵۲ "	۲۹ " ۱۳ "
۱۹۴۳-۴۴ء	۹ " ۳ "	۳۷ " ۶۴ "
۱۹۴۴-۴۵ء	۹ " ۳۲ "	۳۲ "

ذیل کے جدول میں حکومت ہند کی آمدنی اور مصارف کے خلاصہ کو درج کیا گیا ہے

	سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء	سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء	سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء	سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء	سنہ ۱۹۴۴-۴۵ء
آمدنی							
آمدنی کی خالص مدیں	۶۹/۱۱	۸۴/۰۹	۸۳/۰۱	۱۰۶/۱۵	۱۳۶/۸۷	۱۹۱/۵۱	۲۰۱/۳۳
آمدنی کی دوسری متفرق مدیں	۸/۳۴	۸/۱۵	۱۹/۳۹	۱۲/۲۳	۲۹/۵۹	۳۰/۲۷	۴۰/۸۰
ڈاک اور تار سے خالص آمدنی	/۱۹	/۸۹	۱/۲۵	۳/۴۱	۵/۵۲	۹/۰۳	۹/۳۳
ریل سے خالص آمدنی	۱/۳۷	۴/۴۳	۱۲/۱۹	۳۰/۱۷	۲۰/۱۳	۴۷/۹۴	۳۲/۰۰
	۷۹/۰۱	۹۶/۳۹	۱۱۱/۸۶	۱۴۱/۹۶	۱۸۷/۶۰	۲۷۸/۷۵	۲۸۳/۴۴
صوبوں کا انکم ٹیکس میں حصہ	۱/۵۰	۳/۶۹	۴/۱۹	۷/۳۹	۱۰/۹۰	۱۹/۵۰	۲۶/۵۹
میزان آمدنی	۸۴/۵۰	۹۴/۵۶	۱۰۷/۶۵	۱۳۴/۵۷	۱۷۶/۷۰	۲۴۹/۹۵	۲۵۶/۸۵
خرچ							
ڈیفنس پر	۴۶/۱۹	۴۹/۵۴	۷۳/۶۱	۱۰۳/۹۳	۲۱۴/۹۲	۳۵۸/۴۰	۳۹۶/۳۳
غیر فوجی مصارف پر	۳۸/۹۶	۴۵/۰۳	۴۰/۵۶	۴۳/۳۳	۷۴/۱۳	۸۱/۳۵	۱۱۵/۴۲
میزان خرچ	۸۵/۱۵	۹۴/۵۶	۱۱۴/۱۸	۱۴۷/۲۶	۲۸۹/۰۵	۴۳۹/۰۵	۵۱۲/۹۹
خسارہ	/۶۴	...	۶/۵۳	۱۲/۶۹	۱۱۲/۳۴	۱۸۹/۹۰	۱۵۵/۱۴

جنگ کے شروع زمانے میں مصارف کو پورا کرنے کے لئے محاصل ہی پر انحصار کیا گیا اور ان کی مقدار میں اضافہ کیا گیا۔ جنگ کے لئے روپیہ بہت کم قرض لیا گیا۔ لیکن بعد کے زمانے میں قرض کی مقدار آمدنی سے کہیں زیادہ ہوگئی اور جیسا کہ سر جرمی رائیسمین نے اپنے آخری دو بجٹوں کی تقریر کے دوران میں کہا کہ ہندوستان کی جنگی مالیات میں اب قرض کی حیثیت سب سے بڑے لنگر یا آخری پناہ اور سہارے کی ہوگئی ہے۔ یہ قرض نہ صرف جنگ کے مصارف کو

پورا کرنے کے لئے لیا گیا بلکہ افراطِ زر کا تدارک کرنے کے لئے بھی لیا گیا۔

جنگ کے زمانے میں خسارہ کی مجموعی میزان ۲ ارب ۱۱ کروڑ روپیہ ہوئی کہ جس کو حکومت ہند کے زیادہ تر قرض سے کر پورا کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے ——————— جنگ کی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے میں قرض سے بہت کم کام لیا گیا۔ جنگ کی ابتداء سے جنوری ۱۹۴۶ء کے آخر تک قرض کی میزان ۸ ارب ۲۲ کروڑ روپے ہوتی ہے جنگ سے قبل کے سالوں میں طرح کم شرح سود پر کامیابی کے ساتھ قرض لیا جا رہا تھا اس کم شرح کو جنگ کے زمانے میں بھی جاری رکھا گیا۔ چنانچہ جنگ کے زمانے کے تمام قرضے تین فی صدی شرح سود کی بنیاد پر لئے گئے ہیں۔

روپیہ قرض دینے والے لوگوں کی خواہشات کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف قسم کے قرضے طلب کئے گئے۔ کچھ چھوٹی مدت کے تھے، کچھ درمیانی مدت کے۔ کم پونجی رکھنے والے لوگوں کو قرض دینے کے لئے مائل کرنے کی خاص طور پر کوشش کی گئی۔ اس ضمن میں بارہ سالہ نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کا ذکر کرنا ضروری ہے جن کی شرح سود نسبتاً کچھ زیادہ اسی لئے رکھی گئی تاکہ کم پونجی والے لوگ بھی ان کے خریدنے کی طرف مائل ہو سکیں۔

چھوٹی رقموں کی بچت کی حوصلہ افزائی کرنے کی جو کوششیں کی گئیں ان میں صوبائی حکومتوں اور غیر سرکاری اداروں کے اشتراکِ عمل سے اچھی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کا اندازہ ڈاک خانے کے سیونگ بنک کے حسابات اور بارہ سالہ نیشنل سیونگ سرٹیفکٹ کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جس سے تین کروڑ روپیہ ماہانہ کی رفتار سے حکومتِ ہند کو قرض ملتا رہا۔

حکومتِ ہند کے غیر مستقل قرضے کی مقدار ۱۹۴۲-۴۳ء کے خاتمہ پر ایک ارب ۱۱ کروڑ تھی اور ۳۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو ۶۰۹ کروڑ، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند کو اپنی عارضی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لئے بھی قرض لینے میں کسی دشواری کا

سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

۱۹۴۱-۴۲ء کے خاتمہ پر حکومت ہند کے سرکاری قرضے کی (جس پر سود واجب الادا ہو) میزان ۱۷ ارب ۹۹ کروڑ روپیہ ہوتی تھی۔ اس کے بالمقابل جمع کے کھاتے میں سود ادا کرنے والی پونجی کی میزان ۱۰ ارب ۴ کروڑ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ نقدی اور خزانے کے کھاتے کے تمسکات کی مالیات ۳ ارب ۱۲ کروڑ ہوتی تھی۔ اس لئے ایسا قرضہ جس کے اصل اور سود کی ادائی کے لئے کوئی دولت آفریں سرمایہ موجود نہیں تھا۔ صرف ۴ ارب ۳۰ کروڑ تھا۔

اس جنگ کا ایک اہم با شان نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ہندوستان بین الاقوامی منڈی میں ایک مقروض ملک کی جگہ ایک قرض خواہ ملک بن گیا ہے۔ موجودہ جنگ سے پہلے ایک طویل مدت سے ہندوستان کا شمار مقروض ملکوں میں کیا جاتا تھا لیکن جنگ کے زمانے میں ہندوستان کے حساب میں برطانیہ کے اندر جو اسٹرلنگ فاضلات جمع ہوتے رہے ہیں انھوں نے پانسہ پلٹ دیا ہے۔

اسٹرلنگ فاضلات کے ذخیرے کے اجتماع کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے نظام زر کے بارے میں چند ابتدائی باتوں کی تشریح کردی جائے۔

ہندوستان میں چاندی کا یا کاغذ کا روپیہ چلتا ہے۔ حکومت ہند نے اس کی قیمت ۱ شلنگ ۶ پنس مقرر کی ہے۔ لیکن نہ تو چاندی کے روپے میں اس قیمت کی چاندی ہوتی ہے نہ کاغذ کے روپے کی قدر ذاتی اس کے برابر ہوتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کے روپے کو وضعی یا اعتباری زر کہا جاتا ہے۔

وضعی اور اعتباری زر کی قدر و قیمت کو اس کی ذاتی قدر و قیمت کے مقابلے میں اس وقت بلند کیا جا سکتا ہے جبکہ اس کی رسد کی فراہمی پر پورا قابو رکھا جائے۔ حکومت

سے جس کی ضرورت کو قائم رکھنے کا انتظام ریزرو بینک آف انڈیا کو سپرد کر دیا ہے اس کے مطابق بینک کو یہ اختیار کرنا پڑتا ہے کہ جس سے اس کی قیمت ڈیڑھ شلنگ سے زیادہ ہونے نہ پائے۔ اس کو یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کے روپے کے معاوضہ میں انگلستان کا کاغذی سکہ اسٹرلنگ اور انگلستان کے کاغذی سکے اسٹرلنگ یا سونے کے معاوضے میں ہندوستان کا روپیہ ہر اس شخص کو جو اس کا مطالبہ کرے ایک شلنگ چھ پنس فی روپیہ کی شرح سے فوراً ادا کرے۔ اس کے لئے ریزرو بینک کو ایک طرف تو اپنے ذخیرہ محفوظ میں کافی اپنے جاری شدہ مجموعی نوٹوں کے بالمقابل کم سے کم پچاس فی صدی سونا یا اسٹرلنگ جمع رکھنے ہوتے ہیں تاکہ روپے کے بدلے میں فوراً اسٹرلنگ کی ادائی کا بندوبست کر سکے اور دوسری طرف اس پابندی کو پورا کرتے ہوئے اسے نوٹوں کے اجراء کا پورا اختیار ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اسٹرلنگ کے بدلے میں فوراً روپے کی ادائی کا انتظام کر سکتا ہے۔ ملکی معاملات اور لین دین میں تو عموماً کسی شخص کو روپے کے معاوضے میں اسٹرلنگ حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی اور لوگوں کو ریزرو بینک آف انڈیا کی ان کوششوں کا جو وہ روپے کی قیمت کو ایک شلنگ چھ پنس کے برابر رکھنے کے لئے کرتا رہتا ہے کبھی احساس بھی نہیں ہوتا لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں لین دین کرتے ہیں انہیں، البتہ یا تو باہر کے ملکوں کے سکوں کو جو انہیں اپنے برآمد کردہ مال کے معاوضہ میں دوسرے ملکوں سے ملتے ہیں اور جو ہندوستان میں نہیں چل سکتے، ہندوستانی روپے میں تبدیل کرانا ہوتا ہے یا درآمد کردہ مال کی قیمت غیر ملکوں کو ادا کرنے کے لئے ہندوستانی روپے کو جو باہر کے ملکوں میں نہیں چل سکتا باہر کے سکوں میں تبدیل کرانا ہوتا ہے اور انہی لوگوں کے لئے روپے کی یہ قیمت اور شرح مبادلہ غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

اب اگر صورت ہوتی کہ حکومت ہند نے روپے کی قیمت ایک شلنگ چھ پنس انگلستان کے سکے کے بجائے سونے کی شکل میں مقرر کی ہوتی تو ہندوستان مبادلات خارجہ میں انگلستان کے کاغذی سکے کا بالکل محتاج نہ ہوتا کیونکہ ہندوستان کا ذخیرہ ریزرو بینک میں [illegible] سکے کے معاوضے میں سونا یعنی سونا ایک شلنگ چھ پنس

کا قرض [illegible]

کی ادائیگی [illegible] ایسی صورت میں [illegible]

ہندوستان کے روپے کی قیمت انگلستان کے کاغذی سکے یعنی اسٹرلنگ کی صورت میں مقرر کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہر وقت پر اس سے ادائیگی کرنی ہو تو اسٹرلنگ ادا کرنے کے لائق ہو گیا ہو۔ دوسرے ملکوں کا جب وہ قرض ادا کرتا ہے تو اسے انگلستان کے کاغذی سکے اسٹرلنگ کو مزید درمیان میں لانا پڑتا ہو اسی طرح جب اسے دوسرے ملکوں سے قرض وصول کرنا ہوتا ہو تب بھی یہ درمیانی کڑی موجود رہتی ہے۔ قرض ادا کرنے کے وقت وہ ہندوستان کا روپیہ ریزرو بینک آف انڈیا میں داخل کرتا ہو اور یہ بینک اپنے ذخیرہ اسٹرلنگ میں سے اسے اسٹرلنگ ادا کر دیتا ہے جس سے وہ اپنے قرض خواہوں کا مطالبہ بیباق کر سکتا ہو۔ اس ادائی کے بعد ریزرو بینک کے ذخیرہ محفوظ میں اسٹرلنگ کی کمی ہو جاتی ہو۔ اسی کے مطابق وہ اپنے اعتباری روپیوں کو منسوخ کر کے ان کی رسد کو کم کر دیتا ہے۔ جب معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے یعنی ہندوستان کو باہر کے ملکوں سے قرض وصول کرنا ہوتا ہو تو اس صورت میں ریزرو بینک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ میں اسٹرلنگ زیادہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ان کی ضمانت پر وہ ہندوستان میں اعتباری اور نقدی روپیوں کی رسد کو بڑھا دیتا ہے اور ہندوستان کے ان لوگوں کو جن کا مطالبہ واجب الوصول ہے روپیہ ادا کر دیتا ہے۔

الیاتی [illegible] کے بارے میں جو بحث جاری تھی اس کے سلسلے میں ہندوستان کے نظم مالیات کا یہ پہلو خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستان میں افراط زر کے مسئلے نے بالکل ایک نئی صورت اختیار کر لی جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں حکومت [illegible] [illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] کا بہت سا حصہ جنگ [illegible] اتحادی ممالک کی طرف سے اسٹرلنگ کی
[illegible] ریزرو بینک کے ذخیرہ اسٹرلنگ کے بڑھنے کا موجب ہوئے۔ ان
[illegible] بہت کثرت سے روپئے کے نوٹوں کو چھاپ کر
[illegible] ہندوستان میں سب ادا کیا [illegible] اور نظری اعتبار سے ممکن ہو
[illegible] اگر [illegible] اس ساری کارروائی میں کوئی سقم یا ایمانی نقص نہ ہو۔ کیونکہ روپئے
کی اسٹرلنگ قیمت میں اس کی وجہ سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ حسب سابق ایک شلنگ
چھ پنس پر قائم رہی۔ بلکہ حالات اتنے موافق ہو گئے تھے کہ اگر ریزرو بینک سے کہا جاتا
تو وہ اس کی قیمت کو اور بہت زیادہ بڑھا سکتا تھا لیکن ان نظری اور قانونی موشگافیوں
سے کیا حاصل [illegible] جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ روپئے کی خارجی قیمت ضرور
معین معیار پر قائم تھی لیکن مبادلات خارجہ تجارت خارجہ اور ذرائع نقل و حمل کی پابندی
اور کنٹرول کی وجہ سے ہندوستانی خریدار اس کے فائدے سے محروم تھا۔ ملک کے اندر
روپئے کی حقیقی قیمت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ قیمتوں میں تیزی سے اضافہ کا سلسلہ
جاری تھا۔ مصارف زندگی بہت بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اور ان کی ذمہ داری بہت
کچھ حد تک ان نئے نوٹوں پر عائد کی جا سکتی تھی۔ جو ریزرو بینک آف انڈیا، اسٹرلنگ کے
[illegible] ذخیرے کی ضمانت پر چھاپ چھاپ کر جاری کر رہا تھا۔ شروع شروع میں وزیر
[illegible] بہت سے لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہا کہ
[illegible] ہو۔ لیکن بعد میں ناقابل انکار شہادتوں کی موجودگی میں
INFLATIONARY GAP) [illegible]
[illegible] بینک کی طرف سے قرضوں کی ترقی کرنے کے لئے جا
[illegible] ریزرو بینک میں [illegible] آکر مسترد نہیں ہو جاتا
[illegible]

قیمتوں کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس افراطِ زر کے خطرے کو پر کرنے کے لئے مذکورہ بالا بیانات نے ایک طرف تو وہ کارروائیاں اختیار کیں جن کا تذکرہ نئے محاصل کے عائد کرنے کے سلسلے میں اوپر کیا جا چکا ہے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر ہندوستانیوں سے قرض لینے کا کام شروع کیا گیا تاکہ نئے جاری شدہ نوٹوں کو قیمتوں کے بڑھانے کا موقع نہ مل سکے لیکن یہ کارروائیاں بعد میں اختیار کی گئیں اور داخلی قیمتوں کی موجودہ گرانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں حکومتِ ہند کو جیسا چاہئے تھا ویسی کامیابی ابھی تک نہیں ہو سکی۔

بہر حال یہ موضوع ایک جداگانہ بحث چاہتا ہے۔ ہم نے دراصل اسٹرلنگ کے ذخیروں میں جو غیر معمولی اضافہ ہو رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کے نظام زر کے پیشگی مطالعے کو ضروری سمجھا تھا۔ اس لئے اس تمہیدی گفتگو کے بعد دوبارہ ہم اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

موجودہ جنگ کے زمانے میں ایک طرف تو ہندوستان کا توازن تجارت بہت موافق ہو گیا یعنی ہندوستان نے برطانیہ اور دوسرے ملکوں کو اپنا مال برآمد زیادہ کیا اور ان کا مال درآمد کم کیا اس زاید برآمد کی قیمت انھوں نے ریزرو بنک میں اسٹرلنگ جمع کر کے اور اس کی ضمانت پر روپے کے نوٹ چھپوا کر ہندوستانی تاجروں کو ادا کرائی۔ دوسرے سلطنت برطانیہ اور دوسری متحدہ حکومتوں کی طرف سے جو فوجی مصارف ہندوستان میں کئے گئے ان کی ادائی بھی اس طرح ہوئی کہ ریزرو بنک میں اسٹرلنگ جمع کئے گئے اور ان کی ضمانت پر روپے کے نوٹ ہندوستان میں چھپوا کر ہندوستانی صناعوں، ٹھیکیداروں، تاجروں اور مزدوروں کے مطالبوں کا بھگتان کیا گیا۔ تیسرے حکومتِ ہند نے حکومتِ برطانیہ کی طرف سے کچھ اور بھی ایسے متفرق اخراجات ہندوستان میں کئے جن کی ادائی حکومت برطانیہ کی طرف سے اسٹرلنگ میں کی گئی جو ریزرو بنک کے ذخیرہ محفوظ میں جمع ہوئے اور ان کی بنیاد پر روپے کے نوٹ چھاپ کر ہندوستان کے لوگوں کے مطالبے بیباق کئے گئے۔ غرض ان مختلف طریقوں سے ریزرو بنک آف انڈیا کے ذخیرہ محفوظ

میں اسٹرلنگ تیزی کے ساتھ جمع ہونے لگے۔

جب اسٹرلنگ بہت زیادہ جمع ہوگئے تو ان کے ذخیرے سے فائدہ اٹھانے کی ایک صورت یہ نکالی گئی کہ حکومت ہند کے ذمے جو قرض اسٹرلنگ کی صورت میں واجب الادا تھا اس کو بیباق کرنے کی کارروائی اختیار کی گئی۔ یہ قرض ۱۹۳۸-۳۹ء میں یعنی جنگ سے پہلے تین ارب ۵۰ کروڑ ۵۰ لاکھ تھا۔ اب اس کے بیشتر حصے کو بیباق کر دیا گیا ہے اور صرف ۱۲ کروڑ باقی رہ گیا ہے جو اس لیے نہیں ہو سکا ہے کہ اس کا ادا کرنا حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس کثیر قرض کے بیباق ہو جانے کی وجہ سے ہندستان کی مالی حالت بہت مضبوط ہوگئی ہے اور بین الاقوامی منڈی میں اس کا اعتبار بہت بڑھ گیا ہے۔ خارجی مقروضیت کی وجہ سے اس کی سیاسی ترقی میں جو ایک رکاوٹ حائل تھی وہ دور ہوگئی ہے۔ لیکن اس قرض کے ادا کرنے کے بعد بھی رزرو بنک کے ذخیرۂ اسٹرلنگ میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے اجتماع اور اضافے کی رفتار اس قدر تیز رہی کہ ۳۰ مارچ ۱۹۴۶ء کو تیرہ ارب ۶۳ کروڑ کے اسٹرلنگ فاضلات رزرو بنک میں موجود تھے۔ ہندوستان کی حیثیت مقروض ملک کی جگہ اب قرض خواہ ملک کی ہوگئی ہے۔ برطانیہ نے بیسیوں سال کے دوران میں جو رقم ہندوستان کو آہستہ آہستہ قرض دی تھی۔ ہندوستان نے تین چار سال کی مختصر مدت میں نہ صرف اسے ادا کر دیا ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ قرض کا بوجھ خود برطانیہ پر لاد دیا ہے۔

اس تبدیلی کا خلاصہ ذیل کے جدول میں اسٹرلنگ کی رسد کے ذرائع اور اس کے استعمال کے طریقوں کو درج کرکے پیش کیا گیا ہے:-

رسد کے ذرائع :-

۱۔ اگست ۱۹۳۹ء میں رزرو بنک کے پاس اسٹرلنگ کا ذخیرہ	۶۴ کروڑ روپے
۲۔ جنوری ۱۹۴۶ء تک رزرو بنک کی طرف سے اسٹرلنگ کی خریداری	۱۰ ارب ۳۳ کروڑ روپے

۲۔ حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کو اسٹرلنگ
کی ادائی ۱۲ ارب ۱۰ کروڑ روپے

میزان ۱۹ 〃 ۴۲ 〃 〃

استعمال کے طریقے :۔

۱۔ اسٹرلنگ قرضے کی ہندوستان کی طرف سے ادائی	۲ ارب روپے
۲۔ دیگر مصارف اسٹرلنگ	۲ 〃 ۲۰ کروڑ روپے
۳۔ جنوری ۱۹۴۸ء کے آخر میں رزرو بنک میں اسٹرلنگ کا ذخیرہ محفوظ	۱۳ 〃 ۴ 〃 〃
میزان	۱۹ 〃 ۴۲ 〃 〃

اسٹرلنگ کے قرضے کی ادائی کے علاوہ ہندوستان نے دوسرے حسب ذیل اسٹرلنگ کے مطالبوں سے اپنے آپ کو بری الذمہ کر لیا ہے :۔

۱۔ ریلوے کے سالانہ سود کو یکبارگی ادا کر دیا اور ان کے قرضے کے تمسکات کو بیباق کر دیا	۴۲ ملین پونڈ
۲۔ کمپنی کے انتظام میں جو ریلیں تھیں انھیں خرید لیا	۲۸ 〃 〃
۳۔ چیٹ فیلڈ کمیٹی کے سلسلے کے قرض کو ادا کر دیا	۱۸ 〃 〃
۴۔ غیر موثر مطالبوں کی ادائی کو حکومت برطانیہ کے سپرد کر دیا۔	۱۵ 〃 〃

ان سب کاموں کے کرنے کے باوجود ہندوستان کے پاس کثیر مقدار میں اسٹرلنگ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اس مسئلے نے کہ اسے جنگ کے بعد کس طرح استعمال میں لایا جائے بہت اہمیت اختیار کر لی ہے۔ گذشتہ سال جب ہندوستان کے مذہبی مالیات سر [illegible]

انگلستان گئے تھے تو انھوں نے برطانیہ کے محکمۂ مال کے عہدہ داروں سے اس کے بارے میں کچھ گفتگو کی تھی اور آیندہ کے فیصلوں کے لئے زمین کو ہموار کیا تھا۔

جولائی ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے شہر برٹین ووڈز میں جو بین الاقوامی زر کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ہندوستان کی طرف سے ۵ اشخاص کا ایک وفد بھیجا گیا تھا جس میں ہندوستان کے وزیر مالیات سر جیرمی رائس مین۔ ریزرو بنک آف انڈیا کے گورنر سر سی۔ ڈی۔ دیش مکھ اور حکومت ہند کے معاشی مشیر ڈاکٹر سر تھیوڈور گریگری کے علاوہ سر شانمکم چیٹی اور مسٹر اے۔ ڈی۔ شراف شامل تھے۔ اس کانفرنس میں بین الاقوامی ذخیرۂ زر اور بین الاقوامی بنک کے قیام کے مسئلوں پر متحدہ اقوام کے مندوبین نے غور و خوض کیا تھا۔

ہندوستانی وفد نے اس موقع پر اسٹرلنگ فاضلات کے مسئلے کو وہاں اٹھایا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ بین الاقوامی ذخیرۂ زر کی معرفت ہندوستان کے اسٹرلنگ فاضلات بھی ادا کردئے جائیں تاکہ ہندوستان اپنی معاشی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے دنیا میں جہاں چاہے مشینیں اور ضروری سامان خرید سکے۔ لیکن کانفرنس نے اس تجویز کو اس بنیاد پر نامنظور کردیا تھا کہ بین الاقوامی ذخیرہ زر اپنے وسائل کے محدود ہونے کی وجہ سے اس ذمے داری کو پورا نہ کرسکے گا۔

اس لئے اب اسٹرلنگ فاضلات کی ادائی کا معاملہ براہ راست برطانیہ ہی سے طے کرنا ہوگا۔

حکومت ہند کا محکمہ مالیات تعمیر مابعد جنگ کے لئے روپے کی فراہمی کے مسئلے پر بھی غور کررہا ہے۔ ۱۹۴۴ء کا بجٹ پیش کرتے وقت وزیر سر جیرمی رائس مین نے بیان کیا تھا کہ اگر حالات موافق ہوئے تو جنگ کے بعد چھٹے یا پانچویں سال میں ایک ارب سالانہ کی تو تعمیر مابعد جنگ کے کاموں کو پورا کرنے کے لئے نکالی جاسکے گی۔ موافق حالات سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اگر (۱) متحدہ بین الاقوامی کوشش سے روزگار اور

پیداوار دولت کو مکمل طور پر جاری رکھا گیا۔ (۲)، فوج کی برطرفی کی رفتار معقول حد تک تیز رہی اور (۳)، ملک کی اہلیت ادائی محصول سے حکومت نے مستقل مزاجی کے ساتھ پورا پورا فائدہ اُٹھانا جاری رکھا تو ابتدائی ایک سال کے خسارہ کے بعد اس توقیر کو حاصل کرنا ممکن ہوگا

اس کے علاوہ اگر رعایا سے قرض لینے کے ان طریقوں کو جنھیں جنگ کے زمانے میں دریافت کیا گیا ہے جاری رکھا گیا تو یہ توقع ہرگز بے جا نہیں ہے کہ تعمیر مابعد جنگ کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے جنگ کی اولین پنج سالہ مدت گذرنے کے بعد دس ارب روپیوں کو فراہم کیا جاسکے گا۔ اس رقم میں نجی افراد کی سرمایہ کاری شامل نہیں ہے جس کے بارے میں عاملہ حکومت ہند کی منصوبہ ساز کمیٹی کا اندازہ تھا کہ اس ذریعے سے بھی پانچ ارب روپیہ فراہم ہوسکے گا۔ صوبوں اور ریاستوں کی حکومتوں کے وسائل بھی اس رقم میں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔

سر جیرمی رائس مین کی یہ رائے تھی کہ اولین پنج سالہ مدت کے بعد کی پنج سالہ مدتوں میں مالی وسائل کی ترقی دونی اور چوگنی رفتار یعنی ہندسی تناسب سے ہوتی رہے گی۔ لیکن انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ اس نتیجے کو حاصل کرنے کے لئے منصوبہ سازی کو معقول مالی بنیاد پر قائم کرنا ہوگا۔ انفرادی منصوبوں کو اس طرح تیار کرنا ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع بخش ثابت ہوں اور ایسی اسکیموں کو ترجیح دینا ہوگی جو بلا واسطہ طریقے پر دولت اور خوش حالی کی ترقی کا موجب ہوں گی اور اپنی ترقی سے سرکاری آمدنی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی۔

اپنی آخری بجٹ کی تقریر میں سر جیرمی رائس مین نے مابعد جنگ کی مالیات کے بارے میں اپنے خیالات کچھ اور واضح صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے بتلایا کہ جنگ کے بعد سرکاری محاصل کو بڑھانے کے لئے مندرجہ ذیل ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ زراعتی جائداد کے علاوہ باقی جائداد پر محصول جائداد لگا کر
۲۔ زراعتی آمدنی پر انکم ٹیکس لگا کر۔۔
۳۔ محصول کروڑگیری سے جنگ کے فوراً بعد تو بے مثال آمدنی بڑھائی جاسکے گی لیکن اس کے بعد آمدنی گھٹ جائے گی۔ لیکن پھر بہت سے سالوں تک آمدنی اضافہ کی طرف مائل رہے گی۔ لیکن جب صنعتوں کو ترقی ہونا شروع ہوگی تو آمدنی کے اس ذریعے میں توسیع نہیں ہوسکے گی بلکہ مستقل زوال شروع ہو جائے گا۔
۴۔ مرکزی محاصل اکسائز پر پہلے سے زیادہ بھروسہ کرنا پڑے گا۔
۵۔ محاصل فروخت یا مقررہ مدت کی بکری کے محاصل کی توسیع کرنا ہوگی۔

اس کے علاوہ سرجرمی رالیس مین نے یہ کہا کہ حکومت اپنی آمدنی کے ذرائع میں اضافہ کرنے کے لئے بعض صنعتوں کو بھی اپنی ملکیت اور انتظام میں لے سکتی ہے۔

غرض جنگ کا اثر ہندوستان کی مالیات عامہ پر اور اعتبارات سے چاہے کتنا ہی مضرت رساں کیوں نہ رہا ہو لیکن اس لحاظ سے بہت خوش گوار پڑا ہے کہ اس کی وجہ سے تعمیری کاموں کے لئے روپے کی فراہمی کے امکانات بہت بڑھ گئے ہیں اور حکومت کے لئے کسی تعمیری کام کو یہ عذر کرکے ٹالنا آسان نہیں رہا ہے کہ اس کے لئے وسائل فراہم نہ ہوسکیں گے۔ لارڈ ویول ہندوستان کے موجودہ وائسرائے نے اپنے عہدے کا چارج لینے سے پہلے انگلستان میں ایک تقریر کی تھی جس کا یہ اقتباس اس ضمن میں دلچسپی سے خالی نہیں۔

"مجھے یہ بات ہمیشہ بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے لئے کتنا ہی روپیہ کیوں نہ طلب کیا جائے اس کی فراہمی میں کبھی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن کسی قوم نے آج تک امن کے زمانے کی خرابیوں یعنی افلاس، جہالت بے روزگاری اور بیماری کا مقابلہ کرنے کے لئے اس پیمانے پر روپیہ

فراہم نہیں کیا ہے جس پر جنگ کے لئے کیا جاتا ہے، جب ہم اپنا روپیہ اور کوشش اسی آزادی اور اسی جذبے کے ماتحت جو ہم ہٹلر کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ ان خرابیوں کے دور کرنے کے لئے بھی استعمال کرنے لگیں گے تب حقیقت میں ترقی کا کام شروع ہوگا۔ جس ملک میں میں جا رہا ہوں (یعنی ہندوستان) وہاں افلاس، جہالت اور بیماری کا مقابلہ اتنے بڑے پیمانے پر کرنا ہے جتنا شاید دنیا میں کسی دوسری جگہ نہیں کرنا ہے۔"

وائسرائے ہند کی یہ تقریر ہمارے مستقبل کے وزرا مالیات کے لئے ایک چیلنج ہے کیا وہ اس چیلنج کو قبول کریں گے ؟

روس میں عورتوں کی اصلاح و ترقی اور بچوں کی نگہداشت

بالشوکوں نے روسی قوم کی اصلاح و ترقی کا کام مردوں سے نہیں بلکہ عورتوں سے شروع کیا۔ یورپ اور امریکہ میں عورتوں کی آزادی کی تحریکیں یوں تو متفرق طور پر تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھیں اور آہستہ آہستہ عورتوں کے لئے مردوں کے برابر حقوق حاصل کئے جا رہے تھے لیکن روس میں یہ کام نہایت تھوڑے عرصے میں ایک ہمہ گیر منصوبے کے ماتحت کیا گیا۔ کسانوں اور مزدوروں کی عورتوں کو نہ صرف زمیندار اور سرمایہ دار کے استحصال ناجائز سے آزاد کیا گیا۔ بلکہ باپ اور شوہر کے بے جا اقتدار کی بندشوں کو بھی ختم کیا گیا اور ان کی حیثیت اور ان کے مرتبہ کو ہر لحاظ سے مردوں کے برابر قرار دے دیا گیا۔ چاہے معاملہ شہری حقوق کا ہو، چاہے آمدنی کے حصول اور اس کے صرف کا۔ چاہے رہنماؤں کی جگہوں پر تقرر کا، ہر معاملے میں عورت کو مختار بالذات بنا دیا گیا اور انسانی تعلقات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا اور ایک نئے نظام کے ماتحت دیا گیا۔

روس کی عورتوں کی حالت انقلاب سے پہلے بہت خستہ اور ابتر تھی۔ روس کی آبادی کا دسواں حصہ مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ اسلام نے اپنی ترقی کے ابتدائی روشن دور میں عورتوں کی حیثیت میں ایک انقلابی بلندی پیدا کی تھی لیکن اس کے شاندار کارنامے کو روس اور دیگر اسلامی ملکوں کے مسلمان ایک زمانہ ہوا بھلا چکے تھے۔ ہندوستان کی طرح، روس کے مسلمانوں میں بھی، پردے کا رواج عام تھا اور عورتیں تمام حقوق سے محروم تھیں۔ وہ گیارہ برس کی عمر میں اپنے شوہر کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی تھیں اور ان سے لونڈیوں اور باندیوں کی طرح کام لیا جاتا تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ قانونی طور پر اس کے قریب ترین عزیز کی ملکیت میں پہنچ جاتی تھیں اور ان کا شمار گھر کے برتن بھانڈے، بھیڑ بکری اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ کیا جانے لگتا تھا

در باصل ان ہی چیزوں کی طرح انھیں بھی کسی اچھے گاہک کے ہاتھ فروخت کیا جاسکتا تھا۔
جن عورتوں کا تعلق عیسائی مذہب سے تھا ان کی حالت بھی اس سے بہتر نہیں تھی۔ انھیں اپنے شوہر کے مقابلے میں کسی قسم کا کوئی قانونی حق حاصل نہ تھا۔ زار روس کے شہری قانون میں یہ بات صراحت کے ساتھ بیان کردی گئی تھی کہ "عورت کو ہر معاملے میں شوہر کی اطاعت کرنا چاہیے اور کبھی بھی اس کی نافرمانی نہیں کرنا چاہیے" (دفعہ ۱۰۰ جلد دہم) وہ اجرت پر کوئی کام اس کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتی تھی۔ (دفعہ ۲۰۲ جلد دہم) اگر کوئی عورت معلم، نرس یا ٹیلیگراف اپریٹر بن جاتی تھی تو شادی ہوجانے پر فوراً برطرف کردی جاتی تھی۔ شادی شدہ عورت کو عام طور پر پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا بلکہ شوہر کے پاسپورٹ پر بیوی کا نام درج کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ شوہر کے بغیر اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتی تھی۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے اجازت حاصل کئے بغیر کہیں چلی جاتی تھی تو پولیس والے ایک مفرور قیدی کی طرح پکڑ کر گھر واپس پہنچا دیتے تھے۔ نہایت ظالم اور غیر موزوں شوہر سے بھی عورت کسی صورت سے علیحدہ نہیں ہوسکتی تھی۔ شوہر اگر طلاق کے لئے رضامند بھی ہوجاتا تھا تب بھی یہ صورت ممکن نہیں تھی۔ تقریباً تمام کسان عورتیں اور شہر کی تین چوتھائی عورتیں ناخواندہ تھیں۔ ٹالسٹائی نے اپنے ڈرامے "تاریکی کی طاقت" میں روس کی دیہاتی عورت کی حالت کا نقشہ کسان میٹریش کی زبانی ان الفاظ میں کھینچا ہے "کسان کی عورت کیا ہے محض ایک نکمی اور ردی چیز۔ یہ نپٹ اندھی اور بہری ہے۔ یہ بالکل کچھ نہیں جانتی۔ اس نے کبھی کچھ دیکھا ہے نہ سنا ہے۔ ایک مرد تو کسی شراب خانہ یا جیل خانہ یا فوج میں جہاں اسے دوسرے آدمیوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے کچھ سیکھ بھی لیتا ہے لیکن ایک عورت سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ کیا اسے کوئی پڑھاتا ہے؟ اس کو سکھلانے والا تو بس ایک ہی ہوتا ہے یعنی وہ شراب میں مدہوش خر رنگ (کسان) جو اس پر اپنے کوڑے برساتا ہے اور یہی تعلیم کا وہ کام ہے جو اسے میسر آئی ہے"

غرض روس کی نصف بالغ آبادی کی حالت ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے وقت کچھ اس قسم کی تھی۔

انقلاب کے ایک ہی سال بعد نومبر ۱۹۱۸ء میں سارے روس کی مزدور اور کسان عورتوں کی کانفرنس ماسکو میں منعقد کی گئی جس میں ۱۲۰۰ مندوبین شریک ہوئیں۔ یہ سوویٹ روس کی دس لاکھ مزدور عورتوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ عورتوں کے اندر انقلاب نے ایک حرکت پیدا کر دی تھی اور ان کی یہ تحریک آپ ہی آپ چل رہی تھی۔ روس میں عورتوں کی آزادی کی تحریک کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ عورتوں کی قانونی یا انتخابی نا اہلیتوں کو دور کیا جائے بلکہ ان کی معاشی اور خانگی ماتحتی کو دور کرنا بھی مساوی اہمیت رکھتا تھا۔ لینن نے ایک موقع پر کہا تھا "سوشلزم کی فتح اس وقت تک ناممکن ہوگی جب تک کہ انسانیت کا پورا نصف حصہ یعنی محنت کش عورتیں، مردوں کے برابر حقوق حاصل کرنے سے معذور رہیں گی اور وہ گھر اور خاندان کے اندر غلاموں جیسی زندگی بسر کرتی رہیں گی۔" یہی وجہ تھی کہ روس کے تمام قوانین اور عاملہ کے احکامات میں جنسی مساوات کو ایک بنیادی اصول قرار دیا گیا۔ چاہے عورت شادی شدہ ہو چاہے تنہا۔ ہر صورت میں رائے دہندگی کے معاملے میں اس کی اہلیت مرد کے مساوی تسلیم کی گئی۔ سرکاری عہدوں پر تقرری کے لئے اُسے مردوں کے مساوی موزوں سمجھا جانے لگا۔ وہ پوری آزادی کے ساتھ ٹریڈ یونین، کوآپریٹو سوسائٹی اور دیگر تمام انجمنوں کی رکن بننے لگی۔ ایک ہی طرح کے کاموں کے لئے اُسے وہی معیاری اجرت دی جانے لگی جو مردوں کو دی جاتی تھی اور اُسے ہر قسم اور ہر درجے کی ملازمت اور روزگار کے لئے مردوں کے برابر موزوں سمجھا جانے لگا۔ شادی سے پہلے جن چیزوں پر اس کی ملکیت قائم ہوتی تھی، شادی کے بعد ان چیزوں پر اس کی ملکیت جاری رہتی تھی۔ شادی کے زمانے میں رشتۂ ازدواج کے دونوں فریق جو چیز بھی حاصل کرتے تھے اس میں دونوں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ شادی کو طلاق کے ذریعے ختم کرنے کے سلسلے میں عورت کو بھی وہی حقوق دیئے گئے، جو مردوں کو حاصل تھے۔ شادی کے

زمانے میں جو اولاد پیدا ہوتی تھی طلاق کے بعد اس کی کفالت اور رشتہ ازدواج کے دونوں فریق میں سے جو بھی حاجت مند ہو اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری مساوی طور پر قبول کرنا پڑتی تھی۔ ان تمام حقوق ہی کی بنیاد پر لینن نے سنہ ۱۹۲۰ء میں اس بات کا دعوے کیا تھا کہ دنیا میں روس کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں عورت کو ان محرومیوں اور نا قابلیتوں سے جن کا وہ رسم و رواج یا قانون کی بنا پر شکار تھی اتنے مکمل اور غیر مشروط طریقے پر آزاد نہیں کیا گیا جیسا کہ دول ہائے متحدہ اشتراکی روس میں کیا گیا ہے۔ قانونی طور پر مرد اور عورت میں مکمل مساوات قائم کر دی گئی ہے اور ہر جگہ اس کو خلوص کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ عورتوں کو معاشری تنظیم قانون اور حکومت کے کام میں پوری طرح شریک کیا جا رہا ہے۔ تمام درسگاہیں ان کے لئے کھلی ہوئی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی جماعتی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو ترقی دے سکتی ہیں۔ مشترک مطبخ، پبلک طعام خانے، دھوبی گھر، مرمت کی دکانیں، شیر خوار بچوں کی پناہ گاہیں، کنڈر گارٹن، بچوں کے گھر اور ہر قسم کی دوسری درسگاہیں، قائم کی جا رہی ہیں۔ روس اپنے پروگرام کی اس شق کو کہ ہر گھر کے جدا جدا معاشی اور تعلیمی فرائض جماعت کے مشترکہ انتظام میں لے آئے جائیں سرگرمی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ عورت گھر کی غلامانہ مشقت اور مرد کی ماتحتی سے آزاد ہو جائے گی اور وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں اور میلانوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے گی۔ بچوں کی پرورش بھی گھر کے مقابلے میں بہتر ماحول میں کی جانے لگی ہے۔ ہمارے ملک میں مزدور عورتوں کی حفاظت کے لئے جیسے قوانین ہیں دنیا میں ایسے کہیں نہیں ہیں۔ ٹریڈ یونین کے عہدہ دار قوانین کی تعمیل کراتے رہتے ہیں۔ زچگی کے ہسپتال، ماؤں اور بچوں کے لئے گھر، مادریت کی تعلیم گاہیں جہاں یعنی شاہد علامت ماں بننے کی تعلیم دی جاتی ہے، بچوں کی نگہداشت کے لئے گھروں کا کورس، ماؤں کو یہ سکھانے کے لئے کہ اپنے بچوں کی اور خود اپنی خبر گیری کس طرح کرنی چاہئے نمائشیں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں قائم کی جا رہی ہیں۔ جو عورتیں بے روزگار یا بے سہارا ہیں ان کے

گذر بسر کرنے کے انتظامات کے لئے بھی سنجیدگی کے ساتھ کوشش کی جارہی ہے :[1]

یہ بیان تحریک کے آغاز کے وقت کا ہے لیکن اب تقریباً بیس پچیس برس گذرنے کے بعد جب ترقی کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آزادی کے نتائج نہ صرف عورتوں کی عملاً آزادی کی صورت میں بہت شاندار برآمد ہوئے ہیں بلکہ اس کا اثر عورتوں کی دماغی اور جسمانی نشو و نما پر بہت پسندیدہ ثابت ہوا ہے۔اس دوران میں نہ صرف ان کی تندرستی اور طوالت عمر میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کے ذہنی کارنامے اور ہر شعبۂ زندگی میں ان کی کامیابیاں نہایت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہیں ۱۹۱۷ء میں عورتوں میں ناخواندوں کا تناسب مردوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا لیکن اب بالغوں میں بہت کم ایسے لوگ رہ گئے ہیں جو کم از کم پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتے ۔ مدرسوں میں لڑکیوں کا تناسب تقریباً اتنا ہی ہے جتنا کہ لڑکوں کا ہے ۔ روس میں مزدوروں کی جو کمی نہ صرف صنعتوں اور ہلکی صنعتوں میں بلکہ زراعت اور دفتری صنعتوں میں پائی جاتی تھی عورتوں کے آزاد ہو جانے کی وجہ سے اس میں بہت کمی واقع ہوگئی ہے ۔

روس میں معلموں اور ڈاکٹروں کی فہرست میں عورتوں کی تعداد دو تہائی کے قریب ہے اور مخصوص طور پر تربیت یافتہ ماہرانِ زراعت میں ان کا تناسب بہت زیادہ ہے سائنس کی تحقیقات کے ہر شعبے میں ان کی اکثریت ہے ۔ ان سند یافتہ صنعتی ماہروں میں جو پنج سالہ یونیورسٹی نصاب پورا کرتے ہیں، اور جنھیں سالانہ روز افزوں تعداد میں مشین سازی مرمت مشینری کیمیادی اور بجلی کے کارخانوں میں بھرتی کیا جاتا ہے، عورتوں کا تناسب تقریباً ایک تہائی ہے ریل چلانے والوں اور ریل کے انتظامی عملہ میں بھی اُن کی تعداد بہت خاصی ہے مختصر یہ کہ عورتیں ہر پیشے میں کام کرتی ہوئی ملتی ہیں حتیٰ کہ فوج تجارتی بیڑہ اور ہوائی جہاز میں بھی عورتیں کام کرتی ہیں ۔ سفارت کے کام پر بھی مامور کی جا چکی ہیں۔ وزیر مالیات بھی رہ چکی ہیں اور

[1] "سوویٹ روس کی عورتیں" از فینا ہیلے (۱۹۴۳) صفحہ ۹۷

سینکڑوں عورتوں کو غیر معمولی خدمات کے صلے میں لینن کے تمغے اور شرٹ [illegible] کے تمغے عطا
کئے گئے ہیں۔

روس کی عورتیں اور مادریت کی ذمے داری

لیکن عورت کی اصلاح و ترقی کا کام صرف اسی طرح ختم
نہیں ہو جاتا کہ اُسے قانونی اور سیاسی بندشوں سے آزاد کر دیا جائے یا معاشی محرومیوں سے
اُسے نجات دلادی جائے۔ عورت کے ذمے ایک مخصوص فریضہ عائد کیا گیا ہے جس کو نہایت زبردست
پبلک اہمیت حاصل ہے اور اس کی انجام دہی میں اُسے نہ صرف اپنی تندرستی کو سخت خطرے
میں ڈالنا پڑتا ہے بلکہ سرمایہ دارانہ ملکوں میں ان کے مالی بوجھ سے بھی والدین کی کمر ٹوٹ
جاتی ہے۔ ان ملکوں میں محض زچگی اور شیر خوار بچے کی نگہداشت کے خرچ بعض وقت
اتنے ہو جاتے ہیں کہ اُجرت پیشہ طبقہ ان کے بوجھ سے عمر بھر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا
اور حزن و افلاس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ صدیوں تک ایسے موقعوں پر بھی خیر و خیرات
کے ذریعے امداد کی جاتی رہی۔ کہیں کہیں (مثلاً انگلستان میں) غربا کی امداد کے لئے جو
سرکاری انتظامات تھے اور جن کے قبول کرنے کی وجہ سے آدمی اپنے ہم چشموں میں ذلیل اور
کم حیثیت سمجھا جانے لگتا تھا ان میں اس امداد کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔ موجودہ صدی میں بعض
ملکوں نے اپنے معاشری بیمے کے قومی انتظامات میں زچگی کے زمانے کی ایک مختصر اور
ناکافی امداد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ لیکن بالشویکوں کے یہاں ابتدا ہی سے حاملہ عورت کو
سرکار کی طرف سے جملہ سہولتیں اور رعایتیں فراہم کرنا نہایت ضروری سمجھا گیا تاکہ وہ اپنے
فرائض کو جو اس پر ماں، دولت آفریں کارکن اور شہری کی مختلف حیثیتوں سے عاید ہوتے
ہیں حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے سکے۔ جس طرح ایک مرد کو وہ تمام مصارف سرکار
کی طرف سے ادا کر دئے جاتے ہیں جو وہ اپنے فرائض منصبی کی بجا آوری کے دوران میں [illegible]
طرف سے کرتا ہے اسی طرح عورت کو بھی اپنے مخصوص فرائض منصبی یعنی بچہ داری کے خیال سے
جو مصارف اُٹھانا پڑتے ہیں ان کی ادائی کی ذمے دار سرکار ہوتی ہے

روس سرکار کی طرف سے اُس کے اس دردوارے اسامی کے ساتھ جو اس سلسلے میں ناگزیر طور پر اُسے برداشت کرنا پڑتا ہے انتہائی ہمدردی کی جاتی ہے روس میں بچہ داری کے جو مصارف کو جہاں تک ممکن ہے مفوضہ فرائض منصبی کی انجام دہی کے مصارف میں داخل سمجھا جاتا ہے۔

اگر کوئی عورت شہر یا دیہات میں اجرت یا تنخواہ پر یا تو خود ملازم ہوتی ہے یا اس کا شوہر ملازم ہوتا ہے اور وہ ماں بننے والی ہوتی ہے تو سوویٹ سرکار سب سے پہلے تو حمل کے زمانے میں اس کی طبی نگہداشت کا بلا معاوضہ انتظام کرتی ہے۔ پھر زچگی کے ہسپتالوں میں اس کا داخلہ کراتی ہے ۱۲ سے ۱۶ ہفتے تک کی رخصت با تنخواہ دیتی ہے (یعنی ۶ سے ۸ ہفتے کی رخصت وضع حمل سے پہلے اور اتنی ہی مدت کی رخصت وضع حمل کے بعد) اس دوران میں طبی نگہداشت اور امداد کا مسلسل انتظام رکھتی ہے جب وہ طبی طور پر تندرست قرار دے دی جاتی ہے تو اپنی پرانی جگہ پر دوبارہ مقرر کئے جانے کی مستحق ہوتی ہے اور ہر ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اُسے بچہ کو دودھ پلانے کی مہلت دی جاتی ہے بچے کے کپڑوں کے لئے بھی اُسے روپیہ دیا جاتا ہے اور پہلے سال کے دوران میں بچے کی غذا کے لئے بھی ایک ماہانہ عطیہ دیا جاتا ہے اور بچوں کی سرکاری پرورش گاہ میں بچے کے لئے جب تک اس کی عمر دو مہینے اور ۵ سال کے درمیان رہتی ہے ایک نشست محفوظ کر دی جاتی ہے تاکہ جب ماں کام کر رہی ہو تو سرکاری دایہ اس کے بچے کی نگرانی کرتی رہے۔ سوویٹ سرکار کی طرف سے ان تمام رعایتوں کا منشا یہ ہے کہ عورت ماں بننا ایک لعنت، مصیبت یا حقیر اور تکلیف دہ چیز نہ سمجھے بلکہ جتنا طبعی طور پر ممکن ہے ماں بننے کے بعد بھی ہر پیشے میں اُسے کام کرنے کی اتنی ہی آزادی حاصل رہے۔ اپنے کام میں اس کی دولت آفرینی کی اہلیت اتنی ہی زیادہ اور اس کی آمدنی اتنی ہی اچھی رہے جتنی کہ ماں بننے سے پہلے تھی۔

بچوں کی نگہداشت روس میں ولادت سے لے کر کنڈر گارٹن یا ابتدائی مدرسے کے داخلے

تک بچوں کی نگہداشت کا وسیع پیمانہ پر انتظام کیا گیا ہے۔ یہ انتظام ابھی تک سارے ملک میں نہیں پھیل سکا ہے، لیکن تیزی کے ساتھ شہروں سے شروع ہو کر دیہاتوں میں پہنچتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں جو ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے ذمے بچوں کی پوری دیکھ بھال سپرد کی گئی ہے۔ وہ انہیں غذا بھی کھلاتے ہیں، کپڑے بھی پہناتے ہیں۔ نہلاتے دھلاتے بھی ہیں۔ پڑھاتے بھی ہیں۔ تربیت بھی دیتے ہیں اور ان کی تفریح و دلبستگی کا بھی انتظام کرتے ہیں۔

ان اداروں میں سب سے اول تو "مرکز مشاورت" کا نمبر آتا ہے۔ جس کے فرائض میں ہر بچے والی ماں کو مشورہ دینا داخل ہوتا ہے۔ زچگی کے زمانے سے ان کے مشوروں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر، نرسیں اور مشیر قانونی مستقل طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ دودھ کے مطبخ بھی ہوتے ہیں جہاں سے بچوں کو معقانہ دودھ کا راشن تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ ماؤں کو اپنے بچوں کو چھوڑنے سے باز رکھیں اور اگر اس میں وہ کامیاب نہ ہوں تو ان کے بچوں کے پالنے کا مناسب انتظام کریں۔ اس کام کے لئے سب سے پہلے تو وہ حاملہ عورتوں پر نگرانی رکھتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمت بڑھاتے ہیں اور انہیں ضروری قانونی مشورے دیتے ہیں۔ اگر اس میں وہ ناکام رہتے ہیں تو پہلے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایسے بچوں کو دوسرے لوگ گود لے لیں۔ جب یہ بھی ممکن نہیں ہوتا تو وہ ان مخصوص اقامت خانوں میں جو اس کام کے لئے ان کی زیر نگرانی رکھے گئے ہیں، بچوں کو داخل کر لیتے ہیں۔

مرکز مشاورت کے بعد بچوں کی نگہداشت کے کام میں دوسری منزل یہ ہے کہ پھولگھر (کریشز) کا انتظام کیا جائے جس میں دو مہینے کی عمر سے بچوں کی نگہداشت کی جانے لگتی ہے۔ اس نگہداشت کی مختلف موقعوں پر ضرورت ہوتی ہے مثلاً جب ان کی ماں اپنے کام پر جاتی ہے یا شام کے وقت کلب میں جاتی ہے یا تفریح کے لئے نکلتی ہے۔ [illegible]

ریل کے ڈبوں میں بھی ان پرورش گاہوں کا انتظام رکھا جاتا ہے تاکہ سفر کرنے والی ماؤں کو اپنی اولاد کی وجہ سے کسی مخصوص زحمت اور دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس قسم کی پرورش گاہیں روس میں بہت زیادہ ہیں۔ اور ان کی تعداد میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ان کا مقصد یہ ہے کہ ان کو جہاں تک ہو سکے بچوں کی مسلسل نگہداشت کے سخت اور جاذب توجہ کام سے آزاد کیا جا سکے۔ چنانچہ جہاں کہیں اس قسم کی پرورش گاہیں موجود ہیں وہاں دن کے کم از کم ایک تہائی حصے کے لئے ماں اپنے بچے کی ذاتی نگہداشت سے آزاد ہو جاتی ہے۔ اور ان پرورش گاہوں کا خرچ اسے خود برداشت نہیں کرنا پڑتا بلکہ سرکار ان کا انتظام کرتی ہے

مشاورت کے مرکزوں، دودھ کے مطبخوں اور پرورش گاہوں کے علاوہ ملک کے اندر آیہ خانوں، گہواروں کے مدرسوں اور کنڈرگارٹنوں کا بھی ایک جال بچھا ہوا ہے جو روز بروز زیادہ پھیلتا جا رہا ہے۔ ان سب انتظامات کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری سے بڑی حد تک کپڑے کی ذمے داری سے ایک جزئی حد تک اور طبی نگہداشت کی ذمے داری سے مکمل طور پر والدین بچے کی پیدائش سے کر سات آٹھ برس کی عمر تک بڑی حد تک بری ہو گئے ہیں اور یہ کام سرکار نے خود اپنے ذمے لے لیا ہے۔ لیکن یہ ذمے داری اس طرح لی گئی ہے کہ بچوں کو اپنے گھر اور اپنی ماں کی ذاتی نگرانی سے علیحدہ نہیں کیا گیا ہے۔ لوگوں میں امداد اور خیرات کا کوئی باعث ذلت احساس پیدا نہیں ہونے دیا گیا ہے اور نہ لوگوں میں والدین کی ذمے داری کو کسی طرح کم کیا گیا ہے۔ خانگی زندگی کی یکجہتی اور آزادی میں اگر اس کی وجہ سے کوئی خرابی یا ابتری پیدا ہوئی ہے تو وہ بلاشبہ اس سے کم ہے جتنی کہ سرمایہ دار ملکوں میں طبقۂ متوسط یا طبقۂ اعلیٰ کے بچوں کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔

انضباط تناسل | روس کی شرح پیدائش اور شرح اضافہ آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہاں مانع حمل طریقوں کے استعمال کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہوگی لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے روس میں انضباط تناسل کی اختیاری کوششیں ہالینڈ، آسٹریلیا، فرانس، جرمنی، انگلستان

اور امریکہ سے بھی کم کی جاتی ہیں۔ وہاں ماں بننا اور بچے رکھنا ایسی مصیبت نہیں ہے جیسی کہ دیگر ملکوں میں ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں مانع حمل طریقوں کو استعمال کرنا یا ان کے بارے میں گفتگو کرنا قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ بلکہ صورت اس کے برعکس ہے۔ شہر والے اس موضوع پر نوجوان اور بوڑھے آزادی سے بحث کرتے ہیں۔ تعلیمی پوسٹروں اور طبی مشوروں میں بھی اس کو خاصی اہمیت دی جاتی ہے۔ مشورہ گاہوں، سفری اسپتالوں اور کلینک میں اس کے بارے میں ہدایت اور تعلیم کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا ہے اور لوگ اس سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔ اور اس معاملے میں جو بے تکلفی اور آزادی پائی جاتی ہے اسے بالکل معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

غرض عورتوں اور بچوں کے لئے روس میں بہتر حالات پیدا کرنے کی یہ کوششیں ہیں جو کی جا رہی ہیں۔

دلی کی لاہوری برادری

(گذشتہ سے پیوستہ)

ضمیمہ

لاہوری برادری کے ممتاز لوگوں کا تعارف | لاہوری برادری صناع برادری ہے۔ صنعت میں جو لوگ نامور ہیں وہی برادری کے ممتاز آدمی ہیں اس سے قطع نظر کہ ان کا شمار ان بزرگوں میں ہے یا نہیں اس لئے یہاں پر ہم صنعت کے صرف ان ماہروں کا ذکر کرتے ہیں جو اپنے کمال ہنرمندی سے ساری برادری میں ممتاز ہیں۔ علمی پیشوں اور ملازمت کے پیشے کے ماتحت چند نام خانہ پری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لئے دے گئے ہیں۔ اسی طرح مرحوم شاعروں کے نام محض حوالے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ڈزائنر عبدالرؤف صاحب، پہاڑ گنج زیورات کے نمونوں کا نقشہ بنانے میں مشہور ہونہار کاریگر ہیں اور تمام ہندوستان کے جوہری ان سے رجوع کرتے ہیں۔

انگریزی | منشی ممتاز الدین صاحب، پہاڑ گنج۔ انگریزی نگ (جڑائی) میں انگریزی وضع کے کام کے استاد ہیں۔

سادہ کار، متعلقہ صنعتوں کے ساتھ | (۱) چودھری محمد یوسف صاحب، کوچہ رائے مان۔ اُن کے بزرگ قلعہ دہلی میں کام کرتے رہے۔ یہ شاہی صناع کہلاتے ہیں۔

۲۔ محمد اصغر صاحب، کوچہ استاد حامد۔ مشہور سادہ کار اور جوہری ہیں متمول اور برادری میں باثر ہیں

۳۔ حاجی حبیب احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ اعلیٰ درجے کے سادہ کار ہیں۔ ضمنی خصوصیات شکار کی بے مثل مہارت ہے جو باپ دادا سے ورثے میں چلی آتی ہے۔ یہ برادری کے ممتاز چودھری ہیں۔

(۴) عنایت الرحمٰن صاحب ، پہاڑ گنج ۔ نامور اور اعلیٰ درجے کے استاد ہیں ۔ ان کے والد مرحوم کو ان کے صنعتی کمال کے اعتراف میں امیر حبیب اللہ والیٔ کابل نے ۲۰۰ ماہوار وظیفہ دیا اور افغانستان سے کچھ کاری گر ان سے سادہ کاری سیکھنے کے لئے بھیجے تھے

(۵) سعادت اللہ ، باڑہ ہندو راؤ ۔ بڑھیا سادہ کاروں میں ان کا شمار ہے صنعتی صنعت فن آتش بازی میں ان کو کمال مہارت ہے ۔ شاہی زمانے کی صنعت آتش بازی میں بے نظیر ہیں

(۶) نیاز احمد عرف نیازی ۔ صدر بازار ۔ گلٹ اور چاندی کے کام کے ملنے ہوئے کاری گر ۔ فنِ ہیراکی کے زبردست استاد ہیں ۔ ہندوستان کے سینکڑوں نامی ہیراک ان کے شاگرد ہیں ۔

مذکورہ بالا ماہرینِ صنعت کے علاوہ مندرجہ ذیل سادہ کار بہت مشہور کاری گر ہیں :- الطاف احمد ، سادہ کار ، پہاڑ گنج ۔ حافظ عبدالعلیم سادہ کار ، پہاڑ گنج ۔ محمد احمد عرف ممد سادہ کار ۔ جمیل الرحمٰن ، امین الرحمٰن سادہ کاران ۔ اخلاق احمد ، سادہ کار ۔ فخرالدین ۔ سادہ کار ۔

مصوّر استاد عبدالکریم مرحوم ۔ عبدالحمید مرحوم (پہاڑ گنج) اور محمد حسین مرحوم (کوچہ چیلان) پچھلے برسوں میں مشہور ہند استاد مصور رہے ہیں ۔ ہاتھی دانت کی پلیٹ پر تصویر بنانے کے کام میں یہ دہلی کے سب سے بڑے استاد تھے ۔ ریاستیں ان کی سرپرستی اور قدر افزائی کرتی تھیں ۔ ان کے کام کے بعض نمونے آگرہ اور دہلی کے قلعہ کی آرٹ گیلری میں دیکھے جا سکتے ہیں ان اساتذۂ فن کے انتقال کو کچھ ہی سال گذرے ہیں ۔ موجودہ نسل کے نامی مصور مندرجہ ذیل ہیں اور خاص شہرت رکھتے ہیں :-

(۱) محمد ظفر صاحب نبیرہ مشہور استاد محمد فضل مصور ۔ احسن خاں صاحب مصور ۔

نقاش عبداللہ نقاش اور ان کے بیٹے عبدالرحمٰن نقاش مشہور طلاکار نقاش رہے ہیں ۔ دونوں کا انتقال ہو گیا ہے ۔ حبیب الرحمٰن نقاش برادری کے نہایت ممتاز اور مشہور رکن

نقاش تھے۔ افسوس ہے چند برس پہلے وہ جوان موت مرگئے۔ ان کی اعلیٰ درجہ کی گل کاری، نقاشی اور طلاکاری کے نمونے دہلی کے لال قلعہ، سلطان نظام الدینؒ کے آستانے کی دیواروں اور وائسریگل ہاؤس دہلی کے ایوان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ صنعت لاہوریوں کی خصوصیت تھی لیکن اس صنعت کے کمال کا مالک کوئی لاہوری کاریگر اب نظر نہیں آتا۔ بظاہر یہ صنعت لاہوریوں سے اب ختم ہوتی معلوم ہوتی ہے۔

پیتل کی صنعت، ظروف سازی | خلیفہ نثار احمد صاحب، پہاڑ گنج۔ برنجی ظروف سازی میں تمام دہلی میں ممتاز ہیں۔ سینکڑوں اس صنعت میں ان کے شاگرد ہیں۔ یہ برادری کے چودھری ہیں۔

استاد سراج الدین، محلہ گردھیا، ظروف سازی میں باکمال استاد ہیں۔ مذکورہ بالا استادوں کے علاوہ پیتل اور چاندی کی صنعت ظروف سازی اور چاندی کے بڑے کام میں مندرجہ ذیل کاریگر ممتاز ہیں:۔

محبوب بخش صاحب۔ نور احمد صاحب۔ بشیر الدین صاحب، حفیظ احمد صاحب، عمر فاروق صاحب۔ شیخ نیاز الدین صاحب۔ آخر الذکر کیمسٹری اور سائنس کے نازک اور پیچیدہ آلات بنانے میں مشہور کاریگر ہیں۔

گھڑی ساز | عبدالحیٔ صاحب، کوچہ رائے مان۔ دہلی کے تمام گھڑی سازوں میں سب سے بڑے استاد ہیں۔

لوہے اور مشین اور موٹر وغیرہ کے مستری | محمد صدیق۔ محمد ابراہیم کاکران۔ محمد یامین، کٹرہ بڑیاں۔ عبدالحمید، عبداللطیف (انبالہ) مستری محمد ہاشم، محمد قاسم، محمد اعظم نامور لوگوں میں ہیں۔ آخر الذکر دہلی درجے کے الکٹریشن اور مشینی کاموں کے بہت مشہور ہیں ــــ پیتل اور لوہے کی صنعتوں کے مذکورہ استاد جدید ترصنعتی اشیاء بالکل روایتی اشیاء کے مقابلے میں بکنے میں ملنے ہوئے کاریگر ہیں۔ چنانچہ برادری کے

کاری گروں نے بلو لیمپ، اسپرٹ اسٹوو، سیفٹی ریزر، سائیکل کے پرزے بڑی مشینوں اور آلات کی مدد کے بغیر تیار کئے ہیں اور بازار میں بہت مقبول ہیں۔

مہرکن | چودھری ظہیر الدین صاحب نبیرہ استاد بدر الدین مہرکن کے علاوہ مندرجہ ذیل مہرکن اپنے کام کے اچھے کاری گر ہیں۔

عبدالرحمن صاحب، ضمیر الحق صاحب، محمد بشیر صاحب۔

لکڑی کے خرادی | محمد سلطان صاحب، خراد کے کام کے مشہور کاری گر ہیں۔

قفل بند | مغل صاحب (کشمیری دروازہ) استاد قفل بند ہیں۔

شمشیر ساز، بندوق ساز | بشیر احمد صاحب جاگیردار اور مشہور ماہر شمشیر سازی ہیں محمد عثمان صاحب (سبزی منڈی) بندوق سازی اور متعلقہ کاموں کے ماہر ہیں۔

طبلے ساز | لاہوریوں کی یہ نہایت اہم مگر گمنام صنعت ہے۔ اللہ بخش قلب ساز اس فن میں دور دور جواب نہیں رکھتے تھے۔ اب اُن کے بیٹے محمد فاروق صاحب پہاڑ گنج اس کام کے اچھے کاری گر ہیں۔

زیور فروش، سادہ کار MANUFACTURING JEWELLERS | محمد احمد صاحب، دریبہ کلاں۔ فیض محمد صاحب، محمد سلطان صاحب سعید الرحمن صاحب۔ عنایت الرحمن صاحب۔

تاجر | سعید الحسن، نور الحسن، صدر بازار۔ فیاض الدین، سلیم الدین۔ حاجی عبدالغفار عبدالستار صدر بازار۔ محمد اسحق، امپورٹ اکسپورٹ ایجنٹ

دفتر کے ملازم | محمد ظفر صاحب، عبدالعلی صاحب، محمد ادریس صاحب۔ حافظ محمد ابراہیم صاحب بی اے۔ عنایت احمد صاحب بی اے۔ حافظ ضمیر الدین صاحب بی اے

ڈاکٹر | رفیق الدین صاحب۔ ایم بی، بی ایس (کوچہ استاد حامد) کلینک انچارج، ٹی بی ہسپتال، دہلی۔

وکیل | رشید احمد صاحب بی اے، ایل ایل بی، ایڈوکیٹ (کوچہ چیلان)

شاعر محمد حسن صاحب صوفی، کوچہ نثواں۔ انھوں نے درویشی اختیار کرلی ہے۔ کلام میں پختگی، سادگی اور سوز و گداز کی کیفیت ہے۔

حوالہ مضمون میں ہم نے کوئی بات ایسی نہیں لکھی جس کی سند ہم کسی ذمے دار شخص یا کتاب سے نہ دے سکیں۔ مضمون کے دوران میں البتہ گنجلک سے بچنے کے لئے حوالے نہیں لکھے گئے۔ اس لئے یہاں لکھے جاتے ہیں۔

راقم نے معلومات فراہم کرنے میں اپنے برسوں کے مشاہدے کے علاوہ لاہوری برادری کے بزرگوں سے مدد لی ہے۔

غیر ملکی کتابوں میں اس برادری کا حال تو کیا ملتا، زیور سازی کی صنعت کے ذکر میں بھی ہماری تلاش فی الحال بے نتیجہ رہی۔ لی بان کی کتاب تمدن ہند مترجمہ سید علی میں اس عظیم صنعت پر چند سطریں لکھی ہیں۔ اس میں زیور سازی کے کمال کا سہرا ہندو صناعوں کے سر رکھا ہے اور مسلمانوں کا نام تک نہیں لیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۱۱ء) میں البتہ (Jewellery) کے ذیل میں سادہ کاروں کی صنعت کے کمال کا اعتراف کیا گیا ہے اور لکھا ہے کہ انگلستان میں زیور سازی کے عظیم الشان مشینی کارخانوں کی صنعت کا ماخذ ہندوستانی صناع ہے جو اب بھی باوجود بے سرو سامانی ولایتی پرزے کے جواب میں اپنی مہارت کا کمال پیش کرتا ہے۔

اردو کتابوں میں صرف دو کتابیں ہیں جن میں برادری کا ذکر ضمناً چند سطروں میں اور اس کی صنعت کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ پہلی کتابوں میں سید یوسف بخاری دہلوی کا مجموعۂ مضامین بازگشت ہے جس میں دلی کی سادہ کاری اور دہرکنی پر مضامین ہیں۔ یوسف صاحب کے مضمون کا ذکر ہم اپنے مضمون میں لفظ سادہ کاری کی بحث میں کرچکے ہیں۔ انھوں نے خلوص اور محنت سے مضمون لکھا ہے۔ نیارے کو بھی انھوں نے دھوریوں میں شامل کرلیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ لاہوری برادری والے کو نیاریا بھی سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے

ہم کسی ماہر سرجن کو خیال کریں کہ اچھا بکر قصاب بھی ہو سکتا ہے نیارا سادہ کاری کارخانو کے اس کوڑے کو کہتے ہیں جس میں چاندی سونے کے ذرات ملے ہوتے ہیں۔ نیاریا وہ کاریگر ہے جو اس کوڑے کو کئی دن نالیوں میں بھگو کر اور بیسیوں بار چھان پھٹک کر جو مرکب دھات نکلے اسے کٹھالی میں آگ پر رکھ کر کیمیاوی مسالوں سے سونا چاندی الگ کر لیتا ہے۔ نیاریا یہ کوڑا کبھی تخمینی قیمت ادا کر کے خود خرید لیتا ہے کہ جتنا سونا چاندی اس میں نکلے اس کی قیمت کبھی سادہ کار سے مزدوری اور برآمد سونے کی کوئی کسر بطور انعام دیتا ہے۔ نیارے کی آمدنی سے کارخانے میں لاد ما مٹھائی بانٹی جاتی ہے، کچھ حصہ کاریگروں کو نقد ملتا ہے اور بڑا حصہ مالک سادہ کار خود رکھ لیتا ہے —— یہ نیاریا ہرگز لاہوری برادری کا نہیں ہوتا۔ دلی کے ادنیٰ طبقوں مثلاً برف والوں میں سے ہوتا ہے اور اکثر ہندو ہوتا ہے —— سادہ کار جو سونے چاندی کی کھوٹ تیزابی اعمال سے الگ کرتا ہے وہ ایک مختصر کام اور سادہ کاری کا ضمنی عمل ہے۔ اسے تصفیہ کہئے اور سادی اصطلاح میں سودھنا کہئے۔ بہرحال یہ سودھنا کسی کوڑے میں سے نہیں ہوتا بلکہ کھوٹے سونے یا کھوٹی چاندی کی ڈلی میں سے ہوتا ہے! بحیثیت مجموعی یوسف صاحب کا مضمون داد کا مستحق ہے۔

دوسری کتاب انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ کتاب فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں ہے جو ظفر الرحمٰن صاحب کی تالیف ہے۔ اس کی چوتھی جلد میں زیور سازی کی اصطلاحات اور اوزاروں کے نام لکھے ہیں۔ یہ بہت مفید اور خاصی مکمل فہرست ہے۔ سادہ کاری سے متعلق فنی اصطلاحات اور اوزاروں کے نام ہم اپنے مضمون میں دینا چاہتے تھے۔ لیکن فرہنگ اصطلاحات کے ہوتے ہوئے یہ طول عمل ہے۔ البتہ فرہنگ میں اصلاح و ترمیم کی ابھی گنجائش ہے۔ بہت سے اوزاروں کے نام اس میں نہیں آئے۔ بہت سی اصطلاحیں فنی کام کے سلسلے کی نہیں لکھیں۔ بہت سی چیزیں غلط لکھی ہیں۔ مثلاً

کے بارے میں انھوں نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ پرواز کو پرتاج لکھا ہے اور لغت پہ کر شے پر اور تاج سے مرکب بتایا ہے۔ حالانکہ دلّی کا مسلمان سادہ کار کبھی پرتاج نہیں کہتا۔ سب پرداز کہتے ہیں۔ پھر یہ لفظ فارسی اردو تمام قدیم و جدید لغتوں میں بنایت مرتسکر اپنے اصطلاحی معنوں کے ساتھ لکھا ہوا موجود ہے۔ اس کا مصدر پرداختن ہے۔ جس کے معنی رکھنا، لینا، سنوارنا، نقش بنانا وغیرہ ہیں۔ سادہ کار کے ٹھیے یعنی کونڈے میں لکڑی کا جو پایہ (کلا) لگا ہوتا ہے۔ اس کے اوپر ایک چھوٹی سی لکڑی ہوتی ہے جس پر زرہ رکھ کر سادہ کار کام کرتا ہے۔ اس لکڑی کو کوئی سادہ کار باڑ نہیں کہتا۔ اس کا نام بینی ہے۔

مندرجہ بالا دو کتابوں کے علاوہ بہت سی ضمنی معلومات کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں کو سامنے رکھا ہے۔

۱۔ آثار الصنادید — سرسید — ۱۲۴۹ھ — لاہوری صناعوں کا ذکر
۲۔ مرقع الاشیاء — حکیم احسن اللہ خاں محمد ارتضی خاں — ۱۲۵۵ھ / ۱۸۴۳ء — ″
۳۔ دریائے لطافت — انشاء اللہ خاں — دہلی میں لاہوری برادری کے محلے کا ذکر
۴۔ مسلمانوں کی صنعت و حرفت — فان کریمر ترجمہ مولوی جمیل الرحمٰن — ۱۹۳۲ء — عراق میں سونے چاندی کی صنعت کا عروج
۵۔ بادشاہ نامہ — ملا عبدالحمید لاہوری — ۱۰۳۸ھ — سادہ کار کا ذکر
۶۔ عمل صالح (بحوالہ معین الآثار) — محمد صالح — ۱۰۷۰ھ — لاہوری مہندسوں کا ذکر
۷۔ معمار تاج (مضمون) (بحوالہ معین الآثار) — عبداللہ چغتائی — ۱۹۳۲ء — ″ ″ ″
۸۔ لاہور کا ایک مہندس خاندان (رسالہ کاروان لاہور) — مولانا سید سلیمان ندوی — ″ ″ ″
۹۔ لاہوری برادری کا شائع کردہ متفرق لٹریچر اور رسالوں کے فائل۔ (حسب اطلاع مضمون ساز کا)

پہاڑ گنج، دہلی

مختار احمد جامعی

حالاتِ حاضرہ[1]

مابعد جنگ

جنگ کے بارے میں بہت گفتگو ہو رہی تھی، منصوبے بنائے جا رہے تھے، پیشین گوئیاں کی جا رہی تھیں، لیکن کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ مابعد جنگ اس قدر جلد آجائے گا۔ یہ ایک بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا ہے اور اس کے مسئلے جتنا خیال تھا اس سے زیادہ پیچیدہ نظر آرہے ہیں۔

جن ملکوں میں جنگ لڑی گئی ہے یا جو مختلف قسم کے بموں کا شکار رہ چکے ہیں وہاں تباہی بے حد پھیلی ہے اور ان کے بہت سے شہروں، صنعتوں، بندرگاہوں، ریلوں، پلوں، نہروں، پشتوں، بندوں، جہازوں اور رہنے کے مکانوں اور گھر کے ساز و سامان وغیرہ وغیرہ کو از سر نو تعمیر کرنا ہے۔ ایک ماہر نے صرف یورپ کی جنگ میں ملکیت کا جس قدر نقصان ہوا ہے اس کا تخمینہ ایک کھرب دس ارب شمار کیا ہے۔ اگر محض یورپ کو جنگ سے قبل کی حالت پر دوبارہ واپس لانا ہے تو اس نقصان کی تلافی ضروری ہے۔ پھر یورپ کے علاوہ ملکیت کا جو نقصان چین، جاپان، جنوب مشرقی ایشیا، برہما وغیرہ میں ہوا ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے۔

مرمت، تجدید یا قائم مقامی کے اس کام کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کام فاتح اقوام کو خود اپنے ملکوں اور اپنے مقبوضات میں کرنا ہے، دوسرے ان ملکوں میں جو دشمن کی غلامی میں آگئے تھے اور جنہیں اب آزاد کر دیا گیا ہے اور تیسرے مفتوح اقوام کے ملکوں میں۔ ظاہر ہے پہلا کام سب سے مقدم ہے۔ اس کے بعد دوسرے کا نمبر ہے اور سب سے آخر میں تیسرے کام کی طرف توجہ کی جا سکتی ہے۔ پہلی نظر میں اس آخری کام کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن تھوڑے سے غور و تامل سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب تک فاتح اقوام اس کام کو بھی انجام نہیں دیں گی، وہ نہ تو مفتوح اقوام

---

[1] اس مضمون کے علاوہ اس رسالے کے باقی تمام صفحات تقریباً دو مہینے پہلے مرتب کئے جا چکے تھے، اس لیے مضمون صرف گزشتہ شنبہ کو لکھا جا رہا ہے۔ (مدیر)

سے کوئی تاوان وصول کر سکیں گی نہ اپنی اور تمام دنیا کی صنعت و تجارت کو پوری طرح ترقی دے سکیں گی اور نہ چین و آرام سے بیٹھ سکیں گی۔

روس کے علاوہ یورپ کے جتنے ملک جنگ میں شریک رہے ہیں۔ ان سب کی معیشت میں ملکی اور خارجی تجارت کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور ان کی زندگی کا تمام تر دارومدار نقل و حمل، درآمد و برآمد، خرید و فروخت اور اعتبار و بنک کاری کے اوپر تھا۔ یہ سب کچھ مالوں اور غذا کے سامانوں کی ایک بہت بڑی مقدار باہر سے درآمد کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء سے پہلے فاتح اور مفتوح ملکوں کو چھوڑ کر محض یورپ کے آزاد کردہ ملکوں کی درآمد کا تخمینہ چودہ کروڑ دس لاکھ ٹن سالانہ کیا گیا ہے اس کے مقابلے میں امریکہ کی درآمد اسی زمانے میں صرف ڈیڑھ کروڑ سالانہ کے درمیان رہتی تھی یہی حال ان ملکوں کی برآمد کی تجارت کا تھا۔ درآمد کی ادائی بڑی حد تک برآمد کے ذریعے ہو جاتی تھی اور جو تھوڑی کسر رہ جاتی تھی وہ سیاحوں کے خرچ، جہازوں کے کرایہ اور غیر ملکوں میں لگے ہوئے سرمایہ کے سود سے پوری ہو جاتی تھی۔

جب ان ملکوں پر جرمنوں نے قبضہ کیا تو یہ اپنی سابقہ درآمد سے محروم ہو گئے لیکن جرمنوں کے نئے نظام نے ایک حد تک ان کے اس نقصان کی تلافی کی اور یورپ بڑی حد تک اپنی ضرورتوں کی تکمیل خود اپنے وسائل سے کرنے لگا۔ اس سے ان ملکوں کی زندگی کا معیار پست ضرور ہو گیا لیکن اس پست سطح پر اس کے اندر خاص استحکام اور ثبات پیدا ہو گیا۔

لیکن اتحادیوں کی فتح کے بعد ان ملکوں کی زندگی میں دوبارہ ابتری پیدا ہوئی اور اس مرتبہ کی ابتری نہایت سخت اور جاں گسل ہے۔ ان ملکوں کی حالت کا نقشہ حسب ذیل طریقے پر کھینچا جا سکتا ہے:۔

(۱) نئے نظام کی تباہی جس کی وجہ سے جرمنی سے درآمد کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے کچے مال درآمد کرنے کا کوئی دروازہ نہیں کھلا ہے۔

(۲) ہر قسم کی نقل و حرکت اور رسل و رسائل کی مسدودی کیونکہ ملوں، سڑکوں اور ریل کی لائنوں کو یا تو اتحادیوں نے تباہ کر دیا ہے یا جرمنوں نے۔

(۳) اس لئے ہر ملک اپنے وسائل پر انحصار کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ہے۔ کارخانے کچے مالوں کے جمع کئے ذخیروں پر چل رہے ہیں اور جب اس کے کچھ حصے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں تو کارخانوں کا چلنا بھی بند ہو جاتا ہے۔ اور تدریجی طور پر بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

(۴) زر کی مشکلات بھی کسی نہ کسی شکل میں رونما ہو رہی ہیں جن کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ محصول وصول کرنے میں دشواری ہے۔ استعمال کی چیزوں کی رسد کی کمی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ اتحادی فوجوں کی بڑی تعداد کی موجودگی کی وجہ سے افراط زر کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ فوجیں جنگ کے سلسلے میں بھی غیر محدود قوت خرید سے کام لے رہی ہیں اور ان کے سپاہی انفرادی طور پر بھی بہت خرچ زیادہ کر رہے ہیں۔

(۵) ہر قسم کی روشنی، قوت محرکہ اور گرمی پہنچانے والے ذرائع کی قلت رسد۔

(۶) غذا کی قلت، چوربازاروں کی کثرت اور غذا کے سامان کی گرانی۔

(۷) بندرگاہوں میں سامان کو اتارنے، چڑھانے اور رکھنے کی دشواریاں۔

(۸) سمندر پار کے ملکوں سے، سونے یا مبادلات خارجہ کے ذخیرہ محفوظ یا تجارتی قرضوں کے بغیر خریداری کا عدم امکان اور

(۹) ان سب سے زیادہ یہ بات کہ چونکہ اتحادی قبضہ کی ابتدائی منزلوں میں تمام طاقت اتحادی کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ حالات موجود نہیں تھے جن میں ملک کی کوئی حکومت چاہے اس کا خیال، رجحان اور سیرت کیسی ہی کیوں نہ ہوتی۔ کسی قسم کا کوئی معاشی منصوبہ نہیں بنا سکتی تھی۔

غرض آزاد کئے ہوئے ملکوں میں ہر جگہ ایک غیر زبان بولنے والی فوج کا قبضہ، جنگ کی شدید غارت گری، ناکافی اور گراں غذا، غیر معمولی طور پر سخت سردی، ناکافی کوئلہ، نقل و حمل کے ذرائع کا فقدان، مزدوری پکے مالوں کی نایابی اور اضافہ پذیر بے روزگاری کا دور دورہ جاری ہے۔

مفتوحہ ملکوں کا حال اس سے بھی زیادہ خراب ہے۔ ان کا مستقبل مکمل تاریکی میں ہے اور وہ فاتحوں کے رحم وکرم پر ہیں۔

فاتح ملکوں میں انگلستان میں رہنے کے مکانوں کی سخت قلت ہے۔ بندرگاہوں کی تباہی اور جہازوں کی کمی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ روس اور چین اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں بھی بڑی زبردست تباہی ہوئی ہے۔

ان سب ملکوں کی نظر امریکہ کی امداد پر ہے۔ اگر امریکہ امداد دے سکا تو ان کا کام آسانی سے چل سکے گا۔ ورنہ تجدید ومرمت کے کام میں بڑی دیر اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

ہندوستان میں جنگ کی وجہ سے براہ راست تباہی تو تقریباً بالکل نہیں ہوئی ہے، لیکن ہماری معاشی زندگی پر اس کا بڑا انقلاب انگیز اثر پڑا ہے۔ چار پانچ سال سے برابر ہندوستان کی حیثیت "مشرق کے اسلحہ خانے" کی سی رہی ہے۔ اس کو اپنے پورے وسائل جنگ کے سامان فراہم کرنے میں لگا دینا پڑے ہیں۔ ہندوستان کے لاکھوں آدمی فوج میں براہ راست بھی بھرتی ہوئے اور اس سے بہت زیادہ تعداد میں جنگی کارخانوں، مدافعت کے دوسرے کاموں اور جنگ کے مختلف محکموں اور دفتروں میں کام کرتے رہے ہیں۔ ہندوستان میں حکومت ہند اور حکومت برطانیہ نے جنگ کے پانچ سالوں میں مدافعت کے کام پر تقریباً ۲۰ ارب روپیہ خرچ کیا ہے اور اس خرچ نے ہماری معاشی زندگی کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اب کہ جنگ ختم ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ خرچ جاری نہیں رہ سکے گا اور اس کی کمی کے ساتھ ساتھ ہماری معاشی زندگی میں بھی ابتری کا پیدا ہونا لازمی ہے۔

حکومت ہند کو اس بات کا پہلے سے خیال تھا اور اس کی پیش بندی کرنے کے لئے اس نے ۱۹۴۳ء سے مابعد جنگ کی تعمیر نو کے مسائل پر غور وتوجہ شروع کر دی تھی۔ اس کام میں برابر ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ اب تعمیر نو اور منصوبہ سازی کا ایک مستقل محکمہ وجود میں آگیا ہے۔ وائسرائے کی عاملہ کی تعمیری کمیٹی نے ترقیات مابعد جنگ کے بارے میں نومبر ۱۹۴۴ء میں جو رپورٹ

شائع کی تھی اس میں تجدید و مرمت کے ان کاموں کو جنہیں جنگ کے ختم ہونے کے بعد فوراً کرنا ہوگا حسب ذیل عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا تھا۔

(۱) مدافعت کی خدمات سے برطرف کئے ہوئے لوگوں اور جنگی صنعت وغیرہ سے خارج کئے ہوئے مزدوروں اور ملازموں کو امن کے زمانے کے کاموں میں لگانا اور ان کے رہنے سہنے کا انتظام کرنا۔

(۲) زائد فوجی ذخیروں، سامانوں، زمین اور عمارتوں کو نظم و ترتیب کے ساتھ فروخت کرنا۔

(۳) صنعت کو جنگ کے کام سے امن کے کام میں منتقل کرنا۔

(۴) نگرانیوں کا امن کے حالات کے تقاضوں کے مطابق ختم کرنا یا ان میں ضروری ترمیم کرنا

لیکن اس رپورٹ کے لکھتے وقت بلکہ آخر وقت تک جنگ کے اس قدر جلد ختم ہونے کی کسی کو امید نہیں تھی۔ اس لئے اندیشہ یہ ہے کہ حکومت اپنی تعمیری اسکیموں کو ابھی تک مکمل نہیں کر پائی ہے اس کے علاوہ وہ حالات جو تعمیر و ترقی کی کوششوں کے لئے سازگار ہو سکتے تھے وہ بھی ابھی تک پیدا نہیں کئے گئے ہیں نہ تو قومی حکومت کی ابھی تک تشکیل ہو سکی ہے اور نہ ہندوستان کے آئینی تعطل کو ابھی تک دور کیا جا سکا ہے۔ اگرچہ شملہ میں رہنماؤں کی کانفرنس منعقد کرکے اور مرکزی اور صوبائی کونسلوں کے انتخابات کا اعلان کرکے وائسرائے نے اس کی جانب صحیح قدم ضرور اٹھایا ہے لیکن اس کارروائی کی تکمیل میں بہت دیر لگے گی، اور اس اثناء میں لوگوں کی پریشانی اور مصیبت کا جاری رہنا لازمی سا معلوم ہوتا ہے۔

غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور دنیا کو امن کی برکتوں سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے ابھی بہت کافی انتظار کرنا پڑے گا۔

اِعلان

ہندستانی اکیڈمی یو۔ پی الٰہ آباد کی مجلس عاملہ نے اردو کی مطبوعہ کتابوں پر پانسو روپے سالانہ انعام دینے کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ

۱۔ ہر سال مندرجہ ذیل مضمونوں میں سے ایک پر سلسلہ وار انعام دیا جایا کرے گا

(الف) شعر اور ڈراما۔

(ب) ناول اور مختصر افسانے

(ج) مضامین (عام اور انتقادی)

(د) تاریخ اور حیات گرامی

(ہ) فلسفہ

(و) نیچرل سائنس

۲۔ انعام [illegible] میں شعر اور ڈراما کی کتابوں پر دیا جائے گا۔

۳۔ شعر اور ڈراما کی صرف ان کتابوں پر غور کیا جائے گا جو ۳۱ مارچ [illegible] کے بعد شائع کی گئی ہیں۔

پبلک اہل علم حضرات اور تالیفین و ناشرین سے درخواست ہے کہ ہندستا اکیڈمی کو مندرجہ بالا تاریخ کے بعد شائع شدہ شعر اور ڈراما کی کتابوں کے متعلق تفص سے مطلع فرمائیں تاکہ ابتدائی انتخاب کے وقت ان پر غور کیا جا سکے، اور منتخب کتابوں کی نسبت ججوں کی کمیٹی فیصلہ کر سکے۔

منیجر ہندستانی اکیڈمی۔ الٰہ آباد

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ، کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب — عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
ادا شدہ سرمایہ	بارہ لاکھ پچاس ہزار	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجیے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں۔

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمد آباد، کانپور، فلسطین

جامعہ

زیر ادارت :- پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۳۰ - نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء | سالانہ چندہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر پبلشر محمد مجیب بی اے ، آکسن - محبوب المطابع برقی پریس دہلی

اگر

آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا
مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اُردو اکادمی
کی رکنیت قبول فرمائیے اور قواعد و ضوابط
ایک کارڈ لکھ کر طلب کیجئے۔

ناظم اُردو اکادمی
مکتبہ جامعہ قرول باغ
دہلی

برطانیہ کی مزدور پارٹی

برطانیہ کے گذشتہ انتخابات میں مزدور پارٹی کو بڑی اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اسے بہت سے لوگ ایک نہایت انقلابی واقعہ سمجھتے ہیں "سرمایہ داروں کی حکومت کا زمانہ ختم ہوا، اب مزدور حکومت[1] کریں گے" ۱۹۱۷ء میں یہی بات روس میں کہی گئی تھی، اور ۱۹۴۵ء میں یہی بات برطانیہ کے لئے کہی جارہی ہے لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔

وہاں اس کے معنی تھے قتل و خون، تباہی و غارت گری، انتشار و ابتری، زمینداروں سرمایہ داروں، مذہب کے اجارہ داروں اور زارشاہی کا مکمل استیصال، اور مزدور طبقے کی آمریت۔

یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ میں مسٹر چرچل نے رہنا چھوڑ دیا ہے ان کی جگہ مسٹر اٹیلی رہنے لگے ہیں۔ ایوان قانون ساز میں حکومت کی نشستوں پر مسٹر چرچل کی قیادت میں تحفظ پسند پارٹی کے نمائندے نہیں بیٹھتے اب ان کی جگہ مزدور پارٹی کے نمائندے مسٹر اٹیلی کی رہنمائی میں بیٹھنے لگے ہیں۔ دوسرے سرکاری طور پر تسلیم شدہ مخالف پارٹی کی جگہ تحفظ پسند پارٹی نے لے لی ہے۔

بہرحال ایوانِ عوام میں مسٹر چرچل اور مسٹر اٹیلی اب بھی آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ دونوں میں پہلے کی طرح اب بھی نوک جھوک ہوتی ہے۔ ملک معظم، ایوانِ امرا، ملک معظم کی حکومت، ملک معظم کی مخالف پارٹی، انگلستان کا تحریری اور غیر تحریری دستور و ضابطہ مزدور پارٹی کے برطرف کئے جانے اور اس کی جگہ تحفظ پسند پارٹی کے دوبارہ برسرِ اقتدار

---

[1] مزدور پارٹی جیسا کہ آگے تفصیل سے بتلایا جائے گا، برطانیہ میں پہلے بھی دو مرتبہ حکومت کرچکی ہے، لیکن اس وقت اسے وہ اکثریت حاصل نہیں تھی جو اب ہے۔

اُجانے کا امکان ـــــــــــ سب بدستور موجود ہیں ۔ تمام کارروائیاں معمول کے مطابق ہوتی ہیں سابق حکومت کی تمام خارجی اور داخلی پالیسیوں کے تسلسل کو کم ازکم فی الحال قائم رکھا گیا ہے۔ ان میں جو تبدیلیاں بھی کی جائیں گی وہ بہت تدریجی طریقے پر ہی کی جائیں گی۔

انگلستان کی پارلیمنٹ کی کارروائیاں ، رکاوٹوں اور جوابی رکاوٹوں ، شہ اور جوابی شہ کا ایک مجموعہ ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی کام عجلت سے نہیں ہو سکتا۔ دیر طلبی اور تاخیر، غور اور تامل اس کے خمیر میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ ملک معظم کی حکومت کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اُٹھانا پڑتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ ملک معظم کی بیدار اور بے ڈرد مخالف پارٹی جیسے زندہ رہنے اور اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرنے اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا ایسا ہی قانونی حق ملا ہوا ہے جیسا کہ خود اُسے اور جسے وہ کسی طرح بہ خیر نہ فنا اور معدوم کر سکتی ہے اور نہ اس کا منہ بند کر سکتی ہے ، برابر اس کی تاک اور گھات میں ہے اور اس کی رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کرنے کی فکر میں ہے۔ اس کی ہر لغزش پر وہ اس کی گردن پکڑ سکتی ہے اور اڑنگا مار کر نیچے گرا سکتی ہے اور رائے دہندوں کو اس سے منحرف کر کے اپنا طرفدار بنا سکتی ہے اور اس طرح آئندہ کے انتخابات میں اپنی اکثریت کا دوبارہ انتظام کر سکتی ہے۔ اس لئے اس کو مخالف جماعت کے اعتراضوں، نکتہ چینیوں، ترمیموں اور متبادل تجویزوں کی روشنی میں اپنی ابتدائی تجویزوں اور قانونی مسودوں کو دوبارہ ایسی شکل دینی ہوتی ہے جس سے مخالف پارٹی کے زہریلے ڈنک کا اثر زائل ہو سکے اور رائے دہندوں کو غلط اور بدظن کرنے کی جو کوششیں اس نے کی تھیں ان کی تلافی ہو سکے ۔ اس کے معنی عموماً یہ ہوتے ہیں کہ حکومت کو میانہ روی ، اعتدال، مصالحت ، اور مفاہمت کی پالیسی سے کام لینا ہوتا ہے وہ اصلاح و ترقی کے صرف ان کاموں کو ہاتھ میں لیتی ہے جن کی ضرورت لازمی اور ناگزیر معلوم ہوتی ہو اور جن کے لئے پریس اور پلیٹ فارم پر عرصے سے شورش و ہنگامہ برپا رہ چکا ہوتا ہے۔

اور جن کی تائید اور مخالفت میں جتنا کچھ کہنا اور کرنا ہے وہ سب کہا اور کیا جا چکا ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب نیا قانون بنتا ہے تو لوگ نئے حالات سے مطابقت کرنے کے لئے ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں ناقابل مضر سمجھ کر ان کو رضاکارانہ طریقے پر قبول کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں خونی انقلابات یا رجعت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

انگلستان میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آجانے سے ایک عام آدمی کو فوری طور پر اس بات کا احساس مشکل ہی سے ہوسکے گا کہ برطانیہ کی حکومت اور زندگی میں کوئی واقعی انقلاب ہوگیا ہے۔ لیکن پھر بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے نتائج ایسے ہی دور رس ثابت ہوں جیسے کسی دوسری جگہ بہت شور و ہنگامہ، قتل و بربادی، انتشار و ابتری پیدا کرنے کے بعد حاصل کئے جاتے ہیں اور ان میں رجعت اور ناپائداری کا امکان دوسری جگہوں کے مقابلے میں نسبتاً کم ثابت ہو۔

پرامن انقلاب کے اس طریقے کو انگلستان ہی نے ایجاد کیا ہے۔ انگلستان میں بڑی سے بڑی تبدیلیاں ایسی ہی خاموشی سے ہوئی ہیں کہ جس میں نہ خون بہتا ہے، نہ تکلیف ہوتی ہے اور نہ کسی کو ان کے بہت زیادہ غیر معمولی ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ ۱۶۸۸ء کا پرامن انقلاب اسی طرح ہوا تھا۔ ۱۸۳۲ء، ۱۸۶۷ء اور ۱۸۸۴ء میں برطانیہ کے دستور میں جو بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ان سے انگلستان کی رعایا کو وہ حقوق مل گئے جنھیں حاصل کرنے کے لئے فرانس کو متعدد خونی انقلابات سے گذرنا پڑا تھا۔

۱۸۳۲ء کی اصلاحات سے بیچ کے طبقے کے لوگوں، تاجروں اور دکان داروں کو یہ حق ملا کہ وہ اپنے نمایندوں کو پارلیمنٹ میں بھیج سکیں۔ ۱۸۶۷ء کی اصلاحات سے یہ حق شہر کے کاریگروں کو بھی مل گیا کہ وہ ایوان عوام کے اراکین کے انتخاب میں اپنی رائے دے سکیں اور ۱۸۸۴ء کی اصلاحات نے زراعتی مزدوروں کو بھی اس حق میں شریک کرلیا۔

بعد کو یہ حق عورتوں کو بھی مل گیا۔ یہاں تک کہ اب برطانیہ کی تمام بالغ آبادی کو یہ حق مل گیا ہے۔ ایوان امراء کی حیثیت برابر گھٹتی چلی گئی یہاں تک کہ اب تمام اہم معاملوں میں فیصلہ کن اختیار ایوان عوام ہی کو حاصل ہے۔ ایوانِ عوام میں اکثریت رکھنے والی جماعت ہی کو اپنی کابینہ کے ذریعے حکومت کی رہنمائی کرنے کا حق ملا ہوا ہے اور ہر معاملہ میں ایوان عوام ہی کابینہ سے جواب طلب کر سکتا ہے۔

برطانیہ کی قومی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چیزوں کو مٹاتی نہیں بلکہ انھیں بے ضرر بنا دیتی ہے۔ انگلستان میں بادشاہ کو ختم نہیں کیا گیا۔ نام کے لئے بادشاہ کو وہ تمام اختیارات اب بھی حاصل ہیں جو تاریخ کے پچھلے زمانے میں اسے دراصل حاصل تھے۔ وہ حکومت کی رہنمائی کرتا ہے۔ جنگ اور امن کا اعلان کرتا ہے۔ فوج بحری اور ہوائی بیڑہ کا انتظام کرتا ہے۔ مسودۂ قوانین کو منظور یا نامنظور کرتا ہے پارلیمنٹ کو بلاتا اور برطرف کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ان تمام اختیارات کو اپنے وزیر اعظم کی مرضی کے بموجب انجام دیتا ہے۔ اس کے وزراء کی کابینہ اس کے نام سے سب کام کرتی ہے اور اپنے کاموں کے لئے ایوانِ عوام کو اور اس کی معرفت رائے دہندوں کو خود ہی جواب دہ ہوتی ہے۔ بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا۔ تمام غلطیاں اس کے وزرا کرتے ہیں اس لئے انھی سے ان کی باز پرس کی جاتی ہے۔

ایوانِ امراء کو جس کے اراکین کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ جو یا تو موروثی ہوتے ہیں یا انھیں بادشاہ نامزد کرتا ہے باقی رکھا گیا ہے۔ قانون سازی کے وقت ایوان امراء کی منظوری ایسی ہی ضروری ہے جیسی کہ ایوان عوام کی۔ لیکن ہر کابینہ کا بادشاہ سے نئے امراء بنوانے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جب کبھی ایوان امراء کی اکثریت، ایوان عوام کے منظور کئے ہوئے کسی اہم قانون کی مخالفت کرتی ہے تو کابینہ انھیں اس بات کی دھمکی دے سکتی ہے کہ ہم اپنے اختیار سے کام لے کر نئے امراء بنوا دیں گے اور تمھاری اکثریت کو اقلیت میں

یں گے اور اس دھمکی سے دب کر وہ ایوان عوام کے منظور کردہ قانون کی خود بھی منظوری
ے دیتے ہیں۔

اس لئے ہر چند انگلستان کا دستور محدود شہنشاہیت کے نام سے موسوم کیا جاتا
. لیکن دا فعتاً وہ ایسی ہی جمہوریت ہے جیسی کہ امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ اسی مماثلت کی
، پر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ بغیر اس بات کا ڈھنڈورا پیٹے ہوئے کہ وہ ایک
تراکی مملکت ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے اور مزدور پارٹی کی کا
میابی سے اس اشتراکی رجحان کی تکمیل ہو گئی ہے جس کی انگلستان میں ایک عرصے سے
ہستہ آہستہ نشوونما ہو رہی تھی۔

انگلستان میں مزدوروں کی تحریک کو مختلف منزلوں سے گزرنا پڑا۔ ابتدا میں مزدوروں
متحد ہونے کی بھی آزادی حاصل نہیں تھی۔ بچوں، عورتوں اور مردوں سے نہایت بیدردی
، ساتھ ان کی طاقت سے زیادہ کام لیا جاتا تھا اور انھیں بہت کم معاوضہ دیا جاتا تھا
نیسویں صدی کے بیشتر حصے میں، سرمایہ داروں کا نیا طبقہ اور سیاسی مفکر، انفرادیت
، حامی بنے رہے یعنی وہ ملک کی رعایا کے باہمی معاملات میں ان کے آزادانہ معاہدے کو
تی سمجھتے تھے۔ اور اس معاملے میں حکومت کی مداخلت کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے
ے۔ اس اصول عدم مداخلت کو پہلا نقصان فیکٹری کے ان قوانین سے پہنچا جن کی ابتدا
ڈ ایشلے ثانی، ارل آف شیفٹس بری نے کی تھی۔ اس کے بعد مزدوروں کی موافقت میں
نون سازی کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتوں اور بچوں سے کام
ا کانوں کے اندر ممنوع اور فیکٹریوں میں محدود کر دیا گیا۔ تعلیم کو مفت کیا گیا، میونسپلیٹیوں
سٹرکٹ بورڈوں کو مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات فراہم کرنے کے اختیارات
ئے گئے۔ کام کے گھنٹے محدود کئے گئے۔ جسم کو نقصان پہنچنے کی صورت میں مزدوروں کو ہرجانہ
لنگا۔ ایسے قوانین بنائے گئے جن سے ملاحوں اور دوسرے لوگوں کے لئے جو خطرناک کام

میں مصروف تھے۔ زندگی کے ضائع ہونے کے امکانات کم ہوگئے۔ فنی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انتظامات کئے گئے جن سے غریب لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ بے روزگاروں کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھی قانون بنائے گئے۔ قانون امداد غربا کی سختیوں کو کم کیا گیا۔ بڑھاپے کے زمانے میں پنشن کا انتظام کیا جانے لگا۔ مزدوروں کی انجمن سازی کو جائز اور ان کی انجمنوں کے اختیارات کو وسیع کیا گیا۔ ان انجمنوں کے ذریعے متحد ہوکر مزدور اپنی اجرتوں میں اضافہ کرانے لگے۔ مالکوں کے خلاف ہڑتال اور غدار مزدوروں کے خلاف دھرنا دینے کا انہیں حق مل گیا۔ ہڑتال کے زمانے میں انجمن کے سرمایے کو مزدوروں کے گزر بسر کے لئے صرف کرنے کو بھی جائز سمجھا جانے لگا۔ سرمایہ داروں اور مزدوروں میں باہمی مشاورت کے لئے بھی قانون بنائے گئے تاکہ بغیر ہڑتال کئے باہمی سمجھوتے سے اختلافات کو طے کیا جاسکے

یہ بہت اہم مراعات ہیں جو مزدوروں کو قانون نے عطا کی ہیں۔ لیکن یہ قوانین اس وقت بنائے گئے جب مزدور پارٹی برسر حکومت نہیں تھی۔ انہیں یا تو دوسری پارٹیوں کے ہمدرد، نیک دل، فیاض اور انسان دوست افراد نے بنوایا یا ایسے قدامت پسند زمینداروں نے جو نئے سرمایہ داروں کے مخالف تھے یا ان لوگوں نے جو مزدوروں کے ووٹ سے منتخب ہوکر پارلیمنٹ میں پہنچے تھے۔ لیکن بعد کے زمانے میں خود مزدوروں کے درمیان سے بھی ان کے کچھ نمائندے پارلیمنٹ میں پہنچنے لگے اور ان کی یہ تعداد ہر انتخاب میں برابر بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج ایوان عوام میں غالب اکثریت رکھنے کی وجہ سے انگلستان میں ان کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ آیئے برطانیہ کے مزدوروں کی اس تحریک کے تدریجی ارتقا اور نشوونما پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

یوں تو مزدوروں کی سرگرمیاں متحدہ صورت میں ایک عرصے سے جاری ہیں ان کی کچھ ابتدا تو اسی وقت سے ہوگئی تھی جب اٹھارھویں صدی کے شروع زمانے

مزدوروں کا ایک جداگانہ طبقہ سرمایہ داروں کے بالمقابل نمودار ہوا تھا یعنی ایسا طبقہ جو زمین، رہنے کے مکان، کام کی جگہ، اوزاروں، مشینوں، کچے مالوں اور اپنی تیار کی ہوئی چیزوں کی ملکیت سے محروم ہوتا جا رہا تھا۔ جس کے پاس فروخت کرنے کے لئے صرف ایک چیز باقی رہ گئی تھی یعنی محنت کرنے کی صلاحیت جسے وہ روزانہ کے حساب سے یا ہفتہ، مہینہ اور سال کے حساب سے یا اپنے کام کی مقدار کے حساب سے، فروخت کرتا یا کرایہ پر دیتا تھا۔ ایسے مزدور چونکہ بڑی تعداد میں ایک ہی فیکٹری اور ایک ہی شہر کے اندر کام کرتے تھے۔ اس لئے ان میں اتحاد اور اشتراک کے مواقع زیادہ پیدا ہو گئے تھے۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے اس رجحان کو اور زیادہ ترقی ہوئی اور مزدوروں کی اس تحریک نے دو مختلف گروہوں کی صورت میں منظم ہونا شروع کیا۔ ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ موجودہ نظام کو بنیادی طور پر بدلے بغیر کام نہیں چلے گا۔ سرمایہ داری نظام اور اس کی مقرر کی ہوئی حکومت خرابی کی اصل جڑ ہیں۔ پہلے حکومت کو بدلا جائے بعد میں سرمایہ داری نظام کو۔ تب مزدوروں کو کوئی فائدہ حاصل ہو سکے گا۔ دوسرا گروہ حکومت یا سرمایہ داری نظام میں تبدیلی کو ضروری نہیں سمجھتا تھا اور اس انقلاب کے لئے انتظار اور قربانی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنی حالت میں معمولی بہتری پر قانع تھا۔ وہ اپنی مخصوص صنعت کے آجروں سے، صرف اپنی انجمن کے اراکین کی اجرت میں اضافہ یا موجودہ اجرتوں کا قیام یا کام کے اوقات کی کمی وغیرہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے دل میں پورے ملک یا ساری دنیا کے مزدوروں کے پورے طبقے کا زیادہ درد نہیں تھا اس کی وفاداریاں صرف اپنی انجمن تک محدود تھیں۔ ہم نے ان دونوں گروہوں کی خصوصیات کو واضح کرنے کے لئے ان کے امتیازی فرق کو ذرا مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ورنہ عملی زندگی میں ان کے اندر حقیقتاً اتنا بُعد نہیں تھا۔ دونوں کا مقصد چونکہ مزدوروں کو فائدہ پہنچانا تھا۔ اس لئے یہ تحریکیں کئی طرح شروع سے اکثر ایک دوسرے میں مدغم

چھوٹی چلی آئی ہیں۔

لیکن مزدوروں کے اتحاد کی ان دونوں ابتدائی کوششوں کو جائداد اور سرمایہ کے مالکوں نے جو حکومت کی مشین پر بھی قبضہ کئے ہوئے تھے، سختی کے ساتھ کچل دیا جس کی وجہ سے انہیں ایک عرصے تک کھلے طور پر منظم ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں، یہ تحریکیں ریڈیکلزم، سوشلزم، ٹریڈ یونینزم اور چارٹزم کے مختلف ناموں سے چلائی گئی تھیں۔ ان تحریکوں کو پورے طور پر ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ ان میں اپنے رہنماؤں کے شدید اختلافات کے باوجود اکثر باتیں مشترک تھیں۔ ریڈیکل جماعت کے لوگ مزدوروں کے مسئلہ کا حل، پارلیمنٹ میں اصلاحات جاری کرکے اور مزدوروں کو سیاسی حقوق دلا کر کرنا چاہتے تھے۔ سوشلسٹ زمین اور سرمایہ پر مزدوروں کا قبضہ کرانا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چیزوں کے اندر چونکہ قدر و قیمت صرف محنت ہی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے کل قیمت کے مستحق صرف مزدور ہیں۔ لیکن یہ ابتدائی سوشلسٹ، قانونی جبر کے ذریعے۔ انفرادی ملکیت کے حقوق کو ختم کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اختیاری امداد باہمی، رضاکارانہ اشتراک اور انسانی ہمدردی اور محبت کے فطری جذبے اور تقاضے کے ذریعے اس کام کو کرنا چاہتے تھے۔ ان جذباتی سوشلسٹوں کے مقابلے میں انیسویں صدی کے وسط میں، انقلابی سوشلسٹ پیدا ہوئے جن کا سب سے زیادہ مشہور رہنما کارل مارکس تھا۔ یہ طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کے قائل تھے اور حکومت کی طاقت کو مزدوروں کے ہاتھ میں لانا اور اس کے ذریعے دولت آفرینی کے وسائل کو نجی مالکان جائداد سے جبراً چھیننا اور ان کی ملکیت کو اجتماعی سرمایہ بنانا چاہتے تھے لیکن انگلستان میں مارکس کا اثر یورپ کے مقابلے میں زیادہ نہیں ہوا اور انگلستان کی مزدور تحریک نے انقلابی رنگ کبھی قبول نہیں کیا۔ ہنڈمین نے ضرور ۱۸۸۱ء میں سوشل ڈیموکریٹک فیڈریشن قائم کی۔ لیکن فیبین سوسائٹی جسے سڈنی ویب اور برنارڈ شا نے ۱۸۸۴ء میں قائم

سمجھا تھا اس کے اثر کو زائل کر دیا۔ فیبین ازم کی تحریک طبقہ وارانہ جنگ اور خونی انقلاب کی معتقد نہیں تھی۔ یہ طبقہ متوسط کی رائے کو تعلیم و پروپیگنڈا کے ذریعے اپنا ہم خیال بنا کر حکومت کی مشین پر قبضہ کرنا اور تدریجی طور پر زمین اور صنعتی سرمایہ کی ملکیت کو نجی افراد کے ہاتھ سے جماعت کے ہاتھ میں منتقل کرانا چاہتی تھی۔

چارٹزم کی تحریک اس بے اطمینانی کا نتیجہ تھی جو ۱۸۳۲ء کی آئینی اصلاحات میں مزدوروں کی حق تلفی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن یہ وقتی جوش دکھلا کر ٹھنڈی پڑ گئی۔

ان تحریکوں میں اپنے دیرپا اثر اور نتائج کے لحاظ سے سب سے اہم تحریک ٹریڈ یونین ازم یعنی مزدوروں کی انجمنوں کی تحریک تھی جسے ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

(باقی)

سہارنپور کی سکنائی جائداد کا جائزہ

میری خوش نصیبی سے میری تحقیقات جولائی [illegible] سے چند مہینے پہلے سہارنپور میونسپلٹی نے ہاؤس ٹیکس عائد کرنے کے لئے سہارنپور کے جو مکانات کے بارے میں صرف [illegible] مکمل فہرست تیار کرائی تھی جس میں میونسپلٹی کے ہر حلقے کے لئے علاوار، گھروں کی نوعیت، اُن کے مالکوں اور رہنے والوں کے نام اور ان کے واقعی یا امکانی کرایوں اور مجوزہ ہاؤس ٹیکس وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئی تھیں۔ یہ چیز میری تحقیقات کے لئے بہت معاون ثابت ہوئی اور میں مولوی فضل الرحمن صاحب چیرمین میونسپل کمیٹی سہارنپور کا بہت ممنون ہوں کہ انہوں نے ان قیمتی رجسٹروں سے مجھے فائدہ اُٹھانے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں نے تقریباً ڈیڑھ ہفتہ تک میونسپل کمیٹی کے دفتر میں ان رجسٹروں پر کام کیا اور ان سے معلومات کو اخذ کیا۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے دیہات قصبات اور ان شہروں کی جہاں جدید صنعت و تجارت کا ابھی زیادہ غلبہ نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے کہ یہاں تقریباً ہر شخص کا اپنا ذاتی یا خاندانی مکان ہوتا ہے، چاہے وہ پھوس ہی کا کچا گھروندا کیوں نہ ہو، شہر سہارنپور کے بارے میں میں نے کوئی باقاعدہ تحقیقات تو نہیں کی۔ لیکن جہاں تک میں اندازہ کرسکا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگرچہ یہاں کرایہ کے مکانوں میں رہنے والے پردیسیوں کی تعداد بہت خاصی ہے لیکن جن لوگوں کا سہارنپور آبائی وطن ہے، ان میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنا ایک ذاتی یا خاندانی مکان ہے۔ میونسپل کمیٹی نے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے سہارنپور کے مکانوں کے بارے میں جو تحقیقات کرائی وہ ہمہ گیر تھی۔ اس میں شہر کے کسی مکان کو چاہے اس کی حیثیت کتنی ہی کم کیوں نہ ہو تحقیقات کی حدود سے مستثنیٰ نہیں سمجھا گیا۔ اس نے سکنائی مکانات کی

حیثیت کی [illegible] تقسیم معلوم کرنا مجھے بہت مشکل تھا۔ اگرچہ یہ کام دیر طلب ضرور تھا کیونکہ تمام مکانوں کی میزان جیسا کہ میں آگے صحیح صحیح بتلاؤں گا، بیس پچیس ہزار تک پہنچی تھی۔ لیکن میرا مقصد چونکہ محض مکانوں کی فرداً فرداً تقسیم معلوم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ سکنائی جائداد کے ذریعہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کی نسبتی خوش حالی کا اندازہ کرنا تھا۔ اس لئے میں نے اپنی تحقیقات کو محدود کردینا ضروری سمجھا، چنانچہ میں نے اپنی تحقیقات سے ان مکانوں کو خارج کردیا، جن کا کرایہ یا حیثیت دس روپے ماہوار یا ایک سو بیس روپے سالانہ سے کم درج کی گئی تھی۔ اس ایک سو بیس روپے سالانہ کرایہ کا مفہوم مکان کی بازاری قیمت کے لحاظ سے کیا سمجھنا چاہئے۔ اس کے بارے میں میں نے مولوی عبدالحق صاحب وکیل سہارنپور سے مشورہ کیا جن کو اپنی وکالت کے سلسلے میں ان معاملات سے بھی واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ صاحب موصوف نے ازراہ عنایت سکنائی جائداد کی بازاری مالیت نکالنے کا ایک آسان قاعدہ مجھے بتایا جس پر بازار میں بھی عمل درآمد ہوتا رہتا ہے اور اس کو میں ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) ہر سیکڑہ ماہوار کے حساب سے جتنے کی آمدنی کو چھ سو سے ضرب دے لیجئے تو آپ کو جائداد کی مالیت معلوم ہو جائے گی۔

(۲) ۲ر ، ، ، چار ، ، ، ، ،

(۳) ۳ر ، ، ، تین ، ، ، ، ،

(۴) ۴ر ، ، ، دو ، ، ، ، ،

(نوٹ) یہ صاف ظاہر ہے کہ ۱ر اور ۲ر کے لئے تو فارمولا بالکل صحیح نکلتا ہے لیکن ۳ر کی جگہ دو آنے آٹھ پائی اور ۴ر کی جگہ پانچ آنے چار پائی سے حساب لگانا ضروری ہوتا ہے جب حساب ٹھیک بیٹھتا ہے۔

مولوی صاحب موصوف نے یہ بھی بتلایا کہ دور افتادہ محلوں میں جائداد کا حساب ہر سیکڑہ کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ بازار سناروں میں جو غیر اہم بازار ہے ۱ر سیکڑہ کے

حساب سے اور بازار شہنشاہی یا بازار صدر گنج ، بازار شہید گنج جو تجارت کا مرکز ہیں وہاں کبھی سو روپے گز کے حساب سے بھی۔ چنانچہ جب جامع مسجد کے لئے جس کے مولوی صاحب موصوف بھی متولی ہیں۔ بازار شہید گنج میں دکانیں خریدی گئیں۔ تو ان کے ایک تہائی حصے کے لئے جس کا کرایہ تیس پینتیس روپے ماہانہ ہو دس ہزار کی قیمت ادا کی گئی۔ یہ دکانیں پختہ ہیں لیکن صرف ایک منزلہ ہیں۔

بعض محلوں میں گز گتی کے حساب سے مکان فروخت ہوتے ہیں مثلاً محلہ شاہ ولایت میں پندرہ روپے تا بیس روپے اور بعض اوقات پچیس روپے تا تیس روپے فی گز کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور محض خالی اراضی جس پر مکان نہیں ہوتا۔ آٹھ سے پندرہ روپے فی گز تک جیسا اس کا موقع ہو فروخت کی جاتی ہے۔

بنگلہ کوٹھیوں کا حساب یہ ہے کہ امبالہ روڈ ، پٹھان پورہ ، سول لائن اور اسٹیشن روڈ پر ہو کے حساب سے۔ اگر کوٹھی شہر سے زیادہ دور ہو گی جیسے بیہٹ یا سرساوے کی سڑک پر تو ہو یا مر کے حساب سے۔

لیکن ان تمام سودوں میں ذاتی عنصر کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور اس میں خریدار اور فروخت شدہ دونوں کی ضرورت کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال مولوی صاحب موصوف کے اس بیان کی روشنی میں دس روپے ماہوار کرایہ کے مکان کی بازاری قیمت محل وقوع اور خریدار و فروخت شدہ کی نسبتی ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے معمولی حالات میں دو ہزار اور چھ ہزار روپے کے درمیان قرار دی جا سکتی ہے۔

لیکن سہارنپور کے زیادہ تر مکان ایسے ہیں جن میں مالکان مکان خود رہتے ہیں اس لئے ہاؤس ٹیکس لگانے کے لئے ان مکانوں کی حیثیت تشخیص کرنے کے واسطے جو لوگ مقرر کئے گئے تھے انہیں ان کے امکانی کرایہ کا اندازہ خود کرنا پڑا۔ اس اندازہ میں ظاہر ہے کہ انصاف سے کام لیتے ہوئے وہ شبہ کا فائدہ مالک مکان ہی کو دے سکتے تھے اور

اس کا کم ترین امکانی کرایہ ہی تشخیص کر سکتے تھے۔ لیکن میں نے ذاتی طور پر جس قدر تحقیقات کی اس سے مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ بہت سے ایسے مکان جن کا کرایہ دس روپے ماہوار رکھا گیا ہے انھیں اگر کرایے پر اُٹھایا جاتا یا مالک مکان اسی حیثیت کے مکان کو بارہ میں کرایے پر حاصل کرنا چاہتا تو اس کو واقعی کرایہ بیس روپے اگر نہیں تو کم از کم پندرہ روپے خود ادا کرنا پڑتا۔ اس لئے میری رائے میں مکان کی صحیح قیمت نکالنے کے لئے اوسط مرابحہ کے نرخ کو قبول کرنا چاہیے۔ یعنی دس روپے ماہوار کرایے کے مکان کی مالیت چاہے وہ کسی محلے میں کیوں نہ ہو کم سے کم چھ ہزار قرار دینا چاہیے۔ اور اس قیمت کو انفلیشن (افراطِ زر) سے پہلے کی قیمت ماننا چاہیے۔ لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے اور اس کے منوانے کے لئے میرے پاس کوئی قطعی ثبوت اور فیصلہ کن شہادت موجود نہیں ہے۔

بہرحال مندرجہ ذیل فرقہ وارانہ تحقیقات میں صرف وہ مکان شامل کئے گئے ہیں جن کا ماہانہ کرایہ کم سے کم دس روپے ہے اور اپنی اس تحقیقات کے نتائج کو میں نے حسب ذیل طریقے پر ترتیب دی ہے:-

۱۔ میزان حلقہ ہائے میونسپلٹی شہر سہارن پور	۵ =
۲۔ میزان محلہ جات	۱۳۱ =
۳۔ میزان کل مکانات	۱۸،۹۵۴ =
۴۔ میزان ایک سو بیس روپے سالانہ اور اس سے زیادہ حیثیت کے جملہ مکانات	۲،۴۰۵ =
۵۔ " " " " " " " " مسلم "	۹۵۳ =
۶۔ میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کے کل مکانات	۱۲۱ =
۷۔ " " " " " " مسلم "	۳۲ =
۸۔ میزان بارہ سو روپے سالانہ اور اس سے زائد کے کل مکانات	۳۲ =
۹۔ " " " " " " مسلم "	۵ =

۱۰۔ میزان کل رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت سالانہ روپے یا اس سے زائد سالانہ ہے	۱۵۳۲۰
۱۱۔ میزان مسلم رہائشی مکانات و بنگلہ و کوٹھی و بلڈنگ و کوارٹرز جن کی حیثیت ایک سو روپے یا اس سے زائد سالانہ ہے۔	۵۳۲۰
۱۲۔ میزان چھ سو سے بارہ سو روپے سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ	۹۹۰
۱۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 مسلم 〃 〃	۱۴۰
۱۴۔ میزان بارہ سو اور زائد روپیہ سالانہ کی حیثیت کے کل رہائشی مکانات وغیرہ	۱۳۰
۱۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 مسلم 〃 〃	۸۰

۵۰

	[illegible]	خالص ہندو	۹۴	۶	×	×	×	۱	×	۶	×	×	×	×	×	[illegible]
״	۹- کھیرو سوہنہ	״ ״	۴۰	۶	×	×	×	×	×	۶	×	×	×	×	×	
״	۱۰- ابیان	״ ״	۸۱	۱۲	×	×	×	×	×	۱۲	×	×	×	×	×	
״	۱۱- کھیرہ ثانی	اکثریت مسلم	۲۴۴	۸	×	۱	×	×	×	۶	۱	×	×	×	×	
״	۱۲- [illegible] بارہ	تقریباً خالص ہندو	۱۲۲	۲۶	۳	×	×	×	×	۲۴	۳	×	×	×	×	[illegible]
״	۱۳- محلہ [illegible] اول	خالص ہندو	۳۱	۱۱	۲	×	×	×	×	۱۱	×	×	×	×	×	״ ״
״	۱۴- ״ ״ ثانی	״ ״	۹۰	۲۵	×	×	×	×	۲	۲۵	×	×	×	×	×	״ ״
״	۱۵- مفتی ثانی	تقریباً خالص مسلم	۱۶۱	۱۲	۱۰	×	×	×	×	۱۱	۱۰	×	×	×	×	
״	۱۶- بازار [illegible]	خالص ہندو	۱۵۴	۳۰	۲	۴۱	×	۱۷	×	۳۸	×	۱	×	۱	×	خوش حال [illegible]
״	۱۷- کسیرات	״ ״	۶۸	۶	×	۲۱	×	×	×	۹	×	۱	×	×	×	
״	۱۸- [illegible] دروازہ	اکثریت ہندو	۲۰۲	۲۶	۵	×	×	×	×	۲۳	۵	×	×	×	×	״ ״
״	۱۹- برج [illegible] یادگار	تقریباً خالص ہندو	۲۲۲	۱۳۱	۲	۱	×	۲	×	۱۲۵	۲	×	×	×	×	״ ״
״	۲۰- بازار [illegible]	״ ״ ״	۱۶۵	۹۱	۸	۶	۱	۱	۱	×	×	×	×	×	×	״ ״ ״
״	۲۱- [illegible]	״ ״ ״	۱۵۵	۳۹	۲	۲	۱	۲	×	۲۰	۱	×	×	×	×	
״	۲۲- [illegible]	خالص ہندو	۴۰	۱۲	×	×	×	×	×	۱۴	×	۲	×	×	×	
״	۲۳- [illegible] اول و دوم	[illegible] ہندو و دوکانات [illegible]	۶۵	۳	×	۲	×	×	۲	×	×	×	×	×	×	دوکانیں
״	۲۴- [illegible]	تقریباً خالص ہندو مشترک	۸۴	۸	۴	۱	×	×	×	۱	×	×	×	×	×	״
۵ ۱۳۱ ״ ״		میزان کل	۱۸،۹۵۴	۲،۴۰۵	۹۵۳	۱۲۱	۴۲	۳۲	۵	۱۰،۵۷۱	۵۴۴	۶۹	۱۲	۱۴	×	

۰	۲۵- ...یان	۰ ۰ ۰	۲۶	x	x	x	x	x	x	x	۰	x	x	x	x
۰	۲۶- سلامت رائے	۰ ۰ ۰	۵۰	۱۴	x	x	x	x	x	۱۴	x	x	x	۲	x
۰	۲۷- چاہ بنگراں	۰ ۰ ۰	۶۹	۸	x	x	x	x	x	۸	x	x	x	x	x
۰	۲۸- چاہ چھیل	خالص ہندو	۶۰	۱۳	x	x	x	x	x	۱۳	x	x	x	x	x
۰	۲۹- ریروجات چک ملاد...	کم حیثیت ہندو اہل پیشہ کاشتکار خاکروب کمہار	۱۵۳	۲	۱	x	x	x	x	۲	۱	x	x	x	x
	میزان		۳۰۰۲۲	۲۵۹	۵۸	۱۲	۳	۵	۱	۲۲۱	۴۰	۲	x	۱	x

نام محلہ	نوعیت محلہ	کل	۲۰ روپے سے زائد: کل	۲۰ روپے سے زائد: مسلم	۱۰۰ سے ۲۰۰ روپے تک: کل	۱۰۰ سے ۲۰۰ روپے تک: مسلم	۲۰۰ روپے سے زائد: کل	۲۰۰ روپے سے زائد: مسلم	۱۲۰ روپے تک: کل	۱۲۰ روپے تک: مسلم	۱۲۰ سے ۲۰۰ روپے تک: کل	۱۲۰ سے ۲۰۰ روپے تک: مسلم	۲۰۰ روپے سے زائد: کل	۲۰۰ روپے سے زائد: مسلم	کیفیت
		میزان مکانات ودکانات، احاطے وغیرہ							رہائشی مکانات						
سول لائن مختلف محلے	کوٹھیاں و بنگلے	۶۹	۶۹	۱۵	۴۵	۶	۳	۔	۶۹	۱۵	۴۵	۶	۲	۔	
۔ ۔ ۔ ۔	بلڈنگ و کوارٹر	۲۰۷	۲۰۱	۳۰	۱۸	۱	۸	۔	۲۰۱	۳۶	۱۸	۱	۸	۔	
۔ ۔ ۔ ۔	بنگلہ ہی دفتر و دوکان شامل	۵۰	۴۴	۳	۲	۷	۳	۔	۔	۔	۔	۔	۔	۔	
۔ ۔ ۔	میزان	۵۳۰	۳۲۳	۵۲	۵۲	۸	۱۳	۔	۲۶۶	۵۱	۵۲	۸	۱۰	۔	
جنوبی ۵۳ مختلف محلے	۔	۵,۳۲۵	۱۰۶۱	۹۲۷	۲۳	۱۵	۵	۱	۳۰۹	۲۳۳	۔	۔	۔		
غربی ۳۰ ۔ ۔	۔	۲,۸۹۳	۲۰۰	۹۷	۲	۷	۔	۔	۱۶۲	۴۲	۔	۔	۔	۔	
شمالی ۲۵ ۔ ۔	۔	۳,۰۵۰	۴۵۹	۵۸	۱۹	۳	۵	۱	۲۰۱	۴۰	۲	۔		۔	
شرقی ۲۸ ۔ ۔	۔	۵,۱۴۹	۳۶۳	۱۰۸	۳۹	۹	۵	۲	۳۳۳	۱۱۴	۱۳	۔	۔	۔	
۱۳۱ ۔ ۔	میزان کل	۱۰,۹۵۳	۲,۲۰۵	۹۵۳	۱۲۱	۲۰	۳۰	۵	۱,۰۵۱	۵۳۳	۹۹	۲	۱۳	۔	

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت

کھیل کا صحیح مفہوم | ننھے جراثیم اور کیڑے پانی میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چڑھتے اور اترتے ہیں۔ مرغابیاں سطح آب پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں۔ مچھلیاں ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں۔ درختوں پر بلبل چہچہاتے ہیں۔ ہرن میدانوں میں چھلانگیں مارتے ہیں۔ شیر خوار بچہ دودھ سے سیر ہو کر ادھر ادھر شیشی کو حرکت دیتا ہے یہ اور اس قسم کے جو حرکات کھیل کہلاتے ہیں یعنی کھیل سے مراد وہ بے ساختہ جسمانی حرکات ہیں جن سے ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے اور یہ زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ کھیل کی تفہیم کے سلسلے میں ایک محقق یوں رقم طراز ہے۔ "کھیل فطری ورزش اور جسمانی و دماغی خوشی ہے"۔ فرڈبل لکھتا ہے "کھیل عالم طفلی کی ہونہار کلیوں کی شگفتگی ہے" ویبسٹر ڈکشنری میں کھیل کی تعریف یوں لکھی ہوئی ہے "کوئی ورزش یا حرکات کا سلسلہ جو بغرض تفریح کیا جائے"۔ اسٹانڈرڈ ڈکشنری میں کھیل کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے "کھیل وہ عمل ہے جو بے مقصد یا بغرض انبساط کیا جائے"۔

ایک شیر خوار بچہ بھوک لگنے کی وجہ سے دودھ کی شیشی حاصل کرنے کے لئے جو جد و جہد کرتا ہے وہ کھیل نہیں ہے کیونکہ یہ جد و جہد اس کی ذاتی ضرورت کی تکمیل کرتی ہے اور دودھ پی لینے کے بعد شیشی کو ادھر ادھر جو حرکت دیتا ہے وہ کھیل ہے اگرچہ دونوں حالتوں میں حرکات ایک ہی قسم کی ہوں گی۔ مگر عضویاتی کیفیت مختلف ہوگی۔ اگر ہم کھیل اور کام کے فرق پر بھی غور کریں تو کھیل کی صحیح تفہیم ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکا محض مدرس کے خوف و ڈر سے گیمس میں حصہ لیتا ہے تو یہ گیمس کام کی نوعیت اختیار کر لیں گے۔ کیونکہ بیرونی تحریک سے متاثر ہیں اور جب خوشی خوشی اقلیدس کے مسئلے محض طبع آزمائی کے لئے حل کرے گا تو یہ دلچسپ کھیل ہو جائیں گے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ کھیل اور کام میں فرق رجحان طبع پر موقوف ہے مشاغل

کی نوعیت پر نہیں۔ پس کھیل سے مراد ایسے مشاغل و مصروفیات ہیں جن سے [illegible] نہ ہو بلکہ جبلی تقاضہ کی۔

کھیل کے متعلق نظریے | ماہرین نفسیات نے کھیل کے متعلق جو مختلف [illegible] نظریے پیش کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

نظریہ فاضل توانائی | جس طرح ایک ریلوے انجن میں زیادہ [illegible] ہو جاتی ہے تو زائد بھاپ کو خارج کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی بچوں میں جو قوت [illegible] بطور فاضل جمع ہوتی ہے اس کے اخراج کے لئے کھیل ضروری ہے۔ اس نظریہ کے [illegible] سپنسر اور شیلر، المانوی شاعر و فلسفی متفق ہیں لیکن [illegible] ہی تندرست ہو جاتا ہے کھیل میں حصہ لیتا ہے۔ بچے [illegible] کھیلتے رہتے ہیں۔ مگر حضرات دیگر مصروفیات میں تھک [illegible] کھیلتے ہیں۔

نظریہ تیاری | مختلف کھیلوں کے ذریعے بچے [illegible] زندگی میں انھیں پیش آنے والے ہوتے ہیں۔ اس نظریے کا [illegible] گروس جرمنی کا عالم نفسیات ہے۔ لیکن [illegible] کیونکہ اگر یہ بر بنائے حقیقت ہوتا تو معمر افراد [illegible] کی مصروفیت سے ناواقف نہتے ہیں کھیلتے ہیں۔

جبلی نظریہ | اس کو نسلی اعادہ کا نظریہ یا نظریہ [illegible] ہے کہ اعصابی عادات [illegible] کھیل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس نظریہ [illegible] اس کے پیش نظر حسب ذیل واقعات نہیں ہے [illegible] نہیں کھیلتا۔ معمر افراد پچھلی ادوار ختم کر چکنے کے باوجود کھیلتے ہیں۔ بچے موجودہ سائنٹفک کھیلوں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

نظریہ رشک و رقابت | تعالی قوت ایجاد اور دوسروں کی نسبت اچھی کامیابی حاصل کرنے کی خواہش بچہ کھیل کے ذریعے پوری کرتا ہے۔ اس نظریے کا پیش کرنے والا میکڈوگل ہے۔ لیکن اس نے حسب ذیل حقائق کو نظر انداز کیا کہ شیر خوار بچہ شیشی اور اون کے گولے سے بلا رشک و رقابت کھیلتا ہے اور جو کھیل رشک و رقابت کے جذبے کے تحت کھیلے جاتے ہیں ان کی نوعیت جدا ہوتی ہے۔

تفریحی نظریہ | زندگی کی الجھنوں اور افکارات سے نجات پانے کے لئے قدرتی طور پر افراد کھیل میں حصہ لیتے ہیں۔ اس نظریے کے پیش کرنے والے نے یہ نہیں غور کیا کہ بچے بہ نسبت بالغوں کے کھیلوں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں اور فارغ البال اور خوش حال افراد کو بھی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

کھیل کاہلی کا رد عمل ہے | کاہلی اور تساہل سے بچنے کے لئے افراد کھیل کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ لیکن اس نظریے سے اس امر کی تشریح نہیں ہوتی ہے کہ ہم روزمرہ کے ضروری اور ناگزیر دھندوں سے اکتا جاتے ہیں اور پھر کھیل میں کیوں حصہ لیتے ہیں۔

توازنی نظریہ | کھیل ایسی فعلیت ہے جو دماغی اور جسمانی قوتوں کو توازن میں رکھتی ہے اس نظریے کا پیش کرنے والا مسٹر پیاٹرک امریکن فلاسفر ہے۔ لیکن اس نے غور نہیں کیا کہ دماغی کام کرنے والے بھی کھیلتے ہیں۔

حیاتیاتی نظریہ | اس کی رو سے کھیل جسم کی ساخت اور نمو پر منحصر ہے۔ یعنی کھیل کے حرکات و مشاغل ایسے ہوتے ہیں جو بڑھتے ہوئے جسم کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ضروری اور موزوں ہوں اسی لئے عمر کے ہر مرحلے پر مختلف اقسام کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ اس نظریے کا پیش کرنے والی خاتون مس ایپلٹن ہے۔ اس نظریے کا تعلق حقیقت سے معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر جوزف لی بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں "کھیل بالیدگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔"

کھیلوں کے اقسام ۔ بلحاظ نوعیت کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دیسی کھیل اور دوسرے انگریزی کھیل۔ دیسی کھیلوں سے کبڈی، گلی ڈنڈا، درختوں پر چڑھ کر پھل توڑنا تالاب یا دریا میں تیرنا۔ دیسی کسرت کرنا۔ گدر پھرانا وغیرہ اور انگریزی کھیلوں سے مراد کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال وغیرہ۔ ماہرین کا خیال ہے کہ انگریزی کھیلوں کی بہ نسبت دیسی کھیل زیادہ مفید ہیں۔ کیونکہ ہمارے بزرگ صرف دیسی کھیل ہی میں حصہ لینے کے باعث ہم سے زیادہ صحت مند اور قوی الجثہ ہوتے تھے اور ان کھیلوں میں صرفہ بہت ہی کم ہے علاوہ ازیں بلحاظ مکان کھیلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اندرون دروازہ کھیل مثلاً شطرنج، بلیرڈ وغیرہ اور دوسرا بیرون دروازہ کھیل شد فٹ بال، کرکٹ اور والی بال وغیرہ۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت تمام ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ تعلیمی ترقی کے سلسلے میں کھیلوں کی ضرورت ایسی ہے جیسے توانا اور تندرست جسم کے لئے عمدہ غذا کی۔ ایک عام ضرب المثل بھی اس حقیقت کو یوں بے نقاب کرتی ہے کہ تندرست دماغ تندرست جسم میں ہی رہتا ہے مشہور پیاٹرک امریکی فلاسفر کے خیال کے مطابق کھیل دماغی اور جسمانی قوتوں میں توازن برقرار رکھتا ہے۔ طلبہ جب دماغی کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو کھیل نہ صرف دماغی تھکن کو دور کرتے ہیں بلکہ دماغ کی کھوئی ہوئی توانائی کی تکمیل کرتے ہیں۔ طلبا کی تعلیمی مصروفیت اس قوت کا مظاہرہ ہے جو دماغ کے ریشوں اور اعصابوں کے جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جلانے کا فعل خون کی آکسیجن انجام دیتی ہے۔ ان کے جلنے کی وجہ سے ایک طرف توانائی پیدا ہو کر محدود معاون مصروفیت ہوتی ہے تو دوسری طرف مسموم فضلہ تیار ہو کر باعث ذہنی یا اعصابی یا دماغی نقصان ہوتا ہے۔ اس مسموم فضلہ کو ہٹانے کے لئے تازہ خون کے دورہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ یہ پسینہ وغیرہ کے ذریعے خارج ہو جائے۔ تازہ خون کا دورہ اور پسینہ کا اخراج جسمانی حرکات مثلاً کھیل، ڈرل وغیرہ پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہر تعلیمی ساعت

کے اختتام پر ایک منٹ کی ڈرل کے لئے اسی وجہ سے زور دیا جاتا ہے۔

عموماً طلبا تنگ و تاریک کمروں میں بیٹھ کر محنت شاقہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان میں ضعف معدہ کی شکایت پیدا ہوتی ہے۔ یہ شکایت کھیلوں میں حصہ لینے رہنے سے بہت جلد رفع ہوجاتی ہے۔ کھیلوں سے نہ صرف جسمانی صحت مندی حاصل ہوتی ہے بلکہ بہادری، اطاعت، ایمان داری اور اشتراک عمل جیسے اعلیٰ صفات پیدا ہوتے ہیں روایت ہے کہ ایٹن اسکول کے کھیل کے میدان میں جنگ واٹرلو میں فتح یابی حاصل ہوئی تھی۔ غرض تعلیم میں کھیلوں کی بڑی اہمیت ہے۔ کھیلوں کی وجہ سے طلبہ بام عروج پر پہنچے ہیں اور دنیا میں ان کے کارنامے مثل آفتاب کے روشن رہتے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے بعض ماہرین تعلیم کھیلوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ کھیل ہی تعلیم کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے اور کھیل ہی کی بدولت طالب علم کو صحیح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

ویل پولنگ لکھتا ہے:-

Give me the direction of the play life of the youth of this generation and I will dictate the path tomorrow.

کھیل کی اسپرٹ | کھیل کی اسپرٹ سے مراد وہ رجحان طبعی ہے جو درجہ نشو و نما کے موافق ہو اور جس کی بدولت مصروفیات کی انجام دہی برضا و رغبت ہو۔ آج کل ماہرین تعلیم اس کھیل کی اسپرٹ کو مدرسے میں رواج دینے کے کوشاں ہیں تاکہ طلبا بغیر مدرسہ کی تحریک کے خوشی خوشی تعلیمی مصروفیات میں حصہ لیں تاکہ تعلیم مفید اور موثر ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ طلبا جب اس اسپرٹ کے زیر اثر مدرسے کی مصروفیات میں حصہ لیتے ہیں تو ان کو ترک کرکے گھر جانا دوبھر معلوم ہوتا ہے۔

کھیل اور جسمانی تربیت | قدیم زمانے میں بچوں کو اپنے والدین کے کام کاج میں حصہ ملتا تھا

جس کی وجہ سے وہ طاقتور اور جسیم ہوتے تھے۔ موجودہ زمانے میں بچہ [illegible] کی [illegible] عمری ہی میں درسگاہ میں شریک کر دیا جاتا ہے۔ پس انسانی [illegible] انی تربیت اور [illegible] نشوونما کے لئے مدرسے میں کھیل ہی موزوں ذریعہ ہے جس کی وجہ سے ان کے [illegible] اعضا [illegible] کی [illegible] اور [illegible] تربیت ہوتی ہے اور وہ قوی اور طاقتور بن سکتے ہیں۔ جسمانی قوت [illegible] جیسا کہ اکثر ماہرین تسلیم کرتے ہیں۔ اخلاقی سیرت کا ایک جزو ہے [illegible] ثابت قدم رہنے اور دل کو مضبوط کرکے جرأت اور دانشمندی سے [illegible] جسمانی قوت اور توانائی کی ضرورت ہے۔

<u>کھیل اور عقلی تربیت</u> | منظم کھیلوں میں جب بچے حصہ لیتے ہیں [illegible] تفکر اور تخیل کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی اچھی تربیت ہوتی ہے۔ فیصلہ کی تربیت کھیل میں بہت اہم ہے۔ فوری اور صحیح فیصلہ کرنے [illegible] ضروری ہے مثلاً فٹ بال کے کھیل میں ایک سیکنڈ [illegible] گیند کو [illegible] سے [illegible] کا فوراً صحیح فیصلہ کرنا پڑتا ہے ورنہ غلط فیصلہ [illegible] نقصان اٹھانا پڑتا ہے [illegible] کھیلوں میں فیصلہ کی تربیت [illegible] زیادہ ہوتی ہے [illegible] کھیلوں میں بچہ اپنی [illegible] کو فراموش کرکے کھیل کے حرکات میں منہمک رہتا ہے۔ یہ خود [illegible] رہنمائی کے لئے راستہ صاف کرتی ہے۔

<u>کھیل اور معاشرتی تربیت</u> | کھیل میں حصہ لینے سے بچہ خود بخود معلوم کر لیتا ہے کہ ہم صحبتوں کی کتنی اہمیت اور ضرورت ہے سادہ منظم کھیلوں اور ان کے مقابلوں میں مثلاً [illegible] فٹ بال اور کرکٹ میں بچوں کو شریک کرانے اشتراک باہمی کے جذبات کی بخوبی تربیت کی جاسکتی ہے۔ چونکہ بچہ اپنی ٹیم کی خاطر اپنی انفرادی حیثیت کو مٹا دیتا ہے۔ اس لئے

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

کا حقیقی درس بچے کو کھیل ہی سے بخوبی حاصل ہو سکتا ہے۔ اپنے لیڈر کی اطاعت۔ فرمانبرداری

احساس کا احترام کرنا۔ کھیلوں کی وجہ سے ہی بچہ عمدگی سے سیکھتا ہے۔ کسی نے بجا کہا ہے کہ "کھلاڑی پن ہی اخلاقیات کا اولین سادہ اساس ہے"۔

کھیل اور عملی تربیت خود اعتمادی۔ قوت عمل اور معینہ مقصد کامیاب زندگی کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کا حصول حقیقی طور پر کھیلوں میں حصہ لینے سے ہوتا ہے۔ اگر ان کے ساتھ تھوڑا سا علم بھی شامل کر دیا جائے تو شاندار نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ کام خواہ کتنا ہی دلچسپ ہو۔ دو تین گھنٹوں کی محنت کے بعد انسان تھک جاتا ہے مگر جو بچے کھیلوں میں زیادہ عرصے تک حصہ لے کر بلا تھکن محنت و مشقت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ کام کو بھی بلا تھکن انجام دے سکتے ہیں۔ جفاکشی اور تندہی کے مظاہرے کھیل ہی کی بدولت نمایاں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں حرکات و سکنات میں آسانی و تناسب کھیل ہی کی وجہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ طالب علم کی زندگی میں کھیل کس قدر معاونت پیدا کر دیتے ہیں۔

کھیل اور شہریت کھیل کے میدان میں تمام حصہ لینے والوں کی حیثیت یکساں رہتی ہے۔ یہاں امیر و غریب کا امتیاز نہیں رہتا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت اور دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کا سبق کھیل ہی میں عملی طور پر ملتا ہے۔ اخلاقی اور مدنی تربیت کے جو مواقع کھیل میں حاصل ہوتے ہیں وہ کسی نصابی مضمون سے نہیں ہوتے۔ رضاکارانہ خدمات کی انجام دہی کا سبق کھیلوں کے ہی میدان سے حاصل ہوتا ہے۔ ٹیم کے ساتھ پوری وفاداری اپنی انفرادیت پر غالب آ جاتی ہے۔ جس سے شہریت اور جمہوریت کا صحیح احساس پیدا ہوتا ہے۔

تعلیم میں کھیلوں کی اہمیت کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم اس اہم نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کھیل کو تعلیم کے سب سے بڑے ارکان میں سے ایک سمجھا جانا مناسب اور ضروری ہے۔ تعلیم کی مراد اس صلاحیت اور عقل تمیزی کی تربیت ہے جو عملی زندگی کے کاروبار میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کام میں لائی جاتی ہے۔ یہ تربیت کھیلوں کے اہم حصے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

محمد مختار احمد بی ایس سی

زرعی ترقی کے لئے حکومت ہند کا منصوبہ

ذیل میں اس یادداشت کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے جسے زراعت اور فلاحت حیوانات کی ترقی کے لئے زرعی تحقیقات کی شاہی کونسل کے مشاورتی بورڈ نے حکومت ہند کے لئے تیار کیا ہے:

مسئلہ | ہندوستان کی سب سے اہم غذا اناج میں یعنی چاول، گیہوں اور جوار باجرہ جن کے ساتھ اکثر غذاؤں کے ساتھ دالیں بھی ملا کر کھائی جاتی ہیں چکنائی حاصل کرنے کے لئے اکثر لوگ نباتی تیل اور گھی کو استعمال کرتے ہیں۔ دودھ اور دودھ کی بنی ہوئی چیزیں ملک کے بعض حصوں اور بعض گروہوں میں اگرچہ خاص مقدار میں کھائی جاتی ہیں لیکن اکثر حصوں اور غریبوں کی بڑی تعداد ان کا استعمال بہت کم کر پاتی ہے۔ غذا کے بارے میں جو بیانات شائع کئے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی تیس فی صدی آبادی یعنی دس کروڑ سے زیادہ آدمیوں کو عام طور سے ضرورت سے کم غذا میسر آتی ہے۔

پھر غذا محض مقدار کے لحاظ سے ناکافی نہیں ہوتی بلکہ اس کی ترکیب بھی نامطمئن اور غیر متوازن ہوتی ہے۔ چکنائی کا استعمال بلا استثنا کم کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے رہنے والوں کی غذا میں عموماً چونے کی کمی ہوتی ہے اور ہندوستان کی اکثر غذاؤں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں حیاتین بہت کم ہوتے ہیں۔

مقصد | ہندوستان میں خاص خاص غذاؤں کی سالانہ پیداوار کا اوسط تقریباً حسب ذیل قرار دیا جا سکتا ہے:-

اناج	۶ کروڑ ٹن
دالیں	۵۰ لاکھ ٹن
چکنائیاں اور تیل	۱۹ " "

پھل	...	۴۰ لاکھ ٹن
ترکاریاں	...	۱۰ " "
دودھ[1]	...	۲ کروڑ ۲۰ " "
گوشت مچھلی اور انڈے	...	۱۵ " "

بظاہر پیداوار کی یہ مقداریں بہت کثیر معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ماہرین غذائیات نے مناسب اور متوازن غذا کی جو کم ترین مقدار مقرر کی ہے اس کے مقابلے میں ۴۰ کروڑ آبادی کے لئے ان سے ناکافی غذا حاصل ہوتی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے غذا کی پیداوار میں حسب ذیل اضافہ کرنا ضروری ہیں۔

اناج میں دس فی صدی۔ دالوں میں بیس فی صدی چکنائی، اور تیلوں میں دو سو پچاس فی صدی۔ پھلوں میں پچاس فی صدی۔ ترکاریوں میں سو فی صدی۔ دودھ میں تین سو فی صدی مچھلی اور انڈوں میں تین سو فی صدی۔

اس لئے قومی خود کفالت کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے پیداوار کے ان اضافہ فی صدی کو کم ترین مقصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس نصب العین کی تکمیل کے سلسلے میں دودھ اور جانوروں کی محنت کی مقدار کے بڑھانے کی جو ضرورت ہوگی اُسے جانوروں کے لئے کافی چارہ مہیا کر کے ہی پورا کیا جا سکے گا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس کے لئے کھلی اور دیگر دودھ بڑھانے والی غذاؤں کی مقدار میں چار سو فی صدی اور چارہ کی مقدار میں پچپن فی صدی اضافہ کرنا ضروری ہوگا۔ آخر میں غذائی فصلوں اور تجارتی فصلوں کے درمیان بھی ایک مناسب توازن پیدا کرنا ہوگا تاکہ لوگوں کو نہ صرف کافی غذا کھانے کو میسر آئے بلکہ ان کی قوت خرید بھی بڑھے۔ جس سے کہ وہ کپڑا اور دوسری وہ سہولتیں فراہم کر سکیں جو ایک زیادہ مکمل اور زیادہ خوش حال زندگی کے لئے ضروری ہیں۔

---

[1] اس میں سے صرف ۱۰ فی صدی یعنی ۲۰ لاکھ ٹن دودھ کی صورت میں رہتا باقی مکھن اور گھی کی صورت میں استعمال

ہندوستان میں مختلف اسباب کی بنا پر، اکثر فصلوں کی پیداوار فی ایکڑ بہت کم ہے۔ زیر کاشت رقبہ کا بڑا حصہ بارانی ہے اور اس کی کامیابی کا دارومدار زیادہ تر بارش پر ہوتا ہے۔ بیشتر علاقوں میں بارش یا تو غیر یقینی ہوتی ہے یا نادرست ہوتی ہے۔ کاشتکار اپنی مجبوریوں یا ناواقفیت کی بنا پر اپنی زمین سے اور بارش اور آبپاشی کی سہولتوں سے جتنا فائدہ اٹھانا چاہیے اتنا نہیں اٹھاتا۔ وہ اپنی فصلوں میں یا تو ناکافی کھاد ڈالتا ہے یا سرے سے ڈالتا ہی نہیں ہے کاشتکاروں کی اکثریت بیجوں کی بہترین اور ترقی یافتہ قسموں کو استعمال نہیں کرتی۔ کاشت کا معیار پست ہے اور دقیانوسی ہل ہی زیر استعمال ہیں۔ جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے نقصان رساں جانوروں اور فصلوں کی بیماریوں کی روک تھام نہیں کی جاتی۔ کھیت میں گھاس پات خوب اپنی مرضی کے مطابق اُگتی رہتی ہے اور پیداوار کا نقصان ہر قسم کا ہوتا ہے۔ کھیت کی زرخیز مٹی کٹ کٹ کر بہہ جاتی ہے اور بارش کے پانی کو مینڈھیں بنا کر اور دوسرے ذرائع اختیار کر کے قابو میں رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی۔ یہ چند وجوہ ہیں جن پر مناسب توجہ کر کے کاشتکار اپنی زمین کی پیداوار میں بہت حد تک اضافہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اپنے پالتو جانوروں سے بھی بہت کم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو چارہ ناکافی مقدار میں دیا جاتا ہے دوسرے ان کی نسل کشی میں کوئی معیار ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ غیر تسلی بخش انتظام اور امراض کی تباہی کی وجہ سے پیداوار فی جانور جتنی ہندوستان میں کم ہے اتنی دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہے۔

ذرائع | غذائی خود کفالت اور قوت خرید کے اضافہ کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بنیادی ضرورت یہ ہے کہ تمام قومی وسائل کے بہترین استعمال کی ضمانت کی جائے اور سائنس اور ٹیکنالوجی نے اب تک جو جو طریقے معلوم کئے ہیں ان سب سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ ان ذرائع میں حسب ذیل کو شامل کیا جا سکتا ہے:-

پانی :- فصلوں کی پیداوار پر کسی دوسرے عنصر کا اتنا زبردست اثر نہیں پڑتا

جتنا کہ آبپاشی کا پڑتا ہے۔ چاہے وہ مصنوعی ہو یا قدرتی۔ اس کے ذریعے غیر بارانی ریگستان جہاں کوئی فصل نہیں ہوتی پُر بہار اور ثمر دار نخلستانوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اور غیر یقینی بارش کے علاقوں سے ہر سال یقینی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ پھر ان آخر الذکر علاقوں میں نہ صرف پیداوار کو یقینی بنایا جا سکتا ہے بلکہ جب آبپاشی پر قابو رکھنا ممکن ہوتا ہے تو ان کی پیداوار کو سو فی صدی تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ غیر بارانی علاقوں کو بارش سے جو فائدے ہیں ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر چونکہ مزروعہ رقبہ کا کچھ حصہ غیر آبپاشی شدہ تر ہے اس لئے ملک میں بصورت مجموعی پانی کے تمام ذرائع کے بیش ترین استعمال سے پیداوار کو غالباً پچاس فی صدی تک بڑھایا جا سکے گا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ پانی کے تمام ذریعوں سے بیش تر فائدہ اُٹھانا نہایت لازمی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ ان دریاؤں کے بہاؤ، رفتار اور سمت کو گرفت میں لانا جن میں پانی کی رسد کافی ہوتی ہے، اور ان کے پانی کی تقسیم کے لئے آبپاشی کی نہریں تعمیر کرنا۔

۲۔ جہاں بہاؤ کی آبپاشی ممکن نہیں ہے وہاں براہ راست دریاؤں یا نہروں سے پانی کو اٹھانے کے لئے مشینی ذرائع کا استعمال کرنا۔

۳۔ ایسے تہ نشین پانی کے لئے جو آبپاشی کے لئے موزوں ہو۔ نل دار کنویں (ٹیوب ویل)، اور کھلے رہنے والے کنوئیں بنانا اور موجودہ کنوؤں میں سوراخ کرنا (بورنگ)

۴۔ آبپاشی کے لئے چھوٹی تعمیرات بنانا، مثلاً تالاب اور ان میں بارش کا زائد پانی پہنچانا تاکہ اسے بعد میں استعمال کیا جا سکے۔

۵۔ مٹی کے کٹاؤ کو قابو میں لا کر بند کرنا، اور ڈھلوان زمین کو مختلف سطحوں کے ہموار چبوتروں میں تقسیم کر کے بارش کے پانی کو استعمال کرنا اور کاشت کے موزوں طریقوں سے بارش کے پانی کو زمین کے اندر زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھنا۔

پانی سے بیش ترین فائدہ اٹھانے کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ وسائل اور ان رقبوں نہیں ترقی دینا ہے مکمل پیمائش کرائی جائے اس کے بعد ضروری سکیمیں تیار کی جائیں جب باتیں ہو جائیں تب آخری مفصل فیصلے کئے جائیں۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں ان ابتدائی منزلوں گذرنے میں ممکن ہے کئی برس لگ جائیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ ترقی کا کام ب تک سب رقبوں کی پیمائش نہیں ہو جائے گی اس وقت تک رکا رہے گا۔ نئی تعمیرات کام ہر منفرد رقبہ یا منصوبہ کی پیمائش کے بعد شروع کیا جا سکتا ہے اور اس کے بارے ں اسکیم تیار کی جا سکتی ہے اور مفصل لاگت کے تخمینے کرائے جا سکتے ہیں۔

زمین:۔ زمین سے بیشترین فائدہ بھی کئی طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے

(الف) ۱۱ کروڑ ایکڑ کے اس مجموعی رقبہ میں سے جو اس وقت پرتی یا بنجر پڑا ہوا ہے لے رقبے کو کاشت میں لانا جس پر فصلوں کا پیدا کرنا نفع بخش بنایا جا سکتا ہے۔ بظاہر ں کے کٹاؤ بارش کی زیادتی یا قلت انتہائی شوریت اور تقلیت اور گہری جڑ ور دالی اس بات نے اس بڑے بنجر رقبہ کو کاشت کے لئے ناموزوں بنا رکھا ہے۔ لیکن بہت سی صورتوں ں نہ تو ان رقبوں کے محل وقوع کا علم ہے جنہیں دوبارہ کاشت میں لایا جا سکتا ہے اور نہ س بات کا کہ ان کی وسعت کیا ہے۔ اس لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ اس بات کی پیمائش رائی جائے کہ زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر کاشت نہ کئے جانے کے اسباب کیا ہیں۔ ن پیمائشوں کے بعد زمین کی باریابی کے لئے موزوں سکیمیں تیار کرائی جا سکتی ہیں۔

(ب) زمین کے کاشت سے خارج ہو جانے کی روک تھام کی جائے۔ اس ذیل میں ب سے اول کام تو زمین کے کٹاؤ پر قابو حاصل کرنا ہے جس کے لئے اولین ضرورت یہ ہے کہ ر شے طاس کے علاقے کے پانی کو قابو میں رکھا جائے اور زرعی زمین پر سے اس کے گذرنے تدارک کیا جائے۔ کیونکہ وہ اس کی زرخیز سطح کو بہائے جاتا ہے۔ (اس اصل مقصد کے صول کے ضمن میں پانی کو اس طرح بھی گرفت میں رکھا جا سکتا ہے کہ اس سے آبپاشی کا پانی بھی

کا یا دونوں کام لئے جا سکیں ۔ اس معاملے میں بھی پہلی منزل یہ ہے کہ بڑے بڑے خاص کے علاقوں کی پہلے پیمائش کرائی جائے اور بعد میں ان پر قابو حاصل کرنے کے لئے ضروری اسکیمیں تیار کرائی جائیں ۔

ڈھالو زرعی زمینوں کو ان تباہ کن اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے جو شدید بارش کے پانی یا غیر قابو یافتہ پانی کے بلند سطح سے بہہ کر آنے اور اپنے ساتھ اوپر کی زرخیز مٹی کو بہا کر لے جانے سے رونما ہوتے رہتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ چبوترہ بندی اور پشتہ سازی کی ایک مستقل پالیسی کو اختیار کیا جائے ۔ ان پشتوں کی مناسب تقسیم ، درجہ بندی اور تعداد کیا ہو اس کا فیصلہ کرنے کے لئے بھی گاؤں گاؤں کی پیمائش انجینیروں سے کرانا ضروری ہے ۔ اس کے ہر پشتہ کی ضروری لمبائی کا تعین کیا جا سکے گا اور مقررہ سالوں کی ایک مدت کے لئے پشتہ سازی کا ایک مکمل منصوبہ تیار کیا جا سکے گا ۔

(ج) زمین سے مناسب فائدہ حاصل کرنے کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ سائنس کے تجربے اتنے بڑے پیمانے پر کئے جائیں کہ جس کے ذریعے زراعت کے افسر کو یہ موقع حاصل ہو کہ وہ کاشتکار کو بتلا سکے کہ اس کی مخصوص زمین اور اس کی انفرادی ضرورتوں کے لئے کاشت کا کون سا طریقہ موزوں ترین ہوگا ۔ موجودہ زمانے میں بعض معاملات کے بارے میں ہر چند خاصی معلومات موجود ہیں لیکن دوسرے ایسے معاملے بھی ہیں جن کے بارے میں معلومات قطعاً ناکافی ہیں ۔ ان معلومات کے اکٹھا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سارے ملک کی ہر قسمت کے اندر جہاں جہاں اس وقت کوئی تجربی فارم موجود نہیں ہے اس قسم کا فارم قائم کیا جائے ۔

(د) زمین سے بیش ترین فائدہ اٹھانے کی آخری تدبیر کا تعلق زیادہ تر خود کاشتکار کی ذات سے ہے اور اس میں فصلوں کی پیداوار کو بڑھانا شامل ہے جس کے لئے کاشت کے ترقی یافتہ طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں ۔ مثلاً کھاد دینا ، بہتر بیج کا بونا ، جتائی کے

طریقوں کو بہتر کرنا، نقصان رساں جانوروں اور امراض پر قابو پانا۔

غذائی فصلوں کو کھاد سے جو فائدہ پہنچتا ہے وہ فصل، زمین اور آبپاشی کی سہولتوں کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ مناسب کھاد کی وجہ سے چاول کی فصل میں دیکھا گیا ہے کہ ایک سو پچاس فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ہندوستان کے لئے بصورت مجموعی تیس فی صدی کا اضافہ عملی طور پر قابل حصول تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ گیہوں پر جو تجربات کئے گئے ہیں ان میں صفر سے لے کر ۵۰ فی صدی تک اضافہ ہوا ہے۔ اس فصل کے لئے بصورت مجموعی ۲۰ فی صدی اضافہ لائق حصول قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر آبپاشی کی سہولتیں بھی حاصل ہوں گی تو اضافہ اور بھی بہت زیادہ ہوگا۔

کھاد کے ایک ہمہ گیر پروگرام میں تمام کھادوں کو شامل کرنا ہوگا اور ان کو کافی مقدار میں پیدا کرنے کے لئے تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی۔ جانوروں کے گوبر سے کھاد کا موجودہ زمانے میں صرف چالیس فی صد حصہ زراعتی زمینوں میں پہنچ پاتا ہے۔ اس تناسب کو جب ہی بڑھایا جا سکے گا جب گوبر کے ایندھن کے بدلے میں کسی دوسرے ایندھن مثلاً لکڑی یا کوئلہ کی کافی رسد مہیا کی جا سکے گی۔ آبپاشی شدہ غذائی فصلوں اور بعض اور پیداواروں کے لئے نباتی کھاد کو بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ شہر اور دیہات کے [illegible] فضلہ [illegible] کھاد بنا کر دوبارہ زمین میں پہنچا دینا چاہئے۔ کھلی کو بھی بڑی مقدار میں فراہم کرنا چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تیلہن کا صرف تیل ہی غیر ملکوں کو برآمد کیا جائے اور ان کی کھلی کو جانوروں کی غذا اور کھاد کے لئے رکھ لیا جائے۔ مصنوعی کھاد خصوصاً سلفیٹ آف امونیا اور بعض علاقوں کے لئے فاسفیٹ کے کھاد بھی سستی قیمت پر بہت بڑی مقدار میں فراہم کرنے چاہئیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں سالانہ پچاس لاکھ ٹن سلفیٹ آف امونیا سے کم کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اس وقت تین لاکھ پچاس ہزار ٹن سالانہ کی تیاری کا مسئلہ زیر غور ہے۔

بیج کی ترقی یافتہ قسموں کے بونے سے پیداوار فی ایکڑ کو دس تا پندرہ فی صد بڑھایا جاسکتا ہے۔ بیج کو کافی مقدار میں فراہم کرنے کے لئے رجسٹری شدہ بیج اُگانے والوں کی نگرانی میں، بیج کے بہت سے فارم قائم کرنا ہوں گے اور انھیں بیج کی منظم پیداوار سے منسلک کرنا ہوگا۔ اس بیج کی تقسیم اور اس کی قیمت بصورت جنس یا نقد کی وصول یابی کے لئے پانچ ہزار بیج گودام قائم کرنا ہوں گے۔

بوائی کے طریقوں میں ترقی کا جو علم اب تک حاصل کیا گیا ہے وہ کسانوں کی رہنمائی کے لئے بعض معاملوں میں تو کافی ہے لیکن دوسرے معاملوں میں ناکافی ہے اور جو نئے تجرباتی فارم آیندہ قائم کئے جائیں گے ان کے لئے ابھی بہت سا کام کرنا باقی ہے تب کہیں زمین اور آب ہوا کی تمام مختلف حالتوں میں کسان کو مکمل رہنمائی فراہم کی جاسکے گی۔ بیلوں سے کھینچے جانے والے ترقی یافتہ اوزاروں کے ایجاد کرنے میں ہندوستان کے مختلف حالات کا لحاظ کرتے ہوئے عملی تحقیقات کی ضرورت باقی ہے۔ قوت محرکہ سے چلنے والی مشینوں کو جو اہمیت پیداوار کے بڑھانے میں حاصل ہوگی ان کے پیش نظر ٹریکٹروں اور اُن کے اوزاروں اور مشینوں کا درآمد کرنا اور ان سے وسیع پیمانے پر تجربہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔ جب تک اس بات کی پیمائش نہ کی جائے کہ مختلف علاقوں میں قوت محرکہ سے کاشت کی کتنی گنجائش ہے اور اس کی معاشیات کے بارے میں تجربے نہ کئے جائیں اس وقت تک اس قسم کی کاشت کا مستقبل تاریکی ہی میں رہے گا۔

قوت محرکہ کی کاشت کے امکانات سے ملا جلا ایک اور مسئلہ بھی ہے یعنی یہ کہ بیش ترین پیداوار اور بیش ترین بہبود کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کاشت کے کن مختلف نظاموں کی توسیع کے مواقع ہندوستان میں زیادہ موجود ہیں۔ بہت سوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کھیتوں کی چک بندی نہیں کی جائے گی ان کی پیداوار نہیں بڑھ سکے گی۔ دوسرے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے گاؤں کو اکائی مان کر فصلوں کی

چک بندی کے تجربے کو کامیابی کے ساتھ چلا رہا ہے۔ اشتمالی کاشت اور امداد باہمی کی کاشت کے حامی بھی موجود ہیں۔ جب تک بڑے بڑے رقبوں میں ان تمام نظاموں کا تجربہ نہ کیا جائے اس بارے میں کوئی عمومی حکم دینا کہ ان میں سے کون سب سے بہتر ہے یا یہ مشورہ دینا کہ کسی خاص علاقے یا حالات کے لئے کون سا نظام سب سے زیادہ موزوں ہے ناممکن ہوگا۔ اس کے بارے میں تحقیقات کرنا نہایت ضروری ہے اور ان کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہئے۔

نقصان رساں جانوروں اور بیماریوں سے فصلوں کی کافی حفاظت کرنے سے پیداوار میں گمان یہ ہے کہ اوسطاً پانچ فی صد اضافہ کیا جا سکے گا جب ذخیرہ کے طریقوں میں بھی زیادہ احتیاط برتی جانے لگی تو غذائی اناج کی اور زیادہ مقدار کھانے کے لئے محفوظ کی جا سکے گی۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے حفاظتی طریقوں کو پوری طرح عمل میں لانے سے پہلے نہ صرف مختلف سمتوں میں مزید علمی تحقیقات اور تجربوں کی ضرورت ہے بلکہ کافی بڑے پیمانے پر کیڑے مار اور پھپھوند ضائع کرنے والی دوائیں اور ان کے استعمال کرنے کی مشینوں کو بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آلو جیسی پیداوار کو اس عظیم نقصان سے بچانا ہو جو ذخیرہ کے زمانے اس کو پہنچتا ہے تو ہمیں سرد ذخیروں کا بھی خاص کر بیج کے آلوؤں کے لئے انتظام کرنا ہوگا۔

پالتو جانور ہندوستان کے گلوں اور ریوڑوں کی پیداوار میں اضافہ کا انحصار بہت بڑی حد تک ان کی غذا کی مقدار اور اس کی نوعیت کی بہتری پر ہے۔ یہاں ہر قسم کی غذا کی کمی پائی جاتی ہے۔ بھوسے اور اناج کی ضمنی پیداواروں کی رسد میں تو اس وقت اضافہ ہو سکے گا جب انسانی خوراک کے لئے زیادہ اناج بویا جائے گا۔ لیکن چارہ کی ضرورت کو بہت بڑی حد تک گھاس کو خشک کرنے اور سبز حالت میں گڑھے کے اندر دبانے سے اور چراگاہ کی زمینوں کے معقول انتظام سے اگر ان میں مناسب توسیع بھی کر دی جائے پورا کیا جا سکے گا۔ تیلہن کی صنعت سے جو کھلی حاصل ہوتی ہے وہ ضرورت کے صرف چوتھائی حصے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اس کی رسد کے بڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ کھلی کی برآمد پر پابندی عائد کی جائے۔

اور ٹین کی پیداوار بڑھائی جائے۔ چارہ کے لئے بوئی ہوئی فصلیں بھی پالتو جانوروں کے لئے قیمتی غذا، مہیا کرتی ہیں لیکن چونکہ ان کے بونے کے لئے اکثر انہی زمینوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کی انسانی غذا کے بونے کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو مقابلے میں دوسرے درجے پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود چارہ کی فصلوں کی پیداوار بڑھانے کی (خاص طور پر دودھ دینے والے مویشیوں کے لئے) فوری ضرورت ہے اور اس کی طرف مناسب توجہ کرنی چاہیے۔

آج کل جو مویشی پائے جاتے ہیں ان سے بیشتر کی نسل میں کوئی بات لائق ذکر نہیں۔ مزید مویشی کی پیداوار کے بڑھانے کے سلسلے میں دوسرا کام یہ ہے کہ ان کی درجہ بندی کرکے ان کی نسل کو ایسی معروف نسلوں کے معیار تک ترقی دی جائے جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ ان کے اندر بہ مزید خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے لئے نسل کشی پر نگرانی رکھنا ضروری ہے۔ اور اس کے لئے بڑی تعداد میں اعلیٰ نسل کے سانڈ فراہم کرنا چاہئیں۔ اس مقصد کے پیش نظر نسل کشی کے پچاس فارموں سے ابتدا کی جا سکتی ہے۔

پالتو جانوروں کی پیداوار میں فوری اضافہ دیہات کے بعض روزمرہ کے کاموں کے انتظام میں تبدیلیاں پیدا کرنے سے کیا جا سکے گا۔ مثلاً ایسے کاموں سے دودھ دینے والی گایوں کے خشک رہنے کے زمانے کو مختصر کیا جا سکے گا یا ایسے کاموں سے جن کے ذریعے موسم کی سختی سے حفاظت کرکے نئی نسل کی زندگی اور تندرستی کو محفوظ کیا جا سکے گا یا پھر ایسے کاموں جن کے ذریعے مناسب طور پر نظم و ضبط قائم رکھ کر اور ابتدائی طور پر انہیں مصنوعی شکل دے کر حیوانی پیداواروں کا تحفظ کیا جا سکے گا۔

پھر ضرورت اس کی ہے کہ مندرجہ بالا ترقیوں سے جن اچھے نتائج کے حاصل ہونے کی توقع ہے وہ بیماریوں کے پھیلنے کی وجہ سے برباد نہ ہو جائیں۔ جانوروں کی رائج الوقت وبائی بیماریوں کا تدارک کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں ابھی دریافت کرنا باقی ہیں

بیلن بیماری کے بارے میں تحقیقات سے جو فی الحال ہو رہی ہیں [illegible] وسیع استعمال کے ذریعے بھی ملک کو زبردست نقصان سے بچایا جا سکتا [illegible] سب سے زیادہ فوری ضرورت یہ ہے کہ کافی مقدار میں ادویات [illegible] بجوزت پر یعنی بیماری کے جاگزیں ہونے سے پہلے اور بعد میں [illegible]

پالتو جانوروں کے بارے میں ضرامل مسائل پر بھی تحقیقات [illegible] ہیں سب ہی طرح کی چیزیں شامل ہیں مثلاً افزائش نسل [illegible] اور فراہمی غذا کی معاشیات سے کر روزانہ زندگی کے [illegible] مخصوص حالات کی روشنی میں مرغی خانہ کا موزوں ترین [illegible]

حیوانی پیداواروں کی فروخت کی دقتوں کی وجہ سے بھی [illegible] حد تک ہی بڑھایا جا سکتا ہے۔ دودھ کے جمع منتقل و تقسیم [illegible] مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کی نوعیت ہر اس رقبہ کے لیے جس [illegible] مختلف ہوتی ہے۔ ان کے مناسب بندوبست کے لئے [illegible] نہایت احتیاط کے ساتھ پیمائش کرائی جائے [illegible] دینے کی ضرورت ہے اور دودھ کی پیداوار کو مصنوعی [illegible] ہر جگہ قائم کرنا بھی توسیع و ترقی کی ضروری شکلیں ہیں [illegible] درکار ہے۔

ملک کے مچھلی کے وسائل سے کبھی کافی مقدار میں اور مسلسل طریقے پر [illegible] سمندر سے مچھلی پکڑنے کے ترقی یافتہ طریقوں کی آزمائش کرنی اور [illegible] جو مچھلی پکڑی جاتی ہے اس کو ہاتھ لگانے، تیار کرنے، ذخیرہ کرنے اور منتقل کرنے کے [illegible] جدید ذرائع کی تحقیقات کرنا چاہیے۔ بعض سمتوں میں تو فوری کارروائی کی جا سکتی ہے مثلاً خشکی کے اندر ماہی گاہوں کی فوری توسیع، تالابوں، جھیلوں، اور [illegible] میں

مچھلی کے مناسب بیج ڈال کر کی جا سکتی ہے۔ بنیادی اور ترقی دونوں طرح کے کاموں میں عملی تحقیقات کی ضرورت ہے تاکہ مزید ترقی کے لئے جو واقفیت ضروری ہے اسے حاصل کیا جا سکے اس صنعت کی نگرانی، تحقیقات اور توسیع کے لئے باقاعدہ تنظیم کی ضرورت ہے جس کا انتظام ایک کل ہند مرکزی ماہی گیری کمیٹی کا تقرر کرکے جس کی سالانہ آمدنی یقینی ہو کیا جا سکتا ہے۔

پیداوار کے اضافہ کے لئے ضروری محرکات لیکن اس مطلوبہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری محرک بھی مہیا کرنا لازمی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ کاشتکار کو اپنی حالت کی طرف سے مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں جنگ کے زمانے میں اس محرک کو فراہم کرنے کا ایک طریقہ اختیار کیا گیا کہ پیداوار کی کمترین قیمتوں اور یقینی منڈی کی جنگ کے زمانہ اور اس کے ایک سال بعد تک کے لئے کسان کے واسطے ضمانت کردی گئی۔ ہندوستان میں ابھی حال میں اس قسم کی مشروعات گیہوں، جوار، باجرا اور روئی کی قیمتوں کے لئے کی گئی ہے۔ لیکن اگر کاشتکار سے اس اصلاح و ترقی پر روپیہ اور محنت صرف کرانا ہے جو پیدائش کے اضافہ کے لئے ضروری ہے اور اگر ہندوستان میں مستقبل میں افراد کی معیشت کو پیدا کرنا ہے تو پیداوار کی یقینی فروخت اور نفع بخش قیمتوں کے بارے میں لانبی مدت کے لئے ضمانت کرنا ہوگی، کم سے کم ان غذائی فصلوں کے لئے جو بہت لازمی ہیں اس ضمانت کے ساتھ ساتھ ملک کے مجموعی استحکام اور اطمینان کو قائم رکھنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ حکومت کی طرف سے اناج کے ایسے ذخیرے رکھے جائیں جو قحط سالی کے زمانے میں کام آ سکیں۔

ضروری اصلاحات پیدائش کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے اہم معاملات جن کی طرف توجہ ضروری ہے حسب ذیل ہیں :-

کاشتکار کے لئے پٹہ کا کافی حد تک مضبوط اور محفوظ ہونا۔ پرانے زمینداروں کا مسئلہ اور رقبہ زیر جوت کا بہت زیادہ منقسم ہونا۔ اگر کسان کو بہترین معاوضہ دلانا اور خریدار کو بہترین پیداوار مہیا کرنا ہے تو کھیت کی پیداوار جن حالات میں موجودہ زمانے میں

فروخت ہوتی ہے وہ بھی اصلاح چاہتے ہیں۔ فروخت کا ایک معقول اور مرتب نظام اسی وقت بن سکے گا جب ایک مقررہ معیاری نوعیت کی چیز کے لئے ایک ہی قیمت دی جائے گی جس ۔ ان معیاروں کی نگرانی کرنے کے لئے منڈیوں کے لئے قواعد وضوابط بنانا ضروری ہیں۔ اور دکانداروں کو چاہے وہ تھوک ہوں یا خوردہ فروش یا گاؤں کے پھیری والے سب کے لئے لائسنس لینا ضروری کر دیا جائے، اور گاؤں کے اندر فروخت کی تنظیم کو قائم کر دیا جائے۔

یہ نصب العین جو مقرر کیا گیا ہے اسی وقت حاصل ہو سکے گا جب تحقیقات کے سلسلے کو مرکز میں اور صوبوں اور ریاستوں میں خوب ترقی دے دی جائے گی۔ اور ضروری عملہ کو اور ان سہولتوں کو فراہم کیا جائے گا جو تحقیقات کے نتائج کو کسان تک پہنچانے اور زراعت کے روزمرہ کے معمولات میں زیادہ سے زیادہ رائج کرنے کے لئے ناگزیر ہیں۔

منصوبے کی کامیابی کے امکانات اس کی اگر ترقی سے بڑھنے۔ آپ کی ضرورت ہے کہ اس کی تکمیل کی مدت اور اس پر خرچ کا تخمینہ واضح طور پر معلوم کر دیا جائے اور کسانوں کے اندر کوشش کرنے کے محرکات پیدا کر دئے جائیں اور اس خاکے میں جتنی چیزوں خدمتوں سہولتوں کو ضروری بتلایا گیا ہے ان سب کا بندوبست کر دیا جائے تو زراعتی پیداوار میں سو فی صدی کا امکان ہے۔ پھر چونکہ ان سہولتوں کی فراہمی ان تعمیرات پر ہے جن میں سے بعض ابتدا کرنے اور پایۂ تکمیل تک پہنچنے میں کئی برس لگ جائیں گے اس لئے یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پیداوار پندرہ سال سے پہلے دوگنی نہیں کی جاسکے گی مگو نگ کے ختم ہونے سے دس سال کے اندر اندر اس میں پچاس فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا۔

موجودہ حالات میں اس منصوبہ کی لاگت کا تخمینہ زیادہ تر قیاسی ہو سکتا ہے

گویا مشرقی ایشیا میں

کیونکہ بہت سے عامل ابھی تک لا معلوم اور ناقابلِ شمار ہیں ۔

کے بارے میں برطانوی ہندوستان کے لئے غالباً یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ گزشتہ منصوبے

کی تعمیر پر دس ارب روپیہ صرف کرنا ضروری ہوگا ۔ اس کا ۔ سا گئی ہیں۔ چین پہلے

حصہ سالانہ سمجھنا چاہیے ۔ جس میں سے تین کروڑ مرکز کو کرنا ہوگا ۔ بلکہ اتحاد اور

۱ ۔ اور صنعتی

صوبوں کو ۔

... اِیکہ

... روس لڑائی پر آ

... لا کر دینے

ترک ور ...

حالاتِ حاضرہ

رفتارِ عالم

کے معا ... کے ساتھ محسوس ہونے والے انقلابوں کا دور ختم ہو گیا۔ لیکن یہ سمجھنا کہ جنگ کی سخت آزمائش
کے بعد کچھ دنوں تک دنیا ایک حالت پر قائم رہے گی اپنے آپ کو دھوکے میں ڈالنا ہے۔ البتہ تصادم
کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔ جاپان کے ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہی متحدہ اقوام کا ایک
دستور مرتب ہو گیا تھا اور اسی کے ماتحت دنیا مختلف سیاسی حلقوں میں تقسیم ہو گئی تھی جس کی
بدولت قوت میں توازن پیدا کرنے کی صورت نکل سکتی ہے بغیر اس کے کہ بڑی ریاستوں
کی کشمکش خطرناک ہو جائے۔ اس تقسیم کی پوری تفصیل ابھی معلوم نہیں ہے۔ اور شاید اسے
صراحت سے بیان کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ بحر الکاہل میں متحدہ ریاستوں کی اغراض کو
ترجیح دی گئی ہے، اور چین کو بحر الکاہل کے حلقے میں شامل کرنا غلط نہ ہوگا۔ روس نے چین
کی قومی حکومت سے دوستانہ معاہدہ کر لیا ہے، اور غالباً روس ہی کی کوشش سے قومی حکومت
اور چینی کمیونسٹوں میں صلح ہو رہی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ روس نے پورے
طور پر اور صاف دلی سے متحدہ ریاستوں کا بحر الکاہل اور چین پر حق تسلیم کر لیا ہے مگر دوسری
طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جاپان کے ساتھ بے جا رعایت کی جا رہی ہے، اور اگر یہ بات صحیح
ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جاپان قوت کا توازن قائم رکھنے کا ایک ذریعہ بنایا جائے گا۔
... قوت کا توازن روس کے سوا اور کوئی طاقت بگاڑ نہیں سکتی۔ جزائر مشرق ہند کا مسئلہ
ابھی بحث میں نہیں آیا۔ لیکن برما اور ملایا کا معاملہ طے سمجھنا چاہئے، اور ہند چینی پر
فرانسیسی دوبارہ قبضہ کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں کی آبادی ان کی حکومت نہیں چاہتی

اس میں بھی اب کوئی شک نہیں رہا ہے کہ ہانگ کانگ برطانیہ کو واپس ملے گا۔ گویا مشرقی ایشیا میں جنگ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان قوتوں میں سے جو یہاں مقابلہ پر آگئی تھیں، جاپان ایک حصے کے لئے خارج ہو گیا ہے، اور متحدہ ریاستوں کی حدود مشرقی ایشیا سے مل گئی ہیں۔ چین پہلے کی طرح بیرونی امداد کا محتاج ہے اور اس امداد پر صرف اس کی ترقی ہی نہیں بلکہ اتحاد اور امن و امان کا مدار ہے۔ آگے جو کچھ ہوگا اس میں مقابلہ کرنے والی قوتوں کی دولت اور صنعتی استعداد فیصلہ کن ثابت ہوگی۔

یورپ کے مسائل بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ وہاں جرمنی نے جن اختلافات سے فائدہ اٹھایا تھا وہ بہت پرانے، شاید ازل سے مقدر ہیں، اور جرمنی کی شکست سے ان کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ روس نے انقلاب کے بعد توسیع کے منصوبے داخل دفتر کر دئے تھے اور اب جو یہ دفتر کھولا گیا ہے تو معلوم ہوا ہے کہ بہت سی کارروائیاں تکمیل کی منتظر ہیں۔ روسی سیاست کی وہی کیفیت ہو گئی ہے جو کسی دفتر کے نگراں کی ہوتی ہے، جس کے سامنے پرانے کاغذات رکھ دئے جائیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ پچھڑے کیوں رہ گئے۔ روس نے اپنی حفاظت کا انتظام کر لیا ہے، نسلی اور فوجی نقطۂ نظر سے اپنی مغربی سرحد میں ضروری ترمیم کر لی ہے، لندن میں وزیروں کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں روسی کوئی مطالبہ اس بنا پر پیش نہ کر رہے ہوں گے کہ وہ روس کی حفاظت کے لئے لازمی ہے۔ اب وہ اس بات کی کسر نکال رہے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد انھیں کچھ نہیں ملا اور پھر قریب بیس برس تک وہ توسیع کے موقعوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ پہلی جنگ عظیم میں روس کامیاب ہوا ہوتا تو اسے یقیناً قسطنطنیہ، مشرقی تھریس، بحرۂ ایجین کے کچھ جزیرے، اور ایشیائے کوچک کا ساحلی علاقہ ملتا، اور ان مقبوضات کے ذریعے اسے جو اقتدار حاصل ہوتا اسی کی مناسبت سے وہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اپنے مفاد کی خاطر دخل دیتا۔ اسی بنا پر روس نے اس وقت ترکی سے مطالبہ کیا کہ اسے دردانیال میں برابر کا حق دار مانا جائے، اور اتحادیوں

ے مطالبہ کیا ہے کہ اسے بحر کیسپین کے چند جزیرے، جزائر ڈوڈیکانیز اور اٹلی کی افریقی نو آبادیو
ایک حصہ دیا جائے۔ ان مطالبوں سے ترک اور اتحادی دونوں پریشان ہیں۔ مگر وہ جانتے ہیں
۔روس لڑائی پر آمادہ نہیں ہے، اور ان کی پریشانی ویسی ہی ہے جیسے کسی مدعی کے دعوے
دائر کر دینے سے مدعا علیہ کو ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ دعوے کو غلط کیسے ثابت کیا جائے
ترک دردانیال کے معاملے کو ان ریاستوں کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہیں جنھوں نے مونٹرو
ے معاہدے پر دستخط کئے تھے۔ غالباً ان کی بریت کے لئے یہ جواب کافی ہوگا۔ مگر اتحادی
کیا کریں گے۔ اٹلی سے طرابلس، لیبیا، اریٹریا اور سومالی لینڈ چھینے گئے ہیں۔ اب یہ کس کو دئے
جائیں؟ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ متحدہ اقوام کی عملداری میں رہیں اور ایک کمیشن یہاں
حکومت کرے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہاں متحدہ قوموں میں سے کسی ایک کی حکومت ہو
ور باقی اس کی نگرانی کریں۔ بہرحال فیصلہ متحدہ اقوام کی مجلس خاص کمیٹی کے مستقل ارکین یعنی روس
برطانیہ، فرانس، متحدہ ریاستوں اور چین کی سفارش کے مطابق کرے گی۔ اور روسی چاہتے ہیں
یہ کمیٹی سفارش کرے کہ اٹلی کی افریقی مقبوضات میں سے کم از کم طرابلس اور اریٹریا متح
تحدہ اقوام کے زیر نگرانی روس کی عملداری ہو۔ انگریز سے ایک بدیہی بات سمجھتے ہیں کہ دنیا کے
ن حصے میں ان کا تسلط ہو، اور جس زمانے میں برطانیہ کا بیڑا سمندر پر راج کرتا تھا، انگریز
پنے حق کو سب سے تسلیم کرا سکتے تھے لیکن اب یہ سند پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے روس کا مطا
د کرنے کے لئے دلیلیں چاہئیں۔ کوئی تعجب نہیں کہ بحث کرتے وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ
مسٹر بیون کو بار بار غصہ آ جاتا اور وہ میز پر مکے مارنے لگتے۔ مگر مسٹر بیون کی عقل عاجز ہے
ور اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ روس کا مطالبہ مان لیا جائے گا۔ اٹلی کی نو آبادیوں پر برطانیہ
قبضہ ہے، اور اگر روس — یا متحدہ اقوام — برطانیہ کو بے دخل کرنا چاہتی ہیں تو انھیں
جنگ کرنا ہوگی۔ وہ لڑنے پر تیار نہ ہوئیں تو برطانیہ کے قبضہ کو کوئی قانونی شکل دینا ہوگی۔
غالباً ایسا ہی کیا بھی جائے گا۔ لیکن آخری فیصلہ ہونے تک جو بحثیں ہوں گی ان سے روس کو

بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ ایک تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ برطانیہ کی سیاست سراسر اغراض پر منحصر ہے اور ان اغراض کو کوئی فضیلت یا تقدس حاصل نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ برطانیہ وعدہ کرے گا کہ جب دردانیال کا معاملہ حفاظتی کمیٹی یا متحدہ اقوام کی مجلس یا متحدہ اقوام کی مجلس یا معاہدہ مونترو پر دستخط کرنے والی ریاستوں کے سامنے پیش ہوگا، تو وہ روس کی تائید کرے گا، ترکی کا ساتھ نہ دے گا۔

جنوب مشرقی یورپ کے مسائل کو روس کی کج بحثیوں نے بہت پیچیدہ کر دیا ہے۔ تجربہ سے کبھی تو معلوم ہوتا ہے کہ روس بعض ریاستوں یا خاص سیاسی پارٹیوں کا حامی ہے، کبھی یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بے مہر کسی کا آشنا نہیں۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنوب مشرقی یورپ کا ایک جھگڑا طے کیا جائے تو دو تین پیدا ہو جاتے ہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر روس وہاں کی تحریکوں اور پارٹیوں میں اپنے حامی تلاش کرنے اور انھیں تقویت پہنچانے کے بجائے سب کو شطرنج کے مہرے سمجھے اور جو چال مناسب معلوم ہو چلے۔ اتحادیوں کے لیے اس دوسرے طریقے کو اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ برطانیہ یونان کو اپنے اثر میں رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جو پارٹیاں اس کے موافق ہیں وہ رجعت اور تشدد پسند ہیں اور ان کی سرپرستی کرنے میں بدنامی کے بڑے خطرے ہیں۔ یونان کا مطالبہ ہے کہ جنوبی البانیہ اور جزائر ڈوڈیکانیز اسے دے دیے جائیں، اور اگر برطانیہ چاہتا ہے کہ یونان اسے اپنا محسن سمجھے، تو اسے یہ علاقے یونان کو دلوانے ہوں گے۔ رومانیہ کے تیل کے کنوؤں اور ریلوں میں برطانیہ کا بہت سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اور اسے کوئی تدبیر کرنی ہے کہ یہ سرمایہ محفوظ ہو جائے یا واپس مل جائے۔ بلغاریہ سے برطانیہ کا کوئی خاص تعلق نہیں مگر بلغاریہ کا مطالبہ ہے کہ اسے جنوبی تھریس میں سمندر تک راستہ دیا جائے، اور بلغاریہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس راستے کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہو جائیں۔ خصوصاً اگر انھیں خیال ہو کہ روس ان کی مخالفت نہ کرے گا۔ بلغاریہ کی طرح یوگوسلاویہ بھی مقدمے کا ایک فریق ہے۔

جن سے برطانیہ کو کوئی تعلق اور ہمدردی نہیں۔ مگر مقدمہ بہت پیچیدہ ہے۔ یوگوسلاویہ کا مطالبہ ہے کہ اسے ٹریسٹ اور فیوم کی بندرگاہیں دے دی جائیں، اس لئے کہ ان شہروں اور ان کے نواح کی آبادی بیشتر سلاف ہے۔ مارشل ٹیٹو ان دونوں شہروں پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ اور اب وزیروں کی کانفرنس کو طے کرنا ہے کہ ان دونوں شہروں کے متعلق کیا سفارش کی جائے۔ اگر روسی مارشل ٹیٹو کے ہم نوا ہو جاتے تو فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا۔ برطانیہ کو رومانیہ میں رعایتیں حاصل ہو جاتیں اور ٹریسٹ اور فیوم یوگوسلاویہ کو مل جاتے۔ مگر روسی سیاست جذبات سے بالکل خالی معلوم ہوتی ہے۔ وہ مارشل ٹیٹو کے حق کو بھی مانتی ہے آسٹریا کی نئی حکومت کی بھی سرپرستی کر رہی ہے، اور اس دلیل کو بحث سے خارج نہیں کرنا چاہتی کہ ٹریسٹ ۱۹۱۸ء تک آسٹریا کے قبضے میں تھا اور اٹلی نے اس کو ویانا کی مرضی کے خلاف زبردستی حاصل کر لیا۔ اب اگر اتحادیوں کو اختیار رہے کہ وہ اس شہر کو جسے چاہیں دے دیں تو آسٹریا کے حق کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ روسیوں کو جو کچھ لینا تھا وہ لے چکے ہیں۔ ان کے مفاد کے لئے جو کچھ ضروری تھا وہ انھوں نے بحث کئے بغیر حاصل کر لیا۔ اب وہ ایسی منطق چھانٹ رہے ہیں کہ جن سے ان کا مطلب واضح نہیں ہوتا، اور دوسرے اپنی ذہن کو بے حجاب کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ ۔ کلکتہ

سرپرست

عالی جناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال	عالی جناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ	۶۰ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	بائیس لاکھ چوالیس ہزار ساٹھ	۲۲۴۴۰۶۰
ادا شدہ سرمایہ	بارہ لاکھ پچاس ہزار	۱۲۵۰۰۰۰

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل ورسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لنڈن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد دکن، احمدآباد، کانپور، پشاور

فلسطین TELVIV

